محی الدین نواب
آسودگی

نام ناول : آسودگی

مصنف : محی الدین نواب

سن اشاعت : ۱۹۹۱ء

قیمت : چالیس روپے

مطبوعہ : فائن آفسٹ پرنٹرز شاہدرہ دہلی

ناشر : کتاب والا ۲۷۹۴، پہاڑی بھوجلہ دہلی

ایک مہ جبین کا افسانۂ الم جو ماں کی محبت اور باپ کی بے وفائی کے
گرداب میں پھنس گئی تھی۔
گرداب
محی الدین نواب

مجھے نفرت تھی اپنے باپ سے اور دنیا کے ہر مرد سے۔

میری ماں نے میرے دل کو مرد ذات کے خلاف ایک ایسا ناقابلِ تسخیر قلعہ بنانے کی حتی الوسع کوشش کی تھی جس کے گرد نفرت کی ایسی گھنی اور خاردار باڑ کھڑی تھی جس کی جڑیں میری ماں کے دل کی تہہ میں پیوست تھیں۔ انھیں میرے باپ سے نفرت تھی اور اس نفرت کو مرد ذات کے خلاف ایک واضح احتجاج کی صورت انھوں نے قطرہ قطرہ میرے قلب و روح میں انڈیل دیا تھا۔ یہی کچھ انھوں نے کاکا کے ساتھ بھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ ممی کے نزدیک مرد اس دنیا کی سب سے زیادہ ناقابلِ اعتبار مخلوق تھی۔ ان کی زندگی کے تلخ ترین ذاتی تجربے کے حوالے سے ان کا یہ موقف بجا ہی معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ محرومیاں اور تیرہ بختی کو دوسروں کے مقدر پر مسلط کر دینا ان کی ایک ایسی ناقابلِ معافی غلطی تھی جس نے کاکا کی زندگی کو ایک ایسے المیے سے دوچار کر دیا جس کے خیال ہی سے میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

میرے نانا ایک خوشحال اور روشن خیال آدمی تھے۔ لائلپور میں ان کی ایک بڑی ٹیکسٹائل مل تھی جس کا شمار ملکی صنعت کی ان چیدہ ملوں میں ہوتا تھا جو معیار اور تنوع کی ضمانت سمجھی جاتی تھیں۔ میری نانی شہر لاہور کے نواح میں واقع ایک گاؤں کے چوہدری کی اکلوتی اولاد تھیں۔ میرے نانا چوہدری صاحب کے ایک جگری دوست کے بیٹے تھے۔ ان کی میری نانی سے شادی کے موقع پر چوہدری صاحب نے صرف ایک شرط رکھی تھی اور وہ یہ کہ شادی کے بعد ان کی بیٹی یعنی میری نانی جہیز میں دی جانے والی اس حویلی میں رہیں گی جو گاؤں میں واقع تھی۔ مصلحتاً یہ شرط منظور کر لی گئی۔ میرے نانا اور ان کے والدین کا خیال تھا کہ بعد بعد میں اس شرط کا حصار ٹوٹ جائے گا لیکن ہوا یوں کہ جب شادی کے بعد میری نانی رخصت ہو کر چند دنوں کو شہر گئیں تو وہاں انھیں سانس اور خارش کی ایسی تکلیف نے آ لیا جسے ڈاکٹر حضرات نے شہر کی آب و ہوا راس نہ آنے کا نتیجہ قرار دیا۔ نانی کو واپس گاؤں لے جایا گیا۔ چند دن بعد پھر میرے نانا انھیں شہر لے گئے مگر پھر انھیں سانس کی تکلیف اور خارش نے آ لیا۔ گاؤں سے شہر چند پھیروں کے بعد بالآخر وہ شرط جسے میرے نانا اور ان کے متعلقین نے وقتی مصلحت سمجھ کر قبول کر لیا تھا، حرفِ آخر بن گئی۔ میری نانی کا مستقل قیام گاؤں میں واقع اسی حویلی میں رہا جو ان کے والد نے انھیں جہیز میں تحفتاً بطور خاص انھی کے نام لکھ کر دی تھی۔ لائلپور میں میرے نانا کی کوٹھی تھی، کاروبار بھی وہیں تھا چنانچہ شادی کے کچھ عرصے بعد سے آخر وقت تک میرے نانا کا معمول یہ رہا کہ ہر ہفتے کی شام وہ شہر سے گاؤں آ جاتے اور سوموار کی صبح شہر واپس چلے جاتے۔ موقع ملتا تو کبھی کبھار وہ درمیان میں بھی گاؤں کا چکر لگا لیتے مگر سنیچر کی شام تو ان کا شہر سے گاؤں آنا اسی طور لازم تھا جس طرح ہر صبح مشرق سے سورج کا نمودار ہونا۔ آندھی آئے یا طوفان آئے مگر ان کے اس معمول میں فرق نہ آتا۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی ذمے داریوں اور فرائض کا احساس رکھنے والے آدمی تھے اور شاید اس لیے بھی کہ انھیں میری نانی سے پیار تھا۔

میری نانی کے ہاں ایک دو نہیں پورے دس بچے پیدا ہوئے۔ چھ لڑکے اور چار لڑکیاں مگر بد قسمتی سے چھ کے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں عالمِ شیر خوارگی ہی میں اس دنیا سے رنگ و بو سے گزر گئے۔ حیات بخش پانے والی دو بیٹیوں میں سے ایک میری ماں تھیں، دوسری میری خالہ جنھیں میں کاکا کہا کرتی تھی۔ میری ممی کاکا سے تقریباً گیارہ سال بڑی تھیں۔ ممی اور کاکا میں بہت محبت تھی۔ ان دونوں میں ویسا ہی اُنس تھا جیسا مقناطیس اور لوہے میں ہوا کرتا ہے۔ ننھی کاکا پر جان چھڑکتی تھیں اور کاکا ممی کی ہر بات کو آسمانی صحیفہ سمجھتی تھیں۔

تقسیمِ ہند سے صرف چند دن قبل میرے نانا کی بڑی بہن نے جالندھر سے ٹیلی گرام دیا کہ انھیں اپنے ستر سالہ لاکوتے بیٹے کو فسادات میں گھِرتا دیکھ کر سے جنگ کے لیے میرے نانا کے پاس بھجوایا تھا۔ تقسیم کے بعد جو فسادات ہوئے ان میں نانا کی بہن ان کے خاوند اور چار جوان بیٹیوں کو بلوائیوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تاہم ان کا اکلوتا بیٹا اور ان کی نسل کی بقا کا ضامن بلوائیوں کے ہاتھوں سے سیکڑوں میل دور اپنے ماموں یعنی میرے نانا کے سائے میں محفوظ رہا۔ نانا جی نے اپنی مرحومہ بہن کی اس نشانی کو نہ صرف تحفظ فراہم کیا بلکہ اسے وہ قدر و منزلت بخشی جو مرحومہ بہن سے اپنا رشتہ نبھانے کی انتہائی ممکنہ صورت ہو سکتی تھی۔ انھوں نے بھانجے کو پڑھایا لکھایا، اپنے وسیع کاروبار میں اپنا معاون خاص بلکہ..... دستِ راست مقرر کیا۔ انھوں نے اسے بھانجا نہیں بیٹا سمجھا اور تقسیم کے چھٹے برس جب نانا جی صاحبِ فراش ہوئے تو انھوں نے جائیداد کی بابت وصیت میں بیوہ اور دو بیٹیوں کے ساتھ بھانجے کو بھی حصے دار قرار دیتے ہوئے میری نانی سے عہد لیا کہ وہ میری ماں کی شادی نانا جی کے اسی بھانجے سے کریں گی۔ بد قسمتی سے بہ علالت میرے نانا کی زندگی کا چراغ گل کر گئی۔ انھوں نے ترکے میں ایک بڑی ٹیکسٹائل مل کے علاوہ لائلپور میں واقع ایک کوٹھی بھی اپنے لواحقین کے لیے چھوڑی تھی۔

نانا جی کے انتقال کے بعد ان کے اسی بھانجے نے میری نانی کے ایما پر ان کا کاروبار سنبھال لی جو بعد میں میری ماں کا جیون ساتھی بنا۔ میری نانی ایک گھریلو خاتون تھیں۔ میری ماں اپنے والد کے انتقال سے تقریباً دو برس قبل میٹرک پاس کر کے گھر بیٹھ جانے والی نشیب و فرازِ زندگی کے معاملے میں ناتجربے کار قسم کی ایک

دوشیزہ تھیں۔ انھیں حصولِ علم سے کوئی خاص رغبت نہ تھی میرے نانا ایک پڑھے لکھے روشن خیال اور تعلیمِ نسواں کے شدت سے حامی شخص نہ ہوتے تو شاید نانی میٹرک بھی نہ کرتیں۔ البتہ امورِ خانہ داری سے انھیں بہت دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ حویلی میں مختلف کاموں کی انجام دہی پر مامور دس بارہ ملازموں کو مختلف النوع احکامات صادر کرنے اور ان سے کام لینے کا انھیں بڑا سلیقہ تھا۔ نانی کے برعکس ممی بچپن ہی سے ایک غیر معمولی ذہین اور پڑھاکو لڑکی تھیں۔ وہ نانا جی کی بے حد چہیتی بیٹی تھیں۔ اپنے والد کی روشن خیالی کے سبب ان کی تعلیم کا آغاز کانونٹ سے ہوا۔ نانا جی کے انتقال کے وقت وہ زمانے کے سرد و گرم سے قطعاً ناآشنا کانونٹ کی ایک طالبہ تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد میری نانی نے میری ماں کو زیادہ دن گھر بٹھائے رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیے گھر بٹھائے رکھنے کی اصطلاح تو میں محاورۃً استعمال کر گئی ہوں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میری ممی شادی کے بعد بھی اسی حویلی میں رہیں جس میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی۔ نانا جی کی وصیت کے مطابق ان کے بھانجے کو شرفِ دامادی بخشتے ہوئے میری نانی نے تاریخ کو اس طرح دہرایا کہ خود اپنے مرحوم و مغفور باپ کی طرح انھوں نے بھی ہونے والے داماد کے سامنے صرف ایک شرط رکھی کہ شادی کے بعد ان کی بیٹی ان سے دور نہیں جائے گی۔ میرے باپ نے اس شرط کو بے چون و چرا قبول کیا۔ عقد کا جواز بھی کیا تھا۔ شادی کے وقت میری ماں اکیس برس کی ایک دبلی حسین و جمیل دوشیزہ تھیں جن کے حسن کے منہ بولتے ثبوت کے طور پر ہماری ساری ضخیم خاندانی البم میں ان کی بے شمار تصویریں جا بجا محفوظ ہیں۔

میری ماں کی شادی کے بعد میری نانی نے انتظامی مجبوریوں اور تقاضوں کے پیشِ نظر ایک قانونی مختار نامے کے ذریعے ہی کے جملہ معاملات کے سلسلے میں میرے باپ کو مختار مقرر کر دیا۔ وہ خود تو ایک گھریلو خاتون ہونے کے سبب ان کے معاملات کی دیکھ بھال میں حصہ لینے سے قاصر تھیں۔ میری ماں کو کاروباری امور سے قطعاً رغبت نہ تھی اور کالج جاتی تو کاروباری جھمیلوں سے بے نیاز کانونٹ کی طالبہ تھیں چنانچہ میرے نانا کے اختیارات اور شبانہ روز مصروفیات جلد ہی تمام میرے باپ کو منتقل ہو گئیں۔ میری ممی گاؤں والی حویلی میں نانی اماں کے ساتھ مقیم رہیں اور میرے پاپا ہفتے کے سات روز میں سے اوقاتِ کار کے حساب سے پانچ روز شہر میں گزارتے اور ڈیڑھ دن کے لیے ہفتہ بھی گاؤں میں۔ شہر میں نانا جی کی چھوٹی سی کوٹھی اب پاپا کے کام آتی تھی۔ میری ممی میرے پاپا کے ساتھ رہنے کی خاطر گاؤں والی حویلی چھوڑ کر شہر والی کوٹھی میں مستقل قیام کا ارادہ رکھتی تھیں مگر میری نانی کے تنہا رہ جانے کا خیال ہمیشہ ان کی راہ روک لیا کرتا تھا۔ میرے پاپا کی نانی اماں کے بیٹے میں سعادت مندی اس پر مستزاد ثابت ہوئی۔ وہ میری ممی کو اپنے ساتھ رکھنے کے بجائے ان کے نانی اماں کے پاس رہنے کے حق میں تھے۔ نانی اماں پاپا کی سعادت مندی سے بہت خوش تھیں۔ ہفتے کی سات شاموں میں سے دو شامیں پاپا نے ممی کے نام کی ہوئی تھیں۔ سنیچر کی شام وہ حویلی پہنچ جاتے اور اتوار کی ہفتہ وار تعطیل ممی کے ساتھ گزارنے کے بعد سوموار کی صبح شہر واپس چلے جاتے۔ ممی تو چاہتی تھیں کہ وہ ہر شام حویلی آیا کریں اور صبح شہر چلے جایا کریں۔ مگر شہر سے گاؤں تک کا طویل فاصلہ پاپا کو روزانہ اس لمبی دوڑ کی اجازت نہ دیتا تھا۔ پاپا کا خیال تھا کہ میری ممی کو تو اس معمول کا عادی ہونا چاہیے تھا جس پر کہ وہ عمل پیرا تھے۔ آخر کو ان کے والد یعنی میرے نانا کا بھی تو یہی معمول تھا جوانی سے بڑھاپے تک۔ ان کے روز و شب بھی تو شہر اور گاؤں کے مابین بٹے رہے تھے۔ میں اپنے والدین کی شادی کے دو برس بعد دنیا میں وارد ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے والد اور خصوصاً نانی اماں کے لیے قرۃ العین بن گئی۔

میری چشمِ تصور کی کرشمہ سازیاں بھی مجھے اکثر اپنے بچپن اور لڑکپن کی ان ان گنت یادوں سے ہم آغوش ہو جانے میں مدد دیتی ہیں جو کبھی میرے ذہن کے در و بام پر چراغاں کا سا سماں پیدا کر دیتی ہیں اور کبھی سناٹا اور گھور تاریکی پھیلا دیتی ہیں۔ کبھی میرے قلب و روح میں ان یادوں کے جگنو ناچنے لگتے ہیں اور کبھی ہونے والے قلب و روح زخم زخم محسوس ہونے لگتی ہے۔

موسمِ گرما کی وہ تعطیل۔ میری یادوں میں آج بھی تازہ ہے جب میری ممی اپنے بالوں اور کلائیوں میں موتیے کے پھولوں اور گلاب کی کلیوں سے گندھے گجرے سجائے حویلی والی شہزادی سی لمبی سہاگن عورت کی تصویر بنی حویلی کے ملازموں کو احکامات جاری کرتی پھرا کرتیں۔ مجھے انتظار۔ وہ منتظر رہیں ڈرائیور اسٹری وہ میری کبھی یاد رہی جب وہ میرے پاپا کی شہر سے آنے والی ٹیلیفون کال کا حویلی کے برآمدوں میں ٹہلتے ہوئے بے تابانہ انتظار کیا کرتی تھیں۔ جب پاپا پہنچ گئے۔ وقفے کے دوران ہی فون کیا کرتے تھے۔ جوں ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ممی کال ریسیو کرنے کو تیزی سے لپکتیں۔ اس سمے ان کی آنکھوں میں اشتیاق بے ساختہ خوشی دیدنی ہوتی۔ سنیچر کی شام ممی کی سج دھج دیکھنے سے تعلق رکھتی۔ شہر سے پاپا کو جو آنا ہوتا تھا۔ پاپا کے حویلی پہنچتے ہی ممی کھل اٹھتیں۔ پاپا کچھ دیر سستاتے پھر دونوں کی گاڑی میں ساتھ ہی موٹر میں بیٹھ کر لمبی سیر کو نکل جاتے۔

کبھی کبھار وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتے لیکن جب نہ لے جاتے تو میں خود کو بہت اُداس اور دلگیر محسوس کرنے لگتی۔ ایسے موقعوں پر نانی امّاں کا پیار بھی کچھ کام نہ دکھاتا۔ میرا دھیان مستقل اپنے پاپا اور ممی کی طرف لگا رہتا۔ جب پاپا آجاتے تو ممی کے وجود سے مسحور کن خوشبوئیں، اُمڈ کر صورت خود بخود محسوس ہوتیں۔ ان کے بالوں میں لگے اور کلائیوں کے گرد لپٹے گجروں سے موتیا اور گلاب کی کنواری کلیوں کی مہک اٹھتی۔ ان کے جھمکوں میں دمکتے کانوں کی لوؤں پر مسکراتے بیلے کے پھولوں سے مدھر خوشبو آتی۔ ان کے چہرے پر غازہ اور سرخی کی تہوں میں بسی خوشبوئیں نوعمر، شوخ اور بے پرواہ شہزادیوں کی مانند ایک دوسرے کے گلے میں باہیں حمائل کیے مشام جاں تک پہنچی چلی آتیں۔ ان کے حنائی ہاتھوں سے حنا کی خوشبو حِس شامہ کو محظوظ کرنے چلی آتی۔ ان کے گریبان سے شمامۃ العنبر کی مسحور کن لپٹیں اٹھتیں اور ان کی باتوں سے محبت کی خوشبو آتی۔ پاپا سے باتیں کرتے ہوئے ممی بات بات پر کھِل کھِلا ان کی مسکراہٹ لبوں سے آنکھوں تک پھیل جاتی۔ جب پاپا شہر واپس چلے جاتے تو میری ماں سہاگنوں کی طرح بنی سنوری تو رہتیں مگر ان کی مسکراہٹ کا رنگ پھیکا پڑ جاتا اور آنکھوں میں شگفتہ ملتی وہ چمک بھی معدوم ہو جاتی جو پاپا کے آتے ہی ان کی آنکھوں میں عود کر آیا کرتی تھی۔ میرا جی چاہتا جادو کی کوئی چھڑی مل جائے تو میں جادو کے زور سے پاپا کو ممی کے ساتھ مستقل کر دوں، تاکہ وہ کبھی واپس نہ جا سکیں اور میری سندر سی ممی ہمیشہ مسکراتی رہیں۔ مجھے ان کی ہنستی مسکراتی ہی اچھی لگتی تھیں۔ میں انھیں خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ نانی امّاں اور کاکا بھی انھیں مطمئن و مسرور ہی دیکھنا چاہتی تھیں۔

اپنے بچپن سے نوجوانی تک میں نے کاکا کو بہت کم وقت حویلی میں گزارتے دیکھا۔ وہ تحصیل علم کے سلسلے میں شہر میں رہا کرتی تھیں اور تعطیلات کے دوران گھر آیا کرتی تھیں۔ کاکا اگرچہ میری ممی کی طرح حسن و جمال کا پیکر تو نہ تھیں تاہم ان کی سانولی سلونی سی رنگت میں غضب کی ملاحت تھی۔ قدرت نے انھیں دو چیزیں بہت خوبصورت دی تھیں... آنکھیں اور بال۔ اپنی غزالی آنکھوں کو جب وہ کاجل کے ڈوروں سے آراستہ کر لیتیں تو ان کے چہرے کی جاذبیت میں اور اضافہ ہو جاتا۔ ان کے ہونٹ موٹے تھے مگر وہ اپنے ہونٹوں پر سرخی کی تہ کچھ اس انداز سے جماتیں کہ ان کے موٹے ہونٹ بھی پتلے نظر آنے لگتے۔ اپنے سیاہ گھنیرے بالوں کو وہ طرح طرح کے انداز میں آراستہ کرتیں۔ کبھی انھیں کھلا چھوڑ دیتیں، کبھی اوپر اٹھا کر پونی ٹیل کی صورت رنگین ڈوری میں جکڑ لیتیں، کبھی ایک ڈھیلی ڈھالی چٹیا گوندھ کر اپنے کان کی آڑ میں گلاب کا پھول بالوں میں اڑس لیتیں۔ کبھی دو چوٹیاں گوندھ کر ایک چوٹی گلے سے اپنے سینے پر ڈال لیتیں اور دوسری کو پیچھے شانے پر لہرانے کو چھوڑ دیتیں۔ کبھی وہ بنگالی اسٹائل کا جوڑا باندھ لیتیں تو کبھی انھیں طرح طرح کے اسٹائل میں آراستہ کر لیتیں۔ کبھی ان کی گھنیری زلفیں انگریزی ہندسے آٹھ کی صورت سر کے عقبی حصے پر سج جاتیں تو کبھی پانچ پنکھڑیوں والے دلکش پھول کی صورت سنور جاتیں۔ کبھی وہ اپنے جوڑے پر سیاہ جالی چڑھا لیتیں اور کبھی اپنے جوڑے میں گھنگروؤں والی چاندی کی پنیں اڑس لیتیں۔ آرائش زلف و رخسار کے یہ سارے گُر انھوں نے شہر میں رہ کر سیکھے تھے۔ تعطیلات میں جب کاکا گھر آتیں تو نانی امّاں کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا۔ ممی کی مسرت دیدنی ہوتی۔ کاکا وی آئی پی بن کر گاؤں آتیں اور وی آئی پی بن کر رہتیں۔ ان کے آتے ہی حویلی کی رونقیں بڑھ جاتیں۔ حویلی کے بام و در ان کی کھنکتی ہنسی اور شوخ مسکراہٹ کے استقبال کو دیدہ و دل فرش راہ کر دیتے۔ صبح ناشتے اور دونوں وقت کھانے پر ممی کاکا کی پسند کا پورا خیال رکھنے کی کوشش کرتیں۔ ان کی پسند کے ریکارڈ حویلی کی فضاؤں میں رس گھولنے لگتے، حویلی کے برآمدے اور الماریاں کاکا کی پسندیدہ خوشبو لیونڈر کے چھڑکاؤ سے مہکنے لگتیں۔ ممی کاکا کے آرام کا پورا پورا خیال رکھتیں۔ گو ہر مرتبہ شہر سے کاکا اپنے ساتھ دھنک رنگ ملبوسات، وضع وضع کی چپلوں، سینڈلوں، پرس، شوز، نت نئی مصنوعات آرائش حسن اور خوشبویات کا وافر ذخیرہ لے کر گھر پہنچتیں لیکن نانی امّاں اور ممی کی چاہت کاکا کے اس اسٹاک کو ناکافی ہی سمجھتی۔ ان دونوں کی چاہت کاکا کے معطر اسٹاک میں ان کی شہر واپسی تک کبھی دوگنا، کبھی سہ گنا اور کبھی اس سے بھی زیادہ اضافہ کر چکی ہوتی تھی۔ پاپا اپنے کاروباری دوروں کے سلسلے میں لاہور سے باہر جاتے تو ممی ان سے بطور خاص فرمائشیں کر کر کے کاکا کے لیے ان کے شوق کی چیزیں منگواتیں۔ کاکا کے گھر آنے پر ان کے استقبال میں سینت کر رکھے گئے ان سلے کپڑے حویلی کے خاندانی درزی کو سینے کے لیے دے دیے جاتے جو اپنی مشین حویلی ہی میں لے آتا اور کاکا کی ہدایات کی روشنی میں ان کی مرضی کے ملبوسات تیار کرتا۔ کاکا لازماً بلا ناغہ جوڑا تبدیل کرتیں بلکہ کبھی کبھی تو وہ دن بھر میں دو سے تین جوڑے تک بدل ڈالتیں۔ نانی امّاں اور ممی کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ شہر واپس جانے سے پہلے انھیں اپنے تمام جوڑے پہن کر دکھا جائیں۔ جامہ زیبی میں تو کاکا ممی کو بھی مات کرتی تھیں۔ کیا دلکش سراپا تھا ان کا اور اس پر ستم ان کی بانکی چال۔ اونچی ایڑی کا جوتا پہن کر جب وہ ایک ادائے خاص سے دوپٹے کا ایک

خود بھی شانے کی ڈھلان سے سینے پر گرا کر اور دوسرا پلو
بائیں بازو کے نیچے سے نکال کر دائیں ہاتھ میں اس کا ایک
کونہ دبا کر چلتیں تو یوں لگتا جیسے مردوں کے دوش پر کوئی
متوالی چال پر کوئی شہزادی ٹہل رہی ہو۔ نانی اماں اور بھی انھیں
اتنے پریم سے دیکھتیں کہ جیسے نظر لگنے لگتا۔ حویلی سے دور شہر
میں رہ کر تو وہ حویلی والوں کے لیے بڑی اہم اور جیسی بن گئی تھیں
میں خود بھی تو ان سے جا بسنے والوں میں شامل تھی۔ نہ جانے کیوں کا کا
سب اپنے بچپن کا ساتھ بہت اچھوتی اور سادہ سی لگا کرتی تھیں۔

کا کا تعطیلات میں گھر آتیں تو حویلی میں بہار آ جاتی۔ سیر و تفریح
کے پروگرام بنتے اور ان میں شامل ہوتے۔ سب کا کا کی پسند اور ناپسند کا
پورا خیال رکھا جاتا۔ کا کا کی حویلی میں موجودگی کے دنوں میں ہمارا چھوٹا
سا خوش باش گھرانہ جنت کا نمونہ بنا ہوتا۔ کا کا پورا لطف اٹھانے کی
خاطر کسی نہ کسی اچھے اور خوبصورت پہاڑی تفریحی مقام کا
رُخ کرتا اور تھوڑا سا سامان باندھ کر ادھر ہم لوگ چل پڑتے۔ کا کا کو سبزہ، پانی،
موسیقی اور پہاڑوں سے عشق تھا۔ ہمارے گھر والوں اور ان کے والدین کی
جانب سے ہر حال میں زبان کی قدر کی جاتی تھی۔ پاپا البتہ نہ تھے۔ ہر کے
موسیقی تو سب کے لیے جانتے ہوئے بھی کا کا گھر سے کا ٹیپ ریکارڈ
ساتھ لینا نہ بھولتیں۔ کا کا کی خاطر ان کی تعطیلات کے دوران
ہم چند دنوں کو کسی پہاڑی مقام کا رُخ کرتے۔ پاپا کا تو اپنے کی
کاروباری مصروفیات کے سبب شاید ہی ہمارے ساتھ جانا ممکن
ہوتا تھا تاہم نانی، ممی، کا کا اور ان کے ساتھ میں بھی
ہر سال کے ہر تعطیلات کے دوران زیادہ نہیں تو چار چھ دن ہی
کو سہی کسی نہ کسی پہاڑی مقام تفریح پر ضرور جاتے۔ مری، سوات
اور کاغان کا کا کی پسندیدہ جگہیں تھیں۔ سبزہ، پانی اور پہاڑوں کے
بیچ وہ ایک خوش رنگ تتلی کی مانند اڑی اڑی پھرتی تھیں۔ مجھے
یاد ہے ایک بار کا کا کی سرما کی تعطیلات میں ہم ان کی فرمائش
پر مری گئے۔ ایک روز کا کا برفباری کے دوران کھلے سر لیٹ ہاؤس
کے باہر گھومتی پھریں۔ نتیجتاً انھیں نمونیہ ہو گیا۔ دو دن تک وہ بری
طرح ایک کیفیت میں بے سُدھ پڑی رہیں۔ تیسرے دن جب ان
کی حالت ذرا سنبھلی تو نانی اماں نے ان سے کہا: دیکھا! میں تمھیں
منع کر رہی تھی ناکہ کھلے سر برفباری میں نہ گھومو مگر تم نے میری
ایک نہ سنی اور بیمار پڑ گئیں۔ کا کا دھیرے سے مسکرائیں، انھوں
نے نانی اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مدھم سُروں میں بولیں
امی! اتنے خوبصورت موسم میں تو اگر میں مر بھی جاتی تو دکھ نہ
ہوتا۔ کا کا کی اسی بات سے یہ اندازہ کرنا غالباً دشوار نہیں کہ
موسم کی خوبصورتی پر مر مٹنے کو تیار رہنے والی کا کا نے اگر کسی
انسان سے محبت کی ہوتی تو اسے کتنی شدت سے چاہا ہوگا۔

کا کا کے لیے رشتے تو ابھی دونوں آنے شروع ہو گئے
تھے جب وہ سینئر کیمبرج کی طالبہ تھیں۔ گاؤں کے کئی صاحب حیثیت
خوشحال گھرانے انھیں اپنے گھر کی بہو بنانے کے خواہاں تھے۔ چوہدری
فتح محمد کے بیٹے چوہدری نیاز محمد نے تو ایک انگریز سیاح کو کئی ماہ
اپنے پاس ٹھہرا کر اور اس کی انتہائی خاطر مدارات کر کے تھوڑی سی
بہت ٹوٹی پھوٹی ہی اس لیے سیکھی تھی کہ وہ کا کا سے شادی کرنا
چاہتے تھے۔ جب یہ بات کا کا کے علم میں آئی تو وہ بہت ہنسی
تھیں اور اکثر ہنسا کرتی تھیں۔ چوہدری فتح محمد نے گاؤں کی نائن مائی
بخت کے ذریعے کا کا کے لیے بیٹے کا رشتہ بھی بھجوایا تھا مگر کا کا
نے صاف انکار کر دیا تھا۔ کا کا گاؤں کی سیدھی سادی چھریری سی
ہشیار لڑکی نہیں۔ بچپن ہی سے شہر کی آزاد فضاؤں میں رہی تھیں اور نانی
اماں کا خیال تھا کہ وہ اپنی بات منوا لینے کے سلسلے میں قطعاً نانا جی
پر گئی تھیں۔ تحصیلِ علم کا انھیں بے حد شوق تھا۔ نہ صرف گاؤں بلکہ
شہر سے نانا جی مرحوم کے احباب و اقارب اور میرے پاپا کے
توسط سے آنے والے متعدد رشتوں سے بھی کا کا نے یہ کہہ کر انکار
کر دیا تھا کہ وہ ایم اے کی ڈگری لینے سے قبل ہرگز ہرگز شادی
نہیں کریں گی۔ نانی اماں پر دو چار بیٹیوں کا بوجھ ہوتا یا انھیں کا کا
سے اتنی محبت نہ ہوتی جتنی کہ تھی تو وہ کا کا کے انکار پر برافروختہ
ہوتیں اور شاید انکار یا اقرار کا حق انھیں نہ دیتے ہوئے زبردستی
ان کی شادی کر دیتیں مگر اول تو نانی اماں پر ذمے داریوں کا بوجھ
ایسا نہ تھا کہ وہ گھبرا جاتیں، دوسرے وہ کا کا سے پیار کرتی تھیں اس
لیے ان کی ضد پوری کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی تھیں۔ شادی سے کا کا
کے انکار اور ایم اے پاس کر لینے کی شرط سن کر نانی اماں نے
کا کا کے ایم اے کر لینے تک ان کی شادی کا معاملہ التوا میں ڈال
دیا تھا۔ کا کا کے امیدواروں نے مایوس ہو کر دوسرے راستے
دیکھ لیے۔ تاہم نئی امیدواریاں گاہے گاہے پیش منظر میں آتی
رہتی تھیں۔

میری ماں سے میرے باپ کی شادی کے بعد خانگی و
کاروباری معاملات ایک دو نہیں بلکہ تقریباً چودہ برس تک بالکل
ٹھیک ٹھاک بلکہ اطمینان بخش طریقے پر چلتے رہے۔ نانی اماں
پاپا کی سعادت مندی اور لیاقت سے بہت مطمئن اور مسرور تھیں۔
وہ خوش تھیں کہ ان کی بیٹی یعنی میری ممی کی ازدواجی زندگی انتہائی
خوشگوار گزر رہی تھی۔ وہ کا کا کے یونیورسٹی سے فارغ التحصیل
ہوتے ہی ان کے فرض سے بھی سبکدوش ہونے کی متمنی تھیں۔
کا کا پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کر رہی
تھیں۔ نانی اماں کو اگر کوئی ملال تھا تو بس یہ کہ میں اپنے والدین کی
یکہ و تنہا اولاد کیوں ثابت ہوئی تھی۔ اس بات کا ملال تو خود مجھے

بھی تھا۔ گاؤں کے اکثر گھروں میں ڈھیروں بہن بھائی دیکھ کر میں
حسرت سے سوچتی، کاش! بہت سے بہن بھائی نہ سہی کم از کم میری
ایک بہن تو ہوتی... کاکا جیسی دلنواز اور دلکش۔ میری ہر بات
کو ویسے ہی آنکھیں موند کر ماننے والی جیسے کاکا امّی کی ہر بات
پر سر جھکا دیا کرتی تھیں۔ تب شاید نانی امّاں اور امّی مجھے جان
سے لگائے رکھتے اور گاؤں کے واحد سرکاری اسکول میں پڑھانے
کے بجائے کاکا کی طرح شہر کے کسی کانوینٹ میں داخل کرواتیں
اور میں بھی کاکا کی طرح اپنے چاہنے والوں کو طویل اور صبر آزما
انتظار کروانے کے بعد تعطیلات میں ہی آنی پی بن کر گھر آیا کرتی۔
بے شک مجھے اب بھی گھر میں بڑی چاہت اور توجہ حاصل تھی گاؤں
کے اسکول میں میری دوست مجھے بڑے ادب و احترام سے بلایا
کیا کرتی تھیں جب میں اپنے پاپا کی چمکیلی موٹر سے اسکول کے صدر
دروازے پر اترتی تو لڑکیاں سمٹ کر مجھے راہ دے دیتیں استانیاں
بھی میرا بے حد خیال رکھا کرتی تھیں مگر شہر میں رہنے والی کاکا کی
بات ہی کچھ اور تھی۔ جب وہ آتی تو وہ بہت ہی ارفع اور اعلیٰ محسوس ہوا
کرتی تھیں۔ میرے اسکول کی لڑکیاں مجھ پر رشک کرتی تھیں اور
میں کاکا پر۔

مجھے نئی جماعت میں پہنچے تین چار ماہ ہی گزرے تھے کہ
اچانک پاپا کی جانب سے انکشاف ہوا کہ مل گزشتہ دو ڈھائی
برس سے مسلسل خسارے میں چلنے کے بعد قریب دیوالیہ پن سے
ہمکنار ہو چکی ہے۔ جس نے نانی امّاں اور امّی کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ حویلی کی
خوشگوار فضاؤں میں تفکرات، اندیشوں اور مایوسیوں کے رنگ گھل
گئے۔ میں اپنا پندرھواں جنم دن منا چکی تھی گو نانی امّاں اور امّی نے
مجھے اس افتاد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا مگر میں عمر کے اس دور
میں آ چکی تھی جہاں پہنچنے کے بعد بہت سی باتیں بنا کسی کے بتلائے آپ
ہی آپ سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ میں بڑوں کے دکھ سکھ، خوشیوں اور
غموں، آلام و تفکرات سے بے نیاز نہ رہ سکتی تھی۔ البتہ وہ اور
بات تھی کہ میں اس انداز تربیت کے پیش نظر جو کہ امّی نے میرے
سلسلے میں روا رکھا تھا، سب کچھ جاننے بوجھنے اور سمجھتے ہوئے
بھی بظاہر بے نیازی کا مظاہرہ کر کے ان پر ثابت کرنے کی کوشش
کیا کرتی تھی کہ مجھے بڑوں کے معاملات سے چنداں سروکار نہیں۔

جب نانی امّاں نے پاپا سے مل کے خسارے میں جانے
کا سبب جاننا چاہا تو میں بظاہر انجان اور بے نیاز سی کوچ کے
[illegible] میں رکھے کشن کا بخیہ ایک ایک کر کے توڑنے میں
مصروف تھی۔ پاپا نے جو نانی امّاں کے سامنے ہمیشہ انتہائی
سعادت مندی سے سر جھکائے رکھتے تھے، بے دھڑک کہا تھا،
بزنس میں کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ نفع اور نقصان تو ہر

کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ تیرہ چودہ برس تک مل بھی تو نفع ہی میں
چلتا رہا۔ تب تو آپ نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ نفع کیوں ہوا ہے؟
ان کا جواب اس قدر مدلل تھا کہ میری نانی کے لیے خاموش ہو جانے
کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ امّی اس صورت حال سے انتہائی
متوحش اور دلگیر تھیں۔ مل کو دیوالیہ پن سے بچانے کی
خاطر میری نانی امّاں نے پاپا کے ایما پر شہر والی کوٹھی بھی داؤ پر
لگا دی۔ میرے باپ کی نشانی اور گاؤں کی روایات کے مطابق
زمین کو ماں کی طرح عزیز رکھنے کا خیال نہ ہوتا تو شاید نانی امّاں
اس زرعی اراضی کو بھی مل کی خاطر داؤ پر لگا دیتیں جو انھیں اپنے
باپ کے انتقال کے بعد ورثے میں ملی تھی۔ افسوس کہ کوٹھی کو فروخت
کر دینے کے باوجود ڈوبتی ناؤ کو سہارا نہ مل سکا۔ نانی امّاں کے
اعصاب اس صدمے سے اس بری طرح مجروح ہوئے کہ ان
کی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو کے رہ گئیں۔ امّی اس افتادِ ناگہانی
سے سخت متوحش اور دلگیر تھیں۔ میں بڑوں کے معاملات میں
دخل نہ دینے کی روایت کی امین تھی۔ سو خاموش تماشائی بنی رہنے
پر مجبور تھی۔ کاکا ان دنوں یونیورسٹی میں ایم اے فائنل کی طالبہ
تھیں۔ نانی امّاں اور امّی نے انھیں مل کی گرتی ہوئی ساکھ کی خبر سنا کر پریشان کرنا
مناسب نہیں سمجھا۔ ابھی مل کے خاک میں مل جانے کا صدمہ تازہ
تھا کہ ایک زیادہ ہولناک اور لرزہ خیز خبر برق بن کر ہمارے
حواس پر گری۔ مل کے کسی سابق ملازم کی جانب سے حویلی
کے پتے پر نانی امّاں کے نام ایک گمنام مکتوب موصول ہوا۔ خط
خاصا شکستہ تھا اور طرز نوشت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ
مکتوب نگار درون خانہ رازوں سے واقف ہی نہیں بلکہ شاید
ابن الوقت بھی تھا لیکن سب سے بڑھ کر [illegible] آخر کچھ عرصہ
رہا ہو اور بعد میں پاپا سے وابستہ توقعات کے پورا نہ ہونے
پر ان کے خلاف ہو گیا ہو گا۔ بہر حال اصل حقیقت جو بھی تھی،
اس مکتوب کے پڑھنے سے ہی مکتوب نگار کا چہرہ ابن الوقت کا
چہرہ معلوم ہوتا تھا ورنہ وہ یہ سب کچھ بروقت نانی امّاں کے
علم میں کیوں نہ لایا ہوتا۔ اس نے لکھا تھا:

محترمہ و مکرمہ بیگم صاحبہ

السلام علیکم!

میں آپ کا ایک پرانا نمک خوار ہوں اور بڑی
شرمندگی محسوس کر رہا ہوں کہ جو باتیں میں آپ کو
اب جتانے جا رہا ہوں وہ بروقت آپ کے علم میں
کیوں نہ لایا۔ تب شاید آپ کو اتنا بڑا نقصان
نہ اٹھانا پڑتا جس سے بچا جا سکتا تھا۔ بڑے صاحب نے
(اللہ انھیں غریق رحمت کرے) بڑی محنت

اور محبت سے آبیاری کر کے اسے ایک گھنا اور سایہ دار درخت بنایا جس سے سیکڑوں افراد کا رزق بندھا تھا ایک خود غرض، مکار اور عیار شخص نے اس کی جڑیں کھوکھلی کر کے اسے زمیں بوس کر دیا۔ بیگم صاحبہ! مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کا داماد انتہائی خود غرض اور مکار انسان ہے۔ افسوس کہ آپ نے اس پر بھروسا کرتے ہوئے ایک عجب بات کا اسی کو مختار بنا دیا اور پلٹ کر خبر لینے کی زحمت نہ کی۔ بے شک وہ آپ کا سسرالی رشتہ تھا آپ کا داماد بھی تھا مگر کاروبار اور روپے پیسے کے معاملات میں یوں آنکھ بند کر کے تو کسی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا نا.... کاش! آپ اس پر اندھا اعتماد نہ کرتیں۔ کاش! مل کی لگام آپ نے مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں نہ دے دی ہوتی... کیا آپ جانتی ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ شاید نہیں..... اس مکار اور فریبی انسان نے آپ کو اور آپ کی بیٹی کو مسلسل اندھیرے میں رکھا اور مل کو تدریجاً خسارے میں دکھاتے ہوئے گوجرانوالہ میں برقی پنکھے تیار کرنے کی ایک بڑی فیکٹری تیار کر لی ہے۔ کیا آپ جاننا چاہیں گی کہ اس نے گوجرانوالہ ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ میں آپ کو بتاتا ہوں... دراصل آپ کے داماد نے گوجرانوالہ میں ایک اور شادی کر رکھی ہے..... جی ہاں کوئی چھ سات برس پہلے کی بات ہے کہ آپ کے داماد کے ایک کاروباری دورے کے دوران گوجرانوالہ کی ایک رسوائے زمانہ عورت سے مراسم استوار ہوئے جو آہستہ آہستہ ناجائز حدوں تک جا پہنچے۔ معشوقہ موقع شناس تھی اور مردم شناس بھی۔ سونے کی چڑیا عاشق کی خاطر وہ لاہور میں آ پہنچی تقریباً تین برس قبل دونوں نے چھپ کر شادی بھی کر لی تھی اب دو بچے بھی ہیں اور دونوں بیٹے ہیں۔ عورت بڑی ہوشیار تھی اس نے آپ کے داماد سے ٹیکسٹائل مل کے بل بوتے پر گوجرانوالہ میں اپنے نام پر ایک پنکھا فیکٹری لگوالی۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے داماد نے یہ سارا کھیل اس صفائی سے کھیلا کہ آپ کو تو کیا آپ کی بیٹی یعنی اپنی بیاہتا کو بھی خبر نہ ہونے دی۔ اور آپ نے اس بہروپیے سے باز کے جال میں پھنس کر مالک کی شہروالی کوٹھی بھی داؤ پر لگا دی۔ میں جانتا ہوں کہ اب وہ فریبی انسان ایک نئے بزنس کا لالاسا لگا کر آپ کی حویلی اور زمین پر گھات لگائے بیٹھا ہے خدا کے واسطے بیگم صاحبہ اب آپ اس کے جال میں نہ آئیں۔ غالباً آج کل وہ آپ لوگوں سے یہی بہانہ کر کے گاؤں سے باہر ہے کہ نیا کاروبار شروع کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ گوجرانوالہ میں اپنی سابقہ معشوقہ اور حالیہ بیوی نمبر دو کے ساتھ رنگ رلیاں منانے اور پنکھا فیکٹری کی نگرانی کے فرائض سرانجام دینے میں مصروف ہے۔ جی ہاں فیکٹری کا تو وہ محض نگراں ہی ہے فیکٹری کے جملہ حقوق ملکیت اس کی دوسری بیوی کے نام محفوظ ہیں..... میں معذرت خواہ ہوں کہ بعض ناگزیر مجبوریوں کے سبب [illegible] یہ حالات آپ کے علم میں لانے سے [illegible] رہا۔ ویسے جب آپ اسے بتائیں گی کہ آپ کو حقیقت معلوم ہو چکی ہے تو وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ اس قدر باریکی اور گہرائی کے ساتھ واقف حال کون ہو سکتا ہے۔ امید ہے کہ آپ قدم قدم پر احتیاط برتیں گی۔ اپنی حویلی اور زمین کے سلسلے میں آپ کو انتہائی محتاط رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی بیٹی کے توسط سے جال پھیلانے کی کوشش کرے مگر میری التجا ہے کہ آپ اس کے فریب میں نہ آئیں۔

خیر اندیش و خادم۔

اس گم نام مکتوب نے میری نانی اماں اور ممی کی پریشانیوں اور فکروں میں ناقابلِ بیان اضافہ کر دیا۔ پاپا ان دنوں گاؤں سے باہر تھے اور واقعتاً وہ ممی سے یہی کہہ کر گئے تھے کہ نیا بزنس شروع کرنے کے لیے کچھ تیاریاں کرنا ہیں۔ مل کی قرقی کا صدمہ ہی کیا کم تھا کہ یہ نئی آفتاد آ پڑی۔ حویلی کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ سدا مسکراہٹیں نثار کرنے والی میری ماں کسی حرماں نصیب بیوہ کی طرح سوگوار اور کھوئی کھوئی سی نظر آنے لگی۔ کسی آبلہ پا مسافر کی طرح وہ بے کل اور مضطرب سی حویلی کے کمروں، برآمدوں اور راہداریوں میں گھومے جاتیں۔ حویلی کے ملازم خاموش

تماشائی بنے ممی کا یہ بجھا بجھا سا روپ دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں حیرانی کا اظہار کرتے۔ ممی اپنے تکیے کے نیچے سے بار بار وہ گمنام مکتوب نکال کر پڑھتیں پھر تہہ کر کے وہیں تکیے کے نیچے رکھ دیتیں۔ شاید میں بھی حویلی کے ملازموں کی طرح حقیقت حال سے کم از کم پاپا کی واپسی تک بے خبری رہتی اگر ایک سہ پہر ممی کے نہانے کے دوران مجھے ان کی خواب گاہ میں تکیے کے نیچے سے وہ گمنام مکتوب پڑھنے کا موقع نہ مل گیا ہوتا۔ اس بار جب پاپا کئی روز بعد حویلی واپس لوٹے تو ممی ہمیشہ کی طرح دیدہ و دل فرش راہ کیے کسی دلنواز محبوبہ کی طرح ان کی منتظر نہیں بلکہ خفا تھیں۔ اس روز پہلی بار ممی اور پاپا کا جھگڑا ہوا جنگ کا آغاز بند دروازے والی خواب گاہ میں ہوا۔ حویلی کے ملازم کان دبائے بند کمرے سے ابھرنے والی مبہم آوازوں اور الفاظ کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ میں سہم کر برآمدے میں بچھے ایرانی قالین پر نانی اماں کی وہیل چیئر کا ہتھا دبوچ کر بیٹھ گئی تھی۔ پھر یکایک بند خوابگاہ کا دروازہ کھلا پہلے پاپا دریدہ گریبان لیے دروازے سے نکلے، ان کے پیچھے پیچھے ممی برافروختہ شیرنی کی مانند باہر آئیں۔ حویلی کے ملازم کونوں کھدروں اور برآمدے کے ستونوں کی آڑ میں چھپ کر صورت حال کا جائزہ لینے لگے۔ نانی اماں کی وہیل چیئر کے ہتھے کے گرد میری گرفت تنگ پڑ گئی۔ شاید میں خوف کے مارے چلا بھی دی تھی۔ نانی اماں دھیرے دھیرے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے ممی کو اپنے حواس پر قابو رکھنے کی تلقین کرنے لگیں۔ ممی کو میں نے اس سے قبل کبھی اس قدر غصے میں نہیں دیکھا تھا ان کی آنکھیں جو پاپا کو دیکھ کر مسکرایا کرتی تھیں، اس روز شعلے برسا رہی تھیں۔

"تم... تم جھوٹ بولتے ہو... تم نے دوسری شادی کر رکھی ہے" ممی نے پاپا کا گریبان پکڑ کر انھیں جھنجوڑتے ہوئے کہا تھا۔

پاپا نے تردید کرتے ہوئے ممی کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن ممی غصے کی شدت میں بے اوسان ہوئی جا رہی تھیں۔ انھوں نے ملازموں کا لحاظ کیے بغیر پاپا کو فریبی، دغا باز، مکار، بے وفا اور اسی قبیل کے چند دوسرے خطابات سے بار بار نوازا۔ جنون کے عالم میں انھوں نے پاپا کا گریبان تار تار کر ڈالا۔ چلاتے چلاتے ممی کی آواز بیٹھ گئی۔ پاپا انھیں سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے۔ میں نانی اماں کی وہیل چیئر کا ہتھا مضبوطی سے پکڑے نانی اماں کو ان دونوں کی جانب بڑھنے سے روکے رہی۔ تمام تر کوشش کے باوجود بھی جب ممی پاپا کے قابو میں نہ آئیں تو وہ تن کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے بپھرے ہوئے تیوروں کے ساتھ ممی کے دونوں شانے دبوچ لیے اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دانت پیستے ہوئے بولے "ہاں... ہاں میں نے دوسری شادی کر رکھی ہے... میں مرد ہوں تو دو نہیں چار شادیاں کرنے کا حق رکھتا ہوں" اتنا کہہ کر پاپا نے ممی کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور ان کے شانے بڑی حقارت سے چھوڑ دیے۔ ممی لڑکھڑا کر برآمدے کے مرکزی ستون سے جا ٹکرائیں۔ آنکھیں پھاڑ کر انھوں نے پاپا کی طرف دیکھا ان کی شعلہ بار نگاہوں میں بے یقینی ابھر آئی اور وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولیں: "قبول کر لیا نا؟ کر رکھی ہے نا تم نے دوسری شادی؟"

"ہاں کر رکھی ہے۔" پاپا نے دیدہ دلیری سے جواب دیا۔

ممی یکلخت بپھری شیرنی کی طرح پاپا پر جھپٹیں اور ان کے تار تار گریبان کو مٹھیوں میں جکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے ہذیانی انداز میں چلائیں۔

"بے وفا... دغا باز... فریبی... مجھے تجھ سے نفرت ہے... نفرت ہے مجھے تجھ سے..." ممی پر جنون طاری تھا۔ "چلا جا یہاں سے اور... اور... پھر کبھی مجھے اپنی منحوس صورت مت دکھانا... دفع ہو جا۔"

چلاتے چلاتے ممی پہلے نیم جان ہوئیں پھر بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑیں۔ ماسی بشیراں، رحمت اور بیداں انھیں سنبھالنے کو مختلف سمتوں سے ان کی جانب لپکیں۔ میں متوحش ہو کر اٹھی اور ممی کی جانب دوڑی۔ نانی اماں نے بھی وہیل چیئر آگے دھکیلنے کی کوشش کی۔ پاپا چند ثانیوں تک برآمدے کے فرش پر بے ہوش پڑی ممی کو دیکھتے رہے پھر پلٹ گئے تب تک نانی اماں ان تک پہنچ چکی تھیں۔ نانی اماں کو دیکھ کر وہ لحظہ بھر کو ٹھٹکے پھر کچھ کہے بنا اپنا دریدہ گریبان سنبھالتے... لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے برآمدے سے نکل کر سیڑھیاں عبور کر کے پورٹیکو میں کھڑی لمبی سی چمکیلی موٹر کی جانب بڑھ گئے۔ ذرا دیر میں ان کی موٹر فراٹے بھرتی حویلی کے صدر دروازے سے باہر نکل گئی۔ نانا جی کی پرانی مارک ٹو پورٹیکو میں تنہا کھڑی رہ گئی۔ میری ٹانگیں بری طرح لرز رہی تھیں۔ کبھی میں بے ہوش پڑی ممی کو دیکھتی، کبھی نانی اماں کے بے بسی سے عبارت چہرے کو اور کبھی پاپا کی موٹر کو جو تیزی سے حویلی سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ بس وہ آخری بار تھی جب میں نے پاپا کو دیکھا پھر پاپا کبھی حویلی نہیں آئے۔

پھر حویلی کے در و بام سناٹوں اور ویرانوں میں ڈوب گئے۔ نانی اماں کو چپ سی لگ گئی۔ وہیل چیئر پر بیٹھی وہ چپ چاپ نہ جانے کیا سوچے جاتیں۔ ممی دنوں بستر پر پڑی رہیں۔

ان کا رنگ روپ، سج دھج، رعب و دبدبہ جاتا رہا۔ حویلی کی رونق دم توڑ گئی۔ ممی نے خشکا سے سارے رنگ برنگے ریشمی ملبوسات زیب تن کرنا ترک کر دیے۔ اب وہ زیادہ تر سفید یا سیاہ لباس میں ملبوس نظر آنے لگیں۔ گھنے بال سنوار کر انھوں نے بیوگی کی سی جون اختیار کر لی۔ نہ تو ان کے بالوں اور کلائیوں میں موتیا کے گجرے مسکراتے نہ ان کے کانوں کی لووں پر بیلے کے پھول ستارے بن کر دمکتے۔ ان کے سراپا سے پھوٹنے والی مسحور کن خوشبوئیں معدوم ہو گئیں۔ اب نہ ان کے لب مسکراتے تھے نہ آنکھیں۔ وہ پیکرِ حزن و ملال بن گئی تھیں۔ انھوں نے پاپا کی ٹیلیفون کال کے انتظار میں حویلی کے برآمدوں اور طویل راہداریوں میں بے تابانہ ٹہلنا بھی ترک کر دیا۔ انھوں نے پاپا کا انتظار کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ سنیچر کی شام کسی بیوہ کی طرح اداس اور سوگوار سر نیہوڑائے چپ چاپ آگے گزر جاتی۔ ممی جو کبھی اس دنیا کی مسرور ترین عورت نظر آیا کرتی تھیں، اب اس دنیا کی مایوس ترین عورت نظر آنے لگیں۔ نانی اماں روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئیں۔ ان کی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں میرے دل میں دراڑیں ڈالے جاتیں۔ مجھے ان تمام صورتِ حال سے بے نیاز رکھنے کی کوشش کی گئی تا کہ وہ یکسوئی سے امتحان دے سکیں۔ میں تنہا تنہا حویلی کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور طویل راہداریوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بلامقصد گھومتی پھرتی۔

کافی عرصہ تک حویلی موت کے سناٹوں میں ڈوبی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے اس حصار میں شگاف پڑنا شروع ہو گئے۔ ممی بستر چھوڑ کر اٹھیں اور حویلی کے معاملات پر از سرِ نو توجہ دی۔ حویلی میں مختلف فرائض کی انجام دہی پر مامور تقریباً بارہ ملازموں میں سے دس کو سبکدوش کر دیا گیا۔ بس ایک ملازم جوڑا اللہ وسایا اور اس کی گھر والی ماسی بشیراں بدستور حویلی سے وابستہ رہے۔ اللہ وسایا جو پہلے نانی اماں کی زرعی اراضی کی پیداوار کا حساب کتاب رکھا کرتا تھا اب سودا سلف لانے، حویلی کے پائیں باغ کی دیکھ بھال، چوکیداری اور شوفری کے اضافی فرائض بھی انجام دینے لگا۔ ماسی بشیراں جھاڑ پونچھ، خانہ داری کرتی۔ دونوں میاں بیوی بڑے خوش مزاج اور محنتی تھے۔ جب ممی بطورِ خاص پاپا سے جدائی کے بعد کئی دن بستر پر پڑی رہیں، ان دونوں نے ضرورت سے زیادہ میرا خیال رکھا۔

ممی بستر سے اٹھ گئیں اور انھوں نے زندگی کے معمولات میں مشغول ہونے کی کوشش بھی کی، مگر ان کے ظاہری حلیے کے ساتھ ان کا مزاج بھی یکسر بدل چکا تھا۔ ان کا چہرہ جو غصے کے عالم میں بھی مسکراتا محسوس ہوا کرتا تھا، اب ہر وقت ایک تناؤ اور ہیجان سے عبارت نظر آنے لگا۔ بات بات پر مسکرا دینے کی عادت معدوم ہو گئی۔ خوش مزاجی کی جگہ بدمزاجی نے لے لی۔ ان کے لہجے میں تلخی اور جھلاہٹ عود کر آئی۔ بات بات پر کھل اٹھنے والی ممی ذرا ذرا سی بات پر حویلی کو سر پر اٹھانے لگیں۔ ماسی بشیراں جس کے کام سے وہ کبھی انتہائی خوش اور مطمئن رہا کرتی تھیں، اب بے بات ان کی تلخ مزاجی کا نشانہ بننے لگی۔ اللہ وسایا کو جس پر تمام حویلی کے دیگر ملازموں سے زیادہ کا اعتماد کرتی تھیں اب وہ ہڈ حرام، مکار، بے ایمان، چور کہنے لگیں۔ شاید باہر کے کام کاج اور زمین کی پیداوار کا حساب کتاب رکھنے کے سلسلے میں اللہ وسایا کی خدمات مجبوری نہ بنی ہوئی ہوتیں تو ممی اسے حویلی سے نکال باہر کرتیں۔ بلکہ ایک مرتبہ تو وہ اس پر اتنا برہم ہوئیں کہ نہ صرف اللہ وسایا بلکہ اس کی گھر والی ماسی بشیراں نے بھی حویلی چھوڑ کر جانے کے ارادے سے اپنا اسباب سمیٹنا شروع کر دیا۔ نانی اماں مداخلت نہ کرتیں تو وہ دونوں یقیناً چلے بھی جاتے۔ کام کرنے والوں کے لیے دنیا تنگ تھوڑی ہے۔ مجھے یاد ہے جب اللہ وسایا نے ہاتھ جوڑ کر نانی اماں سے حویلی چھوڑ کر جانے کی اجازت چاہی تو نانی اماں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ خاصی دیر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہیں۔ پھر یکایک ان کی آنکھیں بھیگ گئیں اور انھوں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا: "باقیوں کو تو فارغ کر دینے پر ہم مجبور تھے۔ تم دونوں آپ ہی ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہو؟"

نانی اماں کے لہجے میں بے بسی بھی تھی اور شکوہ بھی۔

"مالکن.....!" اللہ وسایا دونوں ہاتھ جوڑے جوڑے نانی اماں کے قدموں میں بیٹھ گیا اور منت سے بولا: "میں تو جی آپ لوگوں کے جوتے بھی کھا سکتا ہوں پر بشیراں کہتی ہے وہ روز روز بڑی بی بی صیب کی باتیں نہیں سن سکتی۔"

نانی اماں نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا: "بشیراں کو سمجھاؤ کہ وہ عائشہ کی باتوں کا برا نہ منایا کرے۔ اس پر مصیبت کا جو پہاڑ ٹوٹا ہے اس سے وہ چڑچڑی ہو گئی ہے۔"

"مالکن! میرے سمجھانے بجھانے پر ہی تو وہ اتنے دن چپ رہی، پر جی اب وہ کہتی ہے کہ میں نے یہاں نہیں رہنا۔"

"بشیراں ہے کہاں؟"

"اپنا سامان اکٹھا کر رہی ہے جی۔"

"اسے میرے پاس بلاؤ۔"

"بہتر۔" اللہ وسایا نیازمندانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اللہ وسایا، بشیراں کے ہمراہ واپس آنے تک

نانی اماں خاموش اور دکھی سی بیٹھی رہیں۔ جب وہ دونوں ان کے روبرو پہنچے تو اللہ وسایا نے کہا "مالکن! میں لے آیا ہوں بشیراں کو۔"

نانی اماں نے بشیراں کی جانب دیکھا اور بولیں "کیا بات ہے بشیراں؟"

بشیراں نے کان کھجایا پھر منہ بنا کر بولی "مالکن! ہم وہی تو بندے ہیں جی جو برسوں سے محنت کر کے کھا رہے ہیں جی پھر ایسی خواہ مخواہ باتیں کیوں سنیں۔"

"کیا میری خاطر بھی تو عائشہ کی باتوں کا بُرا ماننا نہیں چھوڑ سکتی؟"

نانی اماں کی اس بات پر بشیراں نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور بولی "مالکن! آپ کی خاطر تو میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں... ہم نے حویلی کا نمک کھایا ہے جی! ہم نمک حرام نہیں ہیں... آپ کے خاندانی خدمت گار ہیں جی..... میرا باپ چوہدری جی کا خاص بندہ تھا، میرا دادا بڑے چوہدری جی کا خاص بندہ تھا، میرا پردادا....."

"پھر بھی تم حویلی چھوڑ کر جانا چاہتی ہو؟" نانی اماں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مالکن..... ہم پیار کے بندے ہیں جی..... ہم نے جی! تھوڑی ہی نفرت سہی... چھوٹی بی بی صیب منٹ منٹ پر بے عزتی کر دیتی ہیں۔"

"میرے ساتھ اس کی بات کا بُرا نہ منایا کرو... کم از کم میری خاطر..." نانی اماں پل بھر کو رکیں پھر بڑی بے بسی سے بولیں "مجھے تم لوگوں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تم خود بھی طرح سب کچھ جانتے ہو۔ عائشہ کو خاوند کی بے وفائی نے چڑچڑا بنا دیا ہے ورنہ وہ ایسی کب تھی؟"

"ہاں جی یہ تو ہم جانتے ہیں" بشیراں منمنائی۔

"پھر بھی..... پھر بھی..... تم میری پریشانی سمجھو اور اللہ وسایا... درگزر کر کے چلے جانا چاہتے ہو، جانتی ہو تم میاں بیوی سے مجھے کتنا سہارا ہے۔ تم دونوں کو نوکر نہیں گھر کے افراد سمجھتی ہوں۔ باہر کے سارے دھندے میں نے اللہ وسایا کے سپرد کر دیے ہیں اور حویلی کے اندر تو تمہارا راج ہے۔ جو چاہے پکاؤ جو چاہے کھاؤ اور ہمیں بھی کھلاؤ..." [illegible] نانی اماں کی آواز [illegible] رہی تھی۔

"[illegible]..... ایسی باتیں کر کے آپ ہمیں شرمندہ کر رہی [illegible]"

"حالات نے مجھے بے بس اور مجبور کر دیا ہے۔ اب اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو گی کہ میں اپنے پیروں پر اپنا بوجھ بھی نہیں سہار سکتی۔ اس بے بسی کے عالم میں بھی اگر تم دونوں مجھے بے بس چھوڑ کر جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ میں تمہیں روکنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔"

میں جو نانی اماں کے قریب ہی تھی ان کی بے بسی پر مضطرب ہو کے رہ گئی۔

بشیراں نے اللہ وسایا کو دیکھا۔ اللہ وسایا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ سمجھایا۔ وہ جھکی اور نانی اماں کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے بولی "ٹھیک ہے مالکن! نہیں جاتے ہم لوگ پر جی آپ بڑی بی بی صیب کو سمجھائیں کہ وہ دوسرے نوکروں کو خوار نہ کرنے دیا کریں..... آپ کو خبر نہیں جی کہ گاؤں والے بڑی بی بی صیب کے بارے میں کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔"

"مجھے سب خبر ہے بشیراں! عائشہ کی بدمزاجی اور چڑچڑے پن کے جو قصے گاؤں میں گشت کر رہے ہیں میں ان سے غافل نہیں ہوں۔ میں چل پھر نہیں سکتی تو کیا میرے حواس تو سلامت ہیں۔ گاؤں والے میرے پاس آتے ہی رہتے ہیں۔ لگائی بجھائی اور ادھر ادھر کرنے والے مجھے بتا ہی جاتے ہیں کہ عائشہ کے بارے میں کون کیا کہتا ہے مگر..... میں کیا کر سکتی ہوں..... کچھ بھی نہیں..... خاوند کی دوسری شادی اور بے رخی نے عائشہ کو ایسا صدمہ پہنچایا ہے کہ وہ کسی کی کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔ صدمہ تو اور وہ اکثر مجھے جھڑک کر جواب دینے لگی ہے..... میں مجبور ہوں بشیراں! ایسے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میری خاطر اگر تم اس کی زیادتیوں کو درگزر کر سکتی ہو تو ٹھیک ورنہ ظاہر ہے کہ میں تمہیں روکنے پر مجبور تو نہیں کر سکتی..... ہاں البتہ اتنی امید ضرور رکھتی ہوں کہ کچھ اور انتظار کر لو۔ ہو سکتا ہے رعنا کے آنے کے بعد حالات بہتر ہو جائیں۔"

"چھوٹی بی بی صیب کب آئیں گی جی؟" بشیراں نے پوچھا۔

"اس کے امتحان شروع ہو چکے ہیں۔ [illegible] سے فارغ ہونے کے بعد وہ گھر آ جائے گی۔"

"کتنے دن رہ گئے امتحان ختم ہونے میں جی؟"

"بس [illegible] دن کا آخری پرچہ ہے اب [illegible] جلدی آ جائے گی۔"

"اچھا..... [illegible] پھر تو بڑا مزہ رہے گا جی۔ چھوٹی بی بی صیب تو بڑی پیاری ہیں [illegible]"

[illegible]

[illegible]

بہلا۔ وہ چپکے سے اٹھ کر میرا خیال رکھنے لگیں۔ ان کی کوشش ہوتی کہ میں زیادہ تر وقت ان کی نظروں کے سامنے ہی رہوں۔ پھر وہ اپنی خواب گاہ ہی میں سُلانے لگی تھیں۔ رات اپنے نزدیک لیٹا کر میرے بالوں میں دھیرے دھیرے لمبی انگلیاں گھماتے ہوئے وہ مدھم سرگوشیوں میں کہتیں۔

"تمہارے پاپا اچھے آدمی نہیں ہیں بیٹی!... وہ ایک بے ایمان اور بے ایمان آدمی ہیں، انھوں نے تمہاری ماں سے بے وفائی کی... چھپ کر دوسری شادی کر لی... اور... اور بے ایمانی سے سارا کاروبار ہڑپ کر لیا۔ پورے شہر اور گاؤں میں ہماری عزت کا سبب تھا...!" پھر وہ مجھے دھیرے دھیرے بڑے کڑوے سمجھاتیں: "اب اگر وہ کبھی بھی یہاں آ گئیں نا تو تم ان سے ہرگز ہرگز بات نہیں کرو گی... وہ بہت بے ایمان اور مکار آدمی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ تمھیں مجھ سے چھیننے کی کوشش بھی کریں۔ اگر ایسا کوئی موقع آئے تو تم ان سے صاف صاف کہہ دینا کہ مجھے آپ سے نفرت ہے۔ ٹھیک ہے نا بیٹا! کہو گی نا ایسا؟"

ممی کی کپکپاتی انگلیوں کا سہانا لمس مجھے تنویمی کیفیت سے دوچار کر کے کسی معمول کی طرح اثبات میں سر ہلانے پر مجبور کر دیتا۔

"تمہارے پاپا بہت برے آدمی ہیں۔ انھوں نے ہم سے سب کچھ چھین کر اپنی دوسری بیوی کو دے دیا۔ جب وہ تمہارے نانا جی کے پاس پناہ کی تلاش میں پہنچے تو ان کے بدن پر ایک جوڑے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ تمہارے نانا جی نے انھیں سب کچھ دیا۔ پڑھایا لکھایا، کاروبار کرنا سکھایا۔ اپنی حیثیت ہی انھیں بھی مل کا حصے دار بنایا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس دنیا سے جانے سے پہلے تمہارے نانا جی نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کی شادی اپنی بڑی بیٹی سے کریں گے۔ تمہاری نانی اماں نے اس عہد کو نبھایا مگر تمہارے احسان فراموش پاپا نے کیا کیا... چھپ کر دوسری شادی کر لی اور مل کے پیسے سے اس گندی عورت کو خوب عیش کرا دئے۔ اس کے نام سے ایک نئی فیکٹری کھول دی۔ تمہارے پاپا نے ہم سب کے ساتھ غداری کی۔ وہ بہت برے آدمی ہیں۔ تمھیں ان سے نفرت کرنا چاہیے... مرد سب کے سب ایسے ہی ہوتے ہیں... دغا باز، بے وفا، مکار اور کمینے... مرد کی ذات بہت نیچ ہے بیٹا... مرد سے وفا ہو ہی نہیں سکتی۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

میں پھر کسی معمول کی طرح اثبات میں سر ہلا دیتی۔

"تمہارے پاپا نے تمہاری ممی کے ساتھ ظلم کیا۔ بے وفائی کی، بے ایمانی کی۔ نہ صرف تمہاری ممی کا بلکہ نانی اماں اور خالہ کا حصہ بھی ہڑپ کر گئے... جانتی ہو ہمیں حویلی کے بہت سے ملازموں کو چھٹی کیوں دینا پڑی...؟ کیوں کہ تمہارے پاپا نے مل کا نقصان دکھا کر ہمارا ہاتھ تنگ کر دیا۔ اتنے بہت سے نوکروں کی تنخواہ کہاں سے دی جاتی... بہت برے ہیں تمہارے پاپا... کتنی اچھی تھی ہماری شہر والی کوٹھی... تمہارے بے ایمان اور مکار پاپا نے وہ بھی بکوا دی... تمھیں ایسے باپ سے نفرت کرنا چاہیے... وہ نفرت کیے جانے کے لائق ہی ہیں... تمھیں ان سے نفرت کرنا ہوگی بیٹا۔ تم سمجھ رہی ہو نا کہ میں تمھیں کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں؟"

"جی!"

"کیا سمجھا؟"

"پاپا ایک برے آدمی ہیں۔ انھوں نے دوسری شادی کر لی۔ انھوں نے ہم سے سب کچھ چھین لیا۔ مجھے ان سے نفرت کرنا چاہیے۔"

"تمھیں اپنے پاپا سے نفرت کرنا ہو گی۔"

"جی!"

"کیا سمجھا؟"

"مجھے پاپا سے نفرت کرنا ہو گی۔"

"شاباش!"

ممی کے لہجے میں فتح مندی کا سا غرور ہوتا اور میں اس خیال کو لیے نیند کی وادیوں میں اتر جاتی کہ میرے پاپا ایک برے آدمی تھے اور مجھے ان سے نفرت کرنا ہوگی۔

☆☆

امتحانات سے فراغت پا کر کاکا کے شہر سے گاؤں واپس لوٹنے سے قبل نانی اماں نے ایک اہم فیصلہ کر ڈالا۔ حویلی نانی اماں کے نام تھی اور تا حیات وہ اس حویلی کے جملہ حقوق اپنی اولاد یا کسی اور کے نام منتقل کرنے کا پورا حق محفوظ رکھتی تھیں۔

کاکا کی شہر سے گاؤں واپسی سے ایک ہفتہ قبل بات ہے کہ کھانے پر نانی اماں نے ممی سے نرم سے مخاطب لہجے میں کہا: "کل میں نے وکیل صاحب کو بلایا ہے۔"

"کیوں؟" ممی نے چونک کر نانی اماں کی طرف دیکھا۔

نانی اماں کچھ دیر کو خاموش رہیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ جو بات وہ کہنے جا رہی ہیں وہ خاصی مشکل تھی۔

"عائشہ بیٹی.....!" نانی اماں نے پل بھر کو توقف کیا پھر بولیں: "تمہارے ابا جی تم دونوں بہنوں کے لیے جو کچھ چھوڑ

گئے تھے وہ تو سب ٹھکانے لگ گیا۔ اب یہ حویلی ہے اور تھوڑی ہے، تھوڑی بہت نقدی بچ گئی تھی۔ تمھارے اور نادر کے مابین ناراضگی ضرور ہے مگر رشتہ بہرحال برقرار ہے۔ وہ کبھی بھی کسی نیت کے ساتھ واپس آسکتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بعد اس حویلی کے سلسلے میں کوئی تنازعہ پیدا ہو۔ تمھارا حق میں نے تمھیں تمھاری شادی کے موقع پر دے دیا تھا۔ بانو کا حق اسے دینے کی نوبت ہی نہ آئی۔ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو نادر نے سب سے زیادہ ناانصافی بانو کے ساتھ ہی کی ہے۔ بانو کی حق تلفی کے ازالے کا میرے سامنے بس ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ حویلی کے حقوقِ ملکیت اپنے نام سے بانو کے نام منتقل کر دیا دوں۔ زمین البتہ بدستور میرے نام رہے گی اور میرے مرنے کے بعد تم دونوں بہنوں میں تقسیم ہو جائے گی......" اتنا کہہ کر نانی امی رکیں، کچھ دیر چپ چاپ کاکی کے چہرے کا یوں جائزہ لیتی رہیں جیسے ان کے تاثرات جانچنے کی کوشش کر رہی ہوں پھر انھوں نے بڑی آہستگی سے کاکی سے پوچھا: "تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"جی... جی نہیں... مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے" کاکی نے جواب دیا۔

اگلے چار پانچ دن حویلی میں وکیل صاحب کی آمد و رفت جاری رہی۔

کاکا کی شہر سے گاؤں واپسی پر جب حالات کی تمام تر تفصیل ان کے علم میں آئی تو وہ بہت ملول ہوئیں۔ ان کی آمد بھی حویلی پر چھائے سناٹوں اور اداسیوں کو رونق میں نہ بدل سکی۔ گم سم اور رنجور و دلگیر وہ حویلی کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور طویل راہداریوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومتی پھرتیں۔ حویلی کے در و بام ان کے شوخ و شنگ قہقہوں کے منتظر ہی رہے۔ اس بار نہ تو حویلی کے بام و در اور راہداریاں ان کے جھروکوں سے نکلیں، نہ کاکا کی پسند کے گیتوں اور نغموں کی گونج حویلی کی فضاؤں میں بکھرتی سنائی دے سکی۔ حتیٰ ان کی پسند کے کھانے تیار کروانے کے بجائے بیشتر وقت منہ لپیٹے پڑی رہتیں یا پھر چپ چاپ حویلی کے خاموش دریچوں میں جا کھڑی ہوتیں یوں جیسے کسی کا انتظار ہو۔ نانی اماں نے حویلی کے درزی کو بلوا کر اس بار کاکا کے لیے نئے ملبوسات بھی سلنے کو نہیں دیے شاید اس لیے کہ بدلے ہوئے حالات نے انھیں دل گرفتہ کر رکھا تھا اور شاید اس لیے بھی کہ کاکا ایف اے فائنل کا امتحان دینے کے بعد ہوسٹل کو خیرباد کہہ کے گھر آ چکی تھیں۔ کاکا کے آنے کے بعد ایک اور غیر معمولی تبدیلی جو میں نے محسوس کی وہ میری کہ نانی اماں کاکا سے زیادہ تر باتیں سرگوشیوں میں کرنے لگی تھیں اور ایسے موقعوں پر اگر کبھی میں ان کی طرف جا نکلتی تو نانی اماں یک بیک چپ ہو جایا کرتی تھیں۔ میں نے اس کا توڑ یہ ڈھونڈا کہ چھپ چھپ کر ان کی باتیں سننے لگی یا کبھی کبھار جھوٹ موٹ سوتی بن جاتی۔ وہ دونوں یہ سمجھتیں کہ میں سو رہی ہوں مگر درحقیقت میں ان کی باتیں سن رہی ہوتی تھی۔ ایک روز جب میں جھوٹ موٹ سو رہی تھی میں نے نانی اماں کو کاکا سے کہتے سنا۔

"بانو! میں کئی دن سے تم سے ایک ضروری بات کرنے کا ارادہ کر رہی ہوں۔"

"جی کہیے" کاکا نے کہا۔

"وہ... میں نے اس حویلی کے حقوقِ ملکیت تمھارے نام منتقل کروانے کے لیے وکیل صاحب سے کاغذات تیار کروا لیے ہیں۔ وکیل صاحب اگلے ہفتے آئیں گے۔ تمھیں ان کے کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے ان کے ساتھ جانا ہو گا۔"

"اوہ امی! آپ نے ایسا کیوں کیا؟" کاکا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"یہ بہت ضروری تھا بیٹی!"

"کیوں ضروری تھا؟"

"دیکھو ہمارے پاس اس حویلی اور تھوڑی بہت اراضی کے سوا کچھ بھی نہیں رہا۔ نادر بدبخت نے تمھارے ابا جی کی شہر والی کوٹھی بھی فروخت کروا دی۔ عائشہ سے اس کا رشتہ بدستور برقرار ہے۔ وہ بدبخت کبھی بھی کسی بھی نیت کے ساتھ یہاں آسکتا ہے۔ میری چھٹی حس کہتی ہے کہ اب وہ حویلی اور زمین پر گھات لگانے کی کوشش کرے گا۔ اس کے اگلے داؤ سے بچنے کی مجھے ایک ہی صورت نظر آئی کہ حویلی تمھارے نام کر دوں... بیٹی! زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ میرے ہاتھ پاؤں نے تو ساتھ چھوڑ ہی دیا۔ دل بھی اسی طرح اچانک ساتھ چھوڑ.. سکتا ہے۔"

"اوہ! امی جی! ایسی باتیں نہ کریں۔" کاکا کی رنج میں ڈوبی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔

"بیٹی! موت تو سب کو آنا ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔"

"امی جی پلیز!" کاکا لجاجت سے بولیں۔

"ارے تم تو ایسی وحشت زدہ ہوئی جا رہی ہو.... تم پڑھی لکھی ہو ماشاءاللہ تمھیں عقل ہے تمھاری اور دل علم کے نور سے روشن۔ کیا تم موت کے برحق ہونے سے انکار کر سکتی ہو؟"

"امی! آپ کے اور ابا کے سوا میرا ہے ہی کون؟ آپ

آپا نے؟"

"جی ہاں! بڑی آپا جان نے یا سب جانتے ہیں" بابا جی نے کہا۔

بڑی آپا کے کمرے کے دروازے پر پرنسپل شمیم چغتائی لکھا کریں ان کے دفتر میں داخل ہوئی تو میں نے کاکا کو بڑی آپا کے روبرو بیٹھے پایا۔ اللہ وسایا نزدیک ہی کھڑا تھا۔ میری گھبراہٹ اور وحشت نے سکون اور طمانیت کا روپ دھار لیا۔

"آؤ بی بی!" بڑی آپا نے کہا۔

میں سعادت مندی سے ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"یہ کون ہیں تمہاری؟" بڑی آپا نے کاکا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"میری خالہ ہیں جی۔"

"معاف کیجیے گا بی بی، ہمیں تو تنبیہ کرنا پڑتی ہے۔ لڑکیوں کی بڑی ذمے داری ہوتی ہے۔" بڑی آپا نے کاکا کی طرف دیکھتے ہوئے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

"جی آپ درست فرماتی ہیں۔"

"ویسے ذرا غور کر کے تو میں پہچانتی ہوں۔ جب کبھی اس بچی کو جلدی چھٹی دلوانے کی ضرورت ہوتی ہے یہی درخواست لے کر میرے پاس آتے ہیں۔" بڑی آپا نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے بیچ دبے قلم کے پچھلے حصے سے اللہ وسایا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر مزید بولیں۔ "میں عالیہ کی ممی اور نانی سے بھی واقف ہوں۔ وہ آتی رہتی ہیں میرے پاس۔"

"میں تحصیل علم کے سلسلے میں شہر میں مقیم نہ ہوتی تو آپ یقیناً مجھ سے بھی واقف ہوتیں۔" کاکا نے کہا۔

"جی یقیناً۔" بڑی آپا نے تائید میں سر ہلایا۔

پھر بڑی آپا نے کاغذ اور قلم کاکا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ ہمارے ریکارڈ کے لیے دو سطریں لکھ دیں کہ میں اپنی بھانجی عالیہ نادر کو جلدی چھٹی دلا کر لے جا رہی ہوں تو اچھا ہے اور یہاں نیچے اپنے دستخط بھی کر دیں۔"

کاکا نے بہ عجلت تمام چند سطریں گھسیٹیں۔ اسی دوران میں نے اللہ وسایا کی جانب دیکھا تو اس کا چہرہ بجھا بجھا سا اور گھبراہٹ سی میں ڈوبا سا نظر آیا۔ کاغذ اور قلم بڑی آپا کی جانب بڑھاتے ہوئے کاکا اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"شکریہ۔" بڑی آپا نے کہا۔

"اجازت ہے؟" کاکا نے پوچھا۔

"جی بالکل۔ اب آپ عالیہ کو لے جا سکتی ہیں۔"

کاکا، اللہ وسایا اور میں بڑی آپا کے دفتر سے برآمدے میں نکل آئے۔

"کاکا! کہیں جانا ہے کیا؟" میں نے بڑی آپا کے دفتر سے باہر نکلتے ہی پوچھا۔

"ہاں بیٹا!" کاکا نے جواب دیا۔

"کہاں؟"

"گھر۔"

"آپ نے مجھے جلدی چھٹی کیوں دلوائی؟" میں نے برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے پوچھا۔

کاکا کچھ نہیں بولیں۔

"کاکا.....!" لیکن اس سے پہلے کہ میں کاکا سے کوئی سوال کرپاتی، کاکا نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کچھ عجلت میں کہا۔ "بیٹا! تیز تیز چلو۔"

میں نے ذرا کی ذرا تھم کر اپنا بستہ اللہ وسایا کو تھمایا اور پھر کاکا کی حسب ہدایات تیز تیز چلتے بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ہم نے اسکول کا ریتلا میدان عبور کیا۔ اس دوران کاکا نے مجھے کچھ کہنے سننے کا موقع نہیں دیا۔ اسکول کے صدر دروازے کے باہر گاڑی کھڑی تھی۔ اللہ وسایا نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ میں اور کاکا پچھلی نشست پر بیٹھ گئیں۔ میرا بستہ اللہ وسایا نے کار کی اگلی نشست پر رکھنے کے بعد اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

"کاکا! آپ نے مجھے جلدی چھٹی کیوں دلوائی ہے؟" میں نے بے تابانہ پھر اپنا سوال دہرایا۔

کاکا نے اپنی دائیں مٹھی میں دبے رومال سے اپنی ناک کی پھننگ کو بری طرح مسلتے ہوئے کہا۔ "گھر چل کے معلوم ہو جائے گا۔"

مجھے کاکا کی آواز کچھ عجیب سی، اجنبی سی لگی..... جیسے..... جیسے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی ہو۔ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے ہونٹوں کے گوشے دھیرے دھیرے لرز رہے تھے۔ ان کی ناک کی پھننگ سرخ تھی اور آنکھیں بھیگی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میری طرف دیکھنا ہی نہ چاہ رہی ہوں۔

"کیا..... کیا آپ رو رہی ہیں کاکا؟" میں نے آہستگی سے آواز میں پوچھا کہ اللہ وسایا سن نہ لے۔

کاکا نے اپنا چہرہ دائیں جانب پھیرتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔"

"نہیں تو....."

"آپ رو رہی ہیں۔" میرے لہجے میں استفہام کی جگہ یقین نے لے لی تھی۔

کاکا نے میرا سر اپنے شانے سے لگا لیا اور اپنی ٹھوڑی میرے سر پر ٹکا دی۔ میں نے ہلا کر اپنا سر ان کے شانے سے

بتایا اور مطلب کر کہا: "بتائیں ناکیا بات ہے آپ کیوں رو رہی ہیں... کیا... کیا پاپا آئے تھے اور ممی کی ان سے پھر لڑائی ہوئی؟"
"نہیں... نہیں میری جان!" کاکا نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو پھر کیا ہوا ہے؟"
کاکا نے مشکل سے اپنی آنکھیں پونچھیں ایک گہری سانس لی اور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا: "تمھیں پاپا اچھے لگتے تھے؟"

ان کا یہ سوال بہت ٹیڑھا تھا۔
اپنے والد کسے اچھے نہیں لگتے۔
مگر ممی سے پاپا کے کشیدہ تعلقات مجھ سے ڈھکے چھپے نہ تھے اور پھر ممی کا رٹایا ہوا وہ سبق کہ مجھے پاپا سے نفرت کرنا چاہیے، میرے ذہن میں تھا۔
"بولو... پاپا اچھے لگتے تھے تمھیں؟" کاکا نے اپنا سوال پھر دہرایا۔
"پہلے تو اچھے لگتے تھے مگر انھوں نے دوسری شادی کر کے اچھا نہیں کیا۔"
کاکا جنھوں نے بڑی مشکل سے اپنی تھرو والیہ کے بعد سے آج تک اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی، چونکیں اور بولیں: "تم سے یہ بات کس نے کی؟"
"کون سی بات کاکا؟"
"یہی کہ تمھارے پاپا نے دوسری شادی کر کے اچھا نہیں کیا۔"
میں کاکا کی سادگی پر مسکرا دی۔
"میں یہ بات خود جانتی ہوں۔" میں نے پورے اعتماد سے گمراہ شدہ پاپا کے خیال سے بہت آہستہ سے کہا۔
"اچھا!" کاکا کے لہجے سے استعجاب عیاں تھا۔
"ممی کہتی ہیں پاپا اچھے آدمی نہیں تھے۔ مجھے ان سے نفرت کرنا چاہیے۔" میں نے کاکا کے کان میں سرگوشی کی۔
"کیا...؟ کیا واقعی یہ بات ممی نے تم سے کہی؟"
"جی ہاں!"
کاکا کا چہرہ گہری اور گمبھیر سوچ میں ڈوب گیا۔
"کیا پاپا آئے تھے اور ممی کی ان سے پھر لڑائی ہوئی؟" میں نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔
"نہیں جان!"
"پاپا آئیں بھی تو حویلی تو پھر ان کو اب کبھی نہیں مل سکتی۔" میں نے اپنی دانست میں بڑے تدبر سے کہا۔

"کیا کہا تم نے؟" کاکا نے چونک کر کہا۔
"میں یہ کہہ رہی ہوں کہ شہروالی کوٹھی کی طرح پاپا حویلی نہیں بکوا سکتے۔"
"کیا مطلب؟" کاکا ہنوز تصویرِ استعجاب بنی ہوئی تھیں۔
"مطلب یہ کہ حویلی آپ کے نام ہے، پاپا اس پر قبضہ نہیں جما سکتے۔"
"ارے! یہ تمھیں کس نے بتایا؟"
"بس مجھے پتا ہے۔" میں نے ناز سے کہا۔
"لیکن کیسے آخر؟"
"نانی اماں نے جب ممی کو بتایا کہ حویلی آپ کے نام کرانے کے لیے انھوں نے وکیل صاحب کو بلوایا ہے تو میں بھی ان دونوں کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔"
میں نے جان بوجھ کر کاکا کو یہ بتانے سے گریز کیا کہ میں نے ایک روز اس سلسلے میں ان کی اور نانی اماں کی گفتگو بھی سنی تھی۔
"اچھا یہ بتاؤ کہ حویلی میرے نام کروا کے نانی اماں نے اچھا کیوں کیا؟"
"کیوں کہ شاید پاپا شہروالی کوٹھی کی طرح اسے بھی بیچ دیتے پھر ہم سب رہتے کہاں؟"
"شہروالی کوٹھی کے بک جانے کی بات تمھیں کس نے بتائی؟"
"بس مجھے پتا ہے۔" میں نے پھر اترا کر کہا۔
"لیکن کیسے؟"
"ممی نے بتایا ہے مجھے۔"
"کیا... تمھاری ممی نے؟" کاکا نے انتہائی حیرانی سے کہا۔
"جی ہاں... ممی نے... وہ مجھے کئی دفعہ یہ بات بتا چکی ہیں... ویسے اگر وہ نہ بھی بتائیں تو مجھے تو پہلے ہی پتا تھا۔"
"وہ کیسے؟"
"پاپا کے کسی جاننے والے نے نانی اماں کو خط لکھا تھا، جس میں پاپا کے بارے میں بڑی خراب خراب باتیں لکھی تھیں۔ اسی خط سے تو ممی اور نانی اماں کو یہ پتا چلا کہ پاپا نے دوسری شادی کر رکھی ہے۔"
"تمھیں اس خط کے بارے میں کس نے بتایا؟"
"کسی نے بھی نہیں... بس میں نے خود ہی ممی کے تکیے کے نیچے سے نکال کر پڑھ لیا تھا لیکن آپ یہ بات ممی کو بتائیے گا مت۔"

"میرے مرنے کے بعد۔" نانی اماں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"امی جی پلیز! آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔" کاکا نے تڑپ کر کہا۔

ماسی برکتے کی حویلی میں آمدورفت بدستور جاری تھی اور کاکا کی شادی کے لیے ارادہ نہ ہو پا رہا تھا۔ نانی اماں کی تشویش روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ممی کاکا کی شادی کے معاملے میں عجیب ناقابلِ فہم رویہ اختیار کیے ہوئے تھیں۔ ایک روز انھوں نے منہ بگاڑ کر، ماسی برکتے سے کہا۔

"یہ کیا تماشا ہے ماسی کہ تم آئے دن منہ اٹھائے یہاں چلی آتی ہو؟"

"جی! میں تو چھوٹی بی بی صاحب کے واسطے رشتے لے کر آتی ہوں۔" ماسی برکتے نے بڑے تحمل سے جواب دیا تھا۔

"ہونہہ رشتے۔" ممی نے تمسخرانہ انداز میں کہا پھر تیکھے تیوروں سے ماسی برکتے کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ "عورت اور مرد کے اس رشتے سے زیادہ بھی کوئی ناقابلِ بھروسا رشتہ ہے اس دنیا میں؟"

"صدقے میں مر جاؤں... بی بی! آپ اس رشتے کو ناقابلِ بھروسا کہتی ہو۔" ماسی برکتے نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انتہائی استعجاب سے کہا۔

"ہاں میں اسے ناقابلِ بھروسا کہتی ہی نہیں، سمجھتی بھی ہوں۔" ممی نے وثوق سے کہا۔

"بی بی! بڑا سنا تھا اس رشتے سے تو عورت کی آبرو ہے۔"

"ہونہہ آبرو!" ممی نے سر جھٹکتے ہوئے طنز سے اس کے الفاظ دہرائے۔

"بی بی! یہ رشتہ تو عورت اور مرد کو ایک دوسرے کے دکھ کا ساتھی بناتا ہے۔"

"مرد دکھ کا ساتھی کیا بنے گا... مرد تو صرف دکھ دیتا ہے...." ممی نے انتہائی تلخی سے کہا۔

"بی بی! سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

"سب ایک جیسے ہوتے ہیں... فریبی، دغاباز، مکار اور بے وفا۔" ممی شعلہ بار نگاہوں سے ماسی برکتے کو دیکھتی اپنی جگہ سے اٹھیں اور پاؤں پٹختی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ نانی اماں جو خاموش بیٹھی بغیر کسی مداخلت کے ممی اور ماسی برکتے کی باتیں سن رہی تھیں، آہستہ سے ماسی برکتے سے بولیں۔ "برکتے! تم اس کی بات کا برا نہ منانا۔"

"ناں جی ہم کمیں لوگوں نے مالکوں کی بات کا برا کیا منانا۔"

ماسی برکتے نے توقف کیا پھر بولی۔ "بڑی بی بی صاحب کے بارے میں تو سارے گاؤں کو خبر ہے کہ خاوند کی دوسری شادی پھر اس کی موت کے صدمے سے جھلی ہو گئی ہیں۔"

اتنا کہہ کر ماسی برکتے اپنی سفید چادر کے پلو میں دوبارہ سکڑ لپٹ گئی اور میں اُداس اُداس سوچنے لگی۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ مجھے ماسی برکتے پر تاؤ آ رہا تھا یا ممی پر جن کی باتوں نے ماسی کو مضحکہ خیز انداز میں مسکرانے کا موقع فراہم کیا تھا۔

پھر اگلے چند ماہ اس طور گزرے کہ نانی اماں کاکا کی شادی کے سلسلے میں خاصی متفکر رہیں۔ کاکا بدستور انکار کرتی رہیں اور ممی ان کے انکار کو عقل مندی پر محمول کرتی رہیں۔

"کاکو! بہت اچھی زندگی گزار رہی ہو تم... شادی نہ کرنا ورنہ پھنس جاؤ گی۔" ممی کاکا سے کہتیں۔

ایسے موقع پر اگر نانی اماں بھی قریب ہی موجود ہوتیں تو ان کی بے بسی دیدنی ہوتی۔ کبھی کبھی وہ ممی کو ٹوک بھی دیتیں۔

"عائشہ! یہ کیا کرتی ہو تم، میری مشکل آسان کرنے کے بجائے اس میں اور اضافہ...؟"

"امی! آپ کاکو کی شادی کی فکر چھوڑ دیں۔ وہ ایسے ہی بہت خوش ہے۔"

"کاش! تم ماں بن کر سوچ سکتیں۔" ایک روز میں نے نانی اماں کو کہتے سنا۔

"آپ فکر نہ کریں، جب میں ماں کی حیثیت سے اپنی بچی کے لیے سوچوں گی تب بھی میرا مشورہ یہی ہو گا۔ میں اس سے بھی یہی کہوں گی کہ شادی کے بغیر وہ زیادہ اچھی اور پرسکون زندگی گزار سکے گی۔"

نانی اماں اپنا سر ہاتھوں میں تھام کر رہ گئیں اور ممی حسبِ عادت انھیں تشویش اور فکر میں چھوڑ کر کمرے سے نکل گئیں۔

"امی! امی جی! آپ اطمینان رکھیں... میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی.... آپ کی بات پر میں اس لیے ان میں ہاں ملا دیتی ہوں کہ میں انھیں ہمیشہ مسکراتے دیکھنا چاہتی ہوں.... میں آپ کی خواہش کے مطابق شادی ضرور کروں گی... بس تھوڑی سی مہلت اور.... دراصل.... ابھی.... ابھی وقت نہیں آیا۔" کاکا نے نانی اماں سے کہا۔

"کب آئے گا وقت؟ اب تو تمھارا نتیجہ نکلے ہوئے بھی کئی ماہ گزر گئے۔ اب کس بات کا انتظار ہے؟" نانی اماں نے پوچھا۔

"بس ہے.... ہے کسی بات کا انتظار۔" کاکا نے آہستہ سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی سی چمک تھی۔

ابھی کاکا کے لیے مناسب رشتے کے سلسلے میں سوچ بچار کی دوڑ دھوپ جاری تھی اور اس ضمن میں نانی اماں کی تشویش برقرار تھی کہ ایک شام ارشد سایا نمودار ہوئے۔ ایک اجنبی کے طور پر پہنچنے کا علاوہ انداز سنبھالے۔ ہم سب اس وقت برآمدے میں بیٹھے تھے۔ میرے سالانہ امتحانات شروع ہوئے کئی دن گزر چکے تھے اور اس شام کاکا اگلے روز ہونے والے ریاضی کے پرچے کی تیاری میں مصروف تھیں۔ نانی اماں ہمارے نزدیک ہی وسیع چیئر پر نیم دراز کسی گہری سوچ میں گم تھیں اور تحی دریچے میں تصویر پاس بنی ہوئی خلا میں جانے کیا تک رہی تھیں۔ ارشد سایا نے کسی کو بطور خاص مخاطب کیے بغیر کہا تھا۔

"وہ جی لاہور سے کوئی بادی آئے ہیں ملنے واسطے!"

میں نے نانی اماں، تحی اور کاکا کو بیک وقت ارشد سایا کی جانب متوجہ ہوتے دیکھا۔

"لاہور سے؟" نانی اماں نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں جی!" ارشد سایا نے مؤدبانہ جواب دیا۔

"کون ہے؟ نام تو پوچھا ہوتا۔"

"پوچھا تھا جی..... محمود ظفر بتایا ہے جی انھوں نے اپنا نام۔"

"اوہ!" بے اختیار کاکا کی زبان سے نکلا اور وہ اپنی انگلیوں میں دبا ہوا سرا قلم کسی کاپی کے صفحے پر رکھ کر کسی مورت کی مانند ساکت کھڑی ہو گئیں۔

"محمود ظفر؟" نانی اماں کاکا کی اس بے ساختگی سے بے نیاز گہرے غور و فکر میں مبتلا نظر آ رہی تھیں۔

"وہ جی اپنی چھوٹی بی بی کا پوچھ رہے ہیں... کہتے ہیں جی ملنا ہے۔"

"ارے لو بھئی!" نانی اماں اپنی ٹانگوں پر پڑی شال کو سنبھالتی جھٹ بڑی طرح چونک کر سیدھی ہو بیٹھیں اور جواب طلب نگاہوں سے کاکا کی طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے تحی کو بھی عجیب سے انداز سے کاکا کی جانب دیکھتے پایا۔

"وہ..... وہ..... وہ امی جی... محمود ظفر یونیورسٹی میں ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔" کاکا اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو دائیں مٹھی میں دبوچتے ہوئے بولیں۔

نانی اماں نے کچھ کہنے کو لب کھولے لیکن غالباً کوئی ایسی بات تھی جو انھوں نے ارشد سایا کی موجودگی میں زبان سے نکالنا مناسب نہیں سمجھا۔ تحی جو کچھ دیر پہلے تصویر پاس بنی اور دریچے میں کھڑی تھیں اب خاصی تیکھی نظروں سے کاکا کو دیکھ رہی تھیں۔

کاکا نے نانی اماں اور تحی کی تیکھی نگاہوں سے نگاہیں چراتے ہوئے ارشد سایا کو ہدایت کی: "تم..... انھیں بٹھاؤ..... میں آتی ہوں۔"

"بہتر ہے جی۔"

ارشد سایا مڑا اور برآمدے کی سیڑھیاں عبور کرتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا نیم دائروی پختہ راستے سے حویلی کے صدر دروازے کی جانب چلا گیا۔ کاکا نے چند گز پرے اپنے کمرے کے برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی جانب پیش قدمی کا ارادہ کیا لیکن ابھی وہ دو قدم ہی چلی تھیں کہ نانی اماں کی آواز نے ان کے قدم روک لیے۔

"کیوں آیا ہے وہ یہاں؟"

کاکا تھم گئیں اور پلٹ کر نانی اماں کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں: "پتا نہیں..... میرے ٹرانسفر کے بعد شہر میں جانے کیا ہو سکتا ہے کوئی بات بتانے آیا ہو..... شاید کوئی کام ہو..... یا شاید یونہی ملنے کے لیے آگیا ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" نانی اماں نے کچھ اس طور کہا جیسے کاکا کی بات نے انھیں کسی حد تک مطمئن کر دیا ہو۔

کاکا اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں اور میں ریاضی کے الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے اور سمجھنے کو اپنی کتاب اور کاپی پر جھک گئی۔ کچھ دیر بعد جب کاکا اپنے کمرے سے برآمد ہوئیں تو بڑا دلکش منظر تھا۔ اس روز انھوں نے کئی دنوں بعد اپنی محبوب ترین خوشبو اپنے سراپا پر چھڑکی تھی۔ گھیرے سے سرمئی جوڑے کی جگہ انھوں نے ہلکے کاسنی رنگ کا جوڑا زیب تن کر رکھا تھا۔ بائیں کان کے عقب سے بالوں کو اوپر اٹھا کر انھوں نے سنہرے کلپ میں جکڑ لیا تھا جبکہ سیاہ بالوں کی ایک لمبی لٹ ان کے بائیں شانے پر بھی لٹک رہی تھی اور بقیہ بال پشت پر تھے۔ انھوں نے ہلکا سا میک اپ بھی کر لیا تھا۔ کتنی جلدی مگر کس قدر قرینے سے تیار ہو کر وہ اپنے کمرے سے باہر آئی تھیں۔ شہر سے آئے ایک مہمان کے روبرو جانے کے لیے۔ بڑے دنوں بعد کاکا کو ان کے سجل اور سندر روپ میں دیکھ کر مجھے بے اندازہ مسرت ہوئی۔ تحی نے جو دریچے سے ہٹ کر میرے نزدیک اسی جگہ آ بیٹھی تھیں جہاں کچھ دیر قبل کاکا بیٹھی مجھے پڑھا رہی تھیں، ابرو چڑھا کر کاکا کے سراپا کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لیا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے کاکا نے میرا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"عالی میری جان! تم پڑھو میں ابھی آتی ہوں بس ذرا سی دیر میں۔"

"تیار ہونے میں تو تم نے نصف گھنٹہ صرف کر دیا۔" تحی کے لہجے میں طنز بھی تھا، تلخی بھی۔

کاکا نے چونک کر تحی کی طرف دیکھا، ان کے چہرے پر

خفت چھا گئی لیکن اگلے ہی لمحے وہ اس خجالت کو مسکراہٹ کی آڑ میں چھپاتے ہوئے بولیں: "آپا! گھر آئے مہمانوں کے سامنے سر جھاڑ منہ پہاڑ تو نہیں جایا جا سکتا نا۔"

"اتنے اہتمام کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔" ممی نے انتہائی ترشی سے کہا۔

"معافی ڈیئر آپا! آپ اپنے ٹائم کی سب سے زیادہ خوش لباس لڑکی سمجھی جاتی تھیں... کیا آپ بھول گئیں کہ میرے لیے ملبوسات کا تازہ ترین اسٹاک تو آپ ہی فراہم کیا کرتی تھیں؟" کاکا ممی کے عقب سے ان کے دونوں شانوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولیں۔

اس روز بہت دنوں بعد کاکا کے لہجے میں کسی الھڑ شیاملک پازیبوں کی جھنکار سنائی دی تھی۔

"کاکا جی! آپ جلدی جائیں نا تاکہ جلدی واپس بھی آجائیں، مجھے ڈھیر سارے سوال پوچھنے ہیں آپ سے۔" میں نے مداخلت کی۔

"اوکے... اوکے ڈیئر!" کاکا مسکرا دیں۔

"دیر نہیں ہونا چاہیے۔" میرا انداز تنبیہی تھا۔

"میری جان! کچھ دیر تو ضرور ہوگی۔ آخر گھر آئے مہمان کی کچھ خاطر تواضع بھی تو کرنا ہوگی۔"

"اگر زیادہ دیر ہوئی نا تو میں وہیں آجاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے میری جان!"

کاکا آگے بڑھ گئیں اور طویل برآمدے کے دائیں پہلو میں منہ دکھائے ہوئی راہداری سے گول کمرے کی طرف چلی گئیں۔ جس کا اجنبی مہمانوں کے لیے مخصوص دروازہ حویلی کے صدر دروازے سے سبزہ زار تک گھوم کر آنے والے سیاہ و سرخ اور سفید چکنے پتھروں سے مرصع راستے کی سمت کھلتا تھا۔ راہداری کے آغاز تک کاکا کا تعاقب کرنے کے بعد جب میری نگاہیں واپس پلٹیں تو میں نے ممی کی نظریں اسی سمت جمی پائیں جہاں سے کاکا گزر کر گئی تھیں۔ ممی کسی گہری سوچ میں غرق نظر آتی تھیں۔

پھر یک بیک ماضی کے مسائل میں الجھ گئیں۔ نانی اماں نے کرسی کی پشت پر اپنا سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور ممی کچھ دیر بیٹھ کر برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلنے لگیں۔ پھر باورچی خانے سے پیچ پیالیوں کے کھنکنے کی آواز اور چائے کی خوشبو اور مانوس مہک ہوا کے دوش پر برآمدے تک پہنچی۔ کاکا خاصی باسلیقہ تھیں، گھر آئے مہمان کی خاطر مدارات کے سلسلے میں یقیناً مناسب احکامات جاری کر چکی تھیں۔

ممی کچھ دیر تو بڑے صبر و ضبط کے ساتھ برآمدے میں ٹہلنے کی مشق جاری رکھے رہیں، پھر دھیرے دھیرے وہ مضطرب نظر آنے لگیں اور جوں جوں لمحے گزرتے چلے گئے ان کا اضطراب بڑھتا ہی چلا گیا۔ وہ برآمدے کے اختتام پہ راہداری کے آغاز تک جاتیں پھر پلٹ آتیں۔ خاصی دیر یہی صورت حال رہی۔ بالآخر ممی کے ضبط کا پیمانہ چھلک ہی پڑا۔

"امی! کتنی دیر ہو گئی کاکا کو ان کے ساتھ بیٹھے؟" ممی نے نانی اماں کے نزدیک رکتے ہوئے خاصی تشویش کے ساتھ کہا۔

نانی اماں جو آنکھیں موندے وہیل چیئر سے سر ٹکائے بیٹھی تھیں، آنکھیں کھول کر سیدھی ہو بیٹھیں۔

"کتنی دیر ہو گئی اسے؟" ممی نے پھر تشویش ظاہر کی۔

"دور سے آیا ہے، کچھ دیر تو بیٹھے گا۔" نانی اماں نے بہت اطمینان سے جواب دیا اور ان کے اس جواب نے مجھے حیرت سے ہونے پہ مجبور کر دیا۔ کچھ دیر قبل تو اجنبی مہمان کی آمد پر انھوں نے خود بھی تشویش ظاہر کی تھی مگر اب وہ ممی کی تشویش سے قطعی بے نیازی اختیار کرتے ہوئے بہت اطمینان کا اظہار کر رہی تھیں۔ "دور سے آیا ہے، کچھ دیر تو ضرور بیٹھے گا۔" میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ یہ گھر آئے مہمان کے لیے مروت کا اظہار تھا یا ممی کے یاسیت زدہ طرز عمل نے نانی اماں کو بھی بیزار کر دیا تھا۔

نانی اماں کے جواب پر ممی کے تاثرات دیدنی تھے۔ جبڑے بھینچ لیے، ہاتھ کو مٹھی کی صورت دائیں مٹھی میں دبوچے ہوئے انھوں نے برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کئی چکر لگائے پھر وہ دفعتاً میرے نزدیک آ بیٹھیں۔

"سب کچھ سمجھ میں آرہا ہے؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے سر اٹھا کر ان کو دیکھا۔

"سارے سوال آرہے ہیں؟" ان کے لہجے میں اب زیادہ ترشی تھی۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر کیا کرو گی امتحان میں؟"

"ممی! جو سوال مجھے نہیں آرہے انھیں میں نشان لگاتے جا رہی ہوں۔ جب کاکا آئیں گی تو ان سے پوچھ لوں گی۔"

"کاکا... اوہ تو بھول گئیں کہ کل تمھارا پرچہ بھی ہے... جاؤ اپنی کاپی اور کتاب لے کر تم وہیں چلی جاؤ۔" ممی نے کہا۔

میں نے تعجب سے ممی کی طرف دیکھا۔

"ہاں... جاؤ..." ممی نے کسی سخت گیر حاکم کی مانند کہا۔

"مگر ممی!... وہاں... وہاں تو کاکا اپنے مہمان سے باتیں کر رہی ہوں گی۔"

"میں تم سے کیا کہہ رہی ہوں..." ممی نے خشمگیں نگاہوں

سے مجھے دیکھا اور بولیں: "اٹھاؤ کاپی اور کتاب اور جاؤ۔"

میں نے بے بسی سے نانی اماں کی طرف دیکھا۔ دوسری نگاہوں سے ہماری جانب ہی دیکھ رہی تھیں۔ ممی کے خشمگیں تیوروں کے پیش نظر مجھے کاپی اور کتاب اٹھا کر ڈرائنگ روم کا رخ کرنا پڑا۔ برآمدے کے اختتام پر جب میں راہداری میں مڑنے کے لیے گول کمرے کے دروازے پر پہنچی تو میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ مجھے کاکا کے مہمان کا لحاظ کیے بنا بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کاپی اور کتاب سمیت گول کمرے میں داخل ہو جانا چاہیے یا چپ چاپ آگے بڑھ کر حویلی کی راہداریوں میں گم ہو جانے کی کوشش کرنا چاہیے لیکن حکم عدولی کی صورت میں ممی مجھ پر سخت خفا ہو سکتی تھیں۔ پاپا کے بعد تو انہیں بات بے بات اتنا غصہ آنے لگا تھا کہ کبھی کبھی تو مجھے وحشت ہونے لگتی تھی۔ میں ڈری نگاہوں سے پیچھے برآمدے اور راہداری کے سنگم کی جانب پلٹ کر دیکھا۔ ممی وہاں کھڑی مجھ ہی کو دیکھ رہی تھیں۔ راہ فرار مسدود تھی اور حکم عدولی پر ممکنہ مضمرات کی صورت میرے سر پر تلوار بنا لٹک رہا تھا۔ بالآخر میں نے گول کمرے کے دروازے پر پڑے دبیز مخملیں پردے کو تھام کر اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ کاکا اور ان کا مہمان ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ میں ان دونوں کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ شہر سے آنے والا کاکا کا مہمان بڑی تمیز اور سلیقے سے ٹانگ پر ٹانگ دھرے بیٹھا تھا۔ اس کی رنگت سانولی تھی اور چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ میرا خیال ہے میں نے گاؤں میں اس جیسا کوئی چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کے لبوں پر گہری مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں محبوبیت سی۔ ملگجے رنگ کی پتلون کے ساتھ اس نے سیاہ اور سفید دھاریوں والی قمیص پہن رکھی تھی اور سیاہ سفید دھاریوں والی ٹائی اس کے کالر کی اوٹ میں بندھی سینے پر لگی تھی۔ اس کے سیاہ جوتے چمک رہے تھے۔ کاکا کے سراپے سے اٹھتی ان کی پسندیدہ خوشبو کی مانوس مہک، ان کے مہمان کے وجود سے اٹھتی کلون کی ہوشربا لپٹوں میں گھل کر مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ مگر میری حس شامہ ان دو ملی جلی خوشبوؤں کا بالکل ویسے ہی جدا جدا احساس کر سکتی تھی جیسے ٹھنڈے میٹھے دودھ کے گھونٹ بھرنے والا دودھ کے ملائی اور شکر کے میٹھے ہونے کا احساس کر سکتا ہے۔ کاکا اپنے مہمان سے باتیں کرنے میں منہمک تھے۔ ان کی اور ان کے مہمان کی آوازیں اتنی مدھم تھیں کہ ان کی باتیں سن سکنا میرے لیے ممکن نہ تھا تاہم کاکا کے مہمان کی آنکھوں میں گھلی محبوبیت اور کاکا کے چہرے پر رقصاں مسکراہٹ مجھ جیسی اسکول کی نو عمر طالبہ کو اتنا سمجھا دینے کے لیے کافی تھی کہ وہ کاکا کا محض یونیورسٹی فیلو ہی نہ تھا۔

دفعتاً میرا جیومیٹری بکس کاپی اور کتاب کے درمیان سے پھسل کر میرے قدموں میں آ گرا۔ فرش پر آواز پیدا ہوئی تو کاکا اور ان کے مہمان نے بے ساختہ چونک کر اس آواز کی سمت دیکھا۔ میں گھبرا کر ڈبا اٹھانے کو جھکی تو کاکا کی آواز مجھ تک پہنچی۔

"اچھا تو تم ہو۔"

مجھے خجالت نے آ لیا۔

ڈبا اٹھا کر جب میں کھڑی ہوئی تو میں نے کاکا کو اپنے روبرو کھڑے پایا۔ جن کی باچھیں ہنسی کے مارے کھلی پڑتی تھیں۔

"آئی ایم سوری جان! مجھے شاید کچھ دیر ہو گئی... آؤ میں تمہیں اپنے مہمان سے ملوا دوں۔"

میں جھجکی مگر کاکا نے میرا بازو تھام کر مجھے کمرے میں کھینچ لیا۔ میں نے کاکا کے مہمان کو اپنی جانب متوجہ پایا۔ کاکا میرا بازو تھامے آگے بڑھے اور مجھے اپنے مہمان سے متعارف کرانے لگے۔

"محمود! یہ میری اکلوتی بھانجی ہے علیہ... ویسے میں اسے پیار سے ہانی کہتا ہوں... بہت پیاری اور سمجھدار لڑکی ہے۔ اس سال میٹرک کے امتحان میں شریک ہو رہی ہے کل ریاضی کا پیپر ہے۔ جب تمہارے آنے کی خبر ملی تو میں اسی کو پڑھا رہا تھا اور جب میں تمہارے پاس آنے لگا تو اس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ اگر مجھے زیادہ دیر ہوئی تو یہ کاپی اور کتاب لے کر یہیں آ پہنچے گی، دیکھ لو آ گئی۔"

کاکا کا مہمان ہنس کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور میں شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ کاکا کو میں کیسے بتاتی کہ میں یہاں خود نہیں آئی تھی بلکہ مجھے زبردستی بھیجا گیا تھا۔

"آئی ایم رئیلی سوری... مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں آپ کی کلاس کے ساتھ آپ کا وقت بھی ضائع کر رہا ہوں۔ آپ نے یہاں آ کے مجھے میری غلطی کا احساس دلا کر بہت اچھا کیا ہانی! مجھے خوشی ہے کہ اس بہانے ہم آپ سے مل تو لیے۔ بہت ذکر سنا تھا ہم نے آپ کی آنٹی سے آپ کا۔"

میں بدستور احساس خجالت سے دوچار تھی۔

"ہانی! جان، یہ ہمارے دوست ہیں محمود ظفر... یونیورسٹی میں ہمارے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ لاہور میں رہتے ہیں۔ نئے ماڈلز کی گاڑیاں رکھنے کا شوق بھی ہے اور بزنس بھی... ہاں ان کے پاس ایک اسپورٹس کار تو ایسی ہے کہ تم دیکھو تو خوش ہو جاؤ گی۔"

مجھے ہنوز خجالت نے گھیر رکھا تھا۔

"اچھا بھئی محمود اب اجازت۔" میں نے کاکا کے دوست سے اجازت چاہی۔

"ابھی سے نہیں جاؤ گی جان"

"کیوں نہیں..... مگر..... ابھی نہیں۔"

"پھر کب آؤ گے؟"

"بہت جلد۔"

کاکا کی دلفریب مسکراہٹ میں شرماہٹ کا رنگ حلول کر گیا۔

محمود ظفر نے کاکا کی جانب پیش قدمی کی اور ان کے نزدیک رکتے ہوئے اپنی دانست میں تو انہوں نے بہت آہستہ سے کہا۔

"تمہارے بغیر لاہور بہت اداس سا رہتا۔" مگر میں نے ان کی آواز سن لی۔

"جھوٹ۔" کاکا بولیں۔

"سچ۔" محمود ظفر نے پورے وثوق سے کہا۔

"میں تمہارے دوبارہ آنے کا انتظار کروں گی۔"

"دعا بھی کرنا۔"

"محمود اگر حالات نے چاہا....." کاکا کہتے کہتے رک گئیں۔ شاید میری موجودگی نے انہیں محتاط کر دیا تھا۔

"ورنہ.....!" محمود چند ثانیے گہری نگاہوں سے کاکا کو دیکھتے رہے پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ "کسی بھی قیمت پر مجھے منزل تک پہنچنا ہے۔ تم میرے لیے دعا کرنا۔"

"دعاؤں کی ضرورت تو شاید ہم دونوں ہی کو ہے۔"

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی پریشانیوں میں گھری ہو گی۔ کاش! تم نے فون نہ کرنے کی پابندی نہ لگائی ہوتی تو میں اتنا بے خبر نہ رہتا۔"

کاکا کے چہرے پر اداسی ڈولنے لگی لیکن جلد ہی انہوں نے اپنے اوپر قابو پالیا۔

"اچھا..... اب اجازت؟"

"میں تمہارے دوبارہ آنے کا انتظار کروں گی۔"

"اوکے..... اور ہاں جاکر اب تو فون کرنے کی اجازت ہے؟"

"نہیں۔" کاکا نے جواب دیا۔

پھر کاکا محمود ظفر صاحب کے ہمراہ گول کمرے سے باہر نکل گئیں اور ان کے پیچھے پیچھے میں بھی۔ ممی کو میں نے برآمدے اور سامنے لان کے کونے پر کھڑے دیکھا۔ شاید کاکا نے بھی دیکھا ہو۔

"خدا حافظ۔" محمود ظفر نے سبزہ زار میں اترتی سیڑھیوں پر قدم دھرتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ۔" کاکا دھیمے سے بولیں۔

محبوبانہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے وہ دونوں مجھے بے حد اچھے لگے۔

پھر محمود ظفر سبزہ زار سے گزرتے حویلی کے صدر دروازے تک گھوم کر جانے والے پختہ راستے پر لمبے لمبے ڈگ بھرتے بالآخر ہماری نگاہوں کی پہنچ سے باہر ہو گئے۔ کاکا پلٹیں اور انہوں نے تیزی سے بالائی منزل کا رخ کیا۔ میں ان کے پیچھے لپکی۔ بالائی منزل کے وسط پچھلے سے ہم نے محمود ظفر کو حویلی کے احاطے میں کھڑی جیپ کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھے دیکھا۔ اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے انہوں نے گردن گھما کر حویلی کی جانب دیکھا۔ کاکا نے بے تابانہ اپنا ہاتھ ہلایا۔ محمود ظفر نے کاکا پر نظر پڑتے ہی اپنا دایاں ہاتھ اسٹیئرنگ سے اٹھا کر الوداعی انداز میں بار بار لہرایا۔ کاکا کی آنکھیں پھر [illegible] رہی تھیں۔ اپنے قریب میری موجودگی کو انہوں نے تقریباً فراموش ہی کر دیا تھا۔ میں بچی نہ تھی۔ زندگی کے کتنے میٹھے اسرار و رموز بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ میرے دل نے چپکے سے مجھ سے کہا۔

"کہیں کاکا محمود ظفر سے پیار تو نہیں کرتیں؟"

اور میرے لب آپ ہی آپ مسکرا دیے۔

اب میری سمجھ میں بخوبی یہ بات آ چکی تھی کہ کاکا [illegible] کے لیے آنے والے ہر پیام کو رد کیوں کر دیتی تھیں اور جب نانی اماں انہیں کسی رشتے کی بابت مجبور کرنے کی کوشش کرتیں تو کیوں وہ بے نیازانہ انداز میں نانی اماں سے کہا کرتی تھیں۔

"امی! ابھی میری شادی کا وقت نہیں آیا ہے۔"

تب تو میں حیران ہو کر سوچا کرتی تھی کہ کاکا کو کیسے معلوم کہ ان کی شادی کا وقت نہیں آیا ہے۔ شادی کا وقت کوئی اسکول کے وقت کی طرح مقرر تو ہوتا نہیں کہ ٹھیک ساڑھے سات بجے اسکول شروع ہوتے ہی گھنٹی بج جائے لیکن اب میں کاکا کی بات کا مطلب بخوبی سمجھ چکی تھی۔

میں خوش تھی کہ کاکا کی شادی کا وقت آ گیا تھا۔

محمود ظفر کے دوبارہ حویلی آنے تک کاکا جو شہر سے گاؤں واپسی کے بعد حالات کے گرداب میں الجھ کر اپنی سج دھج سے کچھ بے نیاز سی ہو چکی تھیں، دوبارہ اپنے اسی روپ میں آ چکی تھیں جو مجھے ان پر مر مٹنے کو تیار رکھا کرتا تھا۔ شوخ رنگ اور جدید تراش خراش کے ملبوسات کا وافر ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا۔ آرائش حسن کی مصنوعات کی بھی ان کے پاس کمی نہ تھی۔ وہ ہر وقت لک سک سے تیار رہنے لگیں۔ حویلی کی راہداریاں اور برآمدے ان کے دلنواز سراپے سے اٹھتی خوشبوؤں سے مہکنے لگے۔ وہ جس طرف سے گزر جاتیں مدھم خوشبو کا پتا سراغ بنا کر چھوڑ جاتیں۔ ان کی خوبصورت آنکھوں میں انتظار کی کیفیت ڈیرے ڈالنے لگی۔ برآمدے میں ٹہلتے ہوئے ان کی نگاہیں حویلی کے صدر دروازے کا رخ کرتیں۔

[illegible] گھنٹی بجتے ہی ان کے عارضوں کا رنگ گہرا ہو جاتا اور آنکھوں

خوشیاں اُجڑ جانے کے غم نے نانی اماں کو بہت ملول اور آزردہ خاطر کر رکھا تھا۔

"بات یہ ہے بیٹا کہ ایک وقت میں سب کو خوش دیکھنا اکثر ممکن نہیں ہوتا... جب خوشیاں شروع ہونے لگیں تو راستہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے... میرا مطلب ہے خوشیوں کا راستہ... کسی ایک کو تو دکھی دیکھنا ہی پڑتا ہے۔"

نانی اماں نے محمود ظفر کی طرف دیکھا اور بولیں: "اب تم کچھ نہ سمجھ میں آنے والی باتیں کر رہے ہو۔"

محمود ظفر نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور کہا: "خاصی دیر ہو چکی ہے... اس وقت تو اجازت دیجئے جلد ہی پھر حاضر ہوں گا۔"

"کیا لاہور واپس جانا ہے؟"

"نہیں جی۔"

"پھر؟"

"رات تو یہیں ریسٹ ہاؤس میں گزاروں گا کل صبح ملتان کے لیے روانہ ہونا ہے۔ والدہ سے ملنا ہے اور کچھ کام بھی ہے پھر وہاں سے لاہور واپس جاؤں گا۔"

"رات ریسٹ ہاؤس میں گزارو گے؟"

"ہاں جی۔"

"میں تم سے یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ رات حویلی میں گزارو مگر یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ رات کا کھانا کھا کے جانا۔"

کاکا کو غالباً نانی اماں کی جانب سے اس قسم کی توقع تھی چنانچہ انھوں نے خاصا پھڑک کر نانی اماں کی تائید کی: "ہاں... محمود... کھانا کھا کے جانا۔"

محمود ظفر سوچ میں پڑ گئے۔

"دیکھو... جب سے گھر میں کوئی مرد نہیں رہا میرا مطلب ہے گھر کا مالک تب سے کھانے پر کچھ زیادہ اہتمام تو نہیں ہوتا خصوصاً رات کے کھانے پر مگر... پھر بھی ریسٹ ہاؤس سے بہتر کھانا مل جائے گا تمہیں یہاں۔" نانی اماں کی اس بات میں بھی دکھ کا عنصر نمایاں تھا۔

"اماں ٹھیک کہتی ہیں محمود!" کاکا نے کہا۔

"اچھا جیسی آپ لوگوں کی مرضی۔"

"میرا خیال ہے اب اندر چلا جائے... ہاں زاہد تم بشیراں کو بتا دو کہ رات کے کھانے پر ایک مہمان ہمارے ساتھ ہوں گے۔" نانی اماں نے کاکا کو ہدایت کی۔

"جی اچھا۔" کاکا نے نانی اماں کی وہیل چیئر کی پشت پر اپنے دونوں ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ ٹھنڈک محسوس کر رہی ہیں؟" محمود ظفر نے متفکرانہ لہجے میں نانی اماں سے پوچھا۔

"نہیں... نہیں تو... موسم ان دنوں انتہائی خوشگوار ہے، نہ سردی ہے نہ گرمی اور رات خوشگوار ہوائیں چلتی ہیں۔"

"کیا... کیا آپ مجھے تھوڑا سا وقت اور دے سکیں گی؟" محمود ظفر نے نانی اماں سے کہا۔

نانی اماں مسکرا دیں اور آزردہ لہجے میں بولیں: "وقت دینے والی چیز کب ہے، اسے تو جینا پڑتا ہے۔"

کاکا جو غالباً موقع کی نزاکت کو محسوس کر چکے تھے بولے: "میرے خیال میں اب ہمیں اندر چلنا چاہئے پھر بشیراں کو رات کے کھانے کی بابت سمجھانا ہے۔"

"ہاں چلو..." نانی اماں نے کہا پھر وہ محمود ظفر کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں: "آؤ اندر چلتے ہیں۔"

"کیا ہم... کچھ دیر اور... یہاں نہیں بیٹھ سکتے؟"

"کیوں نہیں؟"

"اگر آپ کو کوئی بے آرامی نہ ہو تو؟"

"تم میری فکر نہ کرو... وہیل چیئر میری زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ میں بالکل آرام سے ہوں۔ تم یہاں بیٹھنا چاہتے ہو تو شوق سے بیٹھو۔"

"جی میرا خیال تو یہی ہے... یہاں اچھا لگ رہا ہے... خاموشی بھی ہے اور سکون بھی... اور... یہاں کھلی فضا شاید مجھے کھل کر بات کرنے کا حوصلہ بھی دے سکے۔"

"اچھا اماں میں تو ذرا بشیراں کی طرف جاؤں؟"

"ہاں جاؤ۔"

کاکا نے میری طرف دیکھا اور میں اٹھ کر ان کے ساتھ چل دی۔ کاکا نے اندر جا کر ماسی بشیراں کو رات کے کھانے کی بابت ضروری ہدایات دیں اور میرے اندازے کے برخلاف انھوں نے باغ کا رخ کرنے کے بجائے ممی کے کمرے کا رخ کیا۔ ممی بستر پر چت پڑی چھت پر نگاہیں ٹکائے جانے کس سوچ میں گم تھیں۔ ہمارے قدموں کی آہٹ پر انھوں نے چونک کر ہماری طرف دیکھا مگر بدستور لیٹی رہیں۔

"آپا! طبیعت تو ٹھیک ہے؟" کاکا نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" ممی کا لہجہ سرد تھا۔

"آپ وہاں سے چلی کیوں آئیں؟"

کاکا کے اس سوال پر ممی نے ابرو چڑھا کر دیکھا اور تند لہجے میں بولیں: "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جو لوگ مجھے پسند نہیں ہوتے میں

زیادہ دیر تک انھیں برداشت نہیں کر سکتی اگر وہ خود نہیں اٹھتے تو میں خود ہی وہ جگہ چھوڑ دیتی ہوں۔"

کاکا کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

"انھیں رخصت کرنے کے بعد ہی تمھیں میرا خیال آیا ہو گا؟"

ممی کے لہجے میں طنز و حسد کی کیفیت عیاں تھی۔

"جی... جی نہیں... وہ تو آ گئی ہیں..." کاکا کہہ کر بیٹھ گئیں۔

ممی نے بلٹ کر کاکا کی جانب دیکھا پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں: "عالیہ، بشیراں کو بتا دو کہ ممی اپنے کمرے میں ہی کھانا کھائیں گی۔"

"جی... اچھا..." میں نے مردہ سی آواز میں کہا۔

"آپا..." کاکا نے لجاجت سے ممی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ برا آدمی نہیں ہے۔"

"شاید اس لیے کہ تم اسے پسند کرتی ہو،" ممی نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کاکا کو دیکھا۔

کاکا کو شاید ممی کی جانب سے ایسی بات کی توقع نہ تھی ہڑبڑا کر انھوں نے ممی کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئیں۔ ممی کہنیوں کے بل اٹھ بیٹھیں اور انھوں نے گہری نگاہوں سے کاکا کو دیکھتے ہوئے کہا "کسی کا اعتبار کر لینا مگر مرد کا اعتبار نہ کرنا۔"

"آپا..." کاکا نے التجائیہ لہجے سے ممی کو دیکھا پھر گھٹی گھٹی آواز میں بولیں: "آپ عالیہ کے سامنے تو ایسی بات نہ کریں!"

"کیوں؟"

"کیوں کہ کم عمری کی الجھنیں اس کے لیے زندگی کی اگلی منزلیں دشوار بنا سکتی ہیں۔" کاکا نے دزدیدہ نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

ممی نے میری طرف دیکھا اور کاکا کی تمام حزم و احتیاط کو پس پشت ڈالتے ہوئے اونچی آواز میں بولیں: "عورت کی زندگی کو دشوار بنانے والی ذات مرد ہے اور میں عالیہ کو مرد کے جھوٹے سہارے کے بغیر زندہ رہنا سکھاؤں گی۔"

کاکا تذبذب کے عالم میں ہونٹ چبانے لگیں پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اچھا آپا! ذرا امی کو جا کر دیکھوں، شاید ابھی باہر ہی ہیں۔"

"غالباً تمھارے مہمان کے ساتھ۔" ممی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"جی... جی ہاں..." کاکا نظریں چرا کر بولیں۔

کاکا کے ساتھ میں نے بھی باہر جانے کو پر تولے تھے مگر ممی کی آواز نے میرے قدم روک دیے۔

"عالیہ! تم یہیں ٹھہرو گی۔"

بادل ناخواستہ مجھے رکنا پڑا۔

کاکا کے جانے کے بعد ممی نے مجھ سے کہا: "تم جانتی ہو، میں نے تمھیں کیوں روکا ہے؟"

"جی نہیں،" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تمھیں یہ بتانے کے لیے کہ تمھاری کاکا انتہائی بے وقوف ہیں!"

میں بے وقوفوں کی طرح ممی کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"ہونہہ... بے وقوف کہیں کی..." ممی خود کلامی کے عالم میں بولیں۔

میں کاکا کے ساتھ جانے سے روک دیے جانے پر رنجیدہ بیٹھی تھی۔

"کیا باتیں ہو رہی تھیں تمھاری کاکا کے مہمان اور نانی اماں کے درمیان؟"

"پتا نہیں،" میں نے جھوٹ بولا۔

"عجیب احمق لڑکی ہو تم بھی... اپنی کاکا کی طرح..." ممی نے مجھے دیکھا پھر چند ثانیوں کے توقف سے بولیں: "جب کوئی مرد بولتا نظر آئے تو غور سے سنو اور فیصلہ کرو کہ وہ کتنا جھوٹ بول رہا ہے۔ ویسے... مرد عموماً سچ نہیں بولتے... اسی لیے ان کی بات کا اعتبار کرنا خود کو دھوکا دینا ہے..... اچھا جاؤ، جا کے بشیراں کو بتا دو کہ ممی اپنے کمرے ہی میں کھانا کھائیں گی۔"

"ممی اور میں؟" میں نے دھیرے سے کہا۔

"نہیں... تم نانی اماں اور کاکا کے ساتھ ہی کھانا کھاؤ، لیکن کاکا کے مہمان سے تم ہرگز بے تکلف نہیں ہو گی... میں تمھیں کبھی بھی کسی مرد سے بے تکلف ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی... تم جانتی ہو کہ مرد کتنے برے ہوتے ہیں... تمھیں تو معلوم ہے نا بیٹا کہ تمھارے پاپا نے ہمارے ساتھ کیا کیا... کتنا بڑا دھوکا اور دکھ دیا ہمیں... سزا انھوں نے آپ ہی بھگت لی... کار کا دروازہ کھل گیا تھا، وہ باہر گر پڑے تھے اور ٹرک کا پہیہ ان کے سر پر سے گزر گیا تھا۔ خدا یونہی سزا دیا کرتا ہے برے لوگوں کو۔" لفظ بہ لفظ ممی کی آواز بوجھل سے بوجھل تر ہوتی چلی گئی۔

ممی کے دکھی لہجے نے مجھے ان کی آنکھوں میں جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا جی کٹ کے رہ گیا۔ پاپا کے بعد ان کے مزاج میں کچھ ایسی ہی ناخوشگوار اور بسا اوقات ناقابل برداشت ہو جانے والی تبدیلی رونما ہو گئی تھی بہرحال وہ میری ماں تھیں۔ مجھے ان سے محبت تھی، ان کی سچی دھنک کے ایک مستقل سوگواریت میں بدل جانے کا ملال تھا ان کی مسکراہٹ

اور قسمتوں کے گم ہو جانے کا دکھ تھا، ان کی خوشیوں کے پامال ہو جانے کا غم تھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ میری ممی اس عمل کو پاپا کی بے وفائی کے سبب پہنچی تھیں چنانچہ اگر وہ مردوں کو بُرا کہتی تھیں تو غلط نہ کہتی تھیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ مجھے کاکا سے بھی پیار تھا اور میں ان کو خوش دیکھنا چاہتی تھی۔

اس رات ممی نے اپنے کمرے میں اور میں نے نانی اماں، کاکا اور ان کے مہمان کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ ماسی بشیراں نے اتنے کم وقت میں اچھا بھلا اہتمام کر دیا تھا۔ کھانے کے دوران محمود ظفر باتیں بھی کرتے رہے اور میٹھی میٹھی نظروں سے کاکا کو بھی دیکھتے رہے۔ انھوں نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی مگر میں ان کی نسبت تجویز پانے خاصی محتاط بیٹھی تھی۔ کھانے کے بعد کاکا نے انھیں چائے یا کافی کی پیش کش کی لیکن انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب اجازت، کافی پھر پی لیں گے۔"

"پھر کب؟" کاکا کے استفسار میں ایک بے تابی تھی۔

"بہت جلد۔"

محمود ظفر کے لبوں پر بڑی امید افزا اور پرمعنی مسکراہٹ تھی۔ کاکا انھیں رخصت کرنے برآمدے کی سیڑھیوں تک گئیں اور میں کمرے میں آ گئی۔ پاپا کے بعد سے میں ممی کے ساتھ ان کے کمرے ہی میں سونے لگی تھی۔ ممی جو اس وقت اپنی خواب گاہ کے نرالی دریچے میں کھڑی محمود ظفر کی حویلی سے روانگی کا منظر دیکھ رہی تھیں، میرے قدموں کی آہٹ سن کر پلٹیں اور میری جانب بڑھ آئیں۔ مجھے اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے انھوں نے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور پرجوش لہجے میں بولیں۔ "شاباش! میں تمھاری نگاہوں میں ہر مرد کے لیے ہمیشہ ایسی ہی ناگواری اور حقارت دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میں نے متذبذب نگاہوں سے ممی کی جانب دیکھا۔

ممی دھیرے سے مسکرائیں اور بولیں۔ "میں ڈرائنگ ہال کی کھڑکی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔"

"اوہ!" میں نے چونک کر ممی کی طرف دیکھا۔

تب تو یقیناً انھوں نے محمود ظفر کو میٹھی میٹھی نگاہوں سے کاکا کو دیکھتے ہوئے بھی دیکھا ہو گا۔

اگلے دو تین ماہ کے دوران محمود ظفر کئی مرتبہ حویلی آئے۔ نانی اماں کے ساتھ ان کی طویل نشستیں رہیں۔ نانی اماں اور ممی کے درمیان کچھ کھچڑی سی پکتی رہی۔ پھر ایک روز میں نے نانی اماں اور ممی کے مابین کچھ اس قسم کی گفتگو سنی۔

"وہ کہتا ہے شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔" نانی اماں کہہ رہی تھیں۔

"اور آپ کو اس کی بات کا اعتبار ہے؟" ممی کے لہجے میں استفسار اور طنز کی ملی جلی کیفیت تھی۔

"بظاہر تو وہ شریف اور قابل اعتبار ہی نظر آتا ہے۔"

"شریف تو وہ بھی نظر آتا تھا جسے قابل اعتبار جان کر آپ نے سارا کاروبار ہی اس کے حوالے کر دیا تھا۔" ممی کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔

نانی اماں کا چہرہ ایک ہیجانی کیفیت سے دوچار نظر آنے لگا تاہم چند ثانیوں کے اندر ہی انھوں نے اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے بڑی ملائمت سے کہا۔ "ساری بات مقدر کی ہوتی ہے۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ مقدر راشو کا ساتھ دے گا؟" ممی نے ترش روئی سے کہا۔

"ماں ہونے کے ناتے میری تمنا تو یہی ہو گی۔"

"ہونہہ!" ممی نے طنزاً مسکراتے ہوئے گردن جھٹکی اور بولیں۔ "لگتا ہے ایک تجربے کو آپ نے کافی نہیں سمجھا۔"

"کاش! تم میری جگہ ہوتیں اور میری مجبوری سمجھ سکتیں۔" نانی اماں نے بے بسی سے کہا۔

"جو لڑکی اپنی ماں اور دیگر افراد خاندان سے چھپ کر شادی کرنے کی سوچ سکتی ہے وہ کل شوہر کے اور آپ کے ساتھ بھی کوئی کھیل کھیل سکتی ہے۔"

"محمود ظفر سے اس نے یہ بات چھپائی نہیں ہے۔ انھیں اپنی مرضی سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"لیکن بدقسمتی سے ان کی رضامندی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔" ممی کا لفظ لفظ تلخی اور طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔

"وہ بیٹی کی وجہ سے مجبور ہیں۔"

"لیکن اسے بہن کی پروا کیوں ہو گی... اس کے اس گھر میں شادی نہ کرنے سے اگر بہن کا گھر اجڑتا ہے تو اس کی بلا سے۔" نانی اماں نے التجائیہ بے کسی سے ممی کی جانب دیکھا۔

چند ثانیے وہ انھیں یونہی دیکھتی رہیں پھر آزردگی سے بولیں۔ "میرا خیال تھا تم اس مشکل مرحلے پر میری مددگار ثابت ہو گی لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ تمھاری باتیں میری پریشانی میں اور اضافہ کر دیں گی۔"

"پریشانی کیسی؟ آپ کی باتوں سے تو مجھے یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ اسے اپنی فرزندی میں قبول کر لینے پر آمادہ ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ راشو کی اس سے چوری چھپے شادی کر دینے پر آمادہ ہیں۔"

"بات میری کمزوری کی نہیں۔ میرے نزدیک تو شاہ محمد سے اچھا اور کوئی نہیں تھا۔ بڑی کار والا، کافی پڑھا لکھا تھا اور رانو کے لیے بہت زیادہ خواہش مند تھا۔"

"تو پھر اسی سے کیوں نہ کر دی؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ رانو نے انکار کر دیا تھا... بلکہ ایک شاہ محمد ہی پر کیا موقوف، رانو تو ہر ایک کے لیے انکار کر دیتی تھی۔"

"اور اس کے لیے؟"

"راضی ہے۔"

"آپ کو کیسے پتا؟"

"مجھے اندازہ ہے... میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں... پھر بھی میں نے تصدیق کر لینا ضروری سمجھا۔"

"یعنی؟"

"جب اس نے سوال ڈالا تو میں نے اس سے کہا کہ رانو شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اس پر اس نے مجھ سے کہا۔ میں رانو کی رضا لینے کے بعد ہی آپ سے سوال کر رہا ہوں۔"

"اوہ! رانو تو بہت تیز نکلیں، بالا ہی بالا سب طے کر لیا۔"

"پھر بھی کسی لڑکی کو اتنا حق تو ہونا ہی چاہیے۔"

"گویا یہ سارا عمل کا فیصلہ ہے۔" ممی نے طنز سے کہا۔

"خیر جو بھی سمجھو، میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتی... دن رات میرے ذہن پر رانو کی فکر سوار رہتی ہے۔ میں جلد از جلد اس کے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتی ہوں۔ میری ٹانگیں میرا ساتھ چھوڑ چکی ہیں۔ اندر سے میں اپنے آپ کو کھوکھلا محسوس کرتی ہوں۔ کمزوری اور بے بسی مجھ پر دن بہ دن غالب آتی جا رہی ہے۔ بے دم ہو کر گرنے سے پہلے میں رانو کو اس کے گھر بار کا دیکھنا چاہتی ہوں... کسی بھی طرح..."

نانی اماں کے آخری فقرے میں فیصلہ کن کیفیت تھی۔

"کسی بھی طرح!" ممی نے معنی خیز لہجے میں نانی اماں کا آخری فقرہ دہرایا۔

"ہاں کسی بھی طرح۔"

"ایک بات کہوں بشرطیکہ آپ بُرا نہ منائیں؟"

"ہاں کہو۔"

"رانو کو آپ آزاد اور خود مختار زندگی گزارنے دیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ پڑھی لکھی ہے اور کسی فریب کے بغیر زندگی گزار سکتی ہے۔"

"فریب!" نانی اماں نے تعجب سے ممی کی طرف دیکھا۔

"ہاں... مرد فریب نہیں تو اور کیا ہے؟"

"اوہ میرے خدا...." نانی اماں نے سر ہاتھوں میں تھام لیا اور بولیں: "میری سمجھ میں نہیں آتا تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ خدا کے واسطے عائشہ میری مشکل آسان کرنے میں مدد دو، نہ کہ تم ...." نانی اماں کی آواز گھٹ کے رہ گئی اور وہ رونے لگیں۔

ممی کے چہرے پر شرمندگی کی کیفیت چھا گئی۔ کچھ دیر وہ چپ بیٹھی رہیں پھر انھوں نے گمبھیر لہجے میں کہا: "آپ کیا چاہتی ہیں مجھ سے؟"

نانی اماں نے اپنی آنکھیں پونچھیں، ممی کی طرف دیکھا اور بھیگی بھیگی آواز میں بولیں: "بتاؤ اس مشکل سے کیوں کر گزرا جائے؟"

"میری رائے کو اہمیت دیے جانے کا امکان ہوتا تو میں کہتی انکار کر دیجیے۔"

"میں تم سے یہ نہیں پوچھ رہی ہوں کہ مجھے اس رشتے کو منظور کر لینا چاہیے یا مسترد۔ میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ کیوں کر ہم برادری اور گاؤں والوں کو باتیں بنانے کا موقع دیے بغیر رانو کی اس سے شادی کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے جب اس کے عزیز رشتے دار شادی میں شریک نہیں ہوں گے تو ہمارے لوگ تو باتیں بنائیں گے ہی۔"

"بالکل بنائیں گے۔"

"کوئی ایسا طریقہ ہو کہ لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع نہ ملے۔"

"اس سے کہیں کرائے کے باراتی لے آئے۔" ممی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"عائشہ مت بھولو کہ رانو تمھاری بہن ہے۔" نانی اماں کا انداز تنبیہی تھا۔

"جو کسی مرد کی غلامی کا طوق پہنے بغیر زیادہ بہتر زندگی گزار سکتی ہے۔"

"میں اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتی۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا کوئی ایسا طریقہ تمھاری سمجھ میں آتا ہے کہ رانو کی اس سے شادی بھی ہو جائے اور برادری والوں کو چہ میگوئیوں کا موقع بھی نہ ملے؟"

"نہیں، میری سمجھ میں تو ایسا کوئی طریقہ نہیں آتا۔"

"ویسے ایک تجویز تو اس نے خود ہی پیش کی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"نکاح گواہوں کی موجودگی میں سادگی اور خاموشی سے پڑھا دیا جائے۔ رخصتی بعد میں کی جائے۔"

"اس سے کوئی فرق پڑے گا؟"

"ہاں، اس کا خیال ہے نکاح کے بعد اس کے خاندان

والے اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈال سکیں گے۔"

"کس قسم کا دباؤ؟"

"اس کا مطلب ہے نکاح کے بعد خاندان والے اس کی پھوپی زاد سے شادی پر مجبور نہ کر سکیں گے۔"

"آپ کو اس لڑکے سے ذرا ہمدردی نہیں ہے؟" ممی کا لہجہ تلخ تھا۔

ممی کے اس سوال پر نانی اماں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا پھر سر جھکا کر بولیں: "انسان صرف اپنی غرض کا بندہ ہے عالیہ! اور مجھے اس سے مطلب نہیں۔"

"گویا فیصلہ آپ کر چکی ہیں اور وہ بھی؟"

"ہاں میں سب اور اب میں اس کام میں تاخیر نہیں کرنا چاہتی۔"

"اور وہ؟"

"وہ تو چاہتا ہے کل کا کام آج ہو جائے۔"

ممی کے چہرے پر سوچ و فکر کی لہریں ابھریں۔

"اور سب کچھ تمہیں ہی کرنا ہے۔ میں تو زندہ لاش ہوں کچھ نہیں کر سکتی۔" نانی اماں نے بے بسی سے کہا۔

ممی کے چہرے پر چھائی گمبھیرتا لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ دیر کو سکوت سا چھایا رہا پھر ممی کی آواز نے خاموشی کا سینہ چیرا۔

"یہ سب کب کہا ہے اس نے؟"

"فون نمبر دے گیا ہے کہہ رہا تھا جب آپ فون کریں گی حاضر ہو جاؤں گا۔"

"نمبر گھر کا دے گیا ہے؟"

"گھر اور شوروم دونوں ہی کا دے گیا ہے کہہ رہا تھا اگر میں موجود نہ ہوں اور کوئی دوسرا بات کرے تو آپ بس اتنا کہہ دیں یہ حویلی سے فون تھا کسی کاشی کی خریداری کے سلسلے میں بیگم صاحبہ بات کرنا چاہتی ہیں نام وغیرہ نہ بتائیں میں سمجھ جاؤں گا کہ آپ نے یاد کیا ہے۔"

ممی نے سوچتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ ایک گہری سانس لی اور بولیں: "ٹھیک ہے آپ مجھے نمبر دے دیجیے اس کا۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے تمہاری ماتا ٹھنڈی رکھے اور تمہیں عالیہ کی بہاریں دکھائے۔" نانی اماں نے خاصے جذباتی لہجے میں ممی کو دعائیں دیں۔

آٹھ دس روز بعد غالباً وہ منگل کا دن تھا جب محمود ظفر [illegible] میں حویلی آئے۔ وہ بہت خوش نظر آتے تھے اور کاکا بھی تھیں مگر چلی ہوئی جون میں نظر آتی تھیں۔ نانی اماں کے چہرے پر سکون طمانیت کا احساس تھا۔ ممی، نانی اماں اور محمود ظفر کی گول کمرے میں طویل نشست رہی۔ کاکا کچھ مضطرب اور کچھ مشتاق سی ادھر سے ادھر گھومتی پھرتی رہیں اور میں حسب عادت ان کے ساتھ ساتھ رہی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کاکا سے پوچھوں۔ کیا آپ حویلی سے چلی جائیں گی؟ کیا آپ حویلی سے دور جا کے خوش رہ سکیں گی؟ کیا آپ مجھے یاد کیا کریں گی؟ کیا آپ کو ذرا خیال نہیں کہ آپ کے جانے کے بعد میں کتنی تنہا ہو جاؤں گی؟

مگر یہ سارے سوال میری نوک زبان پر نہ آ سکے۔

کاکا کے چہرے پر مسرتوں کا اجالا بکھرا دیکھ کر مجھے عجب سا محسوس ہو رہا تھا۔

ممی کی بدلی ہوئی سوچ پر مجھے انتہائی حیرانی ہو رہی تھی۔

میں سوچ رہی تھی ممی تو کہا کرتی تھیں کہ مرد بہت برے ہوتے ہیں ان کا کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ ممی تو کاکا کی شادی کی مخالفت کیا کرتی تھیں اور اس مسئلے پر نانی اماں اور ممی میں اکثر معمولی سی رنجش ہو جایا کرتی تھی۔ پھر آخر اب ممی کو کیا ہو گیا تھا؟

مجھے ممی پر غصہ آ رہا تھا۔ میں تو بے چون و چرا ان کی اس بات کو اپنے دل میں جگہ دے چکی تھی کہ مرد بہت خراب ہوتے ہیں۔ پاپا نے مرد ہونے کے ناتے ہی تو ہمیں دھوکا دیا تھا... اور... ممی گول کمرے میں بڑے آرام سے بیٹھی مسکرا مسکرا کر ہنس ہنس کر محمود ظفر سے باتیں کر رہی تھیں... ہاں میں نے پردے کے پیچھے سے جھانک کر دیکھا تھا اور الجھ کے رہ گئی تھی۔ آخر محمود ظفر بھی تو مرد تھے۔

اس روز کاکا نے محمود ظفر سے برائے نام بات کی۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو کھانے کی میز پر بھی وہ محجوب سی بیٹھی رہیں۔ محمود ظفر بھی کھانے پر موجود تھے اور بار بار دزدیدہ نگاہوں سے کاکا کو دیکھنے لگتے تھے۔ ممی نے ان کے ساتھ ہی کھانا کھایا اور خاصے خوشگوار لہجے میں محمود ظفر سے بات کرتی رہیں۔ پاپا کے بعد وہ پہلی مرتبہ اتنی خوش نظر آئی تھیں۔

کھانے کے بعد کاکا اپنے کمرے میں آ گئیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھی مگر میرا دل بہت اداس تھا۔ مجھے کاکا کی شادی کے خیال ہی سے کوفت ہو رہی تھی کیونکہ میں جانتی تھی کہ کاکا کی شادی کے بعد میں تنہا رہ جاؤں گی اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ مرد بہت برے ہوتے ہیں۔ اس روز کاکا کے بعد دیر تک [illegible] سی رہیں۔ جب ممی کاکا کے کمرے میں آئیں تو اس وقت کاکا بستر پر لیٹی انتہائی محویت سے ایک رومانی گیت سن رہی تھیں جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ

اے میرے محبوب! میرے اطمینان کے لیے بس
اتنی بات کافی ہے کہ میں تجھ سے محبت کرتی ہوں۔

محبت، جو قطبی ستارے کی مانند ہمیشہ اپنی جگہ
پہ قائم رہتا ہے اور لوگوں کو بھٹکنے نہیں دیتا۔ تیری
محبت کی روشنی کے سہارے میں ہر تاریکی کا سینہ
چیر سکتی ہوں۔۔۔ دیکھ میں نے تجھ تک پہنچنے کی راہ
نکال ہی لی ہے اور لمحہ بہ لمحہ میں تیری طرف بڑھ رہی
ہوں اور یہ یقین میرے دل کو اک گونہ سرور بخشتا ہے کہ
تو میرا منتظر ہے۔

جب محی کمرے میں داخل ہوئی، تو خانہ بدوش گلوکارہ گیت کے
آخری بول دہرا رہی تھی۔ کاکا آنکھیں موندے ٹیپ ریکارڈر آف
کرنے پر بھی لیٹے رہے۔ محی کی آمد کا احساس ہوا تو بے ساختہ چونکتے
ہوئے جب انھوں نے محی کی جانب دیکھا تو محی نے ان سے کہا۔
"کاکا! ذرا اپنی قمیص کا ناپ، شلوار کی لمبائی اور جوتے کا نمبر
تو ایک کاغذ پر لکھ دو۔"
"کیوں؟" کاکا جانتے بوجھتے انجان بن گئیں۔
"جمعے کی شام محمود ظفر گواہوں کے ساتھ آ رہے ہیں۔ نانا امی
اسی انداز کے ساتھ تم نکاح کا جوڑا اور زیور وغیرہ دے کر آ گئے۔
ان کے جوتے اور جوتوں کے پیسے امی نے انھیں دے دیے ہیں،
اپنی مرضی سے خرید لیں گے۔ مار واری کی شلوار ہوتی تو ہم خود سلوا لیتے۔
خیر کوئی بات نہیں، رخصتی کے وقت ساری کسر پوری کر دیں گے۔"
کاکا انھیں رائٹنگ ٹیبل تک چھوڑ آئیں۔ محی کو جو کچھ مطلوب
تھا ایک کاغذ پر لکھا اور محی کے حوالے کر دیا۔ اس سے کاکا کی
پلکیں حیا بار تھیں اور محی کاکا کی دبی دبی سی خوشی دیکھ کر ایک
عجیب سی ناخوشی کا احساس کر رہی تھی۔ محی نے گہری اور معنی خیز نگاہوں
سے کاکا کو دیکھا اور کمرے سے نکل گئیں۔ کاکا اپنے زیر لب
کو بڑی نزاکت سے دانتوں کی بالائی قطار میں موجود نکیلے دانت
تلے دبائے گاؤ تکیوں کے سہارے مسہری پر نیم دراز ہو گئیں۔
کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کار اسٹارٹ ہونے کی آواز کاکا کے
کمرے کی کھلی کھڑکیوں اور ادھ کھلے دروازے سے ان کی سماعت
تک پہنچی۔ کاکا جست لگا کر بستر سے اتریں اور اسی قدر دیوانہ وار
کیفیت میں ننگے پاؤں، باہر دوڑیں۔ کریپ اسکارف کا بل کھاتی ہوئی اور جب
ان کے پیچھے پیچھے باہر نکلی تو میں نے دیکھا کاکا دریچے میں کھڑی جاتے
دیکھ رہی تھیں اور محمود ظفر اسٹیئرنگ سنبھالے دریچے کی سمت دیکھ رہے
تھے۔ گاڑی موڑتے ہوئے محمود ظفر نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا
اور کاکا کا ہاتھ بھی در جواب آں غزل کی تفسیر بن گیا۔ حویلی کے صدر دروازے
سے گاڑی نکالتے ہوئے محمود ظفر نے اپنا چہرہ گاڑی کی کھڑکی سے
نکال کر لمحہ بھر کو کاکا کی سمت دیکھا اور مسکرا دیے۔ ان کی گاڑی کے
نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے بعد جب کاکا پلٹیں تو ان کے لبوں
پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ہیرے کی سی چمک۔
وہ محبت، عشق اور سرور نظر آتی تھیں۔

جمعرات تک حویلی پر معمول کا سناٹا چھایا رہا۔ جمعہ کی صبح نانی
اماں نے ماسی بشیراں کو ہدایت دی کر نکاح کے فوراً بعد کاکا کے ہاتھوں
میں مہندی لگا دے۔ اللہ وسایا کو انھوں نے اپنے چچا زاد بھائی چوہدری
نیاز محمد اور برادری کے دو تین سربراہ وہ گھرانوں میں اس سندیسے
کے ساتھ بھیجا کہ شام کو وہ کاکا کی رسم نکاح میں شریک ہوں۔ برادری
کے چند بڑے اور با اثر لوگوں کو اکٹھا کرنا نانی اماں کی مجبوری بھی
تھی اور اس تقریب کی ضرورت بھی۔ برادری والوں کی زبانیں بند رکھنے
کے لیے برادری کے سربرآوردہ چیدہ چیدہ معززین کا تقریب میں شامل کیا
جانا ضروری تھا اور پھر آخر کو نکاح کے وقت دلہن کی جانب سے
کسی کو وکیل اور گواہ بھی تو مقرر کیا جانا تھا۔
اچانک اور وقت کے وقت ملنے والے اس سندیسے نے
مدعوئین کو متعجب ضرور کیا مگر چوہدری نیاز محمد کے سوا اور سب نے
تقریب میں شرکت کا وعدہ کیا۔ چوہدری نیاز محمد کے اس تقریب میں
شمولیت سے انکار کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ کاکا
کے لیے پہلے خود ان کا اور پھر ان کے بھائی شاہ محمد کا رشتہ مسترد کر
دیا گیا تھا۔ دوپہر ڈھلنے سے پہلے پہلے اللہ وسایا ان سب کو سندیسہ
پہنچا کر حویلی لوٹ آیا۔
شام تک ماسی بشیراں اور اللہ وسایا نے ڈھیروں کام
نمٹا لیے۔ اللہ وسایا کا ایک پاؤں حویلی میں تھا دوسرا حویلی کے باہر،
محفل خواں کا بندوبست، مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے مناسب
انتظامات، ہار پھولوں کا اہتمام اور اسی نوعیت کے متعدد کام تھے
جو اللہ وسایا انجام دیتا پھر رہا تھا۔ اندر حویلی میں ماسی بشیراں تن تنہا
سے کام میں جتی ہوئی تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ جس تن دہی اور
خلوص سے دونوں میاں بیوی کام کیا کرتے تھے، اس کے باعث
ان دونوں کو حویلی میں افراد خانہ کی سی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔
نانی اماں کے سمجھانے بجھانے سے دونوں نے محی کی تلخ کلامی کا
برا منانا کبھی کا چھوڑ دیا تھا اور پچھلے چند دنوں کے دوران محی کے
رویے میں جو خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی تھی، اس سے وہ دونوں
میاں بیوی بھی محی سے بہت خوش تھے۔
بالآخر شام آ گئی اور یکے بعد دیگرے وہ مہمان حویلی
پہنچنا شروع ہوئے جنھیں نانی اماں نے اس تقریب میں مدعو کیا
تھا۔ اللہ وسایا قاضی جی کو بھی گاڑی میں بٹھا کر حویلی لے آیا تھا۔ مہمان
جن کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی، اس اہم تقریب کے اس قدر
اچانک انعقاد پر خاصے معنی خیز انداز میں نانی اماں اور محی سے

استفسار کر رہے تھے نانی اماں سب کو ایک ہی جواب دے رہی تھیں۔

"رشتہ بہت اچھا تھا لڑکے کی خواہش پر اب تک نکاح کرنا پڑ گیا ہے رخصتی بعد میں دھوم دھام سے ہوگی۔"

ڈھنڈورا کا بج گیا، وقت آ گیا۔ کاکا کے ہاتھوں میں مہندی رچائے نانی دھانی سبز جوڑے میں ملبوس سر پا جوڑے کی منتظر بیٹھی تھیں۔ ان کی نرم و ملائم سیاہ ریشمی زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا ظاہر ہے نکاح کا جوڑا زیب تن کرنے کے بعد ہی انہیں بننا سنورنا تھا۔ اس سادہ سے روپ میں بھی کاکا کچھ کم حسین نہ لگ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں انتظار کی کیفیت تھی بار بار وہ مجھے باہر کی خبر لانے کے لیے اپنے کمرے سے باہر مہمانوں میں بھیج دیتیں۔ سات بجے پہنچنا تھا۔ قاضی جی کچھ پریشان اور معاذ بیزار نظر آنے لگے۔

اللہ وسایا بار بار حویلی کے صدر دروازے تک جاتا اور مایوس سا پلٹ آتا۔

ماسی نذیراں منتظر تھی کہ کب دولہا اور اس کے ہمراہ آپ پہنچیں، نکاح ہو اور وہ مہمانوں کی خاطر مدارات سے فراغت پائے۔

محی ادھر سے ادھر ٹہلتی پھر رہی تھیں۔ کبھی وہ کاکا کے کمرے کا رخ کرتیں کبھی ہال میں مہمانوں کے ساتھ جا بیٹھتیں۔ سب اپنی برادری کے لوگ تھے اس لیے پردے کا کوئی مسئلہ نہ تھا کبھی محی نانی اماں کی وہیل چیئر کے قریب جا کر ان سے سرگوشیاں کرنے لگتیں۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا نانی اماں کی پریشانی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا پروگرام کے مطابق نکاح عصر اور مغرب کے درمیان پڑھایا جانا تھا اور اس وقت عشاء کی اذان ہوئے بھی گھنٹہ بیت چکا تھا۔

میرا ایک پاؤں کاکا کے کمرے میں تھا دوسرا مہمانوں والے حصے میں۔ انتہائی مستعدی سے میں باہر کی خبریں کاکا کو پہنچانے کا فریضہ سر انجام دے رہی تھی۔

معاذ بار بار پوچھ رہے تھے "کیا بات ہے دولہا والے نہیں آئے؟"

"ان لوگوں کو لاہور سے آنا ہے ہو سکتا ہے وہیں سے دیر سے نکلے ہوں۔ شادی بیاہ کے معاملوں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔" نانی اماں وقفے وقفے سے یہی جواب دہرا رہی تھیں۔

رات دس بجے کے لگ بھگ جب میں کاکا کے کمرے میں بیٹھی ان لوگوں کے اس وقت تک نہ پہنچ سکنے پر تشویش کا اظہار کر رہی تھی کہ کاکا کے کمرے کے نیم وا دروازے پر دستک ہوئی۔

"ہاں کون ہے؟" محی نے پوچھا۔

"میں ہوں جی بی بی صیب۔" اللہ وسائے کی آواز سنائی دی۔

"کیا آ گئے وہ لوگ؟" محی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں جی۔" اللہ وسائے کا جواب آیا۔

"ہاں پھر کیا بات ہے... اندر آ جاؤ۔" محی نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

اللہ وسایا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "بی بی صیب! شہر سے ایک بندہ آیا ہے کوئی پیغام لے کے۔"

"کیسا پیغام، کس کا پیغام؟" محی نے چونک کر پوچھا۔

"پتا نہیں جی۔"

"تم نے پوچھا تو ہوتا۔"

"پوچھا تھا جی۔"

"پھر؟"

"وہ کہتا ہے جی گھر کے کسی بڑے سے ملنا ہے۔"

"کس سے؟"

"میرا خیال ہے جی مالکن سے یا پھر آپ سے۔"

"تم نے اسے بٹھایا ہے اندر؟"

"نہیں جی وہ کہتا ہے میں نے بیٹھنا نہیں ہے پیغام دے کر فوری واپس جانا ہے باہر ہی کھڑا ہے۔"

"خدا جانے کون ہے۔" محی سر جھٹکتے ہوئے بولیں۔

"آپا... ہو سکتا ہے... محمود کی طرف سے آیا ہو۔" کاکا نے دھیرے سے کہا۔

"وہ پیغام کیوں بھیجنے لگا اس نے تو خود یہاں پہنچنا ہے۔ خیر دیکھتی ہوں جا کر۔" یہ کہتے ہوئے محی نے دروازے کی جانب پیش قدمی کی اور ان کے پیچھے پیچھے اللہ وسایا بھی سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"معالی! جاؤ! دیکھو تو ذرا جا کے کون آیا ہے اور کیا پیغام لایا ہے۔" کاکا نے مجھ سے کہا۔

ہال کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا ابا جی بیزار بیزار سے بیٹھے تھے اور نانی اماں کے چہرے سے اضطراب عیاں تھا۔ محی اور اللہ وسایا کا پتا نہ تھا غالباً محی اللہ وسائے کے ساتھ حویلی کے صدر دروازے کی طرف چلی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد میرے اس اندازے نے خود کو درست ثابت کر دیا جب میں برآمدے کی طرف نکلی تو میں نے محی کو صدر دروازے کی جانب سے برآمدے کی طرف آتے دیکھا جب وہ برآمدے میں آئیں تو مجھے وہاں کھڑے دیکھ کر بولیں۔ "تم برآمدے میں کیوں نکل آئی ہو۔ کاکا کے پاس بیٹھے رہنا تھا یا پھر ہال میں چلی جاتیں مہمانوں

کے پاس؟"

"وہ... جی... کاکا نے باہر جھانکا جیسے دیکھنے کے لیے کہ کون آیا ہے۔"

ممی کچھ نہیں بولیں، اپنا بایاں ہاتھ جارجٹ کے دوپٹے میں لپیٹے، وہ تیزی سے کاکا کے کمرے کی طرف چل گئیں، میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلی۔ کاکا کی نظریں دروازے کی سمت ہی لگی تھیں، جونہی ممی ان کے کمرے میں داخل ہوئیں کاکا نے بے تابانہ پوچھا۔ "کون تھا آپا؟"

"پتا نہیں کون تھا... یہ لفافہ مجھے دے کر چلا گیا۔" ممی نے اپنا ہاتھ دوپٹے سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ان کے ہاتھ میں آسمانی رنگ کا ایک لفافہ تھا۔

ممی نے کاکا کی مسہری کے کنارے پر بیٹھ کر لفافہ چاک کیا اور اس میں موجود ہم رنگ رقعہ نکال کر تیزی سے اپنی نگاہیں اس رقعے پر دوڑانے لگیں۔ جوں جوں وہ پڑھتی گئیں ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا گیا اور وہ خاصی پریشان نظر آنے لگیں۔ کاکا ٹکٹکی باندھے سوالیہ نگاہوں سے ممی کی طرف دیکھ رہی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ ممی کے چہرے پر بکھری پریشانی کا عکس کاکا کے چہرے پر اپنی چھاپ گہری کرتا جا رہا تھا۔ میں حیران و پریشان کبھی ممی کو کبھی کاکا کو دیکھ رہی تھی۔

رقعہ پڑھ چکنے کے بعد ممی نے اسے تہ کیا اور لفافے میں رکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولیں۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ کتے کا اعتبار کر لینا مرد کا اعتبار نہ کرنا۔"

کاکا نے سراسیمہ نگاہوں سے ممی کی جانب دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں عجیب بے بسی تھی۔ ان کے چہرے کا مجموعی تاثر گواہ تھا کہ وہ اس رقعے کے مندرجات سے آگہی اور ممی کے لہجے کی گمبھیرتا کی توضیح چاہتی تھیں۔ ممی نے کاکا کو دیکھا پھر بوجھل آواز میں بولیں۔ "میں جانتی ہوں تمہیں دکھ ہو گا... مجھے بھی ہوا تھا جب نادر نے میرے ساتھ فریب کا کھیل کھیلا تھا۔"

کاکا نے گردن موڑ کر ممی کی طرف دیکھا اس لمحے ان کی نگاہوں میں خوف، بے بسی اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے کوئی مجرم عدالت سے سزا سننے کا منتظر ہو۔

"جانتی ہو یہ خط کہاں سے آیا ہے اور اس میں کیا لکھا ہے؟" ممی نے کہا۔

"ک... کہاں... سے؟"

"یہ خط محمود کی سسرال سے آیا ہے۔"

کاکا بے اختیار چونکیں۔

"محمود نے ہم سے جھوٹ بولا تھا... وہ نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ ایک بیٹے کا باپ بھی ہے۔ اس کی شادی اپنی پھوپھی زاد سے ہوئی ہے اور اس کی بہن اس کی بیوی کے سگے بھائی سے بیاہی ہوئی ہے۔ یہ خط محمود کے چھوٹے سالے نے لکھا ہے۔ محمود کی سسرال والوں کو کسی نے خبر پہنچا دی تھی کہ فلاں دن فلاں وقت اور فلاں جگہ محمود دوسری شادی کرنے جا رہا ہے۔ آج صبح محمود کی والدہ اس کی بیوی جسے وہ باقاعدہ منصوبے کے تحت اپنی بہن کے پاس ملتان چھوڑ آیا تھا اور چند سسرالی عزیز ملتان سے لاہور پہنچ گئے اور انھوں نے اس کی دوسری شادی کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ خط لکھنے والے نے لکھا ہے کہ فی الحال تو ہم نے محمود کے گرد گھیرا اتنا تنگ کر رکھا ہے کہ وہ نکل ہی نہیں سکتا لیکن اسے وقتی دباؤ نہ سمجھا جائے۔ محمود کو تو ہم نے جتا دیا ہے کہ اگر اس نے ہماری بہن کے ہوتے اس پر سوکن لانے کی کوشش کی تو اس کی بہن کو جو ہمارے ہی ایک بھائی کی بیوی ہے طلاق دے دی جائے گی اور پھر ہم چاروں بھائی نہ محمود کو زندہ چھوڑیں گے نہ اس کی دوسری بیوی کو... لکھنے والے نے یہ خط سربراہِ خانہ کے نام لکھا ہے اور خبردار کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر اس کے بہنوئی محمود کو اس گھر میں قبول کرنے کی کوشش کی گئی تو انجام بہت برا ہو گا۔ خط لکھنے والے نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر اس لڑکی نے جس سے محمود شادی کرنے آ رہا تھا کبھی بھولے سے بھی محمود سے ملنے کی کوشش کی تو وہ خود بھی نقصان اٹھائے گی اور محمود کو بھی سزا بھگتنا ہو گی۔"

ممی نے یہ ساری تفصیل بتانے کے بعد لفافہ کاکا کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو پڑھ لو تم۔"

کاکا نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ تھام لیا اور اپنے ہونٹوں کو پوری شدت سے باہم بھینچتے ہوئے انھوں نے لفافے سے رقعہ نکالا اس کی تہ کھولی اور پڑھنے لگیں۔ میں چپ چاپ بیٹھی کاکا کے کپکپاتے ہاتھوں کی لرزش سے مذکورہ رقعے پر منتقل ہونے کا منظر دیکھتی رہی۔ جب کاکا پورا خط پڑھ چکیں تو انھوں نے اسے تہ کر کے خاموشی سے ممی کی جانب بڑھا دیا۔ کاکا کی ناک کی پھننگ سرخ ہو چکی تھی تاہم پیوستہ لب اب کھل چکے تھے اور خزاں رسیدہ پتے کی مانند کپکپا رہے تھے۔ آنسو کاکا کی آنکھوں میں زندہ مچھلیوں کی صورت تڑپ رہے تھے۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو چکا تھا۔

ممی نے خط ان سے لے کر لفافے میں رکھا اور کاکا کا شانہ تھپتھپاتی لفافہ لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کاکا نے کچھ پوچھنے کا ارادہ کیا مگر ان کے لب کپکپا کے رہ گئے۔ اپنا چہرہ انھوں نے اپنے گھٹنوں

کے بیچ چھپا لیا اور گھٹ گھٹ کے رونے لگیں۔

"صبر کریں۔" تحی نے پھر اپنا ہاتھ کاکا کے شانے پر دھر دیا۔

یک بیک سارے بند ٹوٹ گئے۔ کاکا جو پہلے گھٹ گھٹ کے رو رہی تھیں اب کھل کر تڑپ تڑپ کے رونے لگیں۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا مرد بڑے فریبی ہوتے ہیں.... سب کے سب ایک جیسے.... خود غرض، مطلب پرست، دغاباز اور جھوٹے.... پہلے یہ عورت کے دل کو اپنی جھوٹی محبت سے بہلاتے ہیں پھر اسے اپنے فریب کا نشانہ بنا کر تنہا اور بے دست و پا چھوڑ دیتے ہیں۔"

کاکا مضطربانہ اپنے ہاتھ باہم ملنے لگیں۔

"اچھا میں چلوں، مہمانوں کو تو کسی طرح نمٹاؤں۔"

کاکا نے تڑپ کر بھیگی بھیگی سرخ آنکھوں سے تحی کی جانب دیکھا اور گھٹی گھٹی آواز میں بولیں: "کیا.... کہیں گی آپ ان سب سے؟"

"فی الحال تو یہ کہے دیتی ہوں کہ فون کیا تھا، وہاں پتا چلا کہ وہیں سے وہ لوگ بہت دیر سے نکلے ہیں، ظاہر ہے یہاں بھی دیر ہی سے پہنچیں گے۔"

"کب تک.... کب تک انتظار کریں گے وہ سب؟"

"کھانا کھلوا رہی ہوں اور سب سے کہہ دیتی ہوں کہ نکاح کل تک کے لیے ملتوی۔"

"پھر کل.... کل کیا ہوگا؟"

"کوئی بھی بہانہ کر دیں گے مثلاً یہ کہ لڑکے کی ماں فوت ہو گئی ہیں یا یہ کہ یہاں آتے ہوئے دولہا کی کار کو حادثہ پیش آگیا یا پھر یہ کہ لڑکے کے بارے میں ابھی اطلاع ملی ہے کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے اس لیے ہم نے ان لوگوں سے انکار کر دیا.... یا کچھ بھی نہیں کہیں گے، لوگ آپ ہی سمجھ جائیں گے کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

کاکا نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ ان کا چہرہ عمر قید پانے والے کسی بے گناہ مجرم کی طرح شکستہ ہوا نظر آتا تھا۔

پھر تحی نے لفافہ مروڑ کر مٹھی میں دبا لیا اور کمرے سے چلی گئیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے لپکی تاکہ دیکھ سکوں کہ تحی مہمانوں کو کس طرح نمٹاتی ہیں۔

"بابی صاحب جی! میں بوڑھا آدمی ہوں، میری تو کمر اکڑ گئی ہے بیٹھے بیٹھے تو آپ اب اجازت دیں جی.... لاہور سے آنے والے مہمان تک ٹھہرو گے ضرور.... میں سویرے ہی آ کے نکاح پڑھا دوں گا۔" قاضی جی نے کھڑے کھڑے ہی کہا۔

"اچھا! ایک منٹ قاضی صاحب!" تحی نے لجاجت سے کہا پھر وہ نانی اماں کی طرف بڑھ آئیں جو سب سے الگ مسلسل وہیل چیئر پر بیٹھی تھیں۔ تحی نے نانی اماں سے سرگوشی میں کچھ کہا اور ان کی ان ہی میں نانی اماں کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ تحی نانی اماں کی وہیل چیئر دھکیل کر کچھ دیر سرگوشیاں کرتی رہیں پھر مہمانوں کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

"عائشہ بی بی! کوئی خاص بات ہے کیا؟" برادری کی ایک بزرگ خاتون نے پوچھا۔

"ہاں جی میں امی سے کہہ رہی تھی کہ فی الحال تو کھانا کھلوا دیں۔ وہ لوگ تو خدا معلوم کب پہنچیں، آپ لوگ آخر کب تک انتظار کریں گے۔ نکاح ہی تو ہونا ہے کل ہو جائے گا۔"

"جیو بندی! رہو بیٹا! بڑی عقل مندی کی بات کہی ہے تم نے۔" بڑی بی بولیں۔

"کیوں امی جی! اجازت ہے نا کھلوا دوں کھانا؟" تحی نے پلٹ کر نانی اماں کی جانب دیکھا۔ نانی اماں آنکھیں موندے وہیل چیئر کی پشت سے سر ٹکائے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر بائیں جانب دھرے بیٹھی تھیں۔

"کیا ہوا انھیں؟" کسی نے پوچھا۔

تحی آگے بڑھیں اور انھوں نے اماں پر جھکتے ہوئے انھیں پکارا۔ نانی اماں نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں۔

"امی آپ تھک گئی ہیں۔ میرا خیال ہے پہلے آپ کو آپ کے کمرے تک پہنچا دوں۔ اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"ظاہر بات ہے تھک ہی گئی ہوں گی.... ہم جیسے چنگے لوگ بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہیں بلکہ بیزار ہو گئے ہیں یہ بیچاری تو...." نانی اماں کے دور پار کے رشتے کے ایک بھائی نے نانی اماں کے حق میں اظہار ہمدردی کیا۔

"بشیراں کھانا نکالنا ہے۔" تحی نے نانی اماں کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے بشیراں کو حکم دیا۔ میں تحی کے پیچھے لپکی۔ نانی اماں کو ان کے کمرے میں پہنچانے اور سکون آور دوا دینے کے بعد تحی نے انھیں بستر پر لٹا دیا اور ان پر جھکتے ہوئے بولیں: "امی جی! ذرا مہمانوں کو کھانا کھلا کے رخصت کر آؤں۔"

جب میں تحی کے ساتھ نانی اماں کے کمرے سے باہر نکلی تو بشیراں اور ماما اللہ دیا لپک جھپک کر کام کرنے میں مصروف تھے۔ میری کلائی پر بندھی گھڑی میں چھوٹی سوئی گیارہ کے ہندسے سے آگے بڑھ چکی تھی۔ مہمانوں نے کھانا کھایا اور خاصی معنی خیز مسکراہٹوں اور تبصروں کے ساتھ واپس ہوئے۔ میں کاکا کے کمرے

ممّا جاتی ہی رہی۔ کاکا کی حالت دیکھ کر میں نفسیاتی طور پر بدحواس ہو رہی تھی۔ کسی بیوہ کی طرح اُجاڑ، سوگوار اور بے بس نظر آتیں۔ دُلہن کاکا کا ارمان و تمنا سے عبارت چہرہ دیکھتے ہوئے میں اب بھی کبھی کبھی سوچتی ہوں۔

"کاش! کاکا نے ممّی کی بات سن لی ہوتی... محمود ظفر کا اعتبار نہ کیا ہوتا... وہ کسی کے فریب کی شکار نہ ہوئی ہوتیں... کیا حماقت اُنھیں ایک مرد پر اعتبار کر کے... آنسو، رسوائی، پشیمانی وہ کسے دان کی کل کا تصور بھی مجھے ڈرا رہا تھا۔

کسے دان کی کل کا کاکا کی بارات نہ آنے پر ہزاروں خیال کا دنیا اپنے دامن میں سمیٹے ڈرا رہی تھی۔

"ممّی بالکل ٹھیک کہتی ہیں، مرد کا ہرگز ہرگز اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں سوچا۔

کاکا کا دکھ اور ملال دیکھ کر میرے دل میں مرد ذات کے خلاف نفرت کا ایک بیکراں طوفان امڈ رہا تھا۔

مہمانوں کے جانے کے بعد جب ممّی کاکا کے کمرے میں آئیں اور ان سے پوچھا، "کاکا بیٹی! مشروب یا کچھ کھانا ہے؟" تو کاکا نے مُردہ سی آواز میں جواب دیا: "بھوک نہیں ہے مجھے۔"

"تھوڑا سا کھا لو۔"

"نہیں۔" کاکا پر یہ رقّت طاری ہو گئی۔

"ٹھیک ہے، صبر کرو... جب میں تمھیں مردوں کا اعتبار نہ کرنے کی تلقین کیا کرتی تھی تب تمھارا چہرہ رنگ تو بہت بدلا کرتا تھا اور اتنی بھی خفا ہوا کرتی تھیں۔ مجھ پر بڑھ کر تھیں، اسی لیے سمجھایا کرتی تھی کہ کسی بھی مرد کا اعتبار کرنا خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ اسی لیے میں سمجھاتی تھی تمھیں کہ آزاد اور خود مختار زندگی بسر کرنا بہت خوش اور مطمئن رہو گی... کیا دیتے ہیں یہ مرد عورتوں کو... دکھ، پشیمانی اور رسوائی... برادری کے جو لوگ رسم نکاح میں شرکت کے لیے آئے تھے، طنزیہ مسکراہٹوں کے ساتھ واپس گئے ہیں... مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی نگاہیں میرے وجود کے آر پار ہوتی جا رہی ہوں۔ میں نے اس خیال سے کہ اگر اس وقت جھوٹ سے کام چلا لو تو کل ہم سے کیا کہ سکیں گے۔ ان میں سے کچھ نہیں کہا...... سب مل کر انگلیاں اٹھائیں گے ہم پر اور... نیاز مندوں ... وہ تو ہمیں برادری میں منہ دکھانے کے لائق نہ چھوڑیں گے... باتیں کرنے الگ ملیں گے کہ اور ناتے جوڑنے کی کوشش کرو برادری سے باہر... میرے خدا! کیسی شرمندگی اٹھانا پڑی ہے آج۔ کیا خبر لوگ گاؤں میں گشت کر رہی ہوگی۔"

کاکا گشت گشت کر رہی تھیں اور ان کی بے بسی مجھے اپنے

بیگم شیخ: "تمھارے میاں کو گھڑ دوڑ کے بارے میں ساری معلومات ہیں؟"
بیگم مرزا: "ہاں، ریس سے ایک روز قبل تک وہ پورے یقین سے بتا سکتے ہیں کہ کون سا گھوڑا جیتے گا اور ریس سے اگلے روز پوری تفصیل سے بتا سکتے ہیں کہ وہ کیوں نہ جیت سکا۔"

بے بسی کی گہرائیوں میں بیٹھ کی مانند اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ جب کاکا کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہو گیا تو انھوں نے زکام زدہ سی آواز میں نانی اماں کی بابت پوچھا۔

"ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، انھیں میں نے ان کے کمرے میں پہنچا کے دوا دے کر لٹا دیا تھا۔" ممّی نے بتایا۔

"کیا... آپ نے امّی کو بتا دیا؟"

"ہاں، میں نے انھیں خاموشی سے بتا دیا تھا، انھیں بتانا ضروری تھا۔"

کاکا گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"کہاں؟" ممّی نے پوچھا۔

"امّی کے پاس۔"

"بالکل... اللہ رسا یا جاگ رہی ہیں، ان کو کاکا کہاں خبر نہیں ہونا چاہیے گھر کے بھیدی ہی لنکا ڈھاتے ہیں۔ خدا اپنی حالت درست کر کے باہر نکلو، تمھاری آنکھیں چغلی کھا رہی ہیں کہ کوئی بہت بڑی بلکہ بُری بات ہو گئی ہے۔"

"اب تو انھوں نے ساری عمر چغلی کھانا ہے۔" کاکا نے اتنے دکھ سے یہ بات کہی کہ میرا جی بھر آیا۔

ممّی، کاکا اور میں نانی اماں کے کمرے میں پہنچے تو ایک ایسا صدمہ ہمارا منتظر تھا جس نے ہمیں بے حال کر دیا۔ نانی اماں کا دایاں ہاتھ سینے پر دھرا تھا، گردن ایک جانب کو ڈھلکی ہوئی تھی اور آنکھیں کھلی ہوئی دروازے کی سمت یوں اٹھی تھیں جیسے کسی کی منتظر ہوں۔

اب کاکا کو دنیا کی کوئی طاقت بے خوف ہو کر آنسو بہانے سے نہ روک سکتی تھی۔ کاکا کی بارات نہ آنے اور نانی اماں کی ناگہانی موت پر برادری ہی نہیں گاؤں بھر میں ہزاروں فسانے تراشے گئے تھے۔

ختم

ایک ساتھ دو صدمات نے کاکا کی دنیا ہی بدل ڈالی۔

ہنسنا مسکرانا تو گویا وہ بھول ہی گئیں، بات چیت کرنا بھی انھوں نے بہت کم کر دیا۔ ماں کی ہوش لباس بھی یادِ پارینہ بن گئی۔ کئی کئی دن وہ ایک ہی جوڑا پہنے رہتیں۔ ہار و دیدن بال آراستہ نہ کرتیں، خوشبوؤں اور موسیقی سے انھیں جنون کی حد تک کا شغف بھی اسی آ نہ رہا اب کاکا کا محبوب ترین گرنڈگ ٹیپ ریکارڈر چپکا پڑا رہتا، وہ حسن و جمال کی تصویر بنی چپ چاپ حویلی میں گھومتی پھرتیں یا برآمدے میں ایزی چیئر پر نیم دراز ہو کر آسمانوں کی بیکراں وسعتوں میں نگاہیں دوڑائے جاتیں۔ یا پھر ایزی چیئر کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں موندے کسی گہری سوچ میں غرق رہتیں۔ کبھی وہ برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خاموشی سے ٹہلنے جاتیں۔ ایک دو نہیں وہ، بیسیوں چکر لگاتیں پھر تھک کر ہارے ہوئے جواری کی صورت ایزی چیئر پر ڈھے جاتیں یا برآمدے کے کسی ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاتیں یا پھر دریچے میں جا کھڑی ہوتیں اور اداسی سے جانے کب تک گھورتے رہتیں۔ ان کی شخصیت میں جہاں بھر کی بے کسی اور ویرانی پیدا ہو آئی تھی۔ اکثر بے اختیار ان کے لبوں سے ٹھنڈی سانسیں اور گھٹی گھٹی سی آہیں شرارے بجلی کی طرح نکل جاتیں۔

مجھے کاکا کی یہ حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوتا اور محمود ظفر پر انتہائی غصہ آتا۔ ایک محمود ظفر ہی کیا، مجھے دنیا بھر کے مردوں پر سخت غصہ آتا۔ میں مردوں کے خلاف ایک آگ سی اپنے سینے میں بھری پاتی۔ پہلے میرے پاپا نے میری ممی کو حزن و ملال کی تصویر بنا دیا تھا اور اب ایک دوسرے مرد نے میری کاکا کو صورت بہ دیوار چپ اور بے بس کر دیا تھا۔ کیا حق پہنچتا تھا ان مردوں کو میری ممی اور کاکا سے زندگی کی خوشیاں چھین لینے کا؟ میرا دل مردوں کے خلاف ایک مضبوط قلعہ بنتا جا رہا تھا۔ ایک ایسا قلعہ جسے ممی بڑی محنت سے مردوں کے خلاف نفرت کی دیوار کھڑی کر رہی تھیں۔

"دیکھا تم نے کس قدر ظالم اور فریبی ہوتے ہیں مرد؟ تمھارے پاپا نے مجھ سے خوشیاں چھینیں اور محمود ظفر نے تمھاری کاکا کو حزن و ملال بنا کے چھوڑ دیا۔۔۔ بہت ہی کمینے اور ذلیل ہوتے ہیں یہ مرد۔۔۔ ان کا کبھی اعتبار نہ کرنا۔ تمھاری کاکا نے میری بات مانی ہوتی تو آج دکھی نہ ہوتیں۔۔۔ عالیہ! اپنی ممی اور کاکا کا بدلہ لینے کے لیے تم تو مردوں سے اتنی نفرت کرنا، انھیں قریب نہ پھٹکنے دینا۔ انھیں حقیر سمجھ کر ٹھوکر لگانا۔۔۔ دیکھو میں تمھیں یہ سب کچھ اس لیے سمجھاتی ہوں تاکہ تم ابھی سے نفرت کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تمھیں مردوں سے نفرت کرنا ہے۔۔۔ اپنی ماں اور اپنی کاکا کا بدلہ لینے کے لیے۔"

میں اس سپاہی کی طرح جسے دشمن سے انتقام لینے کا درس دیا جا رہا ہو، بڑی بے تابی سے عہد کرتی: "ہاں میں مردوں سے شدید نفرت کروں گی۔"

*

میرے نتیجے کا اعلان امتحانات کے چار ماہ بعد جناح اسکول کے جلسے میں ہوا۔ مجھے درجہ اول میں کامیاب قرار دیا گیا تھا۔ میری اس کامیابی میں کاکا کا بھی حصہ تھا۔ امتحانات سے قبل اور دورانِ امتحانات انھوں نے پڑھائی میں میری بہت مدد کی تھی۔

کالج میں میرے داخلے کا مرحلہ آیا تو ممی نے ایک ایسا فیصلہ کیا جو میری توقع کے قطعاً برخلاف تھا۔ میرا خیال تھا کہ ممی یا تو مجھے گاؤں کے اکلوتے انٹرمیڈیٹ گرلز کالج میں داخل کرائیں گی یا پھر پہلے گھر ہی پر پڑھ کر بیرونی امیدوار کی حیثیت سے امتحان دینا ہو گا مگر میرے اس خیال کے برعکس ممی نے مجھے لاہور کے کسی معروف ادارے میں داخلہ دلوانے کا فیصلہ کیا۔ گو کہ جن دنوں کاکا شہر میں پڑھا کرتی تھیں ان دنوں مجھے بھی شہر جا کر پڑھنے کا بڑا اشتیاق ہوا کرتا تھا مگر اب میں ممی اور کاکا کی قربت کی اس حد تک اسیر ہو چکی تھی کہ انھیں چھوڑ کر ان سے دور شہر میں جانے پر آمادہ نہ تھی۔ سو میں نے ممی سے کہا کہ مجھے گاؤں کے کالج میں داخلہ دلوا دیں۔

"کیوں۔۔۔ کیا تم کاکا کی طرح شہر جا کے نہیں پڑھنا چاہتیں؟" ممی نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"کیوں کہ میں آپ سے اور کاکا سے دور نہیں رہ سکتی۔"

ممی مسکرا دیں اور میری پیشانی چوم کر بولیں: "میں تمھیں مضبوط اور قابلِ مقابلہ بنانے کے لیے شہر بھیجنا چاہتی ہوں۔"

"مضبوط؟" میں نے استفہامیہ نگاہوں سے ممی کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔۔۔" ممی نے کہا اور ذرا دیر بعد مزید بولیں۔ "دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کی کمزوریوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔۔۔ اور دشمن کی کمزوریوں سے واقف ہونے کے لیے اسے بہت نزدیک سے دیکھنا ضروری ہے بلکہ اس کے قریب رہنا ضروری ہے۔۔۔ تم جانتی ہو تمھیں کس کا مقابلہ کرنا ہے۔۔۔ ممی اور کاکا کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا حساب کتاب کس سے برابر کرنا ہے؟"

"ممی! میں آپ سے اور کاکا سے دور نہیں رہ سکتی۔" میں

نے منہ بسور کر کہا۔

"تمھیں وہیں رہنا پڑے گا۔" ممی نے فیصلہ کن انداز میں یوں کہا کہ میں پھر کچھ نہ کہہ سکی۔

میں ممی کے اس لہجے سے بخوبی آگاہ تھی۔ میں جانتی تھی کہ ممی جب اس لہجے میں بات کرتی ہیں تو وہ بات پتھر کی لکیر ثابت ہوتی ہے۔

میری آخری امید کاکا تھیں۔ انھیں میں نے اپنی مشکل سے آگاہ کیا تو وہ کسی ہمدرد و مہربان دوست کی طرح بولیں: "چند دن تمھیں ضرور پریشانی ہوگی۔ دن لمبے لگیں گے۔ گھر اور گھر والے یاد آئیں گے، خود کو بے بس محسوس کرو گی لیکن میری جان! پھر دھیرے دھیرے تم نئے ماحول اور گھر سے دوری کی عادی ہو جاؤ گی۔ شہر میں رہ کر تم زندگی کو زیادہ وسیع تر رنگوں میں دیکھ سکو گی۔ نئے تجربات ہوں گے تمھیں وہاں... بہت کچھ سیکھو گی... بہت کچھ پاؤ گی۔ ہاں مگر ایک بات ہے..." کاکا کہتے کہتے رک گئیں۔

"آپ چپ کیوں ہو گئیں؟"

کاکا نے ایک گہرا سانس لیا پھر شکستہ لہجے میں بولیں: "اپنی ممی اور کاکا کی طرح دھوکا نہ کھانا۔"

میری آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔

"کاکا جی..." میں نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔ "مجھے ممی اور آپ کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا حساب کتاب لینا ہے۔"

کاکا نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولیں: "حساب کتاب؟ کس سے؟"

"مردوں سے۔"

"اوہ! تم اتنی چھوٹی سی تو ہو... اتنی بڑی بڑی اور خوفناک باتیں کیوں سوچتی ہو؟"

"میں چھوٹی نہیں ہوں کاکا جی... سب کچھ سمجھتی ہوں۔ ممی نے مجھے بہت اچھی طرح سمجھا رکھا ہے۔"

"[illegible]!" کاکا نے زیر لب کہا اور ان کے چہرے پر تشویش جھلکنے لگی۔

مجھے لاہور کے کسی بڑے تعلیمی ادارے میں داخلہ دلوانے کے لیے ممی نے لاہور کا سفر اختیار کیا۔ کاکا بھی ہمراہ تھیں۔ تقریباً بیس پچیس روز ہمارا قیام ایک ہوٹل میں رہا۔ کاکا میرے داخلے کے لیے بھاگ دوڑ کرتی رہیں۔ ممی ان کے ساتھ ساتھ رہیں۔ میرا ان دونوں کے ساتھ ہونا امر لازم تھا۔ مجھ پر جب یہ بھید کھلا کہ مجھے کسی مخلوط تعلیمی ادارے میں داخل کروانے کی کوشش کی جا رہی ہے تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

☐ آرٹ اور سائنس جیسے لوگوں پر اثر ڈالتے ہیں، ویسے ہی لوگ آرٹ اور سائنس پر اثر ڈالتے ہیں۔

☐ ایمان داری یہ ہے کہ تم ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ، امانت داری یہ ہے کہ فریقِ ثانی کا ناجائز نقصان نہ کرو۔

☐ جس کو لوگ تعلیم کہتے ہیں وہ ابتدائی مرحلہ ہے۔ اس کا تعلق ذہن سے نہیں، تہذیب سے ہے۔

☐ تعلیم کا مقصد ذہنی گتھیاں سلجھانا ہے، کھانا پینا اصل مقصد نہیں۔

☐ وہ تعلیم بے برکت ہے جو صرف کمانے کے لیے ہو۔

☐ لوگ تبلیغ سے متاثر نہیں ہوتے، اخلاق اور احسان سے متاثر ہوتے ہیں۔

"ممی! میں لڑکوں کے ساتھ نہیں پڑھوں گی۔" میں نے احتجاج کیا۔

"میں نے تمھیں سمجھایا تھا کہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کی کمزوریوں سے واقف ہونا ضروری ہے اور دشمن کی کمزوریوں سے واقف ہونے کے لیے اسے بہت نزدیک سے دیکھنا اس کے نزدیک رہنا ضروری ہے۔" ممی نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" میں منمنائی۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" ممی نے مجھے چمکارا۔

کاکا نے میری مشکل سنی تو مجھے سمجھایا: "لڑکوں کے ساتھ پڑھنے سے خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ تم لڑکوں کے ساتھ پڑھو گی تو زندگی کے میدان میں ان کا مقابلہ کرنے میں جرأت حاصل ہوگی۔ حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگا۔"

"کاکا! آپ بھی تو پڑھتی تھیں نا لڑکوں کے ساتھ؟"

"ہاں..." کاکا نے ٹھنڈی سانس بھری پھر بولیں: "بس ایک بات کا خیال رکھنا اور وہ یہ کہ اپنے سے بڑھ کر کسی کا اعتبار مت کرنا۔"

"کسی مرد کا نا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے کاکا کی جانب دیکھا۔

ان کے لبوں پر حزنیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرا سر تھپتھپاتے ہوئے انھوں نے کہا: "ممی کی باتوں نے تمھیں اپنی اصل عمر سے دس برس آگے پہنچا دیا ہے۔"

"یعنی میں چھبیس برس کی ہوں۔"

"میری جان! نہ جانے کیوں تمہاری طرف سے مجھے کبھی کبھی بڑا ڈر سا لگنے لگتا ہے۔"

"کیا میں بہت خطرناک ہوں؟"

"نہیں تم خود تو بہت پیاری ہو... تمہاری باتیں مجھے ڈرا دیتی ہیں۔" کاکا نے میرا سر پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ممی کی خواہش کے مطابق بالآخر میرا داخلہ ایک مخلوط تعلیمی ادارے میں ہو گیا۔ کاکا نے میری رہائش کا بندوبست لڑکیوں کے ایک ایسے ہاسٹل میں کروا دیا جس میں شہر کے کئی تعلیمی اداروں کی طالبات کو رہائش کی سہولت میسر تھی۔

میرے داخلے اور رہائش کے انتظامات سے فراغت کے بعد کاکا نے اپنے چند کام نپٹائے۔ یونیورسٹی سے انہوں نے بی اے کی ڈگری اور ایم اے کی مارکس شیٹ حاصل کی۔ ایم اے کی ڈگری ملنے میں ابھی دیر تھی۔

ممی اور کاکا کے گاؤں واپس لوٹنے تک میں ہاسٹل کی چار صبحوں اور تین شاموں کا مزہ چکھ چکی تھی۔

■

ممی، کاکا اور اس گھر سے دور رہنا جس کے در و بام سے مجھے گہری انسیت تھی شروع شروع میں مجھے بہت کٹھن لگا۔ ہر صبح آنکھ کھلنے پر یہ احساس کہ ممی اور کاکا مجھ سے بہت دور ہیں میرے دل کو ہجر و فراق کی ایک تکلیف دہ کیفیت سے دوچار کر دیتا۔ میں اپنی روم میٹ سے اپنے آنسوؤں کو چھپاتی بستر سے اٹھتی اور باتھ روم کے دروازے کے پیچھے گھٹ گھٹ کر روتی۔ ممی اور کاکا مجھے بہت یاد آتی تھیں۔ ناشتے کے بعد کالج کے لیے تیاری کرتے ہوئے بھی میرا دھیان ممی اور کاکا کی جانب لگا رہتا۔ میں ان دونوں کے معمولات کے متعلق اندازے لگانے کی کوشش کرتی رہتی۔ مجھے حویلی، ماسی بشیراں، اللہ وسایا، گاؤں کی سنہری نکھری صبحیں، الجھی ہوئی پگڈنڈیاں، تاحدِ نظر بکھری ہریالی، رہٹ چلنے کی آوازیں، بیلوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی مترنم صدائیں، ٹھمک ٹھمک کر چلتی اور ادھر ادھر گھاس پھوس پر منہ مارتی بکریوں کے ریوڑ، جوہڑوں میں غسل کرتی گائیں بھینسیں، آم کے باغوں میں کوکتی کوئلیں، حویلی کے احاطے کی منڈیروں پر بیٹھی چوں چوں کرتی چڑیاں، انہی منڈیروں پر رقص کرتی گلہریاں، کائیں کائیں کی گردان کرتے کوے، ہر شام اپنے آشیانوں کو لوٹتے طیوروں کی تھکی ماندی آوازیں، ننگ دھڑنگ سانولے بچے، چھینٹ کے لہنگوں، رنگین قمیصوں اور چھاپے دار چنریوں میں ملبوس کئی عورتیں حویلی کے دریچوں سے نظر آتے یہ سارے مناظر ٹوٹ کر یاد آتے۔ ویگن میں سوار ہاسٹل سے کالج جاتے ہوئے بھی میرا دھیان گاؤں میں اٹکا رہتا۔ کالج میں تو جوں توں وقت گزر جاتا مگر کالج سے واپسی پر میرا دل پھر ہجر و فراق کے دکھ میں ڈوب جاتا۔ کھانے کے بعد میں سونا وغیرہ کر کے پڑھ جاتی۔ شام اپنے ساتھ اداسی کے گہرے رنگ لاتی۔ مجھے حویلی کی شامیں بے طرح یاد آتیں۔ رات کو پڑھتے ہوئے میرا دل دکھتا رہتا اور جب بتی بجھانے کے بعد میں بستر پر لیٹتی تو جانے کہاں سے ایک سیلِ رواں میری آنکھوں میں امڈ آتا، میری کنپٹیاں بھیگ جاتیں۔ آنسو کنپٹیوں کی ڈھلوانوں سے اتر کر میرے بالوں میں گم ہو جاتے۔ اپنی روم میٹ کے خیال سے میں جبر سے بھینچی سسکیاں سینے میں گھونٹتی رہتی۔ نیند کی وادی میں اترتے ہی میں ممی اور کاکا کی تلاش میں بھٹکتی اور بالآخر انہیں پا لیتی مگر جب آنکھ کھلتی تو یہ حقیقت ایک گھونسا بن کر میرے دل کو ضرب پہنچاتی کہ ممی اور کاکا مجھ سے بہت دور ہیں۔

کافی دن میں اداسی کے اسی گرداب میں الجھی رہی۔ تیسرے چوتھے دن ہاسٹل میں ممی کا فون آ جاتا۔ کاکا سے بھی بات ہو جاتی مگر گھر سے آنے والی یہ ٹیلیفون کال آکسیجن کا سا اثر دکھاتی جو حیات افزا بھی ہوتی ہے اور سلگتی آگ کو بھڑکا بھی دیتی ہے۔ بہرحال دھیرے دھیرے میں نئے حالات کی عادی ہو گئی۔ حالات سے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے۔

گو ممی نے تو میرے دل میں مردوں کے خلاف نفرت کا الاؤ روشن کرنے کی کوشش کی تھی اور میرے خیال میں کاکا نے بھی دبی زبان میں صنفِ مخالف ہی سے محتاط رہنے کی تلقین کی تھی لیکن میں نے کالج میں لڑکوں ہی سے نہیں لڑکیوں سے بھی محتاط رویہ رکھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کالج کی کوئی ساتھی میری دوست بن کر میرے نجی حالات سے واقف ہو۔ دوستوں سے لاکھ احتیاط برتی جائے مکمل رازداری ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتی ہے۔ لڑکیوں میں بال کی کھال نکالنے، ہر بات کھوجنے اور دوسروں کے نجی معاملات کریدنے اور ان معاملات میں ٹانگ اڑانے کا جو فطری اشتیاق ہوتا ہے میں اسکول میں اس سے بخوبی آگاہ ہو چکی تھی۔ پاپا کی موت کے بعد اسکول میں میری ہم جماعتیں بہانے بہانے سے کبھی ہمدردی کا اظہار کر کے کبھی دوستی جتاتے ہوئے پاپا کی موت، ان کی دوسری شادی، میری دوسری ماں اور میری ممی کے ردِ عمل کے بارے میں استفسار کرنے کی کوشش میں لگی رہا کرتی تھیں۔ سو اسکول کے تجربات کے پیشِ نظر میں نے کالج میں اپنی ساتھیوں کے ساتھ اول دن سے ہی خاصا محتاط رویہ رکھا اور وہ اور میں ہاسٹل میں اپنی روم میٹ کے ساتھ بھی جو کالج میں مجھ سے ایک سال آگے

تھا جیسے یہ کار ہی میری پہچان تھا تو لوگوں کو میرے نزدیک آنے اور میرے نجی حالات سے واقف ہونے کا موقع ملے۔ میری اس محتاط روش کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت جلد میں اپنے کالج میں ایک مغرور لڑکی کی حیثیت سے مشہور ہو گئی۔ ایک ایسی مغرور لڑکی جس کے مغرور ہونے کے جواز لوگوں کی سمجھ میں بآسانی آ جاتے تھے۔

میں اپنی ماں کی طرح خوبصورت تھی، کاکا کی طرح مجھے بھی رنگ برنگ نوع بنوع ملبوسات پہننے اور اپنے سراپا کو ہمہ وقت مدھم خوشبو میں بسائے رکھنے کا شوق تھا۔ حسن اتفاق کالج میں یونیفارم کی پابندی نہ تھی چنانچہ میں ہر روز جوڑا بدل کر کالج جاتی۔ ایک بڑا چرمی صندوق تو میں خود کپڑوں سے بھر کر گاؤں سے شہر لائی تھی، ممی نے گاؤں جانے کے بعد مجھے اللہ دسایا کے ذریعے دو بڑے چرمی صندوق اور بھجوائے جن میں سے ایک میں میرے زیر استعمال رہنے والے ملبوسات کے علاوہ گرم شالیں اور سوئٹر تھے اور دوسرے صندوق میں میرے لیے دو درجن سے زائد ملبوسات کے بالکل نئے جوڑے تھے۔ کاکا نے میرے لیے فرانسیسی خوشبویات کی دو شیشیاں اور جرمن ساختہ نئے فیشن کا دھوپ کا چشمہ بھجوایا تھا۔ گو بابا کے طفیل ہمارے مالی حالات کا گراف خاصا نیچے گر چکا تھا مگر پھر بھی اونچی حویلی اور نانی اماں کی جانب سے ممی اور کاکا کو بطور میراث ملنے والی زرعی اراضی کی برکتیں ہمیں خوشحال رکھنے کے لیے کافی تھیں۔

میرے کالج کے ساتھی تو مجھے کسی بڑے زمیندار کی بیٹی سمجھا کرتے تھے اور میری انتہائی محتاط روی کے باوجود میرے بعض ہم جماعتوں نے میرا سیاق و سباق کھنگالنے کی کوشش بھی کی مگر میں طے کر چکی تھی کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ فری پیریڈز میں جب میری ہم جماعتیں اور دوسری لڑکیاں کالج کے سبزہ زار پر روشوں کے بیچ، وسیع برآمدوں میں چہلیں کرتی پھرتیں۔ سیڑھیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگتیں یا کالج لائبریری میں پڑھنے کے بہانے اپنے... ہم جماعت یا سینئر لڑکوں سے معنی خیز مسکراہٹوں کے ساتھ دبی دبی سرگوشیوں میں مصروف رہتیں یا کالج کینٹین میں جا کر سموسوں کا لطف اٹھانے بیٹھتیں یا پھر کامن روم کے دروازے کے باہر کھڑی ہو کر لڑکوں سے بے باکانہ گفتگو کرنے لگتیں تو میں کامن روم کے کسی گوشے میں سب سے الگ تھلگ اپنی کوئی کتاب کھول کر بیٹھ جاتی۔ اور کامن روم میں بیٹھی دوسری لڑکیوں کی سرگوشیوں، بلند آہنگی میں ان کے مابین ہونے والے جنسی مذاق، مسکراہٹوں، قہقہوں اور ساتھی لڑکیوں اور لڑکوں اور اساتذہ کے بارے میں ان کی بے ہودہ باتوں پر کان لگا دیتی۔ کب کب میری نظریں کامن روم کے دروازے پر پڑتیں

دہلی کا واقعہ

محمد اعظم نے T.V خریدا جس کی گارنٹی ایک سال کی تھی جب بھی T.V بگڑا محمد اعظم نے کمپنی کو فون کیا، مکینک آیا اور درست کر گیا۔

ایک سال بعد خراب ہوا تو اپنے علاقے کے مکینک سے رجوع کرنا پڑا۔ مکینک نے تیس روپے فیس جمع کرائی، شام کو آیا T.V دیکھا، ایٹینا گھمایا اور چلا گیا۔ T.V کام کرنے لگا۔ ہر مہینے میں ایک دو بار ایسا ہوتا رہا۔ ایک روز محمد اعظم نے ایک دوکان پر T.V گائیڈ نامی کتاب بھی دیکھی، دس روپے میں خرید لی۔ پڑھا تو معلوم ہوا کہ 75/ T.V کی خرابی صرف انٹینا کی خرابی سے ہوتی ہے۔ آخر میں کتاب والے کا جب یہ ہوا کہ T.V گائیڈ کا بھی اشتہار دیکھا۔ محمد اعظم نے گھر T.V گائیڈ بھی تیس روپے میں خرید لی۔ اسے پوری توجہ سے کئی کئی بار پڑھا۔ بہت سی باتیں معلوم ہوئیں تو محمد اعظم نے ہمت کر کے مرمت کا سامان جو T.V کو ٹھیک کرنے میں مدد دیتا ہے ستر روپے میں خرید لیا۔ اپنے T.V پر ہی پہلا کام کیا اور کامیاب رہا۔ ہمت بڑھی۔ پڑوس کے لوگوں کے T.V بھی درست کیے۔ دو تین مہینے میں خود پر بھروسہ کرنے لگے۔ ایک دن دیکھا محمد اعظم کے گھر پر بورڈ لگا تھا:

کلر و بلیک اینڈ وائٹ T.V ریپیئر ہاؤس
ملنے کا وقت صبح ۹ سے ۵ بجے تک شام چھ بجے کے بعد

اس طرح محمد اعظم نے آہستہ آہستہ مہارت حاصل کر کے اپنی آمدنی بھی بڑھائی اور سب T.V کی مرمت فیس سے بھی بچ گئے۔ وہ انسان جو اردو پڑھنا جانتا ہو اور T.V سے دلچسپی رکھتا ہو T.V گائیڈ اردو کمرشل ڈی کا یہ پڑھ کر اچھا مستفید ہو سکتا ہے۔

رام کرشن گرجالی

کلاس روم کے باہر تین چار لڑکیاں کھڑی حسب عادت لڑکوں سے ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ ممی نے ٹھٹک کر قدرے ناگواری سے یہ منظر دیکھا۔ لڑکیوں سے باتیں کرتے لڑکوں نے ایک جانب ہوتے ہوئے مجھے اور ممی کو راہ دی تاہم لڑکیاں معنی خیز انداز میں مسکرانے لگیں۔ کلاس روم کی جانب بڑھا کر اندر داخل ہوتے ہوئے مجھے کلاس روم کے باہر کھڑی لڑکیوں کے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔ ان کی معنی خیز کھنکھار میرے لیے اب نئی نہ رہی تھی۔

میرے ہمراہ ممی کے کلاس روم میں داخل ہوتے ہی کلاس روم میں موجود لڑکیوں نے پُراشتیاق نظروں سے ممی کو دیکھا۔ ان کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ وہ میرے ساتھ کلاس روم میں داخل ہونے والی حسین اور پُروقار خاتون سے میرے اس تعلق کی تصدیق چاہتی تھیں جس کا اندازہ دیکھنے والے ہمارے ملتے جلتے نین نقش دیکھ کر لگا لیا کرتے تھے مگر انھوں نے زبان سے اس سلسلے میں کسی قسم کا استفسار کرنے سے گریز کیا۔ دراصل میری محتاط روی نے جسے سب غرور پر محمول کیا کرتے تھے ایک ہی ادارے میں زیرِ تعلیم ہونے اور دن کا ایک حصہ ایک ساتھ گزارنے کے باوجود تعلیمی سال شروع ہونے کے کچھ عرصے بعد ہی میرے اور کالج کی دوسری طالبات کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی تھی۔ میں نے لڑکیوں سے بھی محتاط رہنے کی جو کوشش کی تھی اس کے ردعمل کے طور پر وہ بھی مجھ سے دور ہو گئی تھیں اور منتق تھیں۔ چار ماہ کے مختصر ساتھ کے نتیجے میں وہ میری اس خوشی میں شریک ہونے کو آمادہ بھی نہ تھیں جو اس وقت ممی کی آمد سے مجھے ملی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ کلاس روم میں موجود لڑکیوں میں سے کوئی اس وقت مجھ سے ممی سے میرے تعلق کی بابت استفسار کرے۔ مجھ سے تو خیر کسی نے نہ پوچھا البتہ سیکنڈ ائیر کی ایک لڑکی نے ممی ہی سے پوچھ لیا۔ "آپ عالیہ کی رشتے دار ہیں؟"

"ہاں میں اس کی ممی ہوں۔" ممی نے بتایا۔

"ہمارا اندازہ بھی یہی تھا۔"

مجھے ایک عجیب سی خوشی اور فخر کا احساس ہوا۔ ممی کا حسین اور پُروقار ہونا مجھے اس تفاخر کا حق دیتے تھے مگر مجھے ایک موہوم سا دکھ بھی ہوا۔ میری سینئر ساتھی نے مجھ سے کیوں نہ پوچھا کہ عالیہ تمھارے ساتھ کون خاتون آئی ہیں؟ میں اسے فخر سے بتاتی کہ وہ میری ماں ہیں۔ بہرحال وہ فری پیریڈ میں نے کلاس روم میں ممی کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے گزارا۔ میں نے چاہا کہ ممی کو کینٹین سے چائے منگوا کر پلواؤں مگر ممی نے کہا۔ "بیٹا! اب تو کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔ تمھاری چھٹی ہو جائے پھر چلتے ہیں۔"

"کہاں؟"

"کسی اچھے سے ہوٹل میں۔"

"تو چلیے ابھی چلتے ہیں۔"

"ابھی؟ تمھاری چھٹی کہاں ہوئی ہے؟"

ممی کی سادگی پر مسکرا دی۔ "ممی جان! کالج میں اسکول کی طرح پابندی نہیں ہوتی۔ ہم جب چاہیں گھر جا سکتے ہیں۔ یہ مرضی ہے پیریڈ اٹینڈ کریں یا نہ کریں۔"

"تو کیا تم وقت سے پہلے کالج سے چلی جاتی ہو؟" ممی نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں، آج تک میں نے ایسا نہیں کیا۔ جب تانگہ آ جاتا ہے تب جاتی ہوں، ہاسٹل میں رہنے والی دوسری لڑکیوں کے ساتھ۔"

"اگر تم آج میرے ساتھ جلدی چلی گئیں تو کیا تانگے والا تمھاری راہ نہ دیکھے گا؟"

"ضرور دیکھے گا مگر میں کسی کو بتا کر جاؤں گی۔"

"کس کو؟"

"تانگے میں اپنے ساتھ جانے والی کسی لڑکی [illegible]۔"

"نہیں میرا خیال ہے تم فارغ ہو جاؤ تب [illegible] گے۔"

تب ہی گھنٹی بج گئی اور میں نے ممی سے کہا۔ "امی جان! تو پھر میں اپنا آخری پیریڈ اٹینڈ کر ہی آؤں۔"

"میں یہاں بیٹھ کر تمھارا انتظار کر سکتی ہوں نا؟"

"کیوں نہیں... آپ بالکل آرام سے بیٹھیے۔ ڈیڑھ بجے میں آ جاؤں گی۔"

"اچھی بات ہے۔"

میں نے کلاس روم کے دروازے کا رخ کیا۔ دروازے سے نکلنے سے قبل میں نے پلٹ کر ممی کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔

ڈیڑھ بجے پیریڈ ختم ہونے کے بعد جب میں کلاس روم میں ممی کے پاس واپس پہنچی تو انھیں کالج کی دو ایسی لڑکیوں سے محوِ گفتگو دیکھا جن کی لڑکوں سے بے جا بے تکلفی کے سبب میں انھیں ذرا پسند نہ کرتی تھی۔

"آ گئیں تم؟"

"جی۔"

"عالیہ بیٹے! تمھاری ساتھیوں نے مجھ سے تمھاری شکایت کی ہے۔"

"کیسی شکایت؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"دو تین لڑکیاں ابھی ابھی اُٹھ کر گئی ہیں۔ انھیں بھی یہی شکایت

تھی اور ان دونوں کو بھی..." ممی نے ان دونوں لڑکیوں کی جانب اشارہ کیا جن سے وہ ہم کلام تھیں "کہ تم بالکل الگ تھلگ رہتی ہو کسی سے بات نہیں کرتیں۔"

"آپ تو جانتی ہیں ممی کہ مجھے کم بولنے کی عادت ہے۔" میں نے ان دونوں لڑکیوں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں وہ تو میں جانتی ہوں مگر....."

"چلیں؟" میں نے ممی کی بات کاٹ دی۔

"چلو۔" ممی اٹھ کھڑی ہوئیں اور انھوں نے ان دونوں لڑکیوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا: "اچھا بھئی بچیو اجازت۔"

وہ دونوں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں، ان میں سے ایک نے کہا: "آنٹی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔"

"اور حیرانی بھی کہ آپ عالیہ سے کتنی مختلف ہیں... میرا مطلب ہے مزاجاً" دوسری نے کہا۔

"دراصل میری بیٹی بہت کم گو ہے۔" ممی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کامن روم سے باہر نکل آنے کے بعد کالج کے صدر دروازے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے ممی نے کہا: "بڑی جلدی گھل مل جانے والی ہیں تمھارے کالج کی لڑکیاں، مجھ سے خوب باتیں کیں انھوں نے۔ دو تین لڑکیاں تمھارے آنے سے ذرا دیر پہلے ہی اٹھ کر گئی ہیں، وہ بھی دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔"

"مگر یہ دونوں لڑکیاں جو اس وقت آپ کے ساتھ بیٹھی تھیں مجھے ذرا اچھی نہیں لگتیں۔"

"کیوں؟"

میں ممی کی کیوں کا مناسب ترین الفاظ میں جواب سوچنے لگی۔

"کیوں نہیں اچھی لگتیں وہ تمھیں؟" ممی نے اپنا سوال قدرے وضاحت سے دہرایا۔

"مجھے لڑکوں سے بے تکلف ہو جانے والی کوئی بھی لڑکی اچھی نہیں لگتی۔"

دفعتاً میرے عقب سے کسی لڑکے نے آوازہ کسا۔

"اوہو! مس صاحبہ آج پہلی دفعہ کسی سے باتیں کرتی نظر آئی ہیں۔"

"یار یہ! گونگی تھوڑی ہیں، یہ مغرور ہیں۔" ایک دوسری آواز عقب سے سنائی دی۔

"مغرور بھی کیا لفظ ہے، غ ہٹا کر ف لگا دو تو سارا غرور رفو چکر ہو جاتا ہے اور آدمی مغرور سے مفرور بن جاتا ہے۔" یہ تیسری آواز تھی۔

پھر فلک شگاف قہقہے ابھرے۔

میں تھم کر پلٹی، میں نے شعلہ بار نگاہوں سے پیچھے دیکھا، پانچ چھ لڑکوں کا ایک گروہ ہم سے چند قدم پیچھے تھا۔ جونہی میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا، وہ سب کے سب تھم گئے اور ان کے قہقہوں کو گویا بریک لگ گیا۔

"تمیز سیکھیے اور ایک بات جان لیجیے کہ ہر لڑکی آپ کی چھچھوری حرکتوں کو خاموشی سے برداشت نہیں کر سکتی۔"

"سوری۔" ان میں سے ایک کان کھجاتے ہوئے مکر دینی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"چلیے ممی!" میں نے ممی سے کہا جو گردن موڑے پیچھے ہی دیکھ رہی تھیں۔

ہم صدر دروازے سے نکلنے کو تھے کہ میرے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی: "یار یہ تو پوچھ لیتے کہ تمیز سکھانے کی کلاسیں کہاں ہوتی ہیں اور ایسے کورس کا خرچہ کتنا بیٹھ جاتا ہے؟"

"نہیں یار بڑی خونخوار لگتی ہے، دیکھا نہیں کیسے گھور رہی تھی۔"

"فرسٹ ایئر اور یہ طرارہ۔"

میں جانتی تھی جب یہ آوازیں میری سماعت کا پیچھا کر رہی تھیں تو ممی بھی یقیناً سن رہی ہوں گی۔

کالج کے باہر اللہ وسایا گاڑی میں بیٹھا کالج کے صدر دروازے پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ انتظار کی بھر آزمائش کی جھلک لیے ہوئے تھا، مگر ہم پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کے زاویے بدل گئے۔ دروازہ کھول کر وہ تیزی سے گاڑی سے نکلا اور اس نے پچھلی نشست کے دروازے ہمارے لیے وا کر دیے۔ ہم گاڑی کے نزدیک پہنچے تو اس نے بڑی محبت اور شفقت سے مجھ سے پوچھا: "بی بی! کیسی ہیں جی آپ؟"

"اچھی ہوں، تم کیسے ہو؟"

"اللہ سائیں کی مہربانی ہے بی بی۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے آسمان کی جانب دیکھا، پھر ہمارے گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ دفعتاً میری نظر کالج کے پیچھے کھڑے ان تانگوں پر پڑی جو ہمارے کالج کے ہاسٹل میں رہنے والی لڑکیوں کو ہاسٹل لایا لے جایا کرتے تھے۔

"ممی! پلیز تانگے والے کو بھی تو بتانا ہے کہ میں آج تانگے سے نہیں جاؤں گی۔"

"بتا دو۔" ممی نے کہا اور اللہ وسایا کو گاڑی آگے بڑھانے کا حکم دیا۔ میں نے اللہ وسایا کو بتایا کہ اسے کون سے تانگے کے قریب گاڑی روکنی ہے۔ جب گاڑی تانگے کے نزدیک جا کر رکی تو میں نے کوچوان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی اور اسے بتایا کہ آج میں تانگے میں نہیں جاؤں گی

"شاباش!" ممی نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر بولیں: "ویسے تمھاری کاکا کو مجھ سے شکایت ہے کہ میری باتوں نے تمھیں دس برس آگے لے جا کھڑا کیا ہے۔ کیا تم خود بھی ایسا کوئی فرق محسوس کرتی ہو؟"

"جی!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا اس میں کوئی برائی ہے؟"

"میرا خیال ہے نہیں بلکہ میں فائدے میں رہی۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ میں نے اپنے کالج کے ان لڑکوں کو کس بری طرح چھٹکار دیا تھا؟"

"ہاں!" ممی کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا: "مجھے تم پر فخر محسوس ہوا.... یا امید ہے کہ تم میری توقعات پر پوری اتر سکتی ہو۔ بچہ! از دل مجھے مردوں سے شدید نفرت ہے اور میں اس نفرت کو تمھاری نس نس میں موجزن دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی ممی!" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

ممی جھکیں اور انھوں نے میرا ماتھا چوم کر مجھے آشیرباد دی۔

ممی دو دن شہر میں رہیں اور مجھے انھوں نے اپنے ساتھ رکھا۔ ہم میرے کالج کا ناغہ نہ ہونے دیا۔ وہ صبح کو مجھے کالج پہنچا دیتیں اور دوپہر کو لینے آتیں۔ شام کو وہ مجھے گھمانے پھرانے باہر لے جاتیں۔ ہم دونوں نے ایک دو دفعہ فون پر کاکا سے بات بھی کی۔ میں نے انھیں گاؤں کے کالج میں لیکچررشپ اختیار کر لینے پر مبارکباد دی تو وہ بولیں: "ہاں! انسان کی زندگی میں کسی مقصد کی موجودگی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکچررشپ میں نے تفریحاً یا وقت گزاری کے لیے نہیں اختیار کی بلکہ میں اپنا علم دوسروں کو منتقل کرنے کی خواہاں ہوں۔"

"خدا آپ کو آپ کے مقصد میں کامیاب کرے کاکا!"

"تمھاری ماں بزرگانہ انداز کی باتوں کی وجہ سے میں آپا سے کہتی ہوں کہ آپ کی باتوں نے اسے...."

"دس برس آگے لے جا کر کھڑا کر دیا ہے۔" میں نے کاکا کی بات اچک لی۔

"ٹھیک کہتی ہوں نا میں؟"

"ہاں مگر آپ یہ بھی تو دیکھیے کہ میں نقصان میں نہیں بلکہ سراسر فائدے میں ہوں۔"

"مثلاً؟"

"جب ممی گاؤں واپس پہنچیں گی تو آپ ان سے پوچھیے گا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کالج کیسا چل رہا ہے؟"

"آپ چلنے کی بات کرتی ہیں، وہ تو دوڑ رہا ہے۔"

"شریر!" کاکا کی آواز میں مجھے ہلکی سی مسکراہٹ کا رنگ گھلا محسوس ہوا۔

تیسرے دن گاؤں واپس ہونے سے قبل ممی نے مجھے ہاسٹل پہنچایا اور وارڈن کے تعاون پر ان کا انتہائی شکریہ ادا کیا۔ میں ممی کو ہاسٹل کے صدر دروازے تک چھوڑنے گئی۔ میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

"میں جلدی ہی پھر آؤں گی۔" ممی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ میں بلک بلک رونے لگی۔

"ارے یہ کیا جان! میں تو تمھیں مضبوط دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ممی! میں شاید ہر معاملے میں مضبوط ثابت ہو سکتی ہوں مگر آپ کے معاملے میں میں بالکل کمزور ہوں۔"

ممی نے اپنا دایاں ہاتھ میرے بائیں شانے پر رکھ دیا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولیں: "تمھارے معاملے میں ممی بھی بہت جذباتی ہے.... کیا تم یقین کرو گی کہ تمھیں کالج میں داخل کرا کے گاؤں واپس جانے کے بعد میں نے ہر ممکن ذریعے سے تمھاری خیر و عافیت، تمھاری معمولات روز و شب سے پوری طرح باخبر رہنے کی کوشش کی ہے۔"

"مثلاً کس کس ذریعے سے؟"

"یہ راز کی بات ہے۔" ممی لمحہ بھر کو ٹھہریں پھر انھوں نے کہا: "جانتی ہو میں شہر کیوں آئی تھی؟"

میں نے استفہامیہ نگاہیں ممی کے خوبصورت چہرے پر ٹکا دیں۔

"یہ دیکھنے کے لیے کہ جو اطلاعات مجھے تمھاری بابت ملی تھیں وہ کس حد تک درست ہیں۔"

"کیسی اطلاعات ممی؟" میں نے چونک کر بلکہ گھبرا کے کہا۔

ممی دھیرے سے مسکرا دیں۔ ان کی مسکراہٹ میں اشتباہ اور تشویش کا نہیں یقین اور اطمینان کا عکس بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔

"وہ اطلاعات جو میرے اطمینان کا سبب ہو سکتی ہیں۔"

"میں سمجھی نہیں ممی!"

"جانے دو! بس اتنا سمجھ لینا کافی ہے تمھارے لیے کہ فی الحال تو ممی تمھاری طرف سے مطمئن واپس جا رہی ہے...." ممی نے ایک لمحے کو خاموشی اختیار کی پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولیں: "تم جانتی ہو نا میں کیا چاہتی ہوں تم سے؟"

"بہت اچھی طرح ممی!"

"اچھا تو اب ممی کو خدا حافظ کہنے کو تیار ہو جاؤ۔"

ممی نے بانہیں وا کیں اور میں ان کے سینے سے لگ کر رو دی۔

"بس.... بس میرا بیٹا.... بس...." ممی نے میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد جب میں چپ ہو گئی تو ممی ہاسٹل کے گیٹ سے باہر نکلیں اور گاڑی میں بیٹھ کر گاؤں روانہ ہو گئیں۔ میں ممی کی ... ہی۔

تختۂ سیاہ کی سمت پھیر لیتے اور مجھے نظر انداز کرنے لگتے۔ عمرانیات
کے صفدر نواز آرائیں صاحب نے تو ایک روز زچ ہو کر کہہ دیا
"بی بی! تم بہت ٹیڑھے سوالات کرتی ہو، اتنے سوالات نہ کیا کرو۔"
علوم اسلامی کے پروفیسر سلامت علی شوقی صاحب کے چہرے
کے تاثرات مجھے کرسی سے اٹھنے کا ارادہ کرتے دیکھ کر ہی بدل
جاتے۔ آخر نیزی کے انجان جنجوعہ اپنے لیکچر کے دوران کنکھیوں
سے دیکھتے رہتے کہ کب میں کوئی سوال پوچھنے کے لیے اپنی جگہ
سے کھڑی ہونے جا رہی ہوں۔ ان حضرات کی علمی قابلیت اور
مضمون پر دسترس میں کوئی کلام نہ تھا مگر اب اس کا کیا علاج کہ
میرے ذہن میں سر اٹھانے والے سوالات بظاہر گنجلک ہونے
کے باوجود مضمون زیر تدریس سے غیر متعلق ہرگز نہ ہوتے تھے۔ شروع
شروع میں سوالات بے اختیاری طور پر میرے ذہن میں آتے تھے لیکن
اپنے ہم جماعتوں پر ان سوالات کی دھاک بیٹھتے اور اساتذہ کو
اکثر سوالات سے جز بز ہوتے دیکھ کر میں رات گئے تک کتابوں
میں سر کھپانے لگی۔ عام طلبہ کی طرح محض نصابی کتابوں پر اکتفا کرنے
کے بجائے میں لائبریری سے متعلقہ مضمون میں بڑے بڑے
مصنفین و مؤلفین کی تصنیف و تالیف شدہ کتب مستعار لیتی اور
ہاسٹل میں اپنا بیشتر وقت مطالعے میں صرف کرتی۔ مجھے یہ اعتراف
کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اس دماغ سوزی کا مقصد اپنے علم میں
غیر معمولی اضافہ نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کو مرعوب کرنا اور اساتذہ
کو اپنے سے خائف کر دینا تھا۔ کالج بھر میں یہ سلسلہ میری شہرت
کا دوسرا سبب ثابت ہوا۔

گو کالج کی لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں سے میں کچھ زیادہ
ہی کھنچی کھنچی رہتی تھی مگر لڑکوں کی جانب سے "سوشل بائیکاٹ"
قسم کے کسی رد عمل کا اظہار ہونے کے بجائے خاصی وسیع القلبی
کا مظاہرہ کیا گیا۔ ایک دو نہیں متعدد لڑکوں نے میری جانب
دوستی کا ہاتھ بڑھانے اور مجھ سے خاصے تکلف کے ساتھ بے تکلف
ہونے کی کوشش کی لیکن میرے رویے نے ایسی ہر کوشش کو
ناکام بنا دیا۔ دھیرے دھیرے کالج بھر کے لڑکے جان گئے
کہ ان تلوں میں تیل تو بہت ہے مگر نکالنے کی اجازت نہیں۔

کالج میں اپنے پہلے تعلیمی سال کے اختتام تک میں ایک ذہین،
فطین اور مغرور طالبہ کی حیثیت سے معروف ہو چکی تھی۔ لڑکوں کی
جانب سے کبھی میری جانب "مس جینئس" کا خطاب اچھالا جاتا
تو کبھی "مس پراؤڈ" کا۔ مگر میں جانتی تھی کہ نہ جینئس تھی نہ پراؤڈ۔۔۔
میں تو کاکا کے آدرش پر پورا اترنے کی کوشش کرنے والی ۔۔۔
کمزور سی لڑکی تھی۔

ہاں مگر ان خطابات کے فقرہ بازیوں کی صورت اچھالے
جانے سے قطع نظر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ نہ صرف میرے
ہم جماعت بلکہ غیر ہم جماعت لڑکے بھی خود ایک جانب ہٹ
کر مجھے آگے بڑھنے کے لیے راہ دے دیا کرتے تھے۔

پہلے تعلیمی سال کے دوران امی وقفے وقفے سے مجھ سے
ملنے کے لیے تین مرتبہ گاؤں سے شہر آئیں۔ دوسری بار وہ موسم
سرما کی چند روزہ تعطیلات کے آغاز پر آئیں۔ کاکا بھی ان کے ساتھ
تھیں اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ مجھے تعطیلات میں گاؤں
لے جانے کے بجائے وہ دونوں سرمائی تعطیلات کے دوران
شہر ہی میں قیام کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ قیام و طعام کے
لیے حسب دستور شہر کے ہوٹل حاضر تھے۔ اوائل بہار میں امی تیسری
بار مجھ سے ملنے آئیں اور چوتھی مرتبہ وہ مجھے موسم گرما کی تعطیلات
میں گاؤں لے جانے کے لیے شہر آئیں۔ کاکا جنھیں میں نے
کافی دن سے نہیں دیکھا تھا، جب گاؤں پہنچنے پر میں نے انھیں
دیکھا تو میں حیران بھی ہوئی اور ملول بھی۔ ان کا پُر بہار سراپا افسردہ
معلوم ہونے لگا تھا۔

"کاکا جی! یہ آپ کو کیا ہوا؟"

"کیا ہوا مجھے؟" کاکا نے مسکرانے اور متعجب ہونے کی
کوشش کی۔

"آپ دُبلی بھی ہو گئی ہیں اور آپ کی رنگت بھی۔۔؟"

"ارے یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ پڑھانا محنت کا کام
ہے۔ اس کا مطلب ہے میں کچھ محنت کرتی ہوں۔"

"آپ کی اسٹوڈنٹس تو آپ سے بہت خوش رہتی
ہوں گی؟"

"ہاں شاید رہتی تو ہیں اور تمھارے ٹیچرز تم سے۔۔۔؟"

"اردو کی مسز فاروقی کے علاوہ چاروں مرد لیکچرر شاید [illegible]
نالاں ہو چکے ہیں مجھ سے۔" میں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"کیوں؟" کاکا نے چونک کر پوچھا۔

"کیوں کہ میں ان سے ایسے ایسے اُلٹے سیدھے سوالات
کرتی ہوں کہ وہ چکرا کے رہ جاتے ہیں۔ ان بڑا مزہ آیا، ایک روز
اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر سلامت علی شوقی نے مجھے اپنے
کمرے میں بلوایا اور علیحدگی میں مجھ سے بولے 'عالیہ بی بی۔ اس میں
شک نہیں کہ تم بہت ذہین ہو، بڑے اچھے سوالات کرتی ہو مگر
تمھارے بار بار سوال کرنے سے میرے لیکچر میں یکسوئی نہیں رہتی
باقی تم ایسا کیا کرو جو سوالات دوران لیکچر تمھارے ذہن میں ابھرا
کریں انھیں ترتیب وار نوٹ کرتی جایا کرو اور اپنے فری پیریڈ میں
میرے پاس آ کر ڈسکس کر لیا کرو۔' میں نے شوقی صاحب سے
کہا سر جی، ضروری تو نہیں کہ جب میرا پیریڈ فری ہو تو آپ بھی

فری ہوں یا جب آپ فری ہوں تو میں بھی فری ہوں لیکن جہاں تک
کرتے تھے جی بی! تم سوالات نوٹ کرتی جایا کرو۔ ہم تین چار لیکچرز
سے متعلق سوالات اکٹھے بھی تو ڈسکس کر سکتے ہیں۔ آخر ہفتے میں کسی
نہ کسی دن تو میں کسی ایسے پیریڈ میں فارغ ہوں گا ہی جب تمہارا
بھی فری پیریڈ ہو۔ میں نے کہا۔ مگر سر جی! سوالات باسی ہو جایا کریں
گے۔ شوق صاحب نے چڑچڑا کر میری طرف دیکھا اور بولے۔
کیا! میں! سوالات بھی سبزی ترکاری ہیں کہ باسی ہو جائیں گے!
میں نے کہا۔ سر! ہر سوال کی وقت کے لحاظ سے اہمیت ہوتی
ہے۔ مجھے تو جی کلاس میں ہی دین اینڈ دیئر سوال کرنا اچھا لگتا ہے۔
سوالات نوٹ کرنے کے چکر میں میں آپ کے لیکچر کا کوئی حصہ کوئی
جملہ مس نہیں کرنا چاہتی۔ بہت اچھا پڑھاتے ہیں آپ۔ مکھن لگانے
کی دیر تھی۔ موم جیسے پگھل پڑے بولے۔ اچھا تو اب کرو سوالات کچھ
کم کیا کرو۔ میں نے سوالات کی تعداد کم کرنے کا وعدہ تو کر لیا لیکن
عمل ایسا نہیں کیا۔ تعلیمی سال کے اختتام تک شوق صاحب
میری صورت سے تقریباً بیزار ہی ہو چکے تھے بلکہ ایک شوق صاحب
ہی کیا تمام مرد لیکچررز مجھے ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔

"تو تم اتنے سوالات کرتی کیوں ہو؟ اسی پیشے سے وابستہ
ہونے کے ناتے مجھے اندازہ ہے کہ جب اسٹوڈنٹس کی جانب
سے لیکچر کے دوران بار بار سوالات کی صورت مداخلت ہو تو لیکچر
خاصا متاثر ہوتا ہے۔ سوالات کم اور جامع ہونے چاہئیں۔"

"میں تو ہر دو منٹ بعد اٹھ کھڑی ہوتی ہوں اور ایک
سوال جڑ دیتی ہوں۔"

"محض ایجیٹیشن کے طور پر؟" کاکا نے پوچھا۔

"شاید۔"

"کیوں؟"

"مجھے ان سب کو تنگ کرنے میں مزہ آتا ہے۔"

"لیکچررز کو تنگ کرنے میں؟" کاکا نے خاصے تعجب
سے کہا۔

"جی ہاں۔"

"کیوں؟"

"بس جب انھیں پیچ و تاب کھاتے دیکھتی ہوں تو مجھے
بڑا مزہ آتا ہے۔ بھئی دیکھیں نا سوال پوچھنے سے تو وہ مجھے روک
سکتے ہی نہیں۔"

"ویسے یہ اچھی بات نہیں ہے۔"

"واہ کیوں نہیں ہے اچھی بات۔"

"کیونکہ تمہاری ایجیٹیشن لیکچررز کے محنت سے تیار کیے
ہوئے لیکچرز کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتی ہوگی۔ جانتی ہو لیکچررز
لیکچر دینے سے قبل خاصی تیاری کرنا پڑتی ہے۔ اسکول کے ٹیچرز
کی طرح وہ اکثر بغیر تیاری کے کلاس میں نہیں آ جاتے۔"

"تیاری تو مجھے بھی کرنا پڑتی ہے جناب! لائبریری سے
موٹی موٹی کتابیں لا کر سر کھپاتی ہوں ان میں تاکہ ایسے سوالات کر
سکوں جنھیں لیکچررز حضرات فضول اور بے کار قرار نہ دے سکیں...
کاکا جی! جب میرا کوئی سوال کسی لیکچرر کے چہرے پر بے بسی کا تاثر
پیدا کر دیتا ہے تو میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنی خوشی ہوتی
ہے۔ میں ساری دنیا کے مردوں کو اسی طرح بے بس دیکھنا
چاہتی ہوں۔"

کاکا نے گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولیں۔
"تمہاری باتیں تمہاری عمر سے میل نہیں کھاتیں میری جان اور مجھے
تمہاری باتیں سن کر ڈر لگنے لگتا ہے۔"
میں کاکا کی سادگی پر مسکرا دی۔

حتیٰ نے جس مشن پر مجھے مامور کیا تھا کالج کے دو سال
اس ضمن میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوئے۔ ایک ایسا سنگِ میل
جس نے آئندہ کے لیے میری راہ زیادہ واضح کر دی۔ دوسرے
تعلیمی سال کے دوران پیش آنے والے ایک واقعے نے میرے دل
میں صنفِ مخالف کے خلاف نفرت کو اور بھڑکا دیا۔

جب میں سالِ دوم میں آئی تو پری میڈیکل سالِ اول میں
بڑی ہی پیاری صورت کی ایک لڑکی بلقیس داخل ہوئی۔ اس کے
بارے میں مجھے کلاس روم میں دوسری لڑکیوں کے مابین ہونے
والی باتوں سے پتا چلا کہ وہ لاہور کے ایک مضافاتی دیہات سے
آئی تھی۔ میٹرک کے امتحان میں اس نے سائنس گروپ میں تیسری
پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس کا باپ ایک معمولی ہنرمند تھا۔ میٹرک میں
تیسری پوزیشن حاصل کرنے پر جب اخباری نمائندوں نے حسبِ
روایت بلقیس سے انٹرویو لیا اور مستقبل کی بابت اس کے ارادوں
کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے کہا تھا کہ اس کی دلی خواہش
ہے کہ وہ ڈاکٹر بن کر گاؤں میں خدمت انجام دے مگر شاید گاؤں
کی روایات اور اس کے باپ کی قلیل آمدن اس کے اس خواب کو
تعبیر دینے میں مددگار نہیں ہوں گی۔ بلقیس کا انٹرویو پڑھ کر متعدد
مخیر افراد کی جانب سے اس کی معاونت کی پیشکشیں ہوئیں مگر اس
کے سادہ لوح اور گاؤں کے روایتی غیرت مند باپ نے
اس قسم کی پیشکشوں کو قبول کرنے کے بجائے ہمارے کالج کی
انتظامیہ کی پیشکش کو منظور کر لینا زیادہ مناسب سمجھا جس کی رو
سے بلقیس کی پری میڈیکل کے دو سالوں کی فیس معاف کر دینے
کے ساتھ گرلز ہاسٹل میں رہائشی اخراجات پر قیام کی اجازت بھی

شامل تھی۔ انتظامیہ نے بلقیس کو نصابی کتب بھی فراہم کرنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔ یوں باپ کے اصرار پر بلقیس نے ہمارے کالج میں داخلہ لیا اور گرلز ہاسٹل میں اقامت اختیار کرلی تھی۔ اتفاق سے ہاسٹل سے کالج آنے جانے کے لیے اسے ہمارے تانگے ہی میں جگہ ملی۔

گاؤں سے آنے والی غریب باپ کی بیٹی بلقیس جست کے ایک چھوٹے سے ٹرنک کے ساتھ ہاسٹل آئی تھی۔ اس کے پاس گنتی کے چار پانچ سوتی جوڑے تھے۔ کالج میں یونیفارم کی پابندی نہ ہونے کے سبب لڑکیاں خوب سج دھج کر کالج آتی تھیں مگر بلقیس نے اول تا آخر دن کالج میں خود کو سراپا سفید یونیفارم کا پابند رکھا۔ سفید سوتی شلوار اور لانبی آستینوں والی سفید قمیص پر وہ ململ کا سفید دوپٹہ اوڑھے رہتی اور پاؤں میں سفید کینوس شوز ہوتے۔ بلقیس مجھے اچھی لگتی تھی، اپنی نظر سے سادگی کی وجہ سے بھی اور اپنی کم گوئی کی وجہ سے بھی۔ صبح تانگے میں سوار کالج جاتے ہوئے جب دوسری لڑکیاں چہچہا رہی ہوتیں تو وہ خاموش بیٹھی کبھی حیران اور کبھی مسکراتی نگاہوں سے انھیں دیکھے جاتی۔ اور میں دزدیدہ نگاہوں سے بلقیس کے معصوم چہرے اور حیران و بے ریا مسکراہٹ کو دیکھے جاتی۔ گو بلقیس مجھے بہت اچھی لگا کرتی تھی لیکن دوسری لڑکیوں کی طرح بات میں اس سے بھی نہ کرتی تھی اور وہ غالباً میرے امیرانہ رنگ ڈھنگ اور کالج میں میرے غرور اور خود سری کے فسانے سن کر مجھے کچھ خائف اور کچھ مرعوب سی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی۔

گاؤں سے آئی ہوئی سیدھی سادی بلقیس چار پانچ ماہ تو بڑی سہمی سہمی اور لجائی شرمائی سی کالج کے برآمدوں اور راہداریوں سے گزرتے ہوئے وہ بہت سمٹ سمٹ کر دیواروں سے لگ لگ کر چلتی۔ روشوں پر چلتے ہوئے وہ اپنی کتابوں اور فائل کو سینے سے لگا لیتی اور نگاہیں نیچی کر کے چپ چاپ گزرتی چلی جاتی۔ جب دوسری لڑکیاں اس کے ساتھ ہوتیں تب بھی وہ اپنے سر پہ ڈھکے دوپٹے، ملحوظ حجاب، عجیب نگاہوں اور خاموش لبوں کی وجہ سے سب سے منفرد اور ممتاز نظر آتی۔ لیکن پھر اس کے انداز و اطوار میں تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی۔ کالج یونین کا جوائنٹ سیکرٹری رشید احمد اس سے ملنے اور باتیں کرنے کے لیے کامن روم کے دروازے پر آنے لگا۔ رشید احمد لانبے قد، گٹھی ہوئی جسامت اور گھنی مونچھوں والا ایک نوجوان تھا۔ بی کام سال دوم میں زیر تعلیم تھا۔ عمدہ لباس پہنتا تھا۔ موٹر سائیکل پر کالج آیا جاتا اور بڑی بیر بڈز میں کالج کے احاطے میں سگریٹ کے کش لیتے ہوئے دیکھا جاتا تھا۔ بلقیس سے پہلے بھی وہ متعدد لڑکیوں کے چکر میں کامن روم کے اطراف و جوانب میں گھومتا اور دروازے پر کھڑا اچھی سی لگتی تیتریوں سے اپنی نگاہیں نبرد آزما کرتے ہوئے دیکھا جاتا رہا تھا۔ میں نے اسے اکثر کامن روم کا طواف کرتے دیکھا تھا اور لڑکیوں کی زبانی اس کے عشق کے قصے اکثر میرے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ مجھے وہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا چنانچہ جب میں نے اسے بلقیس جیسی پیاری اور گاؤں کی سیدھی سادی لڑکی کے جو مجھے اچھی بھی لگا کرتی تھی، چکر میں دیکھا تو مجھے قدرتی طور پر ملال ہوا۔ جونہی بلقیس اپنے فری پیریڈ میں کامن روم میں آتی رشید احمد شیطان کی طرح کامن روم کے دروازے پر آ موجود ہوتا اور کامن روم کے دروازے پر تعینات چپراسی یا کامن روم میں آتی جاتی کسی لڑکی کے توسط سے بلقیس کو باہر بلوا بھیجتا۔ میں نے ایک دو دفعہ نہیں بارہا ایسا ہوتے دیکھا۔ بلقیس سر پہ دوپٹہ لیتی باہر نکل جاتی۔ بارہا میں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ کامن روم کے باہر بلقیس نگاہیں جھکائے شرمائی لجائی کھڑی ہے اور رشید احمد انتہائی واہیات مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا ہے یا پھر سرگوشیوں میں بلقیس سے باتیں کر رہا ہے۔ ایسے موقع پر بلقیس کے عارض دہک رہے ہوتے اور اگر وہ نظریں اٹھا کر اوپر دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا خمار ہلکورے لیتا نظر آتا۔ میں اس قسم کے منظر دیکھ کر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ رشید احمد پر مجھے جو غصہ آتا سو آتا بلقیس پر مجھے اس سے سوا غصہ آتا۔ میرا جی چاہتا بلقیس کو سمجھاؤں کہ آگ سے نہ کھیلے ورنہ بھسم ہو کر رہ جائے گی۔ اسے بتا دوں کہ رشید احمد ایک دو نہیں کئی لڑکیوں سے دوستی کر چکا ہے اور یا تو اس نے تلوں میں سے تیل نکلتے دیکھ کر از خود ترک تعلق اختیار کر لی تھی یا پھر لڑکیاں اس کے تیور بھانپ کر خود کھنچ گئی تھیں۔ مگر افسوس کہ میں جس خود ساختہ حصار میں محصور تھی اس نے مجھے بلقیس کو آگ کے اس کھیل سے روکنے، رشید احمد جیسے خراب شہرت والے نوجوان سے محتاط رہنے کی تلقین کرنے کی اجازت نہ دی۔

پھر ایک روز یوں ہوا کہ چھٹی کے بعد جب ہاسٹل جانے والی لڑکیاں تانگے میں آ بیٹھیں تو ان سب کو اور ان کے ساتھ مجھے بھی احساس ہوا کہ بلقیس تانگے میں نہ تھی۔ تانگے والے کو بتایا گیا تو وہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر بلقیس کو بلانے اندر چلا گیا مگر کچھ دیر بعد منہ لٹکائے واپس آ گیا۔

"کیا ہوا جی؟" چند لڑکیوں نے باجماعت پوچھا۔

تانگے والے نے نفی میں سر ہلا دیا۔

منظورہ میں کامن روم میں دیکھ کر آتی ہوں۔" ایک لڑکی نے کہا۔

"میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔" دوسری نے اپنی خدمات پیش کیں۔

اور وہ دونوں آن کی آن تانگے سے چھلانگ لگا کر کالج کے صدر دروازے کی جانب بڑھیں اور کالج میں داخل ہو گئیں۔

"کیا مصیبت ہے چھٹی کے بعد تو فوراً تانگے میں آ بیٹھنا چاہیے۔" تانگے میں بیٹھی ایک لڑکی نے بیزاری سے منہ بنایا۔

"ہو سکتا ہے وہ رشیدہ احمد کے ساتھ کینٹین میں بیٹھی ہو۔" کامرس سال دوم کی خورشید نے کہا اور دوسری لڑکیاں مسکرانے لگیں۔

"ہاں ہاں۔ آج کل بڑا زبردست افیئر چل رہا ہے دونوں کا۔" خورشید نے لڑکیوں کو مسکراتے دیکھ کر کہا۔

ایک لڑکی نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ "لو دو بجنے والے ہیں۔ وارڈن کہتی ہیں دوسرے کالجوں کی لڑکیاں صحیح وقت پر ہاسٹل واپس پہنچ جاتی ہیں مگر تمہارے کالج سے ہر دوسرے تیسرے دن چند لڑکیاں دیر سے پہنچتی ہیں۔"

"غلط تو نہیں کہتیں وہ..." خورشید منہ بنا کر بولی۔ "ہفتے میں ایک آدھ بار تو ہمارا اپنا تانگا ہی دیر سے پہنچتا ہے۔ کبھی کوئی لڑکی دیر کروا دیتی ہے تو کبھی کوئی۔"

بی اے پارٹ ون کی بشریٰ رفیق جو ہفتے میں ایک دو مرتبہ ضرور چھٹی کے بعد پانچ سات منٹ کی تاخیر سے کالج سے برآمد ہوتی تھی سمجھ گئی کہ خورشید کا نشانہ وہی تھی۔ جھلا کر بولی۔ "اور جو صبح کو دیر کرواتی ہیں۔"

لڑکیوں کی نگاہیں بے اختیار میری جانب اٹھیں اور مجھے اپنے سارے بدن میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہونے لگیں۔

"خیر دیر تو صبح کو بھی نہیں ہونا چاہیے مگر صبح کی بات دوسری ہوتی ہے۔ کالج میں ہم سے کوئی باز پرس تو نہیں کرتا ہاسٹل دیر سے پہنچو تو وارڈن دس سوال کرتی ہیں۔" خورشید نے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں لڑکیاں واپس آ پہنچیں جو بلقیس کی تلاش میں اندر گئی تھیں ان کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"ملی؟" ایک لڑکی نے بے تابانہ پوچھا۔

"ہاں جی۔ مل گئی۔"

"کہاں ہے؟"

"ہماری جیبوں میں۔ آدھی اس نے رکھ لی۔ آدھی میں نے۔" دونوں لڑکیوں میں سے ایک نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا تھا۔

"مذاق مت کرو۔ بھوک سے آنتیں کرکٹ کھیلنے لگی ہیں۔"

سال دوم سائنس کی رابعہ منہ بنا کر بولی۔

"بھئی کامن روم، کینٹین، سائنس لیبارٹریز، لائبریری، جاگرافی جگہ جگہ، ساری جگہوں پر دیکھ آئے ہیں۔ بلقیس کہیں نہیں ملی۔"

"بی بیو! ہو سکتا ہے وہ بی بی آج کسی اور تانگے میں بیٹھ کے چلی گئی ہو۔" تانگے والا بولا۔

"نہیں بابا! سارے تانگے ہمارے سامنے ہی گئے ہیں۔ وہ ان میں تھی تو نہیں۔ خیر بابا جی اب تم چلو۔" بی کام سال آخر کی حشمت جہاں نے تانگے والے سے کہا۔

"چنگا بی بی!" تانگے والے نے کہا اور لگام سنبھال لی۔

ہاسٹل پہنچتے ہی ہمیں وارڈن کی غضبناک نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔

"چھٹی کتنے بجے ہوئی تھی؟" انھوں نے کسی سخت گیر ماں کی طرح پوچھا۔

"ڈیڑھ بجے میڈم!" خورشید نے بتایا۔

"اور اس وقت ڈھائی بجنے والے ہیں جب کہ تمہارے کالج سے یہاں تک تانگہ صرف دس منٹ میں پہنچ سکتا ہے۔"

"وہ... میڈم ایک لڑکی گم تھی جی!" ہم میں سے ایک لڑکی منمنائی۔

"کیا! لڑکی گم تھی؟" وارڈن تشویش آمیز استعجاب کے ساتھ بولیں۔

"ہاں جی!"

"کون؟"

"بلقیس!"

"سفید کیٹرز والی بلقیس یا وہ جس کے شیگی کٹ بال ہیں؟"

"ہم کمیشن پر کام کریں گے"

"وہ جو سفید کپڑوں والی؟"

"کہاں ہے وہ؟"

"پتا نہیں، جو ہم تو سارا کالج چھان آئے ہیں اس کی تلاش میں۔ تانگے والا بابا کہہ رہا تھا ہو سکتا ہے وہ اگلے کسی تانگے سے ہاسٹل چلی گئی ہو۔" ان دو لڑکیوں میں سے ایک نے جو بلقیس کی تلاش میں کالج کے اندر گئی تھیں وارڈن کو بتایا۔

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔" وارڈن نے کہا۔

"میڈم ہم رک جائیں؟"

"ہاں جاؤ... بٹ بی شیور نیکسٹ ٹائم دیر نہیں ہونا چاہیے"

وارڈن نے اپنا آزمودہ جملہ دہرایا۔

ذرا دیر میں معلوم ہو گیا کہ بلقیس کسی دوسرے تانگے سے بھی ہاسٹل نہیں پہنچی تھی۔ اس انکشاف کے بعد ہاسٹل کی منتظم اعلیٰ نے فوری طور پر کالج کے پرنسپل سے ان کی رہائش گاہ کے فون نمبر پر رابطہ قائم کیا۔ وہ کالج پہنچ گئیں۔ کالج کا چپہ چپہ انھوں نے بلقیس کی تلاش میں چھنوا ڈالا مگر بلقیس نہ ملی۔ اس کارروائی میں سہ پہر نے شام کا اجالا لیا۔ ہاسٹل کے اعلیٰ عملے تک ہم لڑکیوں کی رسائی ناممکن تھی۔ تاہم نچلی سطح کے عملے کے توسط سے ہم تک خبریں پہنچتی رہیں۔ کالج، ہاسٹل اور گم شدہ لڑکی کی بدنامی کے ڈر سے پولیس کو مطلع کرنے سے گریز کیا جا رہا تھا اور اس اندیشے کے پیشِ نظر کہیں بلقیس گھر نہ چلی گئی ہو، ہاسٹل کے ایک چپراسی کو اس اندیشے کی تصدیق یا تردید کے لیے فوری طور پر بلقیس کے گاؤں روانہ کر دیا گیا تھا مگر اسے ہدایت کی گئی تھی کہ صرف اور صرف بلقیس کے باپ ہی سے اس سلسلے میں بات کی جائے۔ ایسا شاید اس لیے تھا کہ گاؤں کی سیدھی سادی عورتیں موقع کی نزاکت کا لحاظ کیے بغیر رونا پیٹنا ڈال کر ایسی باتوں کو بھی مشتہر کر دیتی ہیں جو راز رکھے جانے کے لائق ہوتی ہیں۔

اندھیرا چھا گیا۔ ہاسٹل کی جانب سے گاؤں بھیجا جانے والا آدمی ابھی واپس نہ لوٹا تھا کہ بلقیس آگئی۔ چوکیدار کے بیان کے مطابق وہ حسبِ معمول ہاسٹل کے صدر دروازے پر بیٹھا تھا کہ ایک کار اس سے کچھ فاصلے پر آکر رکی۔ کار کا اگلا دروازہ کھلا اور کسی نے تیزی سے ایک سفید سی گٹھڑی کو باہر دھکیلا اور کار آن کی آن میں آگے سے مڑ کر چلی گئی۔ چوکیدار نے اٹھ کر دیکھا تو وہ سفید سی گٹھڑی بلقیس تھی۔

جب بلقیس کے آنے کا شور مچا تو لڑکیاں اپنے کمروں سے برآمدوں میں نکل آئیں۔ سب کے ساتھ میں نے بھی بلقیس کو دیکھا۔ وارڈن اور ان کی معاون اسے سہارا دیے دفتر کی طرف لے جا رہی تھیں۔ بلقیس کا سر ننگا تھا، بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھوں میں دوسروں کو سہما دینے والی وحشت تھی۔ اس کا لباس جا بجا پھٹ چکا تھا۔ وہ برہنہ سر ہی نہیں برہنہ پا بھی تھی۔ وارڈن اسے منتظمِ اعلیٰ کے دفتر میں لے گئیں۔

ہاسٹل کے کمروں میں بتیاں بجھنے سے قبل ہاسٹل کے باوثوق ذرائع سے یہ خبر آگ کی طرح ہاسٹل میں پھیل چکی تھی کہ بلقیس آگ کے اس کھیل کی نذر ہو گئی تھی جس کے دو مرکزی کرداروں میں سے ایک وہ خود تھی تو دوسرا رشید احمد تھا۔

رات کو نہ جانے کس پہر بلقیس کا باپ ہاسٹل پہنچا۔ اگلی صبح جب ہم جاگے تو بلقیس ہاسٹل سے جا چکی تھی۔ ہم نے سنا رات کی تاریکی میں بلقیس کا باپ گاؤں سے شہر پہنچا اور اسی تاریکی میں بلقیس کو گاؤں واپس لے گیا تھا۔ رسوائی کے خوف سے اس نے مجرم کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ رشید احمد کو کالج کی انتظامیہ نے بس اتنی سزا دی کہ اسے کالج کی یونین کی عہدے داری سے ہٹا دیا گیا مگر میرے دل میں اس واقعے نے مرد کے خلاف نفرت کو شدید تر کر دیا۔ میں جب بھی رشید احمد کا مکروہ چہرہ دیکھتی، مجھے برہنہ سر اور برہنہ پا بلقیس کی آنکھوں میں امڈتی وہ وحشت یاد آجاتی جسے دیکھ کر ہاسٹل کی لڑکیوں نے کان پکڑ لیے تھے۔ بے شک آگ کے کھیل میں بلقیس خود بھی شریک تھی لیکن اس کی بھی تو حد ہوتی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف تھا کہ جرم کرنے والا تو دندناتا پھرے اور غلطی کرنے والی زندہ درگور کر دی جائے۔ جرم اور غلطی میں بہرحال ایک نمایاں فرق ہوتا ہے، اس فرق کو سزا میں بھی نمایاں ہونا چاہیے۔

انٹر کے بعد کالج کے مشورے پر میں نے آنرز کرنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ میرے سابقہ کالج کے چند ہم جماعت لڑکے اور لڑکیاں یونیورسٹی میں بھی میرے ساتھ تھے۔ نئے ساتھیوں کو انھوں نے جلد ہی میرے سیاق و سباق سے آگاہ کر دیا یعنی میں مغرور اور خود سر تھی۔ وہ نہ بھی بتلاتے تو میری روش میرے نئے ساتھیوں کو از خود یہ نتائج اخذ کرنے پر مجبور کر دیتی۔ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے بعد بھی میری روش میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ میں سب سے الگ تھلگ رہتی، اپنے ساتھیوں سے ضرورتاً یا مجبوراً ہی بات کرتی، بہترین ملبوسات زیب تن کرتی، اساتذہ سے بدستور بے دھڑک سوال کرتی اور یونیورسٹی کے لڑکوں کو خواہ وہ میرے ہم جماعت ہوں یا سینیئر ہوں قطعاً اہمیت نہ دیتی۔ میں سابقہ ہاسٹل سے یونیورسٹی گرلز ہاسٹل میں منتقل ہو چکی تھی مگر بلقیس کو میں اپنے ذہن سے محو نہ کر پائی تھی۔ مجھے جب بھی اس کا پتھر چہرہ اور وحشت زدہ نگاہیں یاد آتیں میرا جی چاہتا دنیا کے سارے مردوں کو آدھا زمین میں گڑوا کر انھیں دُرّوں

کے حوالے کر دوں۔

زندگی مجھے اپنے سامنے بے بس محسوس ہوتی تھی میں جس طور چاہتی تھی زندگی بسر کر رہی تھی۔ کوئی حاکم نہ ہونے والا تھا۔ میں نے طے کیا تھا کہ خود مختار رہوں گی کسی کو اپنے نزدیک نہ آنے دوں گی۔ ممی اور کاکا کی زندگیوں کے المیوں کو اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپا کر مردوں سے شدید نفرت کرنے کی کوشش میں کر رہی تھی۔ کوئی نہ تھا جو مجھے میرے اس راستے پر چلنے سے روک سکتا ہاں البتہ جب میں تعطیلات میں گھر جاتی اور کاکا سے باتیں ہوتیں تو وہ اکثر بڑی تشویش سے کہتیں۔

"میری جان! مجھے تمھاری باتوں سے کبھی کبھی بڑا ڈر لگنے لگتا ہے۔"

میں کاکا کی بات پر مسکرا دیتی۔ "کاکا جی! میں اتنی خوفناک تو نہیں۔"

"مشکل تو یہی ہے کہ تو خود تو بہت پیاری ہے مگر تیری باتیں خوفزدہ کر دینے والی ہیں۔"

"آپ کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، میں مردوں سے تلوار اور بندوق لے کر دوبدو لڑنے تو جا نہیں رہی ہوں، جو کچھ پاپا نے ممی کے ساتھ کیا اور جو آپ کے ساتھ ہوا اس کا بدلہ لینے کے لیے میں کوئی عملی انداز بھی اختیار نہیں کرنا چاہتی ہیں تو مردوں سے نفرت بلکہ شدید نفرت کرنا چاہتی ہوں اور بس... میرا خیال ہے کاکا کسی سے انتقام لینے کی اس سے بدترین صورت کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ آپ اسے انتہائی ذلیل، کمینہ، مکار، عیار، ناقابلِ اعتبار اور قابلِ نفرت سمجھیں۔ کیوں کاکا جی؟"

ایک بار تو کاکا میری یہ بات سن کر گمبھیر سوچ میں پڑ گئیں لیکن جب اگلی تعطیلاتِ گرما میں گھر گئی اور ایک موقع پر میں نے کاکا کے سامنے یہی مسئلہ دہرایا تو وہ بولیں: "بیٹا! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ غلطی ایک فرد کرے اور آپ اس کی سزا دوسروں کو بھی دینے کی کوشش کریں... نہیں... نہیں جان تمھارے اس فلسفے سے میں کلی طور پر متفق نہیں ہوں۔ ایک کا بدلہ سب سے نہیں لیا جانا چاہیے... ویسے بھی بیٹا! ایسے تو ہمارے مقدر میں کاتبِ تقدیر نے لکھے ہوتے ہیں، انھیں دوسروں پر مسلط نہیں کرنا چاہیے۔"

"کاکا جی! آپ نہیں جانتیں مرد سب کے سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"اچھا! میں نہیں جانتی اور تم سب کچھ جانتی ہو۔" کاکا نے شاکی لہجے میں کہا۔

"جی۔"

"حسن اور رشتے میں بڑا کون ہے؟ میں یا تم؟"

"عمر سے کوئی بڑا نہیں ہوتا۔ بڑا ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سارا کھیل تجربے کا ہوتا ہے۔ کالج کے دو برس اور اب یونیورسٹی کا تیسرا سال، یعنی صرف چار پانچ برسوں میں اتنا کچھ سیکھا ہے کہ بتا نہیں سکتی اور جو کچھ میں نے اب تک سیکھا ہے، اس کا نچوڑ یہی ہے کہ مرد قابلِ نفرت ہے... مجھے مردوں سے نفرت ہے کاکا... آئی رئیلی ہیٹ دیم۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھیں کس طرح سمجھاؤں... تم سے کیا کہوں۔" کاکا اپنا سر بے بسی سے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بولیں۔

"آپ زبان سے کچھ نہ کہیں، تب بھی آپ کا چہرہ سب کچھ کہہ دیتا ہے۔" میں نے بڑا ہی دانش مندانہ اندازِ تکلم اختیار کرنے کی کوشش کی۔

"کیا... وہ کیا کہہ دیتا ہے میرا چہرہ؟"

"یہی کہ اس چہرے سے خوشیوں کے سارے رنگ چھین کر اسے اداسی کا رنگ دینے کا سہرا بھی ایک مرد کے سر ہی جاتا ہے۔"

کاکا نے تڑپ کر میری جانب دیکھا اور آن کی آن میں، میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو چمکتے دیکھے۔ اپنے دوپٹے کا آنچل دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت پر لپیٹتے ہوئے وہ مضطربانہ اپنا زیریں لب دانتوں سے چبانے لگیں۔ میں نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ "اماں! ذرا دیکھیں تو کیسی نیلی نیلی ہو گئی ہیں آپ کی کلائیاں۔"

"ارے نہیں۔" کاکا نے ہنسنے کی کوشش کی مگر ان کی ہنسی میں دل گرفتگی کا رنگ غالب تھا۔

"پتا ہے کیا کاکا جی، میرا جی چاہتا ہے آپ کو پھر سے پہلے کی طرح دیکھوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں آپ کو پہلے کی طرح ہنستے مسکراتے اچھے اچھے شوخ رنگ کے ملبوسات پہنے، خوشبوؤں میں بسے، پانی، ہریالی، پہاڑوں اور موسیقی سے عشق کرتے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"تم یہ جتانا چاہتی ہو کہ میں اب بوڑھی ہو گئی ہوں؟" کاکا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"جناب! بوڑھے ہوں آپ کے دشمن۔"

"تو پھر کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"میرا مطلب ہے کہ آپ نے اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ بالکل بے پروا ہو گئی ہیں آپ اپنے آپ سے۔ ہر بار جب میں چھٹیوں میں گھر آتی ہوں تو آپ پہلے سے زیادہ کمزور نظر

"اوہ! اب سمجھا۔ ہاں بھئی یہ بیداری نہیں ہونا چاہیے۔"
ڈاکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"آپ اطمینان رکھیں جی۔"

پھر کافی دن کاکا کا علاج چلتا رہا اور میں اپنے اس پروگرام کے مطابق جو میں شہر سے اپنے ساتھ لے کر چلی تھی گاؤں کی عورتوں کی بہبود کے کاموں میں لگ گئی۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی حویلی کے عقبی حصّہ میں واقع کئی کمروں میں سے ایک کمرے میں سلائی کڑھائی سکول کا قیام تھا۔ گو میری خواہش تو یہی تھی کہ آغاز کار تدریس سے ہوتا کیونکہ قرآن مجید نے بھی تو پہلے نبی کو پہلا حکم یہی بھیجا تھا کہ پڑھو۔ مگر دقت یہ تھی کہ گاؤں کی عورتوں کو الفاظ اور اعداد کی جانب مائل کرنے کی نسبت سلائی کڑھائی کی طرف راغب کرنا زیادہ آسان تھا۔ مجھے یقین تھا وہ اس میں زیادہ دلچسپی محسوس کریں گی اور انہماک سے کام کریں گی اور یہی ہوا بھی۔ گاؤں کے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر غلام حسین کی بڑی بیٹی زینب کے بارے میں مجھے کسی کی زبانی علم ہوا تھا کہ وہ سلائی کڑھائی میں مہارت ہی نہیں سند بھی رکھتی ہے۔ ماسٹر غلام حسین تین سال قبل نزدیکی قصبے میں واقع ایک پرائمری اسکول سے تبادلے کے بعد گاؤں آئے تھے۔ زینب ان کی چار بیٹیوں میں سب سے بڑی تھی۔ تیس چوبیس سالہ زینب تئیس برس کی عمر میں شادی کے چند ماہ بعد ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ سسرال والوں نے اس کے تمام اسباب پر قبضہ جما کر اسے عدت کے دوران ہی میکے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ باپ کے گھر آنے کے بعد زینب نے قصبے کے سلائی اسکول میں داخلہ لے کر سلائی کڑھائی کا دو سالہ کورس کیا تھا اور سند حاصل کر رکھی تھی۔ سو مجھے گاؤں میں قائم کردہ اپنے سلائی کڑھائی اسکول میں استانی کے فرائض سرانجام دینے کے لیے زینب انتہائی مناسب لگی۔ پانچ روپیہ ماہانہ فیس مقرر کی گئی۔ ادارے کا افتتاح ہم نے کاکا کے کانونٹ پرنسپل سے کروایا اور کام شروع کر دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کی متعدد لڑکیاں اور عورتیں سلائی کڑھائی سیکھنے کے لیے آنے لگیں۔ زینب کی ماہوار تنخواہ میں ابتدائی دو ماہ مجھے اپنی جیب سے کچھ پیسے ڈالنے پڑے پھر تو سلائی کڑھائی سیکھنے والیوں کی تعداد بتدریج اتنی بڑھی کہ انہی طالبات میں سے ایک ایسی لڑکی کو جو بقول زینب دوسروں کی نسبت زیادہ تیزی سے کام سیکھ رہی تھی زینب کی مددگار کے طور پر رکھنا پڑا اور دو ماہ میں ایک مددگار کا اضافہ کر دیا گیا۔ کلاسیں صبح سے شام تک جاری رہتیں۔ لڑکیاں اور عورتیں اپنی سہولت کے مطابق سکول آ جاتیں اور کام سیکھتیں۔ رفتہ رفتہ ہم نے اس سکول کو ایک دستکاری اسکول میں تبدیل کر دیا۔ حویلی کے عقبی رخ پر واقع کمروں میں سے چار کمرے اس دستکاری اسکول کے لیے وقف ہو چکے تھے۔ مختلف دستکاریاں جاننے والی گاؤں کی چند عورتوں کا جزوقتی استانیوں کے طور پر انتخاب کیا گیا جو قلیل مشاہرے کے عوض مختلف دستکاریاں سیکھنے کی خواہشمند عورتوں کو ہنر سکھانے لگیں۔ سلائی کڑھائی کے علاوہ چٹائیاں بننا، رنگ برنگے دستی پنکھے، چنگیریں، چھابیاں، موڑھے، آرائشی مصنوعات اور مٹی کے سادہ برتنوں پر رنگین نقش و نگار بنانا، شیشے اور کروشیے کا کام وغیرہ بھی سکھایا جاتا۔ ساتھ ہی سیکھنے والیوں کو میں یقین دلاتی کہ مختلف ہنر سیکھ کر وہ گھر بیٹھے آمدنی میں اضافہ کر کے گھر میں خوشحالی لا سکتی ہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اس سلسلے میں میں ان کی خاطر خواہ مدد کو تیار ہوں بشرطیکہ وہ پہلے پوری ہنرمندی اور مہارت کے ساتھ دستکاریاں سیکھ لیں۔ بالواسطہ طور پر میں گاؤں کی عورتوں کو گاہے گاہے تعلیم کی اہمیت سے بھی آگاہ کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ دبی زبان سے میں انہیں یہ باور کرانے کی کوشش بھی کرتی کہ انہیں مردوں سے کچھ زیادہ توقعات نہیں رکھنا چاہئیں بلکہ خود اپنے اوپر انحصار کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں میں اپنے لہجے میں زیادہ شدت اور سختی اس لیے نہ لا سکتی تھی کہ میری اس قسم کی باتوں پر اگرچہ گردنیں "آپ ٹھیک کہتی ہو بی بی صاحب" کے انداز میں ہلتی تھیں، تو زیادہ تر چہروں پر "لو بھلا ہم نے مردوں سے امیدیں نہیں باندھنی۔ ان پر بھروسہ نہیں کرنا تو بھلا کس پر کرنا ہے" قسم کے ناگوار تاثرات بھی نظر آنے لگتے تھے۔ بہرحال میں مایوس نہ تھی۔ مجھے یقین تھا ناگوار تاثرات والی یہ عورتیں بھی ایک نہ ایک دن مردوں کے حوالے سے اپنے دکھوں، مسائل اور مردوں کی جانب سے ہونے والی ناانصافیوں کی داستانیں بالکل اسی طرح مجھے سنائیں گی جیسے میری حمایت میں گردنیں ہلانے والی دکھی اور مظلوم عورتیں مجھے سنا کر اپنے دلوں کا بوجھ ہلکا کیا کرتی ہیں۔ مردوں کی ستائی ہوئی دکھی عورتیں میرے لیے بڑا ذہنی سہارا تھیں۔ جب وہ اپنے باپوں، شوہروں اور بیٹوں کی جانب سے ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کے قصے سناتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتیں اور ایسے قصوں کے اختتام پر اپنی اوڑھنیوں میں منہ چھپا کر سوں سوں کرنے لگتیں تو میں ان کی [illegible] کے سروں پہ ہاتھ دھر دیتی یا دلاسا دینے والے انداز میں ان کا شانہ تھپتھپانے لگتی۔ جو عورت مرد ذات کو جس قدر برا بھلا کہتی، جتنی گالیاں دیتی میں اس سے اسی قدر خوش ہوتی۔ ایسی عورتوں کے سامنے میں دبی زبان سے نہیں کھلی زبان سے مردوں کو برا کہتی اور وہ میری ہاں میں ہاں ملا کرتیں۔

"ہاں جی! مرد سارے ہی ایسے ہوتے ہیں۔ آپ کچی ہستی دیکھی جی! ان کا تو اعتبار ہی نہیں کرنا چاہیے۔"

پھر کسی [illegible]

سلاموں کے خلاف نئے سرے سے شکایات و حکایات کا دفتر کھل جاتا۔

کاما صبح سے شام تک گاؤں کی عورتوں میں گھری رہتی اور جیسے جیسے ان کی امکان بالی اپنے مشن کو پورا کرنے میں حویلی کا صدر دروازہ دن بھر کھلا رہنے لگا۔ اکثر کی اور کبھی کبھی کاکا بھی حویلی کے عقبی حصے میں نکل آتیں اور عورتوں کو ہنر سیکھتے، کام کرتے اور اپنی اپنی کتھائیں سناتے دیکھتے اور سنتے تھکتیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بی بی جان ان مصروفیات اور گاؤں میں میری مقبولیت سے بہت خوش تھیں مگر کاکا کچھ زیادہ خوش نہ تھیں بلکہ کبھی کبھی تو وہ باقاعدہ پریشان نظر آنے لگتی تھیں۔

"عالی! یہ کیا جھنجٹ لگا لیا ہے تم نے اپنی جان کو؟" ایک روز کاکا نے مجھ سے کہا۔

"جھنجٹ! آپ سروس کو میرا مطلب ہے، خدمت کو جھنجٹ کہہ رہی ہیں! کیا آپ نے نہیں سنا کہ خدمت بھی عبادت ہے؟"

"بے شک خدمت عبادت ہے مگر میری جان! ایک حد تک خود کو نظر انداز مت کرو ورنہ..." کاکا کہتے کہتے رک گئیں۔

"ورنہ کیا؟"

"کچھ نہیں۔" کاکا نظریں چرانے لگیں۔

"بتائیے نا ورنہ کیا؟"

"ورنہ تھک جاؤ گی بہت جلدی اور بہت بری طرح۔"

"نہیں... کبھی نہیں... کبھی نہیں کاکا... میں جلدی تھک جانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ابھی تو آغاز کار ہے، ابھی تو ہم ہنر مند عورتوں کی کھیپ تیار کر رہے ہیں۔ جب یہ اپنے اپنے فن میں مہارت حاصل کر لیں گی تو ہم ان سے مال تیار کروائیں گے اور منڈیوں میں بھیجیں گے۔ میرا مطلب ہے بازاروں میں۔ عورتوں کے خود کفیل ہو جانے سے بڑا فرق پڑے گا کاکا..."

"مثلاً؟"

"مثلاً خوش حالی آئے گی۔ وہ مردوں کی محتاج نہیں رہیں گی۔ مرد انھیں ڈرا دھمکا نہیں سکیں گے۔ انھیں جانوروں کی طرح پیٹنے کی ہمت نہیں کر سکیں گے۔ آخر کو وہ خود کفیل جو ہوں گی۔" میں نے خاصے جذباتی لہجے میں کہا۔

کاکا میری بات سن کر معذرت خواہانہ انداز میں مسکرا دیں یوں جیسے انھیں میرے جذباتی مکالمے سے ناپختگی اور حماقت کی بو آئی ہو۔

"جلد ہی ہم گاؤں کی عورتوں کے لیے اردو پڑھنا لکھنا اور جمع تفریق، ضرب تقسیم کا چھوٹا موٹا حساب کتاب سکھانے کی کلاسیں بھی شروع کرنے والے ہیں تاکہ وہ ایک بیسی، دو بیسی اور چار بیسی کے چکر سے نکل سکیں۔ کیسا المیہ ہے کہ گاؤں کی عورتیں قطعاً جاہل رکھی جائیں۔ ہم انھیں لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب کرنا سکھائیں گے تاکہ انھیں دین و دنیا کا کچھ تو ہوش ہو سکے۔"

"عالی! ایک بات بتا دوں تمھیں، گاؤں والیاں ہنر سیکھنے کی جانب تو بہ آسانی راغب ہو سکتی ہیں۔ وہ تمھارے لیے اجرت پر ایسا مال بھی تیار کرنے کو آمادہ ہوں گی جو شہروں میں فروخت کے لیے بھیجا جائے گا مگر پڑھنے لکھنے کی جانب تم انھیں اس قدر آسانی سے ملتفت نہ کر سکو گی۔"

"چلیے مشکل ہی سے سہی مگر ہم انھیں آمادہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ انھیں لکھنا پڑھنا سیکھنے کے فائدے سمجھائیں گے۔ سمجھانے سے بہت فرق پڑتا ہے۔"

"تے الف تالام الف لا، تالا اور بے الف با جیم الف جا، باجا کی گردان کرنے والی عورتوں کے مرد تمھاری جان کو آ جائیں گے۔"

"ہنہہ، مرد، مائی فٹ۔ میں انھیں اپنے جوتے کی نوک پر بھی نہیں سمجھتی۔ میں عورتوں کو انہی کے مقابلے پر تولانا چاہتی ہوں۔ میری یہ ساری تگ و دو انہی کے خلاف تو ہے۔"

"لیکن ابھی تو تم اسے خدمت کا نام دے رہی تھیں۔" کاکا نے مسکراتے ہوئے گہری نگاہوں سے میری [illegible] دیکھا۔

میں لاجواب ہو کے رہ گئی۔ میرے پاس [illegible] کوئی چارہ نہ رہا، سوائے اس امر کے کہ میں نے سر جھکا کر کہا۔ "کاکا جی! آپ تو جانتی ہیں کہ میری زندگی کا مشن کیا ہے۔"

"اگر میں کہوں کہ نہیں جانتی تو؟"

"تو میں کہوں گی، مردوں سے نفرت اور اس نفرت کا حتی الوسع پرچار۔"

کاکا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایک گہری سانس کھینچنے کے بعد بولیں۔ "میری جان! نفرت دکھ کے سوا کبھی کچھ نہیں دیتی، نہ خود جیسے کو نہ دوسروں کو۔"

"کاکا جی! میں آپ کی طرح نہ تو وسیع القلب ہوں نہ اعلیٰ ظرف۔"

کاکا نے اپنا دوسرا ہاتھ میرے سر پر دھر دیا اور بولیں۔ "میری دعا ہے کہ تمھیں کبھی کوئی دکھ نہ ملے۔"

❀

حویلی کے دستکاری اسکول میں سلائی کڑھائی اور مختلف دستکاریاں سیکھنے والی عورتوں کی پہلی ہنر مند کھیپ عملی میدان میں اترنے کے لیے تیار تھی اور اب وہ منتظر تھیں کہ کب ان کی بافتہ اور دستکاری کا ثمر انھیں ملنا شروع ہوتا ہے۔ میں نے انھیں باور کرا رکھا تھا کہ جب وہ ہنر سیکھ لیں گی تو ہم ان سے اجرت پر مال تیار کروا کے بازاروں میں بھیجیں گے اور یوں وہ خود کفالت اور خوش حالی کی منزل سے ہمکنار ہو سکیں گی۔ پروگرام کا یہ مرحلہ میرے

سامنے آیا تو مجھے اس امر کا احساس ہوا کہ اس مرحلے پر میرے
لیے اگر راہ کچھ دور تک آسان و ہموار تھی تو آگے دشوار گزار بھی
تھی۔ جگہ کی ہمیں کوئی کمی نہ تھی۔ حویلی کے جتنے رُخ پر ہی ہنوز کئی
کمرے مقفل پڑے تھے جتنے رُخ پر ہی وسیع و عریض برآمدہ تھا۔
ضرورت پڑنے پر ہم حویلی کے دوسرے حصے بھی استعمال میں لا
سکتے تھے۔ مختلف دستکاریوں کے لیے خام مال اور اوزار و آلات
کی فراہمی بھی دشوار نہ تھی۔ نانی اماں کی چھوڑی ہوئی اراضی کی آمدنی
جس کا حساب کتاب رکھنے پر اللہ وسایا مامور تھا، ہمیں خوش حال
رکھنے کے لیے بہت تھی۔ امی میری ہر خواہش پوری کرنے کے
لیے تیار رہتی تھیں اور کالج کی تنخواہ تو گویا تھا ہی میرا جیب خرچ۔
جب تک میں شہر میں رہی کاکا گاہے گاہے سوغاتیں بھجواتے
کے علاوہ ماہوار جیب خرچ بھی کبھی ٹی ٹی کے ذریعے اور کبھی منی آرڈر
کے ذریعے ارسال کر دیا کرتی تھیں۔ جب سے میں فارغ التحصیل
ہو کر گھر لوٹی تھی تنخواہ پاتے ہی وہ اپنی آدھی تنخواہ مجھے دے دیا
کرتی تھیں۔ میں منع کرتی تو وہ کہتیں۔

"اچھا بتاؤ پھر میں کیا کروں ان پیسوں کا؟"

"خود خرچ کیجیے یا سنبھال کر رکھیے بڑھاپے میں کام آئے
گا۔" میں مسکرا کر کہتی۔

"خرچ کہاں کروں سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ گھر کا خرچ تمھاری
ممی چلاتی ہیں انھیں دیتی ہوں تو وہ کہتی ہیں کہ ضرورت نہیں بلکہ جب
اللہ وسایا زمینوں کا حساب کتاب لے کر لوٹتا ہے تو آپا جی
خاصی رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتی ہیں حالاں کہ میں بھی تو
جمع کرتی ہوں۔ رہی بات بڑھاپے کے لیے سنبھال کر رکھنے کی تو
میری جان ؎ کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک"

تو یوں اپنے پروگرام کے دوسرے مرحلے پر مجھے پیسے کی بھی
کوئی تنگی نہ تھی۔ ہاں البتہ مسئلہ تھا تو یہ کہ دستکاریوں کے نمونے
بازار میں کیوں کر پہنچیں گے؟ آرڈر کیسے لیے جائیں گے؟ بعد میں
تیار شدہ مال بازار میں کیوں کر پہنچایا جائے گا؟ بنیادی اہمیت
کے ان سوالات میں کیوں کر اور کیسے کا استعمال تو میں [illegible]
کیا کرتا تھا ورنہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ کون یہ سارے کام نمٹائے
گا؟ [illegible] میں مجھے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ تمام
مراحل پر مردوں سے سابقہ پڑے گا اور ایک اکیلی [illegible]
کی طرح مجھے بھی وقت سے [illegible] اور خوش گفتاری کو اہمیت
دینا ہو گی تب ہی کامیابی ممکن ہو سکے گی۔ اور یہی میرے لیے سب سے
بڑی مشکل تھی کہ مردوں سے تو مجھے نفرت تھی۔

پہلا کام تو کسی حد تک آسان تھا۔ پروگرام کے دوسرے
مرحلے کا پہلا حصہ یعنی نمونہ دستکاریاں جنھیں میں نے
خود کفالت اور خوش حالی کے خواب دکھائے تھے کیا کہتیں؟ اور وہ
جن کے باپ، بھائی اور شوہر یا بیٹے انھیں تنگ دست رکھتے
تھے اور جنہیں میں نے "گاؤں والیو! میں تمھارے سروں پر ہاتھ دھرتے
ہوئے انھیں یقین دلایا تھا کہ بس کچھ عرصے کی پریشانی اور ہے
پھر ان کے دلدّر دور ہو جائیں گے" وہ بھلا کیا سوچتیں؟ مرد ذات
کو تو وہ بعد میں ناقابلِ بھروسا سمجھتیں پہلے تو مجھ پر ہی سے ان کا
اعتبار اٹھ جاتا۔ سو اپنے پروگرام کے دوسرے مرحلے پر عمل درآمد
کے لیے میں نے ایک جانب تو دستکاریوں کے نفیس اور عمدہ
نمونے تیار کروائے اور دوسری جانب شہر سے شائع ہونے والے
ایک موقر روزنامے میں کچھ اس قسم کے مضمون کا اشتہار شائع کرایا
کہ ان دستکاریوں کی خرید اور ٹھیکے پر سلائی دینے کے خواہش مند
حضرات یا پارٹیاں اس فون نمبر پر رجوع کریں۔ اخبار میں حویلی کا پتا
دینے کے بجائے میں نے فون نمبر شائع کرانا مناسب سمجھا۔ اس
اشتہار کے جواب میں کوئی قابلِ ذکر صورت حال سامنے نہ آئی مجھے
خاصی مایوسی ہوئی مگر میں نے چند دن انتظار کے بعد دوبارہ اسی
مضمون کا اشتہار شائع کروایا۔ فیصل آباد سے دو اور لاہور سے
ایک فون آیا۔ تینوں پارٹیاں روایتی دستکاریوں والا سامان تیار
کروانے اور خریدنے میں تو دلچسپی رکھتی تھیں مگر سلائی دینے
کی بات کسی نے نہ کی بلکہ مذکورہ پارٹیوں میں سے ایک نے فون
پر بات کرتے ہوئے کہا، "جی شہر والے گاؤں کی عورتوں کی
سلائی کڑھائی کہاں پسند کریں گے۔ شہر میں ایک سے ایک
کاریگر بیٹھا ہے۔" بات غلط نہ تھی۔ تاہم میں ان عورتوں کو
مایوس نہ کرنا چاہتی تھی جنھوں نے اس آس میں بڑے
ذوق شوق سے سلائی سیکھی تھی کہ جب وہ سلائی سیکھ لیں گی
تو سلائی مشینیں نوٹ کمانے کی مشینیں بن جائیں گی چنانچہ انھیں میں
نے بڑے پیار سے مشورہ دیا کہ ہنر تو ان کے ہاتھ میں آ ہی چکا
ہے۔ وہ نہ صرف اپنے گاؤں بلکہ آس پاس کے علاقوں میں بھی
گھر گھر جا کے سلائی اکٹھی کریں اور دستکاری، سکول کی [illegible]
پر کپڑے سئیں۔ میرے اس مشورے پر بعض عورتوں نے جو شاید
بہت ضرورت مند نہ تھیں، [illegible] منہ بنائے
اور اپنے گھر بیٹھ رہیں لیکن ضرورت مند عورتوں نے
میرے مشورے پر عمل کیا اور انھیں تھوڑی سی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ضرورت مند عورتوں کے لیے اتنا دلاسا ہی بڑی [illegible] تھی۔
چنانچہ جلد ہی میں نے دستکاریوں کے نمونے جو [illegible]

تیار رکھے تھے فیصل آباد اور لاہور کی پارٹیوں کو جواب دے [illegible]
نے یہ خدمت سرانجام دی اور دبئی پر وہ تینوں پارٹیوں سے
آرڈر نہ لے کر آیا تو کچھ بڑے آرڈرز تو نہ تھے مگر دوروں کی ہمت
افزائی ضرور ہوئی۔ ابھی سامان تیار ہو ہی رہا تھا کہ میں نے اخبار میں پھر
اشتہار شائع کروا دیا۔ اب کی بار دو فون آئے اور دونوں کراچی
سے۔ ان میں سے ایک فون تو کراچی کے ایک بارونق بازار سے
پاکستان بھر کی روایتی دستکاریاں کے ایک بڑے شوروم کے مالک
نے کیا تھا۔ دوسرا ایک مقامی فرم کی جانب سے تھا جو پاکستان کی
روایتی دستکاریاں ممالک غیر کو برآمد کرتی تھی اور بقول فون کرنے
والے کے مذکورہ فرم بڑے پیمانے پر مختلف علاقوں سے سامان
تیار کرواتی تھی۔ میں نے دونوں کو نمونے بھجوائے۔ شوروم والے
صاحب نے تو صرف دو تین آئیٹمز میں دلچسپی ظاہر کی جبکہ مذکورہ
فرم کی جانب سے خاصا حوصلہ افزا جواب ملا۔ انھوں نے معاملات طے
کرنے کے لیے بالمشافہ ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ گو کہ پیشکش بڑی
تھی مگر میں اس مسئلے کو اپنی راہ کی رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہتی تھی
تھی اور کاکا سے مشورہ کیا تو کمی نے کہا: "تمہیں کام کو زیادہ بڑھانے
اور پھیلانے کی ضرورت کیا ہے۔ بس تھوڑا تھوڑا کام کرتی جاؤ۔"
تاہم کاکا نے میری حوصلہ افزائی کی اور بولیں۔ "جب تم میدان
میں کودی ہو تو مقابلہ بھی کرو۔ پارٹیز سے ملو اور بات چیت کرو۔"

"یہ میرے بس کی بات نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں مردوں سے بات نہیں کر سکتی۔"

"کر تو سکتی ہو یہ کہو کہ کرنا نہیں چاہتیں۔"

"آپ یہی سمجھ لیں۔"

"ہوں۔" کاکا ایک طویل سانس لیتے ہوئے سوچ میں پڑ گئیں۔
پھر کچھ وقفے سے بولیں۔ "اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ایک ایسا آدمی رکھ لو جو تمہاری جانب سے پارٹیز سے
معاملات طے کرے۔"

"مشورہ تو اچھا ہے۔"

"مگر ایک مسئلہ پھر بھی رہے گا۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible] مسکراہٹ چھپ گئی۔

"لیکن ایسا آدمی ملے گا کہاں سے؟"

"بہت آسان ترکیب ہے۔"

میں نے استفہامیہ نگاہوں سے کاکا کی جانب دیکھا۔

"اخبار میں ایک اشتہار شائع کروا دو کہ ہمیں دستکاریوں
کی سیل اینڈ مارکیٹنگ کا تجربہ رکھنے والے ایک آدمی کی ضرورت
ہے۔ ایک نہیں متعدد امیدوار پہنچ جائیں گے تمہارے پاس۔"

"ان سب سے نمٹنا بھی ایک مسئلہ ہوگا۔"

کاکا مسکرا دیں اور مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے
بولیں۔ "مردوں سے نفرت کا دعویٰ رکھنے والی لڑکی کو تو مردوں کا
مقابلہ بے جگری سے کرنا چاہیے۔"

"میں انھیں برداشت نہیں کر سکتی کاکا..... آئی ہیٹ دیم
...نفرت ہے مجھے مردوں سے۔"

"لیکن میری جان! اب اس کا کیا علاج کہ تم جس میدان میں اتری
ہو وہاں مردوں کی اجارہ داری ہے۔ بزنس بنیادی طور پر مردوں کا
شعبہ ہے۔ مارکیٹ پر وہی چھائے [illegible] حیثیت پر انھی
کی اجارہ داری ہے۔ اگر تمہیں اس میدان [illegible] ہے تو مردوں
سے تو سابقہ ضرور پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے ہم ایک آدمی [illegible] رکھ لیں گے جو پارٹیز سے
ڈیل کرے گا۔"

"ہوگا وہ بھی ایک مرد ہی۔"

"ظاہر ہے۔" میں نے شکست خوردہ سی آواز میں کہا۔

"بس تو دے ڈالو اخبار میں ایک اشتہار۔"

"جو امیدوار آئیں گے ان سے انٹرویو آپ کریں گی۔"

"تمہیں ڈر لگتا ہے کیا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔

کاکا نے مجھے جھنجلاتے دیکھا تو بڑی رسانیت سے
بولیں۔ "او کے میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر دوں گی مگر ایک
شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"تمہیں میرے انتخاب پر بھروسا کرنا ہوگا۔"

"بالکل۔"

کاکا کے مشورے اور رہنمائی سے میں نے اشتہار تیار کیا
اور اسے ایک بڑے اخبار میں اشاعت کے لیے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] گئی تھی۔
[illegible]

کرنے۔ کاکا نے باری باری ان سب کو جانچا اور یوں بالآخر ایک امیدوار کاکا کی سمجھ میں آ گیا بلکہ سمجھ میں کیا آیا بہت ہی بھا گیا۔

"ہاں! آدمی تو میں نے تمہارے لیے ایسا کام کا تلاش کیا ہے کہ تم میرے انتخاب کی قائل ہو جاؤ گی۔ گو سیلز اینڈ مارکیٹنگ کا اسے کچھ زیادہ تجربہ نہیں مگر پڑھا لکھا، مستعد اور چاق و چوبند نوجوان ہے۔ بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز ڈگری لے رکھی ہے۔"

"اوہ، اتنے پڑھے لکھے آدمی کا ہم بھلا کیا کریں گے؟ وہ تو تنخواہ بھی زیادہ مانگے گا۔"

"تنخواہ کا تو میں نے اسے بتا دیا ہے کہ فی الحال پانچ سے چھ ہزار روپے ماہانہ مشاہرہ مل سکے گا اسے اور اس میں مزید اضافہ آئندہ حالات پر منحصر ہو گا۔"

"پھر کیا کہا اس نے؟"

"کام کرنے کو تیار ہے مگر ایک مسئلہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

"رہائش کی سہولت چاہتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ملازمت کی خاطر وہ شہر سے گاؤں آنے کو تو تیار ہے مگر اسے کوئی ٹھکانا چاہیے۔"

"رہائش اس کا اپنا مسئلہ ہے ہمارا نہیں۔ رہائش کا بندوبست وہ خود کرے۔"

"رہائش کی سہولت وہ تمہاری جانب سے چاہتا ہے۔"

"میری جانب سے؟"

"ہاں، رہائش کی سہولت کو وہ مراعاتِ ملازمت کے طور پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"آپ نے اسے بتا دیا ہوتا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔"

"نہیں، میں نے کچھ نہیں کہا کیوں کہ میں سمجھتی ہوں یہ ناممکن نہیں ہے۔"

میں نے وضاحت طلب نگاہوں سے کاکا کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ حویلی تو تمہارے پاس بہت بڑی ہے کیا حرج ہے اگر ایک کمرہ اسے دے دیا جائے؟"

"کاکا جی!" میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"آخر اللہ وسایا، ماسی بشیراں اور الف دین بھی تو رہتے ہی ہیں حویلی میں۔"

"لیکن وہ حویلی کے ملازم ہیں۔"

"وہ بھی حویلی کا ملازم ہی ہو گا۔"

میں لاجواب ہو کے رہ گئی۔

کاکا نے مجھے خاموش دیکھا تو بولیں: "ویسے ایک بات بتا دوں تمھیں کہ آدمی بہت کام کا لگتا ہے۔ بہت ہی مستعد اور باصلاحیت۔"

"اگر وہ بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز ڈگری رکھتا ہے، مستعد اور باصلاحیت ہے تو شہر میں ملازمت کا کوئی اچھا موقع تلاش کرنے کے بجائے گاؤں میں ایک ایسی ملازمت میں کیوں دلچسپی رکھتا ہے جو قطعاً عارضی اور چند روزہ بھی ثابت ہو سکتی ہے؟"

"انتہائی اہم اور منطقیانہ سوال ہے یہ... میں نے بھی اس سے یہی بات پوچھی تھی کہنے لگا مشکل راستوں پہ چلنا میرا مشغلہ رہا ہے اور دوسری بات یہ کہ گاؤں کے سادہ ماحول میں میں بڑی کشش محسوس کرتا ہوں۔"

"مسئلہ تو نہیں ہے کہیں؟"

"ارے نہیں میری جان! تم تو گئی اس سے تو میرے انتخاب کی داد دیے بنا نہ رہو گی۔ بس ذرا اس کے اس مسئلے پر غور کر دو۔ دے دو اسے کوئی چھوٹا موٹا کمرہ۔ پہلی منزل پر اب بھی دو تین کمرے تو خالی ہی پڑے ہیں۔"

"چچی سے مشورہ کرنا پڑے گا۔"

"مگر جلدی کیوں کہ میں نے اسے دو دن بعد دوبارہ بلایا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

جب میں نے چچی سے مشورہ کیا پہلے تو انھیں کچھ تامل ہوا کہ ایک اجنبی آدمی کو کیوں کر حویلی میں رہنے کی اجازت دے دی جائے لیکن جب کاکا نے انھیں اللہ وسایا اور الف دین کی مثال دیتے ہوئے سمجھایا کہ وہ بھی تو اجنبی ہیں۔ جنے کے باوجود حویلی میں رہ ہی رہے ہیں تو تھوڑی سی پس و پیش کے بعد قائل ہو گئیں۔ کاکا نے اس شخص کے "کام کا ہونے" کا مجھے اس حد تک یقین دلا دیا تھا کہ میں بھی اس کو دیکھے اور ملے بغیر ہی اسے اپنے کام کا آدمی محسوس کر رہی تھی۔

دو دن بعد جب کاکا نے اپنے انتخاب کو میرے سامنے پیش کیا تو مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ وہ خوش گفتار، خوش لباس، مستعد اور چاق و چوبند تھا۔ فر فر انگریزی بولتا تھا۔ گو سیلز اینڈ مارکیٹنگ کا اسے کچھ خاص تجربہ نہ تھا مگر وہ اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لانے کا یقین دلا رہا تھا۔ جب میں نے اس سے اس معمولی ملازمت میں دلچسپی کا سبب پوچھا تو اس

الف دین اس لڑکے کا نام تھا جسے اللہ وسایا کی ....
[illegible] کے پیش نظر میں نے کچھ عرصہ قبل ہی حویلی کی چوکیداری اور دیگر کام کے لیے رکھا تھا۔

نے مجھے بھی وہی جواب دیا جس سے کاکا مجھے پہلے ہی آگاہ کر چکی تھیں۔ گو اس کے اس جواب سے مجھے معقولیت کے بجائے جذباتیت کی بُو آئی مگر میں نے اسے ملازم رکھ لینا ہی بہتر جانا۔ وقت اور حالات کا تقاضا یہی تھا۔ مجھے ایک ایسے شخص کی جلد از جلد ضرورت تھی جو کراچی جا کر پارٹیز سے گفت و شنید کر سکے اور اس میں مجھے بہرحال یہ صلاحیت نظر آ رہی تھی۔ ابتدائی طور پر مشاہرہ ہزار روپے ماہانہ قرار پایا تھا۔ آرڈرز کے حصول اور مال کی ترسیل کے سلسلے میں آمد و رفت کے سلسلے میں سفر خرچ اور اخراجات طعام و قیام علاوہ ازیں قرار پائے۔ رہائش کے لیے حویلی کی زیریں منزل پر ایک کمرہ اسے دے دیا گیا۔

دو تین دن کے اندر ہی میں نے اسے پارٹیز سے گفت و شنید کے لیے اللہ وسایا کے ہمراہ کراچی روانہ کر دیا۔ اللہ وسایا کو اس کے ہمراہ بھیجنا میں نے اس لیے ضروری سمجھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باہر کا آدمی پکی پکائی پر پانی پھیر بیٹھے۔

آرڈرز دونوں جگہ سے ملے۔ شوروم کے مالک سے چھوٹا، فرم کی جانب سے بڑا۔ ہماری دستکاریوں کے نمونوں کی نفاست انھیں خاصی پسند آئی تھی اور انھوں نے آرڈرز دیتے وقت ہمارے نمائندوں کو یقین دہانی کرائی تھی کہ مال بروقت اور نمونوں کی طرح نفیس ہونے کی صورت میں وہ مستقل ہماری خدمات حاصل کرتے رہیں گے۔ میرے لیے یہ آرڈر ایک چیلنج تھا اور میں نے اس چیلنج سے ان عورتوں کو بھی آگاہ کر دیا تھا جن کے ہاتھوں کی مہارت ہمیں سرخرو کر سکتی تھی۔

مال تیار ہوا، کراچی پہنچایا گیا۔ مذکورہ فرم کے کرتا دھرتا نمونوں کی طرح مال کی نفاست سے بھی خوش ہوئے۔ اللہ وسایا اور وہ نوجوان جسے میں نے مال کی بازار میں ترسیل اور پھیلاؤ کے لیے ملازم رکھا تھا، نہ صرف مذکورہ شوروم اور فرم کے کرتا دھرتاؤں سے بلکہ کراچی کے معروف بازار الفی پر واقع پاکستانی دستکاریوں کی چند دکانوں اور دو فائیو اسٹار ہوٹلوں میں دستکاریوں کے شوروم سے بھی آرڈر لے کر لوٹے۔ ہمارے کام کی نفاست کو بہت پسند کیا گیا تھا۔

پھر تو سلسلہ ہی چل نکلا۔ دستکاریوں کے آرڈرز پر آرڈرز آتے رہے۔ ساتھ ہی میں نے چادروں اور تکیوں کے غلافوں کی سلائی کا کام بھی شروع کروا دیا اور نزدیکی قصبوں اور شہروں میں بھی سلائی شروع کروا دی۔ سلائی کا کام شروع کروانے کا ایک مقصد اگر یہ تھا کہ میں سلائی کرنے والی عورتوں کے لیے بھی روزگار کے ذرائع بڑھانا چاہتی تھی تو دوسرا مقصد ان عورتوں کو جو میرے پاس آنے سے پہلے گھر گھر جا کر سلائی حاصل کرتیں یا رو دھو کر گھر بیٹھ رہتی تھیں ان کی

تحفظ کا احساس دلاتا تھا۔ جلد ہی بیشتر عورتیں کام پر آنے لگیں۔ حویلی دفتر ہی نہیں فیکٹری بن گئی جہاں دن بھر رونق رہتی۔ نچلی منزل پر حویلی کے بیشتر کمرے ہمارے تصرف میں تھے۔ رہائش کی طور پر بالائی منزل اختیار کر لی گئی تھی۔ اللہ وسایا کو میں اس کی ان خدمات کے صلے میں جو وہ صرف میرے لیے انجام دے رہا تھا علیحدہ سے ماہانہ تنخواہ دے رہی تھی اور وہ بڑی خوشی اور جانفشانی سے کام کر رہا تھا۔ کاکا ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ پیسہ بڑا کام دکھاتا ہے۔ واقعی بڑی طاقت ہے پیسے میں۔ حالانکہ اللہ وسایا کی طرح گاؤں کی عورتیں بھی مجھ سے اپنی محنت ہی کا معاوضہ لیتی تھیں لیکن مجھ سے اپنے کام کی اُجرت لیتے وقت ان کے چہروں پر عجیب مسکینی کا سا تاثر آ جایا کرتا تھا۔ وہ سب کی سب اپنے آپ کو میری رعیت میں دے بیٹھی تھیں، حالانکہ میرا مقصد تو انھیں خود کفیل بنا کر ان کے مردوں کا منہ چڑانا تھا۔ کاکا کا منتخب کردہ وہ شخص جس کا نام تیمور عالم تھا، واقعی بڑے کام کا آدمی ثابت ہوا تھا۔

کام کی زیادتی میں میں کاکا کی بیماری کو بھی بھول بیٹھی۔ پہلے صبح سے شام تک کام چلتا تھا، اب رات تک ہونے لگا تھا۔ مجھے تو اب کاکا کے ساتھ چائے پیے اور کھانا کھائے کئی کئی دن گزر جاتے۔ ماسی بشیراں ٹرے سجا کر حویلی کے اسی کمرے میں پہنچا جاتی جسے میں اپنے دفتر کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ کاکا مجھے دن رات مصروف دیکھ کر اکثر تشویش کا اظہار کرتیں۔ وہ اکثر کمرے میں، جسے میں نے دفتر بنا رکھا تھا، آ جاتیں۔ کبھی چپ چاپ بیٹھی مجھے عورتوں سے نمٹتے اور انھیں ہدایات دیتے یا ان کھاتوں میں لکھتے دیکھتی رہتیں جن میں میں اپنے "کلائنٹس" اور "ورکرز" کا حساب کتاب رکھا کرتی تھی اور کبھی وہ میری شبانہ روز مصروفیات کی زیادتی پر تشویش کا اظہار کرنے لگتیں۔ ایک روز شام ڈھلے جب میں اپنی ورکرز کی اُجرتوں کے حساب کتاب سے فراغت پانے کے بعد کرسی کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں موندے کچھ دیر سستا لینے کو بیٹھی تھی کہ کاکا دبے پاؤں آ پہنچیں۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ کب وہ میرے روبرو کرسی پر آ بیٹھی تھیں۔ مجھے ان کی آواز نے چونکایا۔

"تھک گئی ہو نا؟" کاکا کی آواز میں ممتا جیسی محبت بھی تھی اور بہی خواہوں کی سی تشویش بھی۔

میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"تھک گئی ہو؟" کاکا نے بڑے پیار سے دوبارہ پوچھا۔

"نہیں... نہیں تو۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کاکا سے جھوٹ بولتی ہو؟" کاکا کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

"آپ سے جھوٹ بول سکتی ہوں بھلا؟"

"کوشش تو کر رہی ہو۔" کاکا نے بے تحری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے پھر تردید کی۔

"اوکے... مان لیتی ہوں..." کاکا نے کہا اور پل بھر کے توقف سے بولیں: "اب تو بہت دن ہو گئے تمہیں اس کھوج میں پڑے، کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اتنے بہت سے دنوں میں تم نے کیا پایا ہے؟"

میں دھیرے سے مسکرائی پھر میں نے کہا: "کاکا! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میرا اصل مقصد کیا ہے؟"

"میں تو جاننا چاہتی ہوں کہ کس حد تک تم خود کو اپنے مقصد میں کامیاب محسوس کرتی ہو؟"

"اس حد تک کہ میں نے گاؤں کی بہت سی عورتوں کو مردوں کے استبداد سے نجات دلا دی ہے۔ اب وہ مردوں کی محتاج نہیں ہیں۔ وہ اپنے پیروں پہ کھڑی ہیں اور مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی ہیں۔"

کاکا یوں مسکرا دیں جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کی ہو اور انھوں نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ کہا: "میری جان! گاؤں کی عورت مرد کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔"

"بالکل کر سکتی ہے..." میں نے احتجاجاً کہا: "رکھی کو جانتی ہیں نا آپ؟ وہی جس کا خاوند گوالا ہے۔ کم بخت اسے پائی پائی سے محتاج رکھتا تھا اور گدھے بھینس کی طرح پیٹتا تھا۔ بے چاری تنگ دست بھی رہتی تھی اور جانوروں کی طرح پٹتی بھی تھی۔ مگر جب سے اس نے پانچ چھ سو روپے مہینہ کمانا شروع کیا ہے، دبنگ ہو گئی ہے۔ بتا رہی تھی اب ہاتھ اٹھاتا ہے تو میں ہاتھ پکڑ لیتی ہوں۔ آنکھیں بگاڑتا ہے تو کہہ دیتی ہوں بگاڑتے جاؤ آنکھیں، میرا کیا بگاڑ لو گے؟ میں تو کمائی کرتی عورت ہوں اور وہ نوراں جسے اس کے خاوند کی موت کے بعد سسرال ہی نہیں میکے والوں نے بھی بے آسرا چھوڑ دیا تھا، باپ اُسے اور اس کے دو معصوم بچوں کو ناحق کے دشمن قرار دیتا تھا، بھائی اسے اور اس کے بچوں کو بوجھ سمجھتے تھے، دو ڈھائی سو روپے مہینے تک کا کام کر لیتی ہے۔ بتا رہی تھی کہ باپ بھائیوں کی زبانیں بند ہو گئی ہیں۔ بھولے سے بھی اس کے بچوں کو ٹیڑھی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ صاف کہہ دیتی ہے کہ وہ اور اس کے بچے ان کے محتاج نہیں۔ اب تو وہ الگ اپنا گھر آباد کرنے کی سوچ رہی ہے... اور... وہ سروری جو اپنے خاوند کی بدقماشیوں اور بھنگ نوشی کے سبب کئی کئی وقت بھوکی رہتی تھی اور بیٹے کی آوارگی کے باعث تنگ رہتی تھی، اب بہ آسانی اپنا اور اپنے چھوٹے بچوں کا پیٹ پال رہی ہے۔ میں نے اسے ہدایت کر دی ہے کہ اپنے خاوند کو بھنگ خریدنے اور بیٹے کو آوارگی کرنے کے لیے اپنی حلال کمائی کی ایک پائی بھی نہ دے... اور..."

لیکن اس سے پہلے کہ میں کاکا کو مقصودہ کا حوالہ دے پاتی، انھوں نے تنقیدی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولیں:

"تمہارا خیال ہے کہ گاؤں کی بہت سی عورتوں کو روزگار کی سہولت بہم پہنچا کر تم مردوں کے خلاف عورتوں کی ایک جماعت تیار کر رہی ہو؟"

"جی ہاں۔" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

کاکا ایک بار پھر مدبرانہ انداز میں مسکرا دیں اور بولیں: "شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ تم کتنی بھولی ہو۔"

میں نے چونک کر استفہامیہ نگاہوں سے کاکا کی .... جانب دیکھا۔

"میری جان! تم تو اتنی بھولی ہو کہ نفرت اور محبت میں بھی تمیز نہیں کر سکتیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ گاؤں کی بہت سی عورتوں کو خود کفالت اور معاشی خوش حالی کی منزل سے روشناس کرا کے تو تم نے ان کے مردوں کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ جو عورتیں اور لڑکیاں تمہارے پاس کام کر رہی ہیں، ان کے گھر کے مرد تو خوش ہیں کہ ان کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ تم بہت سی عورتوں کو مردوں کے خلاف اکسانے میں کامیاب ہو چکی ہو، نہیں، حقیقت میں ایسا نہیں ہوا ہے۔ گاؤں کی عورت مرد کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ وہ وقتی طور پر تو اس سے خفا ہو سکتی ہے، اسے برا بھلا کہہ سکتی ہے مگر مرد اس کے سر کا تاج ہی رہتا ہے۔ جانتی ہو جو عورتیں اپنے [illegible] والے مردوں کے ظلم و ستم کی داستانیں تمہیں سنا کر، دھواں دھار مردوں کی شان میں گالیاں بک کر، تمہیں خوش کرنے اور مردوں کے خلاف تمہارے لیکچر سننے کے بعد اپنے گھروں کو جاتی ہیں تو تمہارے ان لیکچرز پر کس قسم کے تبصرے کرتی ہیں... خیر، جانے دو۔ تم نے گاؤں کے بیشتر گھروں کا معاشی مسئلہ تو کسی حد تک حل کر دیا مگر تمہارا اپنا مسئلہ جوں کا توں ہے۔"

"میرا مسئلہ؟"

"ہاں، کیا تم جانتی ہو کہ تمہاری مشکل کیا ہے؟"

"کیا ہے میری مشکل؟" میں جو کاکا کا طویل مکالمہ سن کر رنجور ہو چکی تھی، بوجھل آواز میں بولی۔

"تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم اپنے پاپا سے محبت کرنے والی اسکول گرل اور اپنی ممی کی ذہنی الجھنوں کے بیچ الجھ کر رہ گئی ہو۔ تم اپنے پاپا سے محبت کرتی تھیں اور ان کی یادوں سے تمہیں آج بھی پیار ہے مگر ممی کو خوش کرنے کے لیے تم پاپا سے نفرت رکھنے کا دعویٰ کرتی ہو جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تم محبت اور نفرت کے بیچ الجھی ہوئی خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔"

"بات صرف پاپا کی نہیں ہے کاکا!" میں نے قدرے تلخی سے کہا۔

"تمہارے کمپلیکسز کا نقطۂ آغاز تو بہرحال انہی کی ذات ہی تھی۔"

"میں کسی کمپلیکس میں مبتلا نہیں ہوں۔" کاکا نے جو کچھ کہا تھا اس کے ردِ عمل کے طور پر میرے لہجے میں ہلکی سی ناگواری عود کر آئی تھی۔

"کاش، ایسا ہی ہوتا۔" کاکا نے کہا۔

"کاکا جی! میں بہت معذرت کے ساتھ آپ سے یہ پوچھنے کی جسارت کرنے پر مجبور ہوں کہ کیا آپ وہ شام بھول گئیں جب آپ کسی کی منتظر تھیں، اور وہ جو طلعت بخت نہیں آیا تھا۔ پھر آپ جانتی ہیں نا کیا ہوا تھا نانی اماں برادری والوں کی شرم سے مر گئی تھیں اور... برادری والے آج تک آپ کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔"

کاکا کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے کاکا سے ایسی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔

"آئی ایم سوری۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔

"کاش، میں تمہیں بتا سکتی۔" کاکا نے کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے چھت سے لگے پنکھے کو زخمی تتلی کی طرح بے تابانہ گھومتے ہوئے دیکھا۔

"کیا؟" میں نے مدھم سروں میں پوچھا۔

"یہی... کچھ نہیں...!" کاکا نے ایک دبی دبی سی سرد آہ کھینچی اور سیدھی ہو بیٹھیں۔

کیسے بھول رہی ہیں کاکا جی، مرد گزیدہ ہوتے ہوئے بھی مجھے نفرت اور محبت کے بیچ الجھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ مجھے پاپا سے محبت تھی مگر جب انھوں نے ممی کو تنہا اور دکھی چھوڑ دیا تو مجھے ان سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں انھیں یاد نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے ان سے نفرت ہے، مجھے محمود ظفر سے بھی نفرت ہے اور... رشید احمد سے بھی جو بلقیس سے ان کے خواب چھین لے گیا تھا... مجھے دنیا کے ہر مرد سے نفرت ہے۔ آئی ہیٹ دیم! میں نے دانت بھینچتے ہوئے سوچا۔

میرا رواں رواں مردوں سے نفرت کے احساس سے سُلگ رہا تھا مگر کاکا کے خیال سے میں نے جلد ہی اپنے بپھرے ہوئے جذبات پر قابو پا لیا۔ کاکا کے ساتھ تلخ گوئی کی خلش کے احساس اور کاکا کے دکھی چہرے نے میرے دل میں کاکا کی محبت کو بڑھا دیا۔ میں نے کاکا کی جانب محبت سے دیکھا۔ ان کا چہرہ بجھے ہوئے دیے کی مانند ویران لگا۔

"کاکا جی! آپ دوا لے رہی ہیں باقاعدگی سے؟"

"زیادہ باقاعدگی سے نہیں بے قاعدگی سے۔"

"کیوں؟"

"بس یونہی دوا کھانا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔"

"دوا کسے اچھی لگتی ہے؟"

"جنہیں زندگی عزیز ہوتی ہے۔"

"کیا آپ کو نہیں؟"

"تمہی کبھی خراب نہیں۔"

"کیوں؟" میں جانتے بوجھتے انجان بن گئی۔

"کیونکہ جن لوگوں سے ہمیں پیار تھا ان میں سے کسی نے ہماری جھولی میں دکھ ڈال دیے اور کوئی اتنا مصروف ہو گیا کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ کاکا کے لیے ڈاکٹر نے چند لیبارٹری ٹیسٹ اور ایکسریز تجویز کیے تھے۔"

مجھے خفت کے احساس نے آ لیا۔ میں کاکا کی بات کا مطلب بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ کافی عرصہ قبل کاکا کے معالج نے کاکا کے لیے چند لیبارٹری ٹیسٹ اور ایکسریز تجویز کیے تھے اور ہدایت کی تھی کہ یہ ٹیسٹ شہر کی کسی اچھی لیبارٹری سے کروائے جائیں۔ تاکہ نتائج اطمینان بخش ہوں۔ گاؤں کے اسپتال کی ایکسرے مشین ان دنوں خراب پڑی تھی، اس لیے ایکسریز بھی انھوں نے شہر ہی سے نکلوانے کی ہدایت کی تھی۔ میں کاکا کو اگلے ہی دن شہر لے جانا چاہتی تھی مگر کاکا کے کالج میں امتحانات ہو رہے تھے۔ انھوں نے امتحانات ختم ہو جانے کے بعد ان ٹیسٹ اور ایکسریز کے لیے شہر جانے کا پروگرام رکھا جس سے میں ان کی کالج میں مصروفیات کے پیشِ نظر متفق ہو گئی تھی اور کالج میں امتحانات ختم ہونے تک کاکا کے لیبارٹری ٹیسٹ اور ایکسریز کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا لیکن پھر میں کچھ ایسی الجھ کے رہ گئی اپنی مصروفیات میں کہ یہ پروگرام میرے ذہن سے محو ہو کے رہ گیا۔ اب کاکا نے یاد دلایا تو مجھے بڑی خفت محسوس ہوئی۔ "اوہ! آئی ایم سوری کاکا... مجھے بالکل خیال نہیں رہا... آئی ایم رئیلی سوری..... بہرحال کل صبح ہم شہر چل رہے ہیں۔"

کاکا پھر بڑے تدبر سے مسکرا دیں اور ایک لمبا سانس

کھینچنے کے بعد بولیں۔ "ٹیسٹ بھی ہو گئے اور ایکسرے بھی۔"
"کب؟"
"مدت ہوئی۔"
"کس نے کروائے؟"
"میں نے۔"
"کہاں سے؟"
"شہر سے۔"
"کب، کس کے ساتھ گئی تھیں آپ؟"
"کسی کے ساتھ نہیں اکیلی گئی تھی۔"
"مگر آپ نے مجھ سے تو کوئی تذکرہ نہیں کیا۔"
"کیا تم نے پوچھا تھا؟"
میں لاجواب بھی ہو گئی اور شرمندہ بھی۔
"آئی ایم رئیلی سوری کاکا جی!"
"کوئی بات نہیں۔"
"کیا بتاؤں بس کام کچھ اتنا بڑھ گیا ہے کہ..."
"ہمارا المیہ یہی ہے میری جان کہ....." کاکا نے ایک بار پھر گہرا سانس لیا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولیں۔ "ہم محبتوں کے لیے کم وقت نکالتے ہیں۔ اپنی الجھنوں میں زیادہ گھرے رہتے ہیں حالانکہ یہ مختصر سی زندگی تو محبتوں کے لیے بھی کم ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ کوئی جلدی میں بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ اس کے پاس وقت کم ہو۔ جب لوگ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں تو ہم انہیں اہمیت نہیں دیتے لیکن جب وہ بچھڑ جاتے ہیں تب ہم ملول ہوتے ہیں مگر فائدہ؟"
"آپ مجھے اور شرمندہ نہ کیجیے۔"
"میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا ہرگز نہیں جان کاکا! میں تو تمہیں بس یہ بتانا چاہتی ہوں کہ دوسروں سے محبت کرو اور دوسروں کی محبتیں اپنے دامن میں سمیٹو۔ بغض، حسد، نفرت اور غرور۔ انتشار نفسیاتی الجھنیں انسان کو سوائے آزار پہنچانے کے نہیں کچھ دے نہیں سکتے ہیں۔"
"کاکا جی! زندگی میں پہلی مرتبہ میں آپ کو شکوہ و شکایت کرتے اور کچھ خفا ہوتے دیکھ رہی ہوں۔"
"نہ یہ شکوہ و شکایت ہے نہ خفگی یہ تو اس موہوم سی خواہش کا اظہار ہے کہ تمہاری کاکا تمہیں اس گرداب سے نکلے دیکھنا چاہتی ہے جس میں حالات نے تمہیں الجھا دیا ہے۔"
"میں کسی گرداب میں نہیں الجھی ہوئی ہوں کاکا!"
"میری جان! بہت دل دکھتا ہے میرا تمہارے لیے تمہارے یہ دن تو ستاروں پر سیجنے کے تھے محبتیں دینے اور محبتوں سے دامن بھر لینے کے دن تھے اور تم... کبھی غور سے آئینے میں جھانک کر اپنے چہرے کا جائزہ لو اور خود سے پوچھو کہ کیا یہ راستہ درست ہے؟"
میں نے بغور کاکا کی طرف دیکھا ان کا چہرہ مجھے کچھ زیادہ ہی زرد اور آنکھیں بجھی بجھی سی لگ رہی تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے بھی اور گہرے معلوم ہوتے۔
"کاکا جی! میرے چہرے کو تو چھوڑیے مجھے آپ کا چہرہ بہت زرد زرد سا لگ رہا ہے۔" میں نے تشویش کا اظہار کیا۔
"تم میری فکر نہ کرو مجھے تو اس دنیا سے جتنے سکھ سمیٹنے تھے سمیٹ چکی۔ رخت سفر باندھ چکا ہے۔" مجھے یوں لگا جیسے میرے دل پر پوری قوت سے گھونسا مار دیا گیا ہو۔
"اب اگر میں یہ کہوں کہ مجھے آپ کی باتوں سے ڈر لگنے لگا ہے؟"
"تو میں ذرا مائنڈ نہیں کروں گی۔"
میں نے پہلے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا پھر کمرے کی شرقی دیوار پر آویزاں ٹک ٹک کرتے گھڑیال پر نظر ڈالی۔ آٹھ بجنے والے تھے۔
"ارے! آٹھ بج گئے اور پتا بھی نہ چلا۔"
کاکا نے گھڑیال کی طرف دیکھا اور بولیں۔ "پرانی اور نئی وضع کی وال کلاکس میں یہی تو فرق ہے کہ وہ ہر آدھ گھنٹے کے بعد لوگوں کو وقت گزرنے کا احساس دلایا کرتے تھے جبکہ یہ انسان کو اس وقت تک بے خبر رکھتے ہیں جب تک کہ اسے ازخود ہوش نہ آجائے۔ پرانے اور نئے زمانے کا فرق بھی شاید یہی ہے۔ وقت گزرے جا رہا ہے چپ چاپ دبے پاؤں اور ہم بے خبر ہیں۔ اپنے آپ سے بھی اور دوسروں سے بھی۔"
"آپ کو تو فلسفی ہونا چاہیے تھا۔"
"کیوں کیا ایسے بڑی فلسفی ہوں؟" کاکا نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"ارے آپ تو ہر حال میں میری جان ہیں۔"
"تب ہی کئی کئی دن غافل رہتی ہو۔"
"سوری، آئندہ یہ غلطی نہیں ہوگی۔ ارے ہاں یہ تو بتائیے، ٹیسٹ اور ایکسرے کی رپورٹس کیا تھیں؟" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔
"سب کچھ نارمل تھا۔"
"گڈ! اچھا اب اوپر چلیں ممی انتظار کر رہی ہوں گی۔"
"وہ گھر میں ہوتیں تو اب تک نیچے آچکی ہوتیں۔" کاکا بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔
"کیوں؟ کہاں گئی ہیں؟"

"ناہید خالہ سے ملے۔"

زبیدہ خالہ نانی امّاں کی چچازاد بہن اور چھوٹی نیاز محمد کی سوتیلی ماں کی اولاد تھیں۔

"اچھا ہے کئی رشتے داروں سے مراسم رکھتی ہیں۔ آپ نے تو بالکل ہی ترکِ تعلق اختیار کرلیا ہے۔"

"لوگوں کی تنقیدی اور طنزیہ نگاہوں کا سامنا کرنے سے یہ بہتر تھا۔" کاکا کی آواز دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ممی نے کاکا سے ان کی اس بات کی وضاحت نہ چاہی۔ میں جانتی تھی کہ نانی امّاں کی موت بھی ان بہت سے افسانوں اور من گھڑت کہانیوں کا سیلاب نہ روک سکی تھی جنھوں نے کاکا کی شادی کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جانے کے بعد جنم لیا تھا۔

باتیں کرتے ہوئے ہم بالائی منزل کو جانے والے زینے تک آپہنچے تھے۔ کاکا کے دل کا بوجھ میں اپنے دل پر محسوس کرسکتی تھی۔ کتنے دنوں بعد اس روز کاکا سے اتنی دیر باتیں ہوئی تھیں۔

چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک رات کاکا نے کھانے کی میز پر ممی سے کہا: "آپا! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔"

"کیسا فیصلہ؟" ممی نے چونک کر کاکا کی جانب دیکھا۔ کاکا کی اس بات پر میرا چونکنا اور متوجہ ہو جانا بھی یقینی تھا۔

"حویلی کے بارے میں۔" کاکا نے کہا۔

"حویلی کے بارے میں؟" ممی نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"کاکا جی! بہت ہی سوچ وشن میں گفتگو ہو رہی ہے!" میں نے کہا۔

کاکا دھیرے سے مسکرا دیں اور چہرے کا تکدّر تمام میں رکھتے ہوئے بولیں: "میں نے آدھی حویلی عالی کے نام گفٹ کردینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"کوئی خاص وجہ؟" ممی نے سوال کیا۔

"جی ہاں بہت ہی خاص۔" کاکا زیرِ لب مسکرائیں۔

ممی استفہامیہ نگاہوں سے کاکا کو دیکھنے لگیں اور میں بھی۔ کاکا نے بڑے پیار سے میری طرف دیکھا اور بولیں: "وہ بہت ہی خاص وجہ یہ ہے کہ عالی مجھے بہت ہی پیاری ہے۔ میں اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"کاکا جی! آدھی حویلی سے میرا کیا بھلا ہوگا۔" میں نے مذاقاً کہا۔

"میری جان! جی تو یہی چاہتا تھا کہ پوری حویلی تمھارے نام کردوں۔"

"کاکا جی! آپ میری بات کو سنجیدگی سے نہ لیں تو مذاق میں کر رہی ہوں۔"

"مجھے پتا ہے۔" کاکا نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری جانب دیکھا پھر وہ ممی کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولیں: "میرے اس فیصلے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں... میرا بھلا کیا ہوسکتا ہے خیال۔ تمھاری چیز ہے، تم مختار ہو جو چاہو سو فیصلہ کرسکتی ہو۔" ممی نے کہا۔

"میں یہ سمجھ لوں کہ آپ میرے فیصلے سے متفق ہیں؟"

"کیا نامتفق ہونے کا کوئی جواز ہوسکتا ہے؟"

"شکریہ آپا!"

"کس بات کا؟"

"میرے فیصلے سے اتفاق کرنے کا۔"

کھانے کی میز پر ہونے والی اس گفتگو کے چوتھے یا پانچویں دن کاکا نے مجھ سے کہا: "عالی جان! کل کا دن تم مجھے دے رہی ہو۔"

"کوئی خاص بات کاکا جی؟"

"رجسٹرار آفس جانا ہے۔"

"کس لیے؟"

"وکیل صاحب نے کاغذات تیار کرلیے ہیں، ہمارے دستخط ہونا ہیں۔"

"کون سے کاغذات کاکا جی؟" میں جانتے بوجھتے انجان بن گئی۔

"آدھی حویلی میں تمھیں گفٹ کر رہی ہوں۔"

"کاکا جی! اس کی بھلا کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی یا نہیں تھی، یہ میرا مسئلہ ہے، تم زیادہ دادی امّاں بننے کی کوشش مت کرو۔"

"آپ مجھے ڈانٹ رہی ہیں؟"

"میں آپ کے کان بھی کھینچ سکتی ہوں۔"

"لیجیے کھینچ لیجیے۔" میں نے اپنا کان ان کے سامنے کرتے ہوئے کہا: "مگر برائے خدا یہ بتا دیجیے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"میری مرضی۔ تم کون ہوتی ہو سوال کرنے والی؟"

"محترمہ کاکا جی! میں سائن کرنے سے انکار کرسکتی ہوں۔"

"دھمکی دے رہی ہو؟"

"جی نہیں، دھونس دے رہی ہوں۔"

"اوکے تو ذرا آپ کاکا جی کا دھونس جمانا بھی ملاحظہ فرمائیں....." کاکا نے توقف کیا پھر کھنکار کر گلا صاف کرنے کے بعد بولیں: "کل صبح نو بجے اگر تم مجھے تیار نہ ملیں تو کاکا تم سے خفا ہو جائے گی۔"

"میں بھلا خفا ہونے دے سکتی ہوں اپنی کاکا جی کو۔"

میں نے کاکا کی گردن میں اپنی بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا پھر قدرے لجاجت سے دوبارہ پوچھا: "مگر یہ تو بتائیے کہ آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں، حویلی آپ کے نام رہتی تب بھی ہماری ہی تھی۔"

"پھر وہی بوڑھی اماؤں والی باتیں۔" کاکا نے مجھے گھورا۔

"شاید آپ آدھی حویلی میرے نام کر کے مجھے اس امر کا پابند کر دینا چاہتی ہیں کہ میں اپنی کار رضاکاری زیادہ نہ بڑھاؤں؟"

"بلی تھیلے سے نکالنے کی کوشش مت کرو۔" کاکا نے پیار سے آنکھیں دکھائیں۔

اپنا یہ حربہ بھی ناکام جاتے دیکھ کر میں مسکرا دی۔

"گویا طے ہے کہ آپ اپنے اس فیصلے کی وجہ نہیں بتائیں گی؟"

"میری جان، ایک وجہ تو یہ ہے کہ انسان کی حیات زندگی کا کچھ اعتبار نہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں اور تیسری وجہ بہت خاص ہے جو تمہیں میں نہیں بتاؤں گی، وقت خود بتائے گا۔"

"گویا آپ اسے ایک سسپنس فل اسٹوری بنا دینا چاہتی ہیں۔"

"نہیں میری جان، میں تو اسے جذبات و محبت کی ایک دل پذیر کہانی بنتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اچھا اب تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گی بس اتنا سن لو کہ کل نو بجے تم مجھے تیار ملو گی، اور ہم رجسٹرار آفس جائیں گے۔"

"آل رائٹ۔"

"گڈ گرل۔" کاکا نے کہا۔

اگلے دن کاکا مجھے اپنے ہمراہ رجسٹرار آفس لے گئیں۔ وکیل صاحب پہلے ہی وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ کاغذات تیار تھے۔ کاکا ان پر پہلے ہی دستخط کر چکی تھیں۔ وکیل صاحب نے جہاں جہاں کہا میں چپ چاپ دستخط کرتی گئی۔ پھر رجسٹرار کے روبرو ہماری حاضری ہوئی۔ رجسٹرار نے کاکا سے اور مجھ سے چند بہت ہی رسمی سے سوالات کیے پھر سرکاری رجسٹر پر میرے اور کاکا کے دستخط لیے گئے اور انگوٹھے لگوائے گئے۔

مخصوص مقررہ مدت گزرنے کے بعد میں حویلی کے نصف حقوق ملکیت کی مالک قرار پا گئی۔

اس بات کو کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ کاکا کی گرتی ہوئی صحت باقاعدہ علالت کا روپ دھار گئی۔ وہ بستر پر پڑ گئیں اور ایسی پڑیں کہ ان کے لیے کالج جانا اور پڑھانا تو درکنار حویلی کے برآمدوں اور راہداریوں کو عبور کرنا بھی دشوار ہو گیا جو کبھی کاکا کے مہکتے سراپے سے اٹھتی خوشبو کی لپٹوں سے جھوم جھوم اٹھتے تھے۔

گو حویلی کی زیریں منزل پر ہنگامہ روز و شب جاری رہا مگر بالائی منزل پر کاروبار روز و شب تھم سا گیا۔ میرا ایک پاؤں نچلی منزل پر ہوتا تو دوسرا اوپر۔ گاؤں کے پرانے ڈاکٹر کے کہیں اور چلے جانے کے بعد کچھ عرصہ قبل ہی نیا ڈاکٹر آیا تھا۔ چند دن کاکا کا اسی سے علاج جاری رہا۔ بے پناہ نقاہت کے سبب کاکا خود تو اسپتال جانے کی ہمت نہ رکھتی تھیں، ڈاکٹر گھر ہی پر کاکا کا معائنہ کر جاتا اور کبھی تجویز کردہ دوا کو جاری رکھنے اور کبھی رد و بدل کرنے کے بعد چلا جاتا لیکن علاج کے باوجود طبیعت میں افاقے کے بجائے اضافہ ہوتے دیکھ کر ڈاکٹر نے چند لیبارٹری ٹیسٹ اور ایکسریز تجویز کیے اور ہم نے کاکا کو شہر لے جا کر کسی بڑے اور قابل ڈاکٹر کو دکھانے کا ارادہ کیا مگر کاکا ٹیسٹ کروانے پر آمادہ ہوئیں نہ شہر کے کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھانے پر۔ کاکا کا یہ بے معنی تردد مجھے اچھا نہ لگا تھا تو پریشانی کے سبب میں نے کاکا کو ان کی بیماری کے باوجود اس بے معنی اور فضول سی ضد پر خوب گھرکا۔

"کاکا جی! چلیں نا شہر چل کر کسی بڑی لیبارٹری سے ٹیسٹ بھی کروا لیں گے اور کسی اچھے ڈاکٹر کو بھی دکھا دیں گے۔ پتا ہے، آپ کی وجہ سے میں اندر ہی کس قدر پریشان ہوں۔ بار بار نیچے سے اوپر آتی جاتی ہوں۔" میں نے کاکا کے نزدیک بیٹھ کر ان کے بالوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے کہا۔

"میری جان! تم اور آپا تو خواہ مخواہ پریشان ہو، دو چار دن میں ٹھیک ہو جاؤں گی میں۔" کاکا نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔

"ٹیسٹ کروا لینے یا کسی ڈاکٹر کو دکھا دینے میں ہرج ہی کیا ہے؟"

"ٹیسٹ کروانے سے کوئی فائدہ نہیں، سب کچھ ٹھیک ہے، میں ایک بار ٹیسٹ کروا کے دیکھ چکی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے یہ کچھ مختلف قسم کے ٹیسٹ ہوں۔"

"نہیں، وہی ٹیسٹ تجویز کیے ہیں اس ڈاکٹر نے بھی۔"

"بہر حال آپ ٹیسٹ کروا لیں ورنہ میں بھوک ہڑتال کر دوں گی۔"

"اچھا... اچھا کر جاؤں گی" کاکا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"اور شہر چل کے کسی بڑے ڈاکٹر کو بھی دکھائیں گی۔" میں نے مشورہ آمیز انداز میں کہا۔

"اچھی بات ہے۔" کاکا نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس مسکراہٹ پر بھی نقاہت کا غلبہ تھا۔

کاکا نے وعدہ نبھایا مگر اس وقت جب انھیں اپنا کچھ ہوش نہ تھا۔ ہوش سے بے ہوشی کی منزل تک پہنچنے میں وقت ہی کتنا لگتا تھا۔ جس روز انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا اس سے اگلے دن ہی تو ان کی ناک سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اسی روز ہم انھیں شہر لے گئے۔ ایک بڑے اسپتال میں انھیں دکھایا۔ اسپتال والوں نے فوری طور پر تفصیلی معائنے کے بعد کاکا کا خون چند مخصوص ٹیسٹ کروانے کے لیے لیبارٹری میں بھجوایا۔ خون کے معائنوں کے نتائج آنے تک کاکا کے منہ اور دونوں کانوں سے بھی خون جاری ہو چکا تھا۔ اور یہ انکشاف کہ کاکا خون کے سرطان میں مبتلا تھیں اور بیماری کے خلاف ان کے جسم کا مدافعتی نظام تشویش ناک حد تک کمزور ہو چکا تھا مجھ پر بجلی بن کر گرا۔

چند دن اور کاکا اس دنیا کی مہمان رہیں پھر اپنے دل کا بوجھ اپنے دل پہ لیے اس دنیا سے چلی گئیں۔ کاکا کا نا وقت چلا جانا ایک ایسا المیہ تھا جس نے مجھے ہفتوں ملول رکھا اور مرد ذات کے خلاف میرے دل میں نفرت کو اور مستحکم کر دیا۔ ہاں! ایک مرد کی بے وفائی ہی نے تو انھیں اس قدر دکھی اور مجبور کر دیا تھا کہ انھوں نے زندگی کی ہر خوشی سے ترکِ تعلق اختیار کر لی تھی۔ اسی کی عہد شکنی کے دکھ نے تو کاکا کے لبوں سے جاں فزا مسکراہٹ، آنکھوں سے چمک اور لہجے سے نغمگی چھین لی تھی۔ اسی کی بے مہری نے تو کاکا کی شخصیت سے دھنک کے رنگ چھین کر اسے بے رنگ کر دیا تھا۔ اسی کی بد عہدی نے تو گاؤں میں کاکا کی شادی نہ ہو سکنے کے سلسلے میں کیسی کیسی خیالی اور من گھڑت افسانوں کو جنم دیا تھا جن کے سبب کاکا نے برادری میں آنا جانا ہی ترک کر دیا تھا۔ کئی برس تک ان کا معمول یہی رہا کہ کالج جائیں اور پڑھا کر گھر واپس آ جائیں یا پھر کبھی کبھار خریداری کی غرض سے شہر چلی جائیں۔ کیا عجب کہ اسی بے مہر کی بے وفائی کا دکھ ہی کاکا کے خون میں سرطان کی صورت پھیل گیا ہو اور اسی دکھ نے کاکا کے جسم کے مدافعتی نظام کو بھی مفلوج کر دیا ہو۔

کاکا کے جانے کے بعد ان کی ایک بات مجھے رہ رہ کے یاد آتی اور میخ کی مانند میرے دل میں اترتی چلی جاتی۔ ایک روز انھوں نے ہنستے ہنستے کہا تھا: "بھلا المیہ یہ ہے کہ ہم محبتوں کے لیے وقت کم نکالتے ہیں! اپنی الجھنوں میں زیادہ گھرے رہتے ہیں حالاں کہ یہ مختصر سی زندگی تو محبتوں کے لیے بھی کم ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ کوئی جلدی میں بھی ہو سکتا ہے، ممکن ہے اس کے پاس وقت کم ہو۔ جب لوگ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں تو ہم انھیں اہمیت نہیں دیتے لیکن جب وہ بچھڑ جاتے ہیں تب ہم ملول ہوتے ہیں مگر فائدہ...."

میں واقعی بہت ملول تھی۔

کاکا کی جدائی کا دکھ لمحہ لمحہ آرے کی طرح میرے دل کو کاٹے چلا جاتا تھا۔ مجھے کاکا کی ایک ایک بات یاد آتی۔ میں ان کے پیار کو بوند بوند ترس رہی تھی۔ پاپا کی موت کے بعد جب میں ذہنی طور پر بالکل بکھر کے رہ گئی تھی، تب کاکا ہی تو تھیں جنھوں نے مجھے اپنی آغوشِ محبت میں سمیٹ رکھا تھا۔ نہ جانے کہاں سے ہوا اس خوشبو کو جو کاکا کی محبوب خوشبو تھی کھینچ لاتی اور میری مشامِ جاں کو چونکنے پر مجبور کر دیتی۔ میرا دل اس احساس سے دکھنے لگتا تھا کہ اب کاکا اس دنیا میں نہیں تھیں، بس ان کی خوشبو ہی رہ گئی تھی۔ شاید مجھے اختیار ہوتا اور میں دنیا جہان کے خزانے جمع کر لیتی اور ان کے عوض کاکا کو دوسرے جہان سے واپس بلوانے کی کوشش کرتی تو بھی نہ بلا سکتی تھی۔ کس قدر بے بسی کا عالم تھا، ہم سے پیار کرنے والے بچھڑ جائیں تو دل کیسے ناقابلِ بیان دکھ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

کاکا! کاکا! کاکا! میرا دل دیوانہ وار پکارتا پھرتا مگر کاکا کو نہ پاتا۔ البتہ میری چشمِ تصور انھیں حویلی بھر میں گھومتے پھرتے دیکھتی اور مشامِ جاں ان کی خوشبو کو محسوس کرتی۔ کاکا کا ہیولا کبھی مجھے حویلی کے برآمدوں میں نظر آتا، کبھی راہداریوں میں، کبھی دریچوں میں، کبھی کمروں میں، کبھی روشوں پہ اور کبھی سبزہ زاروں پہ۔

میرا جی کام میں بالکل نہ لگتا۔ گاؤں کی بہت سی عورتوں کی روزی کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید میں وہ کام بند کر دیتی جس میں، میں کاکا کی زندگی کے آخری ڈیڑھ دو برس کے دوران اس قدر مصروف ہو گئی تھی کہ بالآخر کاکا شکوہ کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ پچھتاوے مجھے آزردہ کیے دیتے تھے۔ کاکا کی موت کے بعد ان کی الماری کے چور خانے سے برآمد ہونے والی لیبارٹری ٹیسٹ رپورٹس نے پچھتاوے کے احساس کو اور گہرا کر دیا تھا۔ خون کے مختلف معائنوں کے بعد حتمی رپورٹ یہ دی گئی تھی کہ کاکا لیوکیمیا یعنی خون میں سفید جسیموں کی بہتات کی شکار تھیں۔ یہ ٹیسٹ انھی دنوں کروائے گئے تھے جب میں حویلی

میں قائم کیے جانے والے دستکاری اسکول میں بالکل منہمک ہو گئی تھی کہ کاکا کو لیبارٹری ٹیسٹ اور ایکسرے کے لیے شہر لے جانے کا بھی دھیان نہ رہا حالانکہ کاکا نے ایک روز شکوہ بھی کیا تھا جب میں نے ان سے باقاعدگی سے دوا لینے کی بابت استفسار کیا تھا تو انھوں نے کہا تھا۔

"دوا کھا کے مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔"

"دوا ابھی بھی کسے لگتی ہے؟" میں نے کہا تھا۔

"جنھیں زندگی عزیز ہوتی ہے۔"

"کیا آپ کو نہیں؟"

"تھی مگر اب نہیں۔"

"کیوں؟"

میرے اس سوال پر کاکا نے بڑے دکھ سے کہا تھا۔

"کیوں کہ جن لوگوں سے ہمیں پیار تھا ان میں سے کسی نے دکھ ہماری جھولی میں ڈال دیے اور کوئی اتنا مصروف ہو گیا کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ کاکا کے لیے ڈاکٹر نے چند ضروری ٹیسٹ تجویز کیے تھے۔"

میں دم رہ کر سوچتی کاش! میں نے کاکا کو شہر لے جانا یاد رکھا ہوتا۔ تب شاید کاکا کے لیے اپنی بیماری کو ہم سے چھپائے رکھنا ممکن نہ ہوتا شاید علاج ممکن ہوتا مگر اب کیا ہو سکتا تھا پچھتاوے مجھے ڈستے رہتے۔ حویلی کے چپے چپے پر کاکا کی یادیں ثبت تھیں۔ صبح آنکھ کھلتے ہی کاکا کا خیال دل تک در آتا اور شام ڈھلتے ہی ان کی یاد میرے دل کو مٹھی میں بھینچ لیتی۔ کام میں مصروفیت کے دوران بھی ان کا خیال میری آنکھیں بھگو دیتا۔ ممی مجھ سے سوا اداس تھیں، کیوں نہ ہوتیں؟ آخر کو کاکا ان کی چھوٹی اور بے حد چہیتی بہن تھیں۔

⁂

کاکا کے چہلم کے بعد ممی نے کاکا کے ترکے کی بابت اپنے خاندانی وکیل سے رابطہ قائم کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ گزشتہ دو ماہ سے ملک سے باہر گئے ہوئے تھے تاہم ان کی واپسی جلد ہی متوقع تھی۔ ممی نے وکیل صاحب کے منشی کو ہدایت کی کہ وکیل صاحب کے واپس آجانے پر انھیں بتا دیا جائے کہ حویلی والی رعنا بی بی انتقال کر گئی ہیں۔ ان کی بڑی بہن ان کے ترکے کے سلسلے میں قانونی مشورہ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

کاکا کے انتقال کو دو ماہ پورے ہونے میں تین چار دن باقی تھے کہ ایک شام وکیل صاحب حویلی آ پہنچے۔ کاکا کی ناوقت موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے وکیل صاحب نے ممی سے کہا: "رعنا بی بی کی وفات کی خبر سن کر مجھے دلی دکھ پہنچا مگر مشیت ایزدی میں کس کا چارہ ہے۔ آگے پیچھے ہم سب ہی قطار میں کھڑے ہیں۔"

ممی سر جھکائے مغموم بیٹھی تھیں۔

"منشی نے مجھے بتایا کہ آپ نے رابطہ قائم کرنے کی زحمت کی تھی۔" وکیل صاحب نے قدرے توقف سے کہا۔

"جی ہاں۔ دراصل میں رعنا کے ترکے کی بابت آپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اگرچہ مجھے اس کے مال و زر سے ذرا رغبت نہیں، میرے لیے تو ساری اہمیت میری بہن کی تھی مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ رعنا کے ترکے کی بابت جو اس کے نام پر موجود جائداد کے انتقال حقوق کے لیے ایک قانونی طریقہ کار سے بہرحال گزرنا ہوگا۔ اسی سلسلے میں میں آپ سے مشورہ اور رہنمائی چاہتی تھی۔"

وکیل صاحب نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر دھیمے سُروں میں گویا ہوئے: "مرحومہ رعنا بی بی کی رجسٹرڈ وصیت میرے پاس موجود ہے۔"

وکیل صاحب کی اس بات نے مجھے اور ممی کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ گویا کاکا اپنی موت کے لیے پہلے ہی سے تیار تھیں۔ وکیل صاحب نے اپنا بریف کیس صوفے کی آڑ سے اٹھا کر میز پر رکھا اور اسے کھول کر اس میں سے جہازی سائز کا خاکی رنگ کا ایک لفافہ نکالا پھر اس لفافے میں سے سبز رنگ کی ایک

ایک صاحب اپنی بیوی کے لیے ساڑی خریدنے گئے۔ وہ اسے اس کی سالگرہ پر تحفہ دینا چاہتے تھے۔ ساڑی خریدنے کے بعد انھوں نے دکان دار سے خجالت آمیز لہجے میں کہا: "معاف کیجیے گا اگر میری بیوی کو یہ ساڑی پسند نہ آئی تو کیا آپ اسے تبدیل کر دیں گے؟"

دکان دار بولا: "بڑی خوشی سے جناب۔ مگر آپ کی خریدی..."

فائل نکال کر اپنے گھٹنوں پر دھر لی۔ بعد ازاں انھوں نے اپنی جیب سے عینک نکال کر آنکھوں پر لگائی اور فائل میں سجی دستاویز کے صفحۂ اوّل پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولے: "رعنا بابا! مرحومہ نے یہ وصیت شرعی احکام کی روشنی میں تیار کروائی تھی۔ شرعاً ایک عاقل و بالغ مسلمان اپنے مال کے ایک تہائی حصے کی وصیت کر سکتا ہے۔ بقیہ دو تہائی اس کے وارثوں کا حق ہے۔ اپنا شرعی حق استعمال کرتے ہوئے مرحومہ نے اپنے مال کے ایک تہائی سے بھی کم حصے کی وصیت کی ہے۔ باقی سب کچھ آپ کا ہے کیوں کہ آپ ہی ان کی شرعی وارث ہیں۔ حویلی کے نصف حقوقِ ملکیت وہ اپنی حیات ہی میں اپنی بھانجی اور آپ کی صاحبزادی عالیہ بی بی کے نام ہبہ کر چکی تھیں۔ چوں کہ مرحومہ سرکاری ملازمت میں تھیں اس لیے محکمہ ان کے سرکاری واجبات ان کی نامزدگی کو ادا کرنے کا پابند ہے یعنی جس کو وہ اس ضمن میں اپنا وارث نامزد کر گئی ہوں۔ واضح رہے کہ ہر سرکاری ملازم کو جو اپنی ملازمت پر مستقل ہو، متعلقہ محکمے کو تحریراً اس امر سے آگاہ کرنا ہوتا ہے کہ اس کی موت کی صورت میں اس کے واجبات کی وصولی کا اختیار کسے ہوگا۔ محکمہ مرحوم کے نامزد کردہ شخص کو واجبات کی ادائیگی کا پابند ہوتا ہے۔ اپنے واجبات کی وصولی کا حق مرحومہ اپنی بھانجی عالیہ بی بی کو دے گئی ہیں۔ سرکاری واجبات کی ادائیگی سے قطع نظر ان کے انتقال کے وقت ان کے بینک اکاؤنٹ میں موجود تمام رقم، بینک لاکر میں موجود جملہ زیورات و جواہرات، نقدی، اراضی، حویلی میں موجود مرحومہ کے زیرِ استعمال رہنے والی تمام اشیا بلا شرکتِ غیرے ان کی شرعی وارث یعنی بی بی صاحبہ! آپ کے حق میں جائیں گی۔ ویسے مرحومہ اس امر کی صراحت نہ بھی کرتیں تو ان کی جائیداد کے دو تہائی حصے پر آپ ہی کا حق بنتا۔ مرحومہ نے دو تہائی سے زیادہ میراث آپ کے لیے چھوڑی ہے۔ ایک تہائی سے کم کے سلسلے میں انھوں نے اپنا شرعی حق استعمال کیا ہے۔"

"مزید وضاحت سے بتائیے وکیل صاحب!" ممی نے کہا۔

وکیل صاحب نے ایک بار پھر کھنکھار کر حلق صاف کیا پھر ٹانگ پر ٹانگ دھر کر صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے۔

"اس حویلی کا نصف حصہ مرحومہ نے اپنی حیات ہی میں عالیہ بی بی کو ہبہ کر دیا تھا اور عالیہ بی بی اس پر قبضہ بھی رکھتی ہیں۔ لہٰذا شرعاً تو حویلی کے نصف حقوقِ ملکیت مرحومہ کی ملک سے نکل چکے تھے چنانچہ مذکورہ ملکیت مرحومہ کے ترکے میں داخل نہیں رہی۔ حویلی کے بقیہ نصف حقوقِ ملکیت مرحومہ کے اختیار میں تھے چنانچہ ان کے ترکے میں شامل ہیں۔ آدھی حویلی کی مالیت کا اندازہ لے مرحومہ کے کل ترکے کے ایک تہائی سے بھی کم مالیت کا قرار دیا ہے۔ اپنا شرعی حق استعمال کرتے ہوئے حویلی کے نصف حقوقِ ملکیت مرحومہ حویلی کے ایک ملازم تیمور عالم ولد مسعود عالم کے نام کر گئی ہیں۔"

"تیمور عالم کے نام!" ممی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"جی ہاں! تیمور عالم کے نام!"

میں ہکا بکا کبھی ممی کو اور کبھی وکیل صاحب کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا... کیا آپ مذاق... مذاق کر رہے ہیں؟" ممی نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں زینب صاحبہ! میں جو کچھ بیان کر رہا ہوں پوری سنجیدگی اور ہوش و حواس کے ساتھ۔ یہ لیجیے آپ خود دیکھ لیں وصیت موجود ہے۔" وکیل صاحب نے فائل ممی کی جانب بڑھا دی۔

ممی نے فائل وکیل صاحب سے لے کر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے وصیت پڑھنا شروع کی اور جلد ہی وہ سطور زیرِ نظر تھیں جو تیمور عالم کو حویلی کے نصف حقوقِ ملکیت کا حق دار ٹھہرا رہی تھیں۔ شروع سے آخر تک وصیت نامہ پڑھنے کے بعد میں نے فائل وکیل صاحب کی جانب بڑھا دی جو اس وقفے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سگار کے کئی کش لے چکے تھے۔

"بی بی! یہ اپنی والدہ صاحبہ کو دیجیے۔ انھی کی کاپی ہے۔"
وکیل صاحب نے مجھ سے کہا۔

میں نے فائل ممی کی جانب بڑھا دی۔

"پڑھ لیا تم نے؟" ممی نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں!"

"کیا...؟"

میں پوچھے بنا ہی ممی کا سوال سمجھ گئی تھی۔

"جی ممی! کاکا یہی وصیت کر گئی ہیں۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"اوہ! مگر کیوں؟ رعنا نے ایسا کیوں کیا؟" ممی نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان پیوست کرتے ہوئے تذبذب کے عالم میں کہا۔

وکیل صاحب چپ رہے۔

"بتلائیے نا وکیل صاحب! رعنا نے ایسا کیوں کیا؟" ممی کے لہجے سے جھنجلاہٹ عیاں تھی۔

"میں کیا عرض کر سکتا ہوں!" وکیل صاحب بولے۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ رعنا نے ایسی حماقت کیوں کی؟" ممی نے مجھ سے کہا۔

"زینب صاحبہ! انسان کبھی کبھی خلافِ قیاس کام کرتا ہے،

رعنا بی بی جیسی پڑھی لکھی، سمجھدار اور روشن خیال خاتون سے کسی حماقت کی توقع کی تو نہیں جا سکتی۔ میری ان سے جتنی بھی ملاقاتیں رہیں، میں نے انھیں دوراندیش اور دانش مند محسوس کیا۔"

"آپ اسے عقلمندی اور دوراندیشی تصوّر کرتے ہیں؟" ممی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں محض اس امر کے حوالے سے بات نہیں کر رہا ہوں، یہ میری مجموعی رائے تھی۔"

"اوہ، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ رعنا ہمارے لیے اتنی بڑی مشکل کھڑی کر گئی ہوگی۔"

"بہرحال اگر آپ اسے مشکل سمجھتی ہیں تو اب تو آپ لوگوں کو اس مشکل کا سامنا کرنا ہی ہے۔" وکیل صاحب بولے۔

ممی کچھ دیر گہرے تذبذب میں مبتلا رہیں۔ پھر انھوں نے کہا: "وکیل صاحب! کیا اس مشکل سے فوری نجات کا کوئی راستہ ہے؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"میرا مطلب ہے... رعنا کی اس وصیت کو... تلف... کر دیا جائے۔"

وکیل صاحب مسکرائے پھر بولے: "آپ اپنی کاپی کو تلف کرنے کا پورا اختیار رکھتی ہیں مگر واضح رہے کہ یہ وصیت رجسٹرڈ ہے۔ رجسٹرار کے ریکارڈ میں یہ وصیت نامہ موجود ہے اور اس کی ایک کاپی تیمور عالم کے نام بھی موجود ہے جو اسے میرے توسط سے ملے گی۔ وراثت نامہ حاصل کرنے سے پہلے آپ کو ایک باقاعدہ ضابطے سے گزرنا ہوگا اور اس مرحلے پر اس شخص کو نظرانداز کر دینا ممکن نہ ہوگا جسے مرحومہ اپنی آدھی حویلی وصیت کر گئی ہیں۔"

"کوئی راستہ نکالیے وکیل صاحب!" ممی نے لجاجت سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے۔" وکیل صاحب نے اظہارِ معذرت کیا۔
"وکیل صاحب! کیا آپ چاہیں گے کہ یہ وصیت ہمیں کسی بڑی الجھن سے دوچار کر دے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تو پھر کچھ کیجیے... کوئی راستہ نکالیے... برائے خدا اس عذابِ ناگہانی سے ہماری جان چھڑا لیجیے۔" ممی نے کہا۔
"کیا آپ کے خیال میں کوئی راستہ نکل سکتا ہے؟"

"بالکل۔"

"کیا؟"

"ہم اس شخص کو اس کی ملازمت اور حویلی سے نکال باہر کرتے ہیں۔ آپ اس کے نام وصیت کی کاپی دبا لیجیے۔ اسے وصیت کا الہام تو ہونے سے رہا۔ رہا وراثت نامہ حاصل کرنے کا مرحلہ تو اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیں گے... یہاں کیا کچھ نہیں ہو جاتا۔"

وکیل صاحب کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔

"بی بی صاحبہ!" انھوں نے کہا: "یہ وصیت نامہ شرعی اور قانونی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر درج الفاظ کسی کہانی یا افسانے کے واقعات و مکالمات نہیں اور نہ ہی میں کوئی کہانی کار ہوں کہ کسی مقام پر کسی کردار کے کہانی کے الجھ جانے پر اسے سلجھانے کے لیے واقعات و مکالمات اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لوں اور اس کردار کی گردن مار دوں۔"

وکیل صاحب کے اس کورے جواب پر ممی کی خجالت میں اضافہ ہو گیا۔ تاہم انھوں نے کہا: "وکیل صاحب! آپ کے اور ہمارے مراسم خاصے دیرینہ ہیں۔"

"بجا۔ لیکن مراسم کو فرائض پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ وصی بننا ایک دشوارگزار ذمے داری ہے۔ ہمیشہ وصی بننے والے شخص کو مواخذۂ خداوندی اور عذابِ آخرت سے ڈر کر پوری دیانتداری اور خیرخواہی سے کام کرنا چاہیے۔ مرحومہ رعنا بی بی کی وصیت کا احترام میرا قانونی اور اخلاقی ہی نہیں، مذہبی فریضہ بھی ہے۔ سورۂ البقرہ میں ربِّ ذوالجلال کا ارشاد ہے کہ وصیت بدلنے کا گناہ ان لوگوں پر ہے جو وصیت کو بدلیں۔"

ممی مضطربانہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم مروڑنے لگیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات انتہائی ذہنی ہیجان کے غمّاز تھے۔ خاصی دیر وہ کشمکش سے دوچار نظر آتی رہیں پھر انھوں نے وکیل صاحب سے پوچھا: "وکیل صاحب! کیا رعنا نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ وصیت نامہ کیوں تیار کروا رہی ہے؟"

"جی نہیں اور میں نے پوچھنا ضروری بھی نہیں سمجھا۔ اوّل تو وصیت تیار رکھنا ایمان کا تقاضا ہے۔ زندگی کا کچھ بھروسا نہیں، کسی کو معلوم نہیں کہ کب موت آ جائے اور وصیت کرنے کا موقع بھی ملے یا نہیں۔ ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ ہر لمحہ موت کے لیے تیار رہے اور حالتِ صحت ہی میں وصیت تیار کر رکھے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس مسلمان کے پاس ایسی کوئی چیز ہے جس کے متعلق اسے وصیت کرنا ہے، اسے دو راتیں بھی اس حالت میں گزارنے

کا حق نہیں کہ وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔ دوسرے مذہبی نکتۂ نظر سے قطع نظر رعنابی بی کا وصیت نامہ تیار کروانا کوئی امرِ عجوبہ نہ تھا۔ اکثر صاحبِ جائداد لوگ ایسا کیا کرتے ہیں۔ تاکہ ان کی موت کے بعد ترکے کی تقسیم کسی تنازعہ کی شکار نہ ہو۔ چنانچہ رعنابی بی کا وصیت نامہ تیار کروانا میرے نزدیک کوئی غیر معمولی امر نہ تھا حالانکہ ان کی زود رنجی اور کمزور صحت سے مجھے کچھ تشویش ضرور ہوئی تھی لیکن مجھے شبہ بھی نہ تھا کہ وہ ایک ایسی مہلک بیماری میں مبتلا ہونے کے سبب وصیت تیار کروا رہی ہیں جس کے نام ہی سے لوگ ڈرتے ہیں۔"

"اس نے تو مجھ سے بھی چھپایا۔" ممی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے ممی کی جانب دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو لرزاں پائے۔

"بی بی صاحبہ! صبر کیجیے۔ ہر متنفس کو ایک نہ ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔" وکیل صاحب بولے۔

ممی ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئیں۔

کچھ دیر کو ماحول پر خاموشی سی چھا گئی پھر وکیل صاحب کی آواز نے اس خاموشی کا سینہ چیرا۔

"بی بی صاحبہ! میں تیمور عالم کو بھی اس وصیت سے آگاہ کرنا چاہوں گا۔"

ممی کا چہرہ تشنج کی کیفیت سے عبارت نظر آنے لگا۔

"کیا آپ مذکورہ شخص سے میری ملاقات کرواسکتے ہیں؟" وکیل صاحب نے کہا۔

میں نے ممی کو ازحد پریشان دیکھتے ہوئے وکیل صاحب سے کہا۔ "پلیز! آپ اس شخص کو اہمیت دینے کی کوشش نہ کیجیے۔ وہ ہمارا ملازم ہے۔"

"مجھے اس سے بحث نہیں۔ وہ یقیناً آپ کا ملازم ہی ہوگا لیکن اب تو بہرحال وہ اس حویلی کے نصف حقوقِ ملکیت کا مالک قرار پاچکا ہے۔"

"اوہ نو وکیل صاحب ایسا نہیں ہوسکتا۔" میں نے کہا۔

"بی بی! ایسا ہوچکا ہے آپ کی مرحومہ خالہ کی وصیت کی رو سے۔" وکیل صاحب رسانیت سے بولے۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"بات ممکن یا ناممکن ہونے کی نہیں۔ بات رعنابی بی مرحومہ کی وصیت کی ہے۔ رعنابی بی کو اپنی جائداد کے ایک تہائی حصے کی بابت وصیت کا کامل اختیار تھا اپنے اس اختیار کو وہ اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کرنے کے لیے استعمال کرنے کا پورا حق رکھتی تھیں۔ سو رعنابی بی نے اپنے شرعی حق کا استعمال کیا۔ حویلی کے نصف حقوقِ ملکیت کا تخمینہ مرحومہ کے کل ترکے کے ایک تہائی سے بھی کم ہے۔ وصیت میں بظاہر کوئی سقم نظر نہیں آتا۔ رعنابی بی ایک تہائی ترکے کی وصیت کا پورا استحقاق رکھتی تھیں جس شخص کو وہ حویلی کی ملکیت کے نصف حقوق وصیت کرگئی ہیں اب اس کی ملک بن چکی ہے۔"

کچھ دیر کو پھر خاموشی چھا گئی پھر ممی نے وکیل صاحب سے پوچھا۔ "یہ بتایئے وکیل صاحب کہ رعنا نے اپنی وصیت کب تیار کروائی تھی؟"

"وصیت تیار کروانے کی بابت انھوں نے مجھ سے پہلی مرتبہ تو تقریباً ڈھائی برس قبل رابطہ قائم کیا تھا۔ وہ خود میرے دفتر آئی تھیں اور اپنی وصیت تیار کروانے کی بابت مجھ سے سرسری سی بات چیت کی تھی میرے لیے ان کی گفتگو سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ وصیت کی بابت اپنا شرعی استحقاق وہ اپنی بھانجی عالیہ بی بی کے لیے ملحوظ رکھنا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں اہم اور ضروری معاملات وہ اگلی نشست میں طے کرنا چاہتی تھیں لیکن پھر انھوں نے اندازاً ایک سال تک اس سلسلے میں رابطہ قائم نہیں کیا۔ غالباً اپنی مصروفیات کے باعث یا شاید کوئی اور سبب تھا۔ میں بھی کچھ اپنی مصروفیات کے باعث اور کچھ اس خیال سے کہ ممکن ہے ان کا ارادہ بدل گیا ہو رابطہ قائم کرنے سے قاصر رہا۔ تقریباً ڈیڑھ سال قبل انھوں نے اس سلسلے میں دوبارہ مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ اس بار وہ اپنی وصیت کی تیاری کے سلسلے میں خاصی سنجیدہ نظر آتی تھیں۔ اس دفعہ انھوں نے مجھ سے خاصی تفصیلی گفتگو کی۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ ان کے ترکے کے شرعی وارث کون کون ہوں گے؟ وہ یہ بھی جاننا چاہتی تھیں کہ شرعی ورثاء سے قطع نظر وہ اپنی ملک کا کتنا حصہ کسی غیر کے نام وصیت کرسکتی تھیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ اپنے کل ترکے کا ایک تہائی یا اس سے کم وہ کسی کو بھی وصیت کرنے کی مجاز تھیں۔ انھوں نے مجھ سے چاہا کہ میں اپنے طور پر مگر نہایت رازداری سے حویلی کی موجودہ قیمت کا اندازہ کسی اسٹیٹ پراپرٹی ڈیلر کے ذریعے معلوم کرکے انھیں اس سے آگاہ کروں۔ ظاہر ہے کوئی پراپرٹی ڈیلر حویلی کی مکانیت اور بناوٹ کا اندازہ کیے بغیر قیمت کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ رعنابی بی نے خود ہی اس مسئلے کا حل پیش کردیا اور بولیں۔ حویلی پر رنگ و روغن ہوئے کافی عرصہ ہوگیا آپ کسی پراپرٹی ڈیلر کو رنگ و روغن کروانے والے ٹھیکیدار کے روپ میں بھیج دیجیے میں اسے حویلی اچھی طرح

دکھا دوں گی مگر ہاں، دیکھیے یہ بات آپ کے اور میرے سوا کسی تیسرے شخص کو کانوں کان معلوم نہ ہو کہ ہم حویلی کی قیمت کا اندازہ لگوا رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک پراپرٹی ڈیلر کو حویلی دیکھنے اور اس کی اس وقت کی قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے حویلی بھیجا۔ رعنائی بی نے اسے حویلی یوں ہی دکھائی جیسے وہ واقعی اسے رنگ روغن کروانے والا ٹھیکیدار ہی سمجھ رہی ہوں۔

پراپرٹی ڈیلر نے مجھے حویلی کی اس وقت کی حد سے حد قیمت سے آگاہ کیا اور میں نے رعنائی بی سے رابطہ قائم کرنے پر انھیں اس قیمت سے آگاہ کر دیا پھر رعنائی بی مرحومہ کے ساتھ میری ایک طویل نشست رہی۔ مجھ سے رازداری کا وعدہ لیتے ہوئے انھوں نے مجھے بتایا کہ حویلی وہ اپنی بھانجی عالیہ بی بی اور ایک ایسے نوجوان کے نام کرنے کی متمنی تھیں جس سے ان کا کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ انھوں نے مجھے اپنے جملہ اثاثوں سے بھی آگاہ کیا جن کی مجموعی مالیت کا اندازہ قائم کرنا چنداں دشوار نہ تھا۔ خاصی مغز سوزی، سوچ بچار اور حساب کتاب کے بعد میں نے مرحومہ کو اس امر سے آگاہ کر دیا کہ چونکہ حویلی کی قیمت وصیت کی بابت ان کے شرعی استحقاق سے دوگنی کے لگ بھگ ہے، اس لیے وہ پوری حویلی کی بابت تو وصیت نہ کر سکیں گی اور اگر وہ ایسا کریں گی تو شرعاً وصیت باطل قرار پائے گی۔ تاہم حویلی کے حقوق ملکیت کے دو نصف حصوں میں تقسیم کی بابت رعنائی بی مرحومہ کی خواہش کے پیش نظر راستہ نکال ہی لیا گیا اور رعنائی بی نے حویلی کی ملکیت کے نصف حقوق عالیہ بی بی کو بطور تحفہ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی رعنائی بی نے اپنی وصیت بھی تیار کروالی۔ یعنی ملک کا ایک تہائی۔ سو کم انھوں نے تیمور عالم ولد مسرور عالم کے نام بصورت حویلی کے نصف حقوق ملکیت کرنے کی وصیت تیار کروائی۔ بقیہ دو تہائی سے کچھ زیادہ حصے کی بابت نہیں میں نے بتا دیا تھا کہ یہ ان کے شرعی وارثوں کا حق ہے۔ خواہ وہ اس کی بابت کوئی ہدایت دیں یا نہ دیں، تاہم انھوں نے بقیہ دو تہائی املاک کی تصریح ضروری سمجھی تاکہ لواحقین کو یہ جاننے میں کوئی دشواری نہ ہو کہ مرحومہ کے ترکے میں کیا کچھ شامل ہے۔ وصیت تیار کروانے اور اسے کسی کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لیے انھوں نے وصیت کو رجسٹر بھی کروا دیا لیکن ان کی ہدایت کے بموجب ان کی وصیت سے ان کے ورثا کو ان کی موت کے بعد ہی مطلع کیا جانا تھا۔ اپنی اور رعنائی بی کی عمروں میں نمایاں تفاوت کے پیش نظر مجھے یقین تھا کہ مجھے اس وصیت کو ورثا تک پہنچانے کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی لیکن افسوس کہ رعنائی بی نے بہت جلدی کی . . .''

مرنے سے پہلے ایک بیوی اپنے شوہر کے لیے جا بجا وصیتیں کاغذ کے پرزوں پر لکھ کر رکھ گئی، مثلاً "یہ کپڑے دھوبی کو دے دیجیے!" "یہ بجلی کا بل ستائیس تاریخ کو جمع کرانا ہے۔" ایک روز شام کو جب شوہر اپنا بہترین سوٹ پہننے لگا تو اسے کوٹ کی جیب میں ایک کاغذ پر یہ تحریر نظر آئی: "یہ بہترین سوٹ پہن کر کہاں چلے؟ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے خبر نہ ہوگی۔"

ماحول خاصا سوگوار ہو گیا تھا۔

تقریباً ڈھائی برس قبل وصیت نامہ تیار کروانے کے لیے کاکا کا وکیل صاحب سے رابطہ قائم کرنے کا مطلب یہ تھا کہ کاکا نے اپنے اسپیشلسٹ کی اس رپورٹ کے سامنے آنے کے بعد وصیت نامہ تیار کروانے کے لیے پہلی بار وکیل صاحب سے رجوع کیا تھا جو اُن کی موت کے بعد ہمیں ان کی الماری کے چور خانے سے ملی تھی اور جس کی رُو سے ان کے خون میں سفید جسیموں کی تعداد معمول سے زیادہ پائی گئی تھی۔ کاش! کاکا نے اپنی بیماری چھپانے کے بجائے ظاہر کر دی ہوتی۔ کاش! وہ اس خاموش دشمن کو جان لیوا حد تک اپنی رگوں میں سرایت کر جانے کی اجازت نہ دیتیں۔ بے شک یہ دشمن مہیب اور مہلک تھا مگر معجزے بھی تو رونما ہوتے ہی ہیں۔ کیا عجب کہ دشمن بروقت پکڑ لیا جاتا اور کوئی معجزہ اسے زیر کر دیتا۔ بیمار تو کاکا اسی زمانے سے تھیں جب میں شہر میں زیرِ تعلیم تھی۔ کچھ بعید نہیں کہ یہ مہلک دشمن ان کی رگوں میں اسی وقت سے پاؤں پسار رہا ہو۔ اگر ایسا تھا تو کاکا کا کئی برس تک اس سے نبرد آزما رہنا بھی بجائے خود ایک معجزہ تھا۔

میرے دل میں محمود ظفر کے خلاف نفرت کا لاوا اُبلنے لگا۔ شاید اسی کی بے وفائی نے کاکا کی رگوں میں ٹھاٹھیں مارتے لہو میں دکھ گھول دیا تھا۔ ایسا دکھ کہ بالآخر کاکا نے موت کی آغوش میں منہ چھپا لیا تھا ورنہ اس سے پہلے تو کاکا زندگی سے پیار کرنے اور اسے عزیز رکھنے والوں میں شامل تھیں۔ حویلی کے در و بام آج بھی ان کے سراپے سے پھوٹنے والی خوشبوؤں کو سینے سے لگائے کھڑے تھے۔

مگر کاکا کی موت کے دکھ سے قطع نظر حویلی کے حقوقِ ملکیت کی تقسیم کی بابت ان کی وصیت نے ممی کو اور مجھے اس وقت ایک انوکھی الجھن میں گرفتار کر دیا تھا اور کس قدر حیرت انگیز انکشاف تھا یہ امر کہ مجھے حویلی کے نصف حقوقِ ملکیت گفٹ کرنے سے قبل ہی کاکا حویلی کے حقوقِ ملکیت میرے اور ایک ایسے نوجوان کے مابین تقسیم کرنے کے سلسلے میں وکیل صاحب سے مشورہ کر چکی تھیں جس سے ان کا کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ مزید برآں آدھی حویلی مجھے گفٹ کرنے کے موقع پر کاکا نے حویلی کے بقیہ نصف حقوقِ ملکیت تیمور عالم کے نام وصیت کر دیے تھے۔ اس وقت تک تو تیمور عالم کا حویلی سے دور دور تک بھی واسطہ نہ تھا۔

تو کیا کاکا تیمور عالم کو باقاعدہ منصوبے کے تحت حویلی میں لائی تھیں؟

کاکا کے اس اقدام کا کوئی جواز میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

"جی! تو تیمور عالم سے میری ملاقات آپ کے وسیلے سے ہو گی یا... مجھے کوئی دوسری صورت اختیار کرنا ہو گی۔ ایک صورت تو یہی ہو سکتی ہے کہ میں حویلی کے دربان سے کہوں کہ میں تیمور عالم سے ملنا چاہتا ہوں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وصیت نامے کی نقل میں بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ حویلی کے پتے پر تیمور عالم کے نام ارسال کر دوں۔ وہ از خود مجھ سے رابطہ قائم کرے گا۔" وکیل صاحب نے گمبھیر خاموشی کو توڑا۔

ممی نے ذرا دیر کو اپنے لب باہم پوری شدت سے بھینچ لیے پھر انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرنے کے بعد وکیل صاحب سے کہا۔ "وکیل صاحب! کیا اس شخص سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی؟ آپ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ ہم ماں بیٹی اپنے گھر میں ایک انجان شخص کو کیونکر رکھ سکتے ہیں؟"

"بی بی صاحبہ! معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ وہ تو اب بھی رہ رہا ہے یہاں۔"

"ایک ملازم کی حیثیت سے صرف ایک کمرے میں۔" ممی نے کہا۔

"آدھی حویلی کا مالک بن کر تو وہ پوری حویلی میں اِتراتا اور دندناتا پھرے گا۔" میں نے اضافہ کیا۔

"کیا وہ اسی قدر غیر مہذب اور نالائق ہے؟" وکیل صاحب نے پوچھا۔

"میں آئندہ کی بات کر رہی ہوں وکیل صاحب!" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"ایک غیر آدمی کا کیا اعتبار۔" ممی بولیں۔ پھر انھوں نے انتہائی لجاجت سے کہا۔ "برائے خدا کوئی صورت بتائیے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں بی بی صاحبہ! اختیار تو اب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہے تو آپ کی مشکل آسان کر سکتا ہے، اپنے حصے سے دستبردار ہو کر یا اس کی قیمت لے کر۔"

"بالکل... بالکل وکیل صاحب... ہم اسے آدھی حویلی کی قیمت دے دیں گے۔" ممی کے لہجے میں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملنے والی سرخوشی عود کر آئی۔

"آپ اس سے بات کر لیجیے گا۔ ہو سکتا ہے وہ راضی ہو جائے۔" وکیل صاحب بولے۔

"اس سلسلے میں آپ کو ہماری مدد کرنا ہو گی۔ ہماری جانب سے آپ اس سے بات کیجیے۔" ممی نے کہا۔

"بہتر ہے کروں گا مگر آپ اس سے مل لیجیے تو سہی پہلے۔"

"وہ نچلی منزل پر ایک کمرے میں رہتا ہے۔ میں آپ کو اس تک پہنچوائے دیتی ہوں۔ غالباً وہ لوگ ابھی تک باہر سے واپس نہیں لوٹے ہیں، کیوں عالیہ؟"

"جی ہاں! پارٹیز سے وصولی کے سلسلے میں کورنگی اور حیدرآباد وغیرہ گیا ہوا تھا۔" میں نے قدرے ناگواری سے کہا۔

اللہ دیا کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ ممی نے اللہ دین کو پکارا جو شام ڈھلنے کے بعد حسبِ معمول اوپر آ چکا تھا اور اسے وکیل صاحب کو تیمور کے کمرے تک پہنچا آنے کی ہدایت کی۔

"اچھی بات ہے بی بی صاحبہ! خدا حافظ۔" وکیل صاحب نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بریف کیس سنبھالنے کے بعد دایاں ہاتھ پیشانی تک لے جاتے ہوئے کہا۔

"آپ اس سے بات کر کے ہمیں بتائیں گے تو سہی؟" ممی نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"جی ضرور، مگر موقع اور حالات دیکھ کر بات کروں گا۔ اگر آج فوری طور پر بات نہ کر سکا تو پھر اسے اپنے دفتر میں بلا کر بات کروں گا۔" وکیل صاحب نے پل بھر کو خاموشی اختیار کی پھر بولے "بہرنوع جو بھی صورت رہی، میں آپ کو ضرور مطلع کروں گا۔"

"میں آپ کی دوبارہ آمد یا آپ کے فون کا بے چینی سے انتظار کروں گی، پوری کوشش کیجیے گا کہ وہ راضی ہو جائے۔"

"ضرور... ضرور..." وکیل صاحب نے گرمجوشی سے کہا۔

چلتے چلتے وکیل صاحب نے رخ میری جانب کیا اور بولے "عالیہ بی بی! خدا کرے کہ آپ کو کوئی بڑی مشکل درپیش نہ آئے تاہم اگر کبھی کسی معاملے میں میری خدمات درکار ہوں تو مجھے خوشی محسوس کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ حویلی کی ملکیت کی تقسیم کے سلسلے میں فریق دوم کے ساتھ آپ کے معاملات خوشگوار طریق پر انجام پذیر ہوں گے تاہم خدانخواستہ کسی قسم کے اختلاف یا تنازعہ کی صورت میں آپ کا مجھ سے رجوع کر لینا آپ کے حق میں یقیناً بہتر ہوگا۔ ویسے وصیت نامے میں تو ایسی کوئی شرط نہیں رکھی گئی کہ فریق دوم سے تنازعہ کی صورت میں آپ مجھ سے رجوع کرنے کی پابند بھی ہو جائیں، تاہم میں آپ کو اپنی خدمات پیش کر رہا ہوں۔"

"وکیل صاحب! سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلنے کی صورت میں ہمیں یقیناً آپ ہی کو زحمت دینا پڑے گی۔"

وکیل صاحب نے بڑے تدبر سے مسکراتے ہوئے اجازت چاہی۔

وکیل صاحب کو رخصت کرنے کے بعد ممی بے دم سی صوفے پر بیٹھ گئیں اور انھوں نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ان کا چہرہ انتہائی پریشانی کا غماز تھا۔ پریشان میں بھی تھی اور یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ کاکا یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے مردوں سے چڑ ہے، ایک اجنبی مرد کو حویلی کی ملکیت میں میرا شریک کیوں قرار دے گئی تھیں، کیا کاکا کے نزدیک اپنی عزیز از جان بھانجی اور ایک اجنبی شخص کی یکساں اہمیت تھی؟

خاصی دیر تک آنکھیں موندے صوفے کی پشت سے سر ٹکائے بے دم سی بیٹھی رہیں۔ پھر انھوں نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور بولیں: "سمجھ میں نہیں آتا کہ رضا کا اس شخص سے کیا تعلق تھا؟"

مجھے ممی کی آنکھوں میں عجیب سے اشتباہ کی پرچھائیاں ہلکورے لیتی دکھائی دے رہی تھیں۔

"اتنا عزیز تھا یہ شخص رضا کو کہ آدھی حویلی نام کر گئیں۔ وہ حویلی جو میری ماں کی یادگار ہے۔"

"جی ہاں، یہی حیرانی مجھے بھی ہے۔ دینا ہی تھا اسے تو کچھ اور دے جاتیں۔ نقد رقم، زیورات یا کچھ بھی، انھوں نے تو آدھی حویلی دے ڈالی حالانکہ کاکا اچھی طرح جانتی تھیں کہ مردوں کے حوالے سے ہم سب نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں۔ پاپا نے آپ کو دھوکا دیا، مجھے باپ سے محروم کر دیا اور خود کاکا کو بھی تو ایک مرد ہی نے... کاکا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"اب تو وہ کر گئیں اور ایسی جگہ جا پہنچیں کہ تم یا میں ان کے اس غلط فیصلے کے خلاف احتجاج بھی نہیں کر سکتے۔" ممی نے کہا۔

"مگر ہم چپ بھی تو نہیں رہ سکتے ممی! یہ سراسر ناانصافی ہے کہ ایک اجنبی ہمارے سروں پر مسلط ہو جائے۔" میں نے تڑپ کر کہا۔

ممی اٹھ کھڑی ہوئیں، غالباً انھوں نے میری آنکھوں میں امڈ آنے والی آبی لہر دیکھ لی تھی۔ میرے نزدیک آ کر انھوں نے میرے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا: "اچھا اب تم زیادہ پریشان مت ہو، خدا بہتر کرے گا۔"

"کیا آپ پریشان نہیں ہیں؟" میں نے سر اٹھا کر ممی کو دیکھا۔

ممی کے لبوں کے گوشے دھیرے دھیرے کپکپانے لگے۔ اف، کاکا ہمیں کس مشکل سے دوچار کر گئی تھیں۔

اگلے دن میں نیچے نہیں گئی۔ سر درد اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیے اوپر ہی اپنے کمرے میں پڑی رہی۔ نیچے میری عدم موجودگی میں بھی کام حسبِ معمول جاری تھا۔ عورتیں دو دو تین تین کی ٹولیوں میں میری مزاج پرسی کو نیچے سے اوپر آتی رہیں اور مجھے صحت اور حیاتی کی دعائیں دے دے کر لوٹتی رہیں۔ میں آپ اپنی تماشائی بنی پڑی تھی۔ کیسے بتاتی میں انہیں کہ میری اپنی عزیز از جان کاکا مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر گئی تھیں۔ کل تک جس شخص کو میں اپنا ملازم جان کر ہدایات و احکامات جاری کیا کرتی تھی، اسے اس گھر کی ملکیت میں اپنے حصے دار اور شریک کی حیثیت میں دیکھنے کا تصور ہی میرے لیے محال تھا جس سے میں ایک ناقابلِ بیان وابستگی رکھتی تھی۔

مجھے حویلی سے پیار بلکہ عشق تھا۔ شاید اس لیے کہ حویلی کے بام و در اس دنیائے رنگ و بو میں میری پہلی صدا کے امین تھے۔ یہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ اسی حویلی کے برآمدوں اور راہداریوں میں اور سبزہ زاروں پر میں نے دھیرے دھیرے چلنا سیکھا تھا۔ حویلی کے دریچوں میں ممی کے سنگ کھڑے ہو کر پاپا کی موٹر کی راہ تکی تھی۔ انہی دریچوں سے میں پاپا اور ممی کو موٹر میں پہلو بہ پہلو بیٹھے سیر کے لیے باہر جاتے دیکھ کر اس بری طرح مچل جایا کرتی تھی کہ نانی اماں کے لیے مجھے سنبھالنا دشوار ہو جایا کرتا تھا۔ اسی حویلی کے در و دیوار سے میری نوعمری کے خوشگوار دنوں کی یادیں عشق پیچاں کی بیلوں کی مانند لپٹی پڑی تھیں۔ انہی یادوں کے جھروکوں سے میں آج بھی ممی کو سہاگن کی کھلی تفسیر بنے اور حویلی میں مسرتوں کو دیوانہ وار رقصاں دیکھ سکتی تھی۔ ممی کسی ملکہ کی طرح حویلی کے ملازموں کو ہدایات جاری اور احکامات صادر کرتی پھرتیں اور نانی اماں ملکہ بنی بڑے کروفر سے بیٹھی رہتیں۔ اسی حویلی کی فضاؤں میں کاکا کی دلپذیر یادوں کی مہک بسی تھی۔ تصور کی کرشمہ سازیوں کے طفیل میں آج بھی کاکا کا رنگین سراپا حویلی کے طول و عرض میں ڈولتے دیکھ سکتی تھی۔ ان کی سینڈلوں کی کھٹ پٹ، ان کے مترنم قہقہوں کی کھنک اور ان کی پسندیدہ انگریزی دھنوں اور انڈین گیتوں کی بازگشت میں آج بھی سن سکتی تھی۔ راک اینڈ رول اور چاچا چا کی مسحور کن دھنیں آج بھی حویلی کی فضاؤں کے دوش پر سوار میری سماعت کے ایوانوں تک پہنچتی رہتی تھیں۔ حویلی کے بام و در کاکا کی پسندیدہ خوشبوؤں سے مہکتے رہتے۔ کیسے اچھے دن تھے وہ۔ پھر اسی حویلی میں میں نے ممی کو سہاگن سے ابھاگن کا روپ دھارتے دیکھا۔ اسی حویلی میں، میں نے کاکا اور محمود ظفر کی سرگوشیاں سنی تھیں۔ کاکا کو پھول کی طرح کھلتے دیکھا تھا۔ پھر اسی حویلی میں میں نے کاکا کی خوشیوں کو دم توڑتے بھی دیکھا تھا۔ کتنی بہت سی یادیں وابستہ تھیں اس حویلی سے۔ خوشگوار بھی اور ناخوشگوار بھی۔ دل کو خوش کرنے والی بھی اور دل دکھا دینے والی بھی۔ ذہن کو کیف و سرور سے ہم آغوش کر دینے والی بھی اور مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے پر مجبور کر دینے والی بھی۔

میرے ماضی کی ان گنت یادوں کی امین ہونے سے قطع نظر حویلی میرے لیے جائے پناہ تھی، ایک ایسا قلعہ تھی جس میں خود کو محصور کر کے میں اپنے دشمن کا مقابلہ کر سکتی تھی نہ کہ اس کا نشانہ بن سکتی تھی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حویلی میری راجدھانی تھی جہاں گزشتہ چند برسوں سے میرا سکہ چل رہا تھا۔ گاؤں کی وہ تمام عورتیں میری رعیت بن چکی تھیں جو کام سیکھنے یا اجرت پر مختلف النوع کام کرنے میرے پاس حویلی آیا کرتی تھیں۔ اسی حویلی سے گاؤں بھر میں ہماری عزت تھی۔ جن عورتوں کے لیے میں نے وسائلِ روزگار مہیا کیے تھے، وہ پرستش کی حد تک میرا احترام کرتی تھیں۔ میری شہ پا کر ان میں سے بہت سی اپنے مردوں کو جن کے آگے وہ زبان کھولتے بھی ڈرتی تھیں، باقاعدہ جواب دینے لگی تھیں اور اسے میں اپنی ایک بڑی کامیابی خیال کرتی تھی۔

کاکا کی وصیت سے آگاہ ہونے کے بعد میرے دل کی کیفیت ایسی تھی جیسے کسی سلطنت کے حکمران عالی مقام کو یہ خبر ملے کہ حدودِ سلطنت میں اپنوں نے بغاوت پھیلا دی ہے اور ایک بیرونی طاقت اس کی سلطنت کے نصف حصے کو اپنی عملداری میں لے چکی ہے۔ ایک غیور سلطان کی طرح میں اس غاصب کی منتظر تھی اور بھاری تاوان کے عوض اس نصف حصے کو بدستور اپنی عملداری میں رکھنے کی متمنی۔

صبح سے شام تک ممی وکیل صاحب کے فون یا ان کے حویلی آنے کی منتظر رہیں۔ وہ وعدہ کر گئے تھے کہ تیر سے مل کر حویلی کے نصف حقوقِ ملکیت سے اس کی دستبرداری کی کوئی صورت نکالنے کی کوشش کریں گے۔ میں بھی وکیل صاحب کی آمد یا ان کے فون کا بے چینی سے انتظار کرتی رہی مگر نہ وکیل صاحب کا فون آیا نہ وہ خود آئے۔ کاکا کی وصیت ہمارے لیے ایک ایسا صدمۂ گراں ثابت ہوئی تھی جس نے میری اور ممی کی بھوک پیاس تک اڑا دی تھی۔ گزری رات بھی ہم کھانا کھائے بغیر ہی سو گئے تھے۔ صبح ناشتہ بھی برائے نام کیا تھا۔ دوپہر کو بھی دو چار نوالے زہر مار کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ماسی بشیراں اور اللہ وسایا کی نگاہوں میں بلکتی سی حیرانی ہم سے اس پژمردگی کا سبب پوچھ رہی

تی ممی کا اصول تھا کہ گھر کے ملازموں سے فاصلہ رہنا چاہیے کیونکہ وہ گھر کے بھیدی بن جائیں تو لنکا ڈھا سکتے ہیں۔

مگر آج میرا جی چاہ رہا تھا کہ تی کے اس اصول سے ٹکرا جاؤں اور کم از کم اللہ دسایا کو تو اپنی پژمردگی کا سبب بتا ہی دوں۔ اسے کاکا کی وصیت کے بارے میں بتا کر اس سے اپنے رقیب روسیاہ کی حرکات و تاثرات کی بابت استفسار کروں۔ اس سے پوچھوں کہ اس کے رویے میں کل کی نسبت آج کس قسم کی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ آدھی حویلی کا مالک بن کر وہ کس حد تک اترا رہا ہے۔ زندگی میں پہلی بار یوں ہوا تھا کہ میں حویلی میں اپنے اختیارات کے سلسلے میں خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔ میں نیچے جانا چاہتی تھی مگر ہمت ساتھ نہ دے رہی تھی۔ حویلی سے مجھے عشق تھا۔ حویلی کو میں اپنی راجدھانی سمجھا کرتی تھی مگر آج وہ عشق بے بس ہو رہا تھا اور اس راجدھانی کی بنیادیں ہل رہی تھیں۔ میں اختیارات سے محروم کر دیے جانے والوں کی بے بسی اور نارسائی کا درد بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔

رات کو تی نے از خود وکیل صاحب سے ان کی ملاقات کے فون پر رابطہ قائم کیا۔ وکیل صاحب گھر ہی پر تھے۔ تی نے ان سے یہ جاننا چاہا کہ تیمور سے انھوں نے حویلی میں اس کے حصے کی بابت بات کی تھی یا نہیں۔ وکیل صاحب کا جواب نفی میں تھا۔ تی وکیل صاحب سے بات کرنے کے بعد میری جانب متوجہ ہوئیں تو میں سراپا منتظر بیٹھی تھی۔ تی نے میری جانب سے کسی سوال کا انتظار کیے بنا کہا۔

"وکیل صاحب نے ابھی اس سے کوئی بات نہیں کی۔"

"جی ان کا یہ جواب تو میں ان کی آواز سنے بنا ہی آپ کے تاثرات سے بوجھ چکی تھی لیکن کیوں نہیں کی انھوں نے اس سے بات؟"

"کہہ رہے تھے موقع دیکھ کر بات کریں گے۔"

"موقع دیکھ کر؟ کون سا موقع؟"

"اب یہ وکیل صاحب ہی جانیں۔"

"تو کیا تب تک میں اسی شش و پنج میں رہوں گی؟"

"کیا مطلب؟" تی نے حیرانی سے میری جانب دیکھا۔

"میں آج محض اسی خیال سے نیچے نہیں اتری کہ اس منحوس آدمی کی صورت دیکھنا پڑے گی۔"

"وہ منحوس کہاں ہے۔ اسے تو تمھارے کاکا لاکھوں کی جائداد دے گئے ہیں۔" تی نے تلخی سے کہا۔

"ہمارے لیے تو وہ منحوس ہی ثابت ہوا ہے۔"

"ہاں بعض لوگوں کی اپنی بختاوری دوسروں کے لیے نحوست بن جاتی ہے۔"

"کاش... کاش... کاکا نے یہ ظلم نہ کیا ہوتا۔" میں نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

"اچھا فرح تم زیادہ پریشان مت ہو۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔"

میں نے اپنا سر ہاتھوں سے تھام لیا۔

"بیٹا! زیادہ پریشان ہوگی تو بیمار پڑ جاؤ گی۔" تی نے سمجھایا۔

"خدا کرے میں مر ہی جاؤں۔"

"کیسی باتیں نکال رہی ہو منہ سے۔"

"اور کیا اس منحوس کا سامنا کرنے سے تو بہتر ہے کہ میں مر جاؤں۔"

"کون کہتا ہے تمھیں اس کا سامنا کرنے کو؟"

میں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے تی کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میں نیچے اتروں گی تو اس سے سامنا ضرور ہوگا۔"

"تو نہ اترو نیچے۔"

"نیچے نہیں اتروں گی تو کام کیونکر ہوگا۔ اس ماہ کے آخر تک ہمیں کاٹن کے ایک بڑے آرڈر کی سپلائی دینا ہے۔"

"تو چلی جانا نیچے۔" تی نے بڑی متانت سے کہا۔

"اوہ! اوہ تی! آپ نہیں سمجھ سکتیں۔" میں نے ہیجان کے عالم میں کہا۔

"کیا نہیں سمجھ سکتی میں؟"

"کہ وہ شخص کہ جو کل تک میرے آگے سر جھکائے رہا کرتا تھا اسے اس حویلی کی ملکیت میں اپنے برابر کے شریک کی حیثیت میں دیکھنا میرے لیے کس قدر مشکل ہوگا۔"

"تم اس سے تعلق ہی نہ رکھنا۔"

"کیا یہ ممکن ہوگا؟"

"کیوں ممکن نہیں ہوگا؟"

"کیونکہ وہ میرا معاون کار ہے۔"

"دوسرا آدمی رکھ لو تم۔"

"جبکہ وہ بھی اسی حویلی میں موجود ہوگا۔" میں نے تندی سے تی سے کہا۔ "چلیے آپ کے کہنے کے مطابق دوسرا آدمی توں رکھ لوں گی مگر کیا آپ اس امر پر نہیں سوچیں گی کہ اس کی جگہ دوسرا آدمی رکھ لیے جانے کے باوجود بھی وہ اسی حویلی میں رہ رہا ہوگا۔ ہم اسے ملازمت سے تو نکال سکتے ہیں مگر اس حویلی سے...؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" تی نے کہا اور سوچ میں پڑ گئیں۔

"اب آپ بتائیے کہ میں کیا کروں؟"

"جب تک کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا مت جاؤ نیچے۔"

"اور کام کیسے چلے گا؟"

"دفع کرو کام کو۔"

"یہ آپ کہہ رہی ہیں! آپ بھی... یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں نے اس ادارے کے لیے کتنی محنت کی ہے؟"

"تو بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں؟"

بے بسی کا احساس مجھے سانپ کی پھنکار کی طرح ڈسنے لگا۔

"خدا جانے آج وہ کس قدر اترا رہا ہوگا" میں خود کلامی کے عالم میں بڑبڑائی۔

"اترانے دو کب تک اترا سکے گا"

"بہرحال ہی کل مجھے نیچے جانا ہی پڑے گا"

"تو چلی جانا پریشان کیوں ہو رہی ہو" ممی کے لہجے میں ہلکی سی بیزاری تھی۔

"اللہ وسایا سے پوچھیں کہ آج اس کا رویہ کیسا رہا؟" میں نے تائید طلب نگاہوں سے ممی کی طرف دیکھا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ نوکروں کو میں گھر کے معاملات میں دخل نہیں ہونے دیتی۔ کیا اللہ وسایا اس امر پر نہیں چونکے گا کہ آج تم اس شخص کے رویے کے بارے میں بطورِ خاص کیوں استفسار کر رہی ہو؟"

"میں اللہ وسایا کو اعتماد میں لے کر بات پوچھوں گی"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں اسے بتا دوں گی کہ کا کا کس قسم کی گڑبڑ کر گئی ہیں"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو" ممی نے مجھے جھڑکا — "آنِ واحد میں بات کہیں سے کہیں جا پہنچے گی۔ میں ریحانہ کی حماقت کی تشہیر نہیں ہونے دینا چاہتی"

"تشہیر کا کیا ہے۔ تیمور خود ڈھنڈورا پیٹ سکتا ہے"

"مگر ہم اپنی زبان سے کیوں کہیں؟"

ممی کی یہ منطق میری سمجھ سے بالا تھی۔

کسی خول میں محصور ہو کر خود کو جملہ آفات سے محفوظ سمجھ لینا دانشمندانہ اقدام تو نہیں ہوتا کوئی بھی شدید ضرب اس خول کو پارہ پارہ کر کے ہمیں نہاں سے عریاں کر سکتی ہے۔ بہرحال ممی کا حکم مرے لیے حکمِ حاکم کے مصداق تھا۔

اس رات بستر پر لیٹے ہوئے میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"عالیہ! تجھے اس سے خائف ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ وہ مرد ہے اور تو عورت کے خلاف سینہ سپر ہے تو اس سے خائف ہونے کے بجائے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ اس سے ڈر کر چھپ جانے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ تو نے اپنی کمزوری تسلیم کر لی ہے"

"میں ڈر تو نہیں رہی ہوں" میرے اندر موجود لڑکی نے بلبلا کر کہا۔

"تو پھر آج بیماری کا بہانہ کر کے اوپر ہی رہنے کا سبب؟"

"میں واقعی بیمار محسوس کر رہی تھی"

میرے اندر والی لڑکی کھلکھلا کر ہنس دی اور اس کی ہنسی نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔

"خاموش! اے بے وقوف کہیں کی" میں نے اسے پھٹکارا۔

"کون؟ میں یا تو؟"

اس کی اس دیدہ دلیری پر میں حواس باختہ ہو کے رہ گئی۔

"بی بی! ایک مرد مقابلے پر ہے۔ پیچھے ہٹو گی تو کوئی اور ہنسے یا نہ ہنسے کم از کم میں تو خوب ہنسوں گی"

میں نے اپنے لب باہم بھینچ لیے، کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور آنکھیں اس شدت سے بھینچ لیں کہ میری آنکھوں میں ستارے شرارتی بچوں کی طرح ناچنے لگے مگر وہ کھلکھلاتی ہنسی تھمتی ہی نہ تھی۔

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے... میں جاؤں گی... کل صبح ضرور جاؤں گی میں نیچے اور... اور دیکھوں گی کہ وہ کیا کہتا ہے اور کیا کرتا ہے" میں نے اس ہیجان پر قابو پانے کی کوشش کی جس سے کہ میں اس وقت خود کو دوچار پا رہی تھی۔

☆

گیارہ بجے صبح میں نیچے جانے کو تیار ہوئی تو ممی نے قدرے بے یقینی سے پوچھا: "کیا تم نیچے جا رہی ہو؟"

"جی ہاں" میں نے بظاہر بڑے اطمینان سے جواب دیا مگر اندر سے میں خوف زدہ سی تھی۔

"مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ...؟" ممی نے اپنا سوال ادھورا ہی چھوڑ دیا۔

"ممی اب تو حالات جیسے بھی ہوں ان کا سامنا تو کرنا ہی ہے"

"دیکھو فی الحال اس سے کچھ مت کہنا سننا وکیل صاحب کہہ رہے تھے کہ چار چھ روز بعد وہ خود چکر لگائیں گے اور اپنے طور پر اس سے بات کریں گے"

"ٹھیک ہے ممی!" میں نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔

"اور بیشتر فی الحال اس سے اس کی ملازمت کے سلسلے میں بھی کچھ مت کہنا سننا میرا مطلب ہے اگر وہ کام جاری رکھتا ہے تو ابھی اسے نوکری سے علیحدہ کرنے وغیرہ کی کچھ بات نہ کرنا"

"جی اچھا"

"وکیل صاحب بات کریں گے تو پتہ چلے گا کہ اس کے ارادے کیا ہیں۔ اس وقت تک ہم اپنے ارادے اس پر کیوں ظاہر کریں"

"کیوں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

"ممی جی!"
"تم تو اس طرح یوں ظاہر کرتا ہے جیسے تمہیں کچھ پروا ہی نہیں۔"
"ٹھیک ہے جی!"
"کمزور مرد ہی اپنی کمزوریاں چھپا کر ہی رکھنا چاہیں ورنہ وہ عادی ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔"
"جی۔"
"اگر کہو تو میں بھی نیچے چلوں تمہارے ساتھ؟"
"نہیں ممی! اس کی ضرورت نہیں۔ معمولی اس تبدیلی کو کہیں وہ ہماری کمزوری نہ سمجھ بیٹھے اور ابھی آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ مرد ہی اپنی کمزوریاں چھپا کر ہی رکھنا چاہیں۔"
"ٹھیک ہے بیٹی، میں دوپہر کو ایک چکر لگاؤں گی۔"
"جی اچھا۔"
"تم نے آج لپ اسٹک کیوں نہیں لگائی اور تم نے ہی پف کیا ہے؟"
"بس یونہی۔"

ممی میری جانب بڑھ آئیں اور میرے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک کر بولیں: "بیٹا! تم اس طرح ظاہر کرنے جا رہی ہو کہ جیسے حالات کی تمہیں ذرا پروا نہیں، متعلق پریشانی یا فکر نہیں۔ اس قدر اترا ہوا چہرہ لے کر نیچے اترو گی تو وہ لوگ اسے تمہاری طبیعت کی خرابی پر محمول کریں گی مگر وہ سمجھ جائے گا کیونکہ ایک دن کی معمولی بیماری آدمی کو یوں اجاڑ نہیں دیتی۔"

بادلِ ناخواستہ میں نے اپنی سنگھار میز کا رخ کیا اور اپنے ہونٹوں پر کاسنی رنگ کے جوڑے کی مناسبت سے کاسنی شیڈ کی لپ اسٹک کی تہہ جماتے ہوئے میں نے آئینے میں دیکھتے ہوئے سوچا۔
"ممی کتنی دور اندیش ہیں۔"

اس روز زینہ اتر کر حویلی کی زیریں منزل پر جاتے ہوئے میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ یہ احساس کہ حویلی اب صرف ہماری نہیں رہی، مجھے کچوکے دے رہا تھا۔ زینہ عبور کرنے کے بعد برآمدے سے گزرتے ہوئے میں نے ستونوں اور محرابوں کے اس پار سرسبز و شاداب منظر کو دیکھتے ہوئے جی ہی جی میں کہا۔ "دادا جی! یہ حویلی تو میری جنت تھی، آپ نے بے رخی سے اس کے دو ٹکڑے کیوں کر دیے!"

بے اختیار میری آنکھیں بھر آئیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہیں ملک عدیل کی بات سن سکتی، دادا ان کے محسوسات کو محسوس کر سکتی ہیں تو دادا جی اس لمحے میرے دل کو اتنا دکھی اور ملول پا کر اپنے اس

وہ دن گئے جب مارک انتھونی مجھ سے کہتا تھا، روم والو!
اپنے اپنے کان مجھے ادھار دے دو۔
پاکستان کے سامعین کہیں گے، دو کان دو، پہلے ضمانت جمع کراؤ۔

☆☆☆☆☆

بیوی عشق کی کھڑکی ہے، شکووں کا مال گودام نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

میں ہمالیہ کو تھرپارکر لا سکتا ہوں، اگر جگہ ہو۔

☆☆☆☆☆

ہماری سیاسی پارٹی میں کوئی نظم نہیں ہے، سب نثر ہے۔

☆☆☆☆☆

ابھی آپ کی انگلیاں اتنی کمزور تو نہیں ہوئیں کہ میری دکھتی ہوئی رگ نہ پکڑ سکیں۔

فیصلے پر ضرور پچھتائی ہوں گی۔

اللہ دسایا میرے دفتر کا مقفل دروازہ کھول کر الف دین سے جھاڑ پونچھ کروا چکا تھا۔ کام کرنے والی جو عورتیں آ چکی تھیں وہ لپک کر میری خیریت پوچھنے لگیں۔
"اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔
"بی بی! رب سوہنا میری چندری آپ کو لگا دے۔" ماسی رحمتے اپنا دوپٹہ پھیلا کر بولی۔
"ماسی رحمتے! زندگی سب اپنی اپنی ہی جیتے اچھے لگتے ہیں۔" میں نے کہا ——
"ہاں بی بی ناں! کبھی کبھی دوسروں کی دی ہوئی زندگی اپنی زندگی سے زیادہ سوہنی لگتی ہے۔" بیداں مسکرا کر بولی۔
"میں بھی نہیں۔"
"دیکھیں ناں جی! میری اپنی زندگی تو یونہی خراب تھی پر جو نئی زندگی بی بی جی! آپ نے دی ہے ناں جی! وہ مجھے بڑی سوہنی لگتی ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ بی بی سوہنی کہ میرا خاوند مارا کرتا تھا جی مجھے پر جب آپ نے اسے سمجھایا جی کہ مرد سے پٹنا اچھی بات نہیں

تو میں نے بھی اس کا فیصلہ کر کے مقابلہ کیا۔ وہ جب ہاتھ اٹھاتا تھا تو میں بھی نہیں چھوڑتی تھی۔ وہ ڈنڈا اٹھاتا تو میں بھی اس کا بازو پکڑ لیتی۔ اس نے بولا، تیرا کیا ہے پانی بند میں نے بولا۔ جا نہیں چاہیے مجھے تیرا کیا ہے پانی۔ میں آپ دو ڈھائی سو روپیہ مہینے کا خرچ کماتی ہوں۔"

"اچھا پھر… پھر کیا ہوا؟" میں نے بڑا اشتیاق لیے میں پوچھا۔

"ہونا کیا تھا جی… پہلے اٹھتے بیٹھتے مارتا پیٹتا تھا۔ اب ہفتہ دو ہفتے بعد ہی ہاتھ اٹھاتا ہے۔"

"گویا خاوند کی مار تم اب بھی کھاتی ہو؟" میں نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"بی بی جی! اتنا تو اس کا حق بنتا ہی ہے۔" بیداں بولی۔

مجھے بیداں کی حالت پر افسوس ہوا۔

"ایک بات بتا بیداں مرد سے مار کھا کر تجھے اس سے نفرت نہیں ہوتی؟"

"ناں جی ناں…" بیداں اپنی اوڑھنی کا کونا دانتوں تلے دبا کر شرماتے ہوئے بولی "مرد سے بھلا عورت کو نفرت کب ہوتی ہے۔ مرد سے تو پیار ہوتا ہے جی عورت کو۔"

ابھی ذرا دیر پہلے بیداں کی اس بات نے کہ جو خوشی بی بی جی آپ نے دی ہے، وہ مجھے بڑی سوہنی لگتی ہے، مجھے جس کیف سے دوچار کر دیا تھا وہ آن واحد میں رفو چکر ہو گیا۔

"اچھا جاؤ، جا کے کام کرو تم لوگ۔" میں نے بیداں، ماسی رحمتے اور ان کے ساتھ آنے والی ان کارکن عورتوں سے کہا جو میری مزاج پرسی کو میرے دفتر میں آ گئی تھیں۔

انھیں گئے ذرا ہی دیر گزری تھی اور میں عورتوں کی ہفتہ واری اجرت کا گوشوارہ بنا رہی تھی کہ میرے کانوں سے ایک مانوس مردانہ آواز ٹکرائی۔

"میں اندر آ سکتا ہوں میڈم؟"

میرا دل بے محابا دھڑکنے لگا۔ شاید میری انگلیوں کے بیچ دبا قلم بھی کپکپانے لگا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ تیمور حسب معمول انتہائی مودبانہ انداز میں دروازے پہ کھڑا اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

"جی۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

وہ میرے روبرو آ بیٹھا۔

"میڈم! لاہور کی ایک پارٹی ملبوسات اور گرم شالوں پر سندھی کڑھائی اور شیشوں کے کام میں انٹرسٹڈ ہے۔ اگر آپ چند سیمپلز عمدہ قسم کے تیار کروا دیں تو میں لاہور کا چکر لگا آؤں۔"

میرے جی میں تو آیا صاف صاف کہہ دوں کہ اب ہمیں آپ کی خدمات کی ضرورت نہیں رہی مگر پھر مجھے ترجی کی ہدایات کا خیال آ گیا۔

"جی… ٹھیک ہے… میں نمونے تیار کروا دیتی ہوں… بلکہ… چند نمونے تو تیار رکھے ہیں۔ آپ لے کر چلے جائیں۔" میں نے اس موقع کو چند روز کے لیے اس سے نجات حاصل کرنے کا بہترین موقع سمجھتے ہوئے کہا۔

"وہ نمونے کل میں نے دیکھے تھے لیکن…!"

"لیکن کیا؟" میں نے اس کی جانب دیکھے بنا پوچھا۔

"اوّل تو وہ پرانے ہو چکے ہیں، دوسرے ان میں وہ نفاست نہیں جس کی مذکورہ پارٹی متقاضی ہے۔ بقول اس پارٹی کے کام کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن وہ نفاست چاہتے ہیں کام میں کیونکہ ان کا بزنس مال پر ہے۔ وہاں جنرزی آتی ہے۔"

"تو پھر آپ اپنی مرضی سے نمونے تیار کروا لیجیے۔"

"میڈم! یہ تو آپ کا شعبہ ہے۔ میرا کام تو آپ کو پارٹیز کی ریکوائرمنٹس سے آگاہ کرنا اور پارٹیز کو مال کی فراہمی ہے۔"

"او کے، میں نمونے تیار کروا دیتی ہوں۔" میں نے اپنے سامنے کھلے رجسٹر پر نگاہیں مرکوز کیے رکھیں۔

"کراچی کے لیے تو مال وقت پر تیار ہو جائے گا نا؟"

"جی۔"

"وصولی کے لیے فیصل آباد بھی جانا ہے۔"

"ہوں۔"

میری نگاہیں بدستور رجسٹر پر تھیں اور اب میں اس سے کچھ اور سننے کی منتظر تھی۔ عموماً وہ کام کی بات کر لینے کے بعد اٹھ ہی جایا کرتا تھا مگر اس روز وہ بیٹھا رہا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر اس کی آواز نے یہ خاموشی توڑ دی۔

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

جی میں آیا کہوں "تمہیں اس سے مطلب؟"

مگر ترجی کی ہدایات نے مجھے تحمل سے کام لینے پر مجبور کر دیا۔

"اب ٹھیک ہے۔" میں نے متانت سے کہا۔

"میرے لائق کوئی خدمت؟"

"جی… شکریہ…"

"اجازت؟"

"جی۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے اپنے جبڑے پوری سختی سے باہم بھینچ لیے۔ مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ جونہی وہ دروازے سے نکلا میں نے رجسٹر بند کیا اور سر ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئی۔

دوپہر کو ممی نے حسبِ معمول نیچے کا چکر لگایا۔

سہ پہر گزری، شام آئی اور میں حسبِ معمول کچھ جلدی ہی دفتر سے اٹھ کر اوپر چلی گئی۔ رات آئی اور گہری ہو گئی کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی۔

اگلا دن بھی کسی غیر معمولی واقعے کے بنا ہی گزر گیا۔ حسبِ معمول اس نے ایک حاضری دی۔ چند ضروری امور کی بابت بات کی۔ لاہور کے نمونوں کی تیاری کی یاددہانی کرائی پھر چلا گیا۔

تیسرا دن بھی اسی خاموشی سے تمام ہوا۔

چوتھا دن بھی چپ چاپ گزر گیا۔

اب اس کی خاموشی کھلنے لگی مجھے بھی اور ممی کو بھی۔

پانچویں دن بھی جب ممی کے استفسار پر میں نے انہیں یہی بتایا کہ اس نے کاکا کی وصیت اور حویلی میں اپنے حقوق کی بابت کوئی بات نہیں کی تو ممی ناحق تشویش میں پڑ گئیں۔

"ہر خاموشی طوفان کی تمہید ہوا کرتی ہے۔" ممی نے کہا۔

"ممی! اب تو مجھے بھی اس کی خاموشی سے وحشت ہونے لگی ہے۔ آپ وکیل صاحب سے بات کریں اور ان سے کہیں کہ وہ جلد از جلد ہمیں اس عذاب سے چھٹکارا دلائیں۔"

"مغرب کے بعد کرتی ہوں میں انہیں فون۔" ممی نے کہا۔

مغرب کے بعد جب ممی نے وکیل صاحب کے گھر کے نمبر پر ان سے بات کرنا چاہی تو پتا چلا کسی مقدمے کے سلسلے میں وکیل صاحب دس پندرہ دن کے لیے گجرات گئے ہوئے تھے۔

"بتاؤ اب کیا کریں؟"

"ممی! ہم خود ہی کیوں نہ بات کریں اس سے؟"

"نہیں بیٹا! ہم براہِ راست بات کریں گے تو وہ پھیل بھی سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اپنے حق سے دستبرداری کی اتنی قیمت مانگ لے جو ہماری توقعات سے بہت زیادہ ہو یا ہماری پہنچ میں نہ ہو۔"

"ممی! اگر ہمیں سب کچھ دے کر بھی سودا کرنا پڑا تو ہم کر لیں گے۔ ہم سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں، ساری چیزوں سے محروم ہو سکتے ہیں مگر حویلی ہماری ہی رہے گی۔ حویلی میں ہم اپنے سوا کسی اور کی مداخلت برداشت نہیں کریں گے۔" میں نے کسی ضدی بچے کی طرح مچل کر کہا۔

"لیکن میری جان! ہمیں یہ سب کچھ اس پر ہرگز ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ وہ زیادہ قیمت طلب کرے گا۔ کوئی شخص دوسروں کو ستانے پر آ جائے تو ہر طرح سے ستانے کی کوشش کرتا ہے۔"

"ممی! اس گھر سے مجھے عشق ہے۔ میں کسی قیمت پر بھی اس کا کوئی حصہ کھونا نہیں چاہتی۔" میں نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔

[illegible]

"تمہارا کیا خیال ہے، میں کھونا چاہتی ہوں؟" ممی نے دلگیر لہجے میں کہا پھر قدرے توقف سے بولیں: "اس حویلی سے میری ان گنت یادیں وابستہ ہیں۔"

ممی کی آواز رقت میں بھیگی ہوئی پاکر میں نے ممی کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"ہمیں اس سے خود بات کرلینا چاہیے۔ وکیل صاحب کا انتظار ہم کب تک کریں گے آخر؟"

"بیٹا! ہمیں وکیل صاحب کا انتظار کرنا ہوگا، ان کا بات کرنا زیادہ بہتر رہے گا۔"

"اور تب تک اس کی خاموشی ہمیں ڈراتی رہے گی۔"

"ڈرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟"

میں ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

کیسے سمجھاتی میں ممی کو کہ اس کی خاموشی سے میں اس لیے خائف تھی کہ گھٹا مستقل چھائی رہے، نہ برسے نہ کھلے تو بے سائبان لوگوں کے دل تو کانپتے ہی رہتے ہیں کہ جانے کب جل تھل ہو جائے۔

لمحہ لمحہ ڈراتے رہنے والی گھنگھور گھٹا سے تو اس کا جل تھل ہو جانا ہی اچھا۔ گہری کھائی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک تنے رستے پر سہم سہم کر قدم اٹھانے سے تو کھائی کی آغوش میں جا پڑنا ہی بہتر... جانکنی کے عذاب سے دوچار رہنے کے بجائے تو موت کو تسلیم کر لینا ہی بھلا۔ میں جلد از جلد کسی ایک نتیجے پر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ گو میں خائف تھی مگر طوفان کے جلد از جلد آکے گزر جانے کی متمنی بھی تھی۔

اگلے دن ملبوسات اور شالوں پر کڑھائی کے نمونے تیار ہو گئے۔ اس نے اسی شام لاہور روانگی کی اجازت چاہی۔ میں نے اس کی خائف کر دینے والی خاموشی سے ایک آدھ روز کو نجات حاصل کرنے ہی میں عافیت جانی۔ یوں بھی وکیل صاحب کی واپسی بقول ان کے اہل خانہ تین چار روز ہی میں متوقع تھی اور مجھے ایک ایک پل پہاڑ لگ رہا تھا۔

اس شام تیمور کے حویلی سے جانے کے بعد میں کم و بیش اسی سرخوشی سے دوچار ہوئی جس سے اپنی کسی گمشدہ عزیز شے کو دوبارہ پا لینے والے دوچار ہوا کرتے ہوں گے۔ حویلی کے سبزہ زاروں اور پائیں باغ کی روشوں پر ممی کو اور مجھے چہل قدمی سے محروم ہوئے چھٹی شام تھی۔ یہ محرومی خود ساختہ تھی۔ ہم خود ہی نیچے نہ اترے تھے۔ محض اس خیال سے کہ اسے کچھ کہنے سننے یا اترانے کا موقع نہ مل جائے۔ طرفہ تماشا یہ تھا کہ ہم اس کی خاموشی سے بھی ہول رہے تھے اور اس کے کچھ کہنے سننے کے خیال سے بھی خائف تھے۔ بہرحال! اس رات ہم تادیر حویلی کے باغ میں چہل قدمی کرتے رہے۔ ممی کے محسوسات کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی مگر میرا دل بار بار اس خیال کی سختی میں جکڑنے جا رہا تھا کہ کل جب تیمور لوٹ آئے گا تو میں پھر اوپری کھڑکی حویلی کے پائیں باغ اور سبزہ زاروں کو چھپ چھپ کر تنہائی نگاہوں سے دیکھ رہی ہوں گی۔

خوش قسمتی سے وہ اگلے پانچ دن تک واپس نہیں لوٹا اور جب واپس لوٹا تو پتا چلا کہ وہ وصولی کے لیے فیصل آباد بھی چلا گیا تھا۔ لاہور سے وہ تین سو گرم شالوں پر کڑھائی کا آرڈر لے کر آیا تھا۔ پارٹی نے ایک آدھ دن میں سادہ شالیں بھجوا دینا تھیں، ہمیں ان پر کڑھائی کروانا تھی۔

وکیل صاحب واپس لوٹے تو انھوں نے از خود ممی سے رابطہ قائم کیا۔ ممی نے انھیں تیمور سے معاملہ طے کرنے کی بابت یاد دہانی کرائی تو انھوں نے اس ضمن میں اپنی مصروفیات کے سبب ہو جانے والی تاخیر پر رسماً اظہارِ معذرت کیا اور اسی شام یا پھر اگلے روز حویلی آنے اور تیمور سے بات کرنے کا وعدہ کیا۔

وکیل صاحب اس شام تو نہ آئے تاہم اگلے دن شام کے وقت جب میں ممی کے ساتھ دریچے میں کھڑی تھی، وکیل صاحب کی شیورلیٹ حویلی کے احاطے میں آ کر رکی۔ گاڑی سے اتر کر وکیل صاحب نے حویلی کی پُرشکوہ عمارت کا رخ کیا اور ممی اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے وہیں بیٹھے رہنے کو ترجیح دی۔ کچھ دیر بعد جب میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ممی کے کمرے میں گئی تو میں نے دیکھا ممی بڑی سی سفید چادر اوڑھے مصلے پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک کتابچہ تھا۔ میں نے ممی سے بات کرنا چاہی تو انھوں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ میں نے یہ جانتے ہوئے کہ ممی کیا پڑھ رہی ہیں، نیم غم ہو کر دیکھا۔ سراپا عقیدت و نیاز بنی ممی دشمن پر غلبہ پانے کی دعا کا ورد کر رہی تھیں۔ مجھے ممی پر بے حد ترس آیا۔

میں ممی کے کمرے سے باہر نکلی تو اللہ وسایا کو ماسی بشیراں سے کھسر پھسر کرتے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر اللہ وسایا کچھ متذبذب سا نظر آنے لگا۔ میں اس کے تذبذب کا سبب جانتی تھی مگر میں جانتے بوجھتے بھی انجان بنتے ہوئے بولی: "کیا بات ہے؟"

"چھوٹی بی بی! اپنے وکیل صیب آئے ہوئے ہیں جی۔"

"اچھا۔"

"ہاں جی... میں نے سوچا بتا دوں۔"

"تو بیٹھی اوپر سے آتا تھیں۔"

"وہ جی... آج تو وہ... اپنے تیمور باؤ کے کمرے میں

چلے گئے ہیں جی۔"

"غلط فہمی میں چلے گئے ہوں گے یہ کچھ... ہم لوگ یہ نیچے ہیں۔ تیمور والا کمرہ بھی تو پہلے ان کا ہوا کرتا تھا۔"

"نا جی نا...." اللہ وسایا میرے قیاس کو پوری شدت سے رد کرتے ہوئے بولا۔ "وہ غلط فہمی میں نہیں گئے ہیں تیمور باؤ کی طرف۔"

"تو پھر؟"

"میں جی نیچے برآمدے میں ہی تھا جب وکیل صاحب آئے۔ میں نے جی انھیں سلام کیا۔ فیر اوپر لانے لگا تو وہ کہنے لگے تیمور صاحب کدھر ہوں گے۔ میں نے جی پوچھا تیمور باؤ؟ کہنے لگے ہاں۔ میں نے کہا جی آپ اوپر تو چلیں، بی بی صاحب بلا رہی ہیں میرے کو تو میں تیمور باؤ کو اوپر ہی لے آؤں گا۔ وہ کہنے لگے نا۔ تم میرے کو تیمور باؤ سے پہلے ہی ملا دو۔ جی میں ان کو لے گیا جی تیمور باؤ کے کمرے میں... فیر جی جب میں اوپر آنے لگا تو الف دین نے میرے کو بتایا کہ پچھلی دفعہ وی وکیل صاحب تیمور باؤ کو مل کے گئے تھے... شاید بڑی بی بی صاحب نے خود بھیجا تھا انھیں۔"

"تو اس میں اس قدر تشویش کی کیا بات ہے؟ ہو سکتا ہے وکیل صاحب کو اس سے کچھ کام ہو۔"

"نا جی نا... تشویش کی کوئی بات نہیں..." اللہ وسایا مجھے بے وقوف نظر آنے لگا۔ پھر مزید بولا۔ "میرے کو اندیشہ یہ تھا کہ تیمور باؤ نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کر دی؟ پرانے بندے کا بھی اعتبار کیا۔"

"بے وقوف آدمی گڑبڑ کرنے والے آدمی کے پاس پولیس چلی آتی ہے۔"

"ہاں جی... ٹھیک کہتی ہیں جی آپ۔" اللہ وسایا اپنی کھوپڑی کھجاتے ہوئے بولا۔

"ہو سکتا ہے اس کا کوئی مقدمہ ہو وکیل صاحب کے پاس یا کوئی اور بات ہو۔"

"ہاں جی... ٹھیک کہتی ہیں جی آپ۔" اللہ وسایا نے ٹیپ کا مصرعہ دہرایا اور قدرے مطمئن نظر آنے لگا حالانکہ ابھی اس کے چہرے پر سے بھی فکر و تردد کے بادل چھٹ گئے تھے۔

"اور اب تم نیچے نہ جاؤ۔ وکیل صاحب کہیں یہ نہ سمجھیں کہ اوپر والوں کو ان کے آنے سے کچھ پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔"

"بہتر سرکار۔"

دو ڈھائی گھنٹے کے طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد بالآخر وکیل صاحب اوپر آ پہنچے۔ میں نے ان کے ہمراہ گول کمرے کا رخ کیا اور ساتھ ہی نیراں کو ہدایت کی کہ وہ وکیل صاحب کی آمد کی خبر پہنچا دے۔ ممی ذرا سی دیر میں گول کمرے میں آ پہنچیں۔ رسمی علیک سلیک کے بعد ممی نے وکیل صاحب سے پوچھا۔

"آپ کافی پینا پسند کریں گے یا....؟"

"کچھ نہیں بی بی صاحبہ!"

"یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟"

"آپ جانتی ہیں کہ میں بہت ہی بے تکلف آدمی ہوں۔ اس وقت موڈ نہیں ورنہ بلا تکلف کہہ دیتا۔"

"چلیے جیسی آپ کی مرضی! ویسے میں ملازمہ کو ہدایت کر چکی تھی کہ اگر ہماری جانب سے کوئی خاص ہدایات نہ ہوں تو کافی لے آئے۔"

وکیل صاحب مسکرا دیے مگر مجھے ان کی مسکراہٹ میں گرم جوشی کے بجائے مایوسی نظر آئی۔

"بہت بے چینی سے گزرے یہ چند دن۔" ممی نے اصل موضوع پر آنے کے لیے تمہید باندھی۔

"مجھے بخوبی اندازہ ہے۔" وکیل صاحب سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"بات ہوئی آپ کی؟"

"جی ہاں، بات تو ہوئی۔"

"کیا کہا اس نے؟"

وکیل صاحب نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا اور میرا دل گویا دھڑکنا ہی بھول گیا۔ خدا جانے ممی پر کیا گزر رہی تھی۔

"کیا کہتا ہے؟" ممی کی آواز مجھے بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

وکیل صاحب نے ایک گہرا سانس لیا پھر بولے۔ "وہ کسی صورت بھی حویلی کے ان حقوق ملکیت سے دستبرداری پر آمادہ نہیں جو مرحومہ رضا بی بی اسے وصیت کر گئی ہیں۔"

"آپ نے اس سے قیمت کی بات کی ہوتی۔"

"کی تھی۔"

"پھر؟"

"بی بی صاحبہ! آپ یہ سن کر حیران ہوں گی، وہ [illegible] ہیں کہ وہ کسی قیمت پر بھی اس ملکیت سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں۔ وہ کہتا ہے اگر اس حویلی کی آدھی اینٹوں کے وزن کے برابر سونا تول دیا جائے تب بھی وہ اس حویلی سے نہیں جائے گا۔"

"لیکن کیوں؟" میں نے مداخلت کی۔

"اس کی مرضی۔"

"لیکن حویلی ہماری ہے۔"

"اتنی ہی جتنی کہ اس کی ہے۔" وکیل صاحب برجستہ بولے۔

میں نے بلبلا کر وکیل صاحب کی طرف دیکھا۔

"عالیہ بی بی! آپ اس امر سے انکار نہیں کر سکتیں کہ مرحومہ رضانہ بی بی آپ کو اور تیمور عالم کو حویلی کے حقوقِ ملکیت یکساں تقسیم کر گئی ہیں۔ آدھی حویلی کی مالک آپ ہیں اور آدھی کا وہ۔"

"آپ نے اس سے یہ پوچھا کہ رضانہ سے اس کا کیا تعلق تھا؟" ممی نے پوچھا۔

"جی نہیں! میں نے یہ نہیں پوچھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا سوال کرنے کا مجھے کوئی حق بھی نہیں تھا۔" وکیل صاحب بولے۔

کچھ دیر کو ماحول موت کے سناٹے میں ڈوب گیا۔ پھر ممی نے مردہ سی آواز میں کہا۔ "اب آپ ہی بتایئے وکیل صاحب، کیا کیا جائے؟"

"جس شدت سے وہ اپنے مؤقف پر اڑا نظر آتا ہے، اس کے پیشِ نظر تو میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ حویلی تقسیم کر دی جائے۔"

"حویلی تقسیم کر دی جائے؟" ممی نے استعجاب آمیز وحشت زدہ نگاہوں سے وکیل صاحب کی جانب دیکھا۔

"جی ہاں۔"

"لیکن یہ کیونکر ممکن ہے؟"

"آپ کو کوئی نہ کوئی صورت تو بہر حال نکالنا ہوگی۔ حویلی کے اندازِ تعمیر کے پیشِ نظر درمیان میں دیوار کھڑی کر کے اسے دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا تو ممکن نہ ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ منزل وار تقسیم پر آمادہ ہو جائیں۔ اس سلسلے میں میں نے تیمور کا ارادہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے یہ معاملہ آپ لوگوں پر چھوڑ دیا ہے۔ آپ اپنی رہائش کے لیے بالائی منزل کا انتخاب کریں یا زیریں منزل کا، اسے کچھ اعتراض نہ ہوگا۔"

"اسے اعتراض کرنے کا حق بھی کیا ہے؟" میں نے غصے سے کہا۔

"معاف کیجیے گا عالیہ بی بی! آپ غالباً بھول رہی ہیں کہ اس حویلی پر اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ آپ کا۔" وکیل صاحب بولے۔

"لیکن وکیل صاحب! آپ خود ہی ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ ہم ایک غیر مرد کو اپنے گھر میں کس طرح رکھ سکتے ہیں؟" ممی نے کہا۔

"بی بی صاحبہ! یہ گھر اب اس کا بھی ہے۔"

"بہر حال وکیل صاحب! وہ یہاں نہیں رہ سکتا۔" ممی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"وہ تو پہلے ہی یہاں رہ رہا ہے۔"

"مگر اب میں اسے یہاں سے نکال باہر کروں گی۔" ممی نے کہا۔

"جی ہاں! ہمیں بس آپ ہی کے اس سے بات کر لینے کا انتظار تھا اور جب سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلے تو انگلیاں ٹیڑھی کر لینا پڑتی ہیں۔" میں نے کہا۔

وکیل صاحب مدبرانہ انداز میں مسکرا دیے۔ تب ہی ماسی بشیراں کافی لے آئی اور اس نے باری باری سب کو کافی مگ پیش کیے۔

"وکیل صاحب! اب ہمیں آپ کی خدمات درکار ہیں۔" ممی نے کافی کا ایک گھونٹ لینے کے بعد کہا۔

"میں آپ کے کسی کام آ سکوں تو مجھے مسرت ہوگی۔" وکیل صاحب کا انداز نیاز مندانہ تھا۔

"میری جانب سے اس کے خلاف ایک کیس تیار کر لیجیے۔"

"آپ کی جانب سے؟"

"جی ہاں۔"

"کیس کی نوعیت؟"

"کہ میں ایک بیوہ عورت ہوں اور میری ایک غیر شادی شدہ جوان بیٹی ہے۔ کسی غلط فہمی یا نامانستگی میں میری مرحومہ بہن آدھی حویلی ایک اجنبی شخص کو وصیت کر گئی ہے۔ اب میں اس شخص کو آدھی حویلی کی قیمت چکا کر معاملہ صاف کرنا چاہتی ہوں کیونکہ ایک مسلمان ہونے کے ناتے اور ایک جوان بیٹی کی موجودگی میں میں کسی غیر مرد کو حویلی میں نہیں رہنے دے سکتی۔ اسلامی اصول و اقدار کی روشنی میں اس شخص کو حویلی چھوڑ دینے کا پابند کیا جائے۔ میں اسے اس کے حصے کی قیمت ادا کرنے پر بخوشی آمادہ ہوں۔"

وکیل صاحب نے ممی کی بات بغور سنی پھر چند ثانیے کسی گہری سوچ میں مستغرق رہنے کے بعد بولے۔ "بی بی صاحبہ! اگرچہ ہر شہری اپنے کسی قانونی مسئلے کے حل اور حصولِ انصاف کے سلسلے میں عدالت سے رجوع کرنے کا پورا حق رکھتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ عدالت کا فیصلہ اس کی منشا کے مطابق ہو۔ آپ کا خاندانی وکیل ہونے کے ناتے میرا فرض ہے کہ میں آپ کو ان پیچیدگیوں سے بھی آگاہ کر دوں جو ہماری راہ میں مشکلات بن کر سامنے آ سکتی ہیں۔ آپ کا مؤقف بظاہر بڑا ہی مناسب و مدلل معلوم ہوتا ہے لیکن یہ امر آپ کے ملحوظِ خاطر رہے کہ وہ حویلی کے ایک حصے پر اپنا قبضہ ثابت کر کے عدالت سے حکمِ امتناعی حاصل کر سکتا ہے۔ پھر جب تک عدالت اپنا کوئی فیصلہ نہ سنائے، آپ اسے بے دخل نہیں کر سکیں گی۔ کیا آپ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے

تیار ہیں؟"

"آپ کے خیال میں اسے حکمِ امتناعی مل جائے گا؟"

"نہ مل سکنے کی بظاہر تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ رضابی بی مرحومہ کی وصیت اسے حویلی کی ملکیت میں عالیہ بی بی کے برابر کا شریک ٹھہراتی ہے اور حویلی میں اس کا قیام اس کے قبضے کو ثابت کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے حکمِ امتناعی مل جائے گا۔"

"اور اگر ہم اس کے حکمِ امتناعی حاصل کرنے سے قبل ہی اس کا سامان حویلی سے باہر پھنکوا کر اور خود اسے حویلی سے دھکے دے کر نکال باہر کریں تو؟" میں نے خاصی تلخی سے کہا۔

"تو..." وکیل صاحب میری جانب رخ کرتے ہوئے بولے: "آپ قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کریں گی۔ کسی کو بے دخل کر دینا خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ اس کا قبضہ بھی ثابت ہوتا ہو اور ملکیت بھی، اتنا آسان نہیں ہوتا۔"

"گویا آپ ہمارے عدالت سے رجوع کرنے کے حق میں نہیں ہیں؟" تمی نے استفہامیہ لہجے میں وکیل صاحب سے کہا۔

"آپ کا حق ہے۔ میرا فرض آپ کو صورتِ حال سے آگاہ کر دینا تھا۔"

"اچھا... یہ بھی کچھ پتا چلایا آپ نے کہ یہ شخص ہے کون؟ میرا مطلب ہے کہاں سے تعلق رکھتا ہے؟ کس خاندان کا فرد ہے؟ کچھ اتا پتا؟" تمی نے پوچھا۔

"جی نہیں، نہ اس نے بتایا، نہ میں نے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔"

کچھ دیر کو ماحول پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اس دوران تمی نے کافی کی آخری دو تین چسکیاں پینے کے بعد مگ میز پر دھرتے ہوئے کہا۔

"بات وہیں کی وہیں رہی وکیل صاحب!"

"جی ہاں..." وکیل صاحب بولے پھر انھوں نے مزید کہا: "بی بی صاحبہ! بندہ تیز، ہشیار اور کچھ ہٹیلا بھی لگتا ہے۔ میرا مخلصانہ مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اس سے بگاڑ کرنے کے بجائے محبت اور نرمی سے کام لیں۔ میرا طویل تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ ایسے لوگوں سے ٹکر لینے کے بجائے انھیں پیار کی مار دینا بہتر ہوتا ہے۔ آگے آپ کی مرضی۔"

تمی کچھ دیر کو سوچ میں پڑ گئیں پھر انھوں نے وکیل صاحب سے کہا: "اچھا وکیل صاحب! آپ یہ تو بتائیے کہ وراثت نامہ حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟"

"وہ کوئی گمبھیر مسئلہ نہیں۔ اس سلسلے میں آپ کو چنداں تردد کی ضرورت نہیں۔"

"وکیل صاحب! اس مصیبت سے چھٹکارے کی بھی کوئی صورت نکالیے۔" میں نے کہا۔

دہلی کا واقعہ

محمد اعظم نے T.V خریدا جس کی گارنٹی ایک سال کی تھی۔ جب بھی T.V بگڑا محمد اعظم نے کمپنی کو فون کیا، مکینک آیا اور درست کر گیا۔

ایک سال بعد خراب ہوا تو اپنے علاقے کے مکینک سے رجوع کرنا پڑا۔ مکینک نے تیس روپے فیس جمع کرائی، شام کو آیا T.V دیکھا، اینٹینا گھمایا اور چلا گیا۔ T.V کام کرنے لگا۔ ہر مہینے میں ایک دو بار ایسا ہوتا رہا۔ ایک روز محمد اعظم نے ایک دکان پر T.V گائیڈ نامی کتاب دیکھی، دس روپے میں خرید لی۔ پڑھا تو معلوم ہوا کہ 75% T.V کی خرابی صرف اینٹینا کی خرابی سے ہوتی ہے۔ آخر میں کتاب والوں کی طرف سے کلر T.V گائیڈ کا بھی اشتہار دیکھا۔ محمد اعظم نے کلر T.V گائیڈ بھی تیس روپے میں خرید لیا اور اسے پوری توجہ سے کئی کئی بار پڑھا۔ بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ محمد اعظم نے ہمت کر کے مرمت کا سامان جو T.V کو چیک کرنے میں مدد دیتا ہے ستر روپے میں خرید لیا۔ اپنے T.V پر ہی پہلا کام کیا اور کامیاب رہا۔ ہمت بڑھی۔ پڑوس کے لوگوں کے T.V بھی درست کیے اور تین مہینے میں خود پر بھروسہ کرنے لگا۔ ایک دن دیکھا، محمد اعظم کے گھر پر بورڈ لگا تھا:

کلر و بلیک اینڈ وائٹ T.V ریپیئر ہاؤس

ملنے کا وقت صبح ۸ سے ۱۰ بجے تک، شام چھ بجے کے بعد

اس طرح محمد اعظم نے اپنے لیے پارٹ ٹائم کام حاصل کر کے اپنی آمدنی بھی بڑھائی اور اپنے T.V کی مرمت فیس سے بھی بچ گیا۔ ہر وہ انسان جو اردو پڑھنا جانتا ہو اور T.V سے دلچسپی رکھتا ہو۔ T.V گائیڈ اور کلر ٹی وی گائیڈ پڑھ کر اچھا مکینک بن سکتا ہے۔

رام کرشن [illegible]

کہ آپ ایک غیر شادی شدہ نوجوان خاتون ہیں۔ بے شک
آپ کی خالہ ایک اجنبی کو آدھی حویلی وصیت کر گئی ہیں مگر آپ
کیونکر ایک ایسے اجنبی مرد کو حویلی میں اپنے ساتھ رکھ سکتی
ہیں جس سے آپ کو آبرو کا خطرہ لاحق ہو۔ مجھے یقین ہے کہ
عدالت آپ کو فیور کرے گی چونکہ میں آپ کو بتا رہا ہوں بڑا
ہی اسٹرانگ پوائنٹ ہے۔"

"کوئی اور نکتہ بتائیے وکیل صاحب جس کو بنیاد بنا کر
ہم کیس جیت سکیں۔"

"بی بی! آپ اس پوائنٹ سے اتنی گھبرا کیوں رہی ہیں؟
یہ تو بہت کام کا بہت ہی مضبوط پوائنٹ ہے۔"

"کتنا ہی کام کا اور اسٹرانگ پوائنٹ کیوں نہ ہو وکیل صاحب
میں اسے بنیاد نہیں بنا سکتی۔"

"کیوں آخر؟"

"شاید اس لیے کہ یہ میرے معیار کے مطابق نہیں ہے۔"

"بی بی!" وکیل صاحب فوراً ہی کھڑے ہو گئے "میں محسوس
ہوتے مجبوراں کی تو رسائی دی۔ کیس تو بہرحال تیار کر رہی ہیں
گے مگر بغیر تربیت کی بغیر ضمانت نہیں ہو گی۔ بہرحال آپ
میرے دفتر آ جائیے بیٹھ کر تفصیل سے بات کریں گے شاید
کوئی اور اسٹرانگ پوائنٹ سامنے آ جائے۔"

دوپہر کا کھانا میں نے تنہا ہی کھایا۔ شام کو فراغت پانے
کے بعد جب میں اوپر پہنچی تو ممی نے عجیب سی گہری نگاہوں سے
میرا استقبال کیا۔

"کوئی خاص بات ممی؟" میں نے ممی کی نگاہوں کی تاب
نہ لاتے ہوئے پوچھا۔

"ایڈووکیٹ احسان ملک کو فون کیا تھا تم نے؟"

میں نے چونک کر ممی کی جانب دیکھا اور بے ساختہ
میرے منہ سے نکلا "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"جب تم نے فون کیا تو میں ان کے دفتر میں تھی۔"

"اوہ نو۔"

"ہاں... میں وہیں تھی... پہلے وکیل صاحب کے پاس
تو بمشکل آدھ گھنٹے کا کام تھا موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے
میں نے کسی دوسرے وکیل سے مشورہ لینے کی کوشش کی۔ کسی
نے بتایا ایڈووکیٹ احسان ملک دیوانی مقدمات میں بڑی
شہرت رکھتے ہیں۔ جب میں ان کے دفتر میں پہنچی تو وہ فون
کان سے لگائے تمہارا مسئلہ سن رہے تھے۔"

میں نے کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔

"بہرحال تمہیں اتنا تو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں نے تم سے
غلط نہیں کہا تھا۔ جاگیرداروں کے منہ سے بہت خوار کرتے ہیں
آدمی کو... تم نے یہ اچھا کیا کہ اپنا نام اور اتا پتا انہیں نہیں بتایا۔"

گو میں اپنی خود مختاری کا بھرپور استعمال کرنے پر
شرمسار تھی، تاہم میں نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے
ممی سے پوچھا "آپ نے اپنے مسئلے سے آگاہ کیا انہیں؟"

"نہیں! مجھے ضرورت نہیں تھی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ ان کا مشورہ میں سن ہی چکی تھی اور وہ میرے
لیے بھی کم از کم اسی قدر ناقابل قبول تھا جس قدر کہ اس کے
ناقابل قبول ہونے کا تم نے اظہار کیا۔"

"وکیل صاحب نے آپ کی آمد کا سبب نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا۔ میں نے کہا میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں پیدائش کا سال غلط لکھا گیا تھا۔ میں اپنی عمر کم کروانا چاہتی ہوں۔"
ممی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ممی کی اس بات پر میں [illegible] کے بغیر نہ رہ سکی۔
[illegible]
[illegible]

میری حیرانی بھانپتے ہوئے ممی مسکرائیں [illegible] میرے
نزدیک آ کر بڑے پیار سے میرے شانے [illegible]
ہوئے بولیں "تم وہاں سب سے زیادہ ... تھی ہو۔ زیادہ ضد مند ہو گئی ہو ... تھا مگر یہ زندگی
ابھی لمبی ہے۔ یاد رکھنا ... بیٹا اگر صحت
کے اپنے راستے سے انحراف کرنا پڑ رہا ہے..." انتظار سے
دیکھنے کے بعد ممی اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولیں "ہم
کورٹ میں جا سکتے ہیں۔ فیس ادا کر کے کسی بڑے وکیل کی خدمت
حاصل کر سکتے ہیں۔ میں چیلنج کر سکتی ہوں کہ حویلی کی نصف ملکیت
میری بہن کے کل ترکے کے ایک تہائی سے زیادہ ہے۔ یاد رہے
جب کہ مرحومہ ترکے کا صرف ایک تہائی یا اس سے کم وصیت
کرنے کا استحقاق رکھتی تھی۔ ہم اسی نکتے کو بنیاد بنا سکتے
ہیں کہ اسلامی اقدار کی رو سے ہم کسی نامحرم اور اجنبی شخص کے
ساتھ حویلی میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتے... الغرض اگر لڑنے
کی نیت ہو تو ایک دو نہیں سو جواز نکالے جا سکتے ہیں اور

اس کے حصے کی نقد قیمت ادا کر کے حویلی کی مشترکہ ملکیت سے
دستبرداری پر مجبور کیا جا سکتا ہے مگر میں لڑنا نہیں چاہتی، برادری
والوں کو ہنسنے اور انگلیاں اٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہتی۔
مفاہمت اور مصالحت کی راہ اختیار کرنا چاہتی ہوں۔ کبھی
کبھی مجبوراً ایسا بھی کرنا پڑتا ہے بیٹا! یہ تمہاری اور میری
زندگی کا ایک خطرناک موڑ ہے میری جان! اس سے بخیریت
گزر گئے تو سمجھو زندگی کی بازی جیت لی اور خدانخواستہ اس موڑ
پر الجھ گئے تو زندگی بڑی کٹھن ہو جائے گی۔"

میں نے بے بسی سے ممی کی طرف دیکھا۔ ممی دھیرے سے
مسکرا دیں اور مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے مایوسی سے بچائے
رکھنے کو مسکرائی ہوں پھر انھوں نے دھیرے دھیرے میرا شانہ
تھپتھپاتے ہوئے کہا: "دیکھو بیٹے! یہ تو طے ہے کہ اسے یہاں
سے جانا پڑے گا مگر ..... ہم اسے اپنا دشمن بنا کر نہیں بلکہ
بنا کر اس سے اپنا پیچھا چھڑائیں گے تم سمجھ رہی ہو نا میری
بات...؟"

"جی نہیں۔"

ممی معنی خیز انداز میں مسکرا دیں: "اب نہیں اس کی پُراسرار
خاموشی پر خود ضرب لگانا ہوگی... اسے ٹٹولنا ہوگا... اس
سے پوچھنا ہوگا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟"

"وکیل صاحب نے بتا تو دیا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔"

"وکیل صاحب کو بتایا ہوگا اس نے ہمیں تو نہیں۔ اب ہم
پوچھیں گے کہ وہ کیا چاہتا ہے مگر نرمی سے ہمیں نرمی اور رعایت
سے بات کرنا ہوگی۔"

"تب بھی وہ وہی جواب دے گا۔" میں نے منہ بنا
کر کہا۔

"نہیں... ضروری نہیں بلکہ میرا دل کہتا ہے کہ ایسا نہیں
ہوگا۔"

[illegible]

انھوں نے اپنے ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیے اور میری

آنکھوں میں جھانک کر بولیں: "ہاں تمہیں۔"

"لیکن... ممی... آئی... ہیٹ ہم... مجھے نفرت
ہے مردوں سے..... دنیا کے سارے مردوں سے۔"

"مگر مجھ سے زیادہ نہیں۔" ممی نے کہا۔

میں چپ ہو رہی۔

"بیٹا! اس سے پہلے زندگی میں اتنی کٹھن آزمائش
میرے سامنے کبھی نہیں آئی تھی۔ شاید تم اندازہ بھی نہیں کر
سکتیں کہ میں کتنی مشکل میں ہوں۔ زندگی کی اس کڑی آزمائش
سے گزرنے کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

ممی کا لہجہ یک بیک بدل گیا تھا۔ ان کی آواز میں
ہلکی سی لرزش تھی۔ ان کے لہجے اور آواز کی اس نمایاں تبدیلی
نے مجھے بے اختیار ممی کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ممی کی
آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا دل تڑپ کے رہ گیا۔ میرے
دل میں تیمور کے خلاف نفرت کا لاوا ابلنے لگا۔ جی چاہا کہ
لمبے ڈگ بھرتی نیچے جا پہنچوں اور اس کے سامنے جا کر کھڑی
ہو جاؤں اور چلا چلا کر کہوں۔

"یو ایڈیٹ... دفع ہو جاؤ... نکل جاؤ یہاں سے...
اور پھر کبھی اپنی منحوس صورت نہ دکھانا کیوں کہ... تم میری
ممی کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سبب بنے ہو...!"

ڈھاکے کی میں ایک مہاراجہ "ہوٹل" سے
دودھ پیتے ہوئے ایک غیر ملکی سیاح نے پیالے سے منہ
ہٹا کر کہا: "میاں! اس دودھ میں اس قدر پانی ملا کر بیچنے کا
حوصلہ تم کو ہو سکتا ہے۔ معلوم ہے مارشل لاء... کے تحت دودھ
میں پانی ملا کر بیچنا سخت جرم ہے۔"
دکاندار نے دیگچی میں چمچہ ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
"مجھے معلوم ہے صاحب! معلوم ہے۔ ہم بے قانونی نہیں کرتے
اس دودھ میں تو مارشل لاء سے پہلے کا پانی ملا ہوا ہے۔"

مگر عشنا میں ایسا نہ کر سکی۔ تائی نے میرے دونوں ہاتھ
یک بیک اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیے اور لجاجت سے بولیں:
"بیٹا! ہمیں اس سے دشمنی مول نہیں لینا ہے۔ اس سے نرمی
سے بات کرو۔ وہ ایک بار نکل جائے یہاں سے پھر میں ہمیشہ
کے لیے حویلی کے دروازے اس پر بند کر دوں گی۔"
"سچ تائی؟"
"ہاں جان تائی۔" تائی نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا پھر کچھ دیر
چپ رہنے کے بعد بولیں: "مجھے یقین ہے تم عقل ہی کے کام و
قوت سے زیر کر سکتی ہو۔"
"تائی! آپ بات کریں نا اس سے۔"
"بیٹا! حویلی کی ملکیت میں تم اس کی شریک ہو میں تو نہیں
ہوں۔ معاملات کرنا زیادہ مناسب رہے گا۔"
جواز انتہائی معقول تھا مگر جو تائی مجھ سے چاہ رہی تھیں وہ
میرے لیے کارِ گراں تھا۔ میں سوچ میں پڑ گئی۔ کافی دیر کشمکش
سے دوچار رہنے کے بعد میں نے بالآخر سر جھکا دیا۔
"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے تائی! میں اس سے بات
کروں گی۔"
"لیکن نرمی سے۔"
"جی اچھا۔" میں نے بادلِ ناخواستہ کہا۔

اپنی تمام تر بے سروسامانی کے باوجود میں اسی شام
منجدھار میں کود پڑی۔
کارکن عورتیں چھٹی کر کے اپنے اپنے گھروں کو جا چکی
تھیں اور الف دین حسبِ معمول کمروں کے دروازے دھڑا
دھڑ بند کر کے انھیں قفل لگا رہا تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھی
تھی اور دفتر کی کھلی کھڑکی سے تیمور کو حویلی کے سبزہ زار پر پڑی بید
کی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھے کسی رسالے کی ورق گردانی
کرتے دیکھ سکتی تھی۔ میرا ذہن ایک ناگفتہ کشمکش سے دوچار تھا۔
تمام کمرے مقفل کرنے کے بعد الف دین چابیوں کا
گچھا میرے حوالے کرنے میرے کمرے میں آیا تو میں نے [illegible]
"الف دین! ذرا تیمور بابو کو تو بلاؤ مجھے ان سے کام ہے۔"
"[illegible] سرکار!" الف دین نے کہا [illegible]
[illegible]
میرے دفتر کی کھڑکی سے [illegible] الف دین کو اس [illegible]
[illegible] تک پہنچتے دیکھ سکتی تھی پھر میں نے تیمور کو
رسالہ [illegible] کرسی سے اٹھ کر [illegible]
[illegible] الف دین حویلی کے صدر دروازے کی جانب
چلا گیا تھا۔
کچھ دیر بعد جب تیمور میرے کمرے کے دروازے پر
پڑا ریشمی پردہ ہٹا کر میرے کمرے میں داخل ہوا تو میرا دل بے طرح
دھڑک رہا تھا۔
"میڈم! آپ نے یاد فرمایا؟"
"جی ہاں... جی ہاں..."
"فرمائیے۔" وہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔
"بیٹھیے۔"
وہ میرے روبرو بیٹھ گیا اور استفساریہ نگاہوں سے
میری جانب دیکھنے لگا۔
مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔
کچھ دیر یہاں مسلسل خاموشی طاری رہی پھر اس کی آواز
نے اس خاموشی کا سینہ چیرا: "جی فرمائیے۔"
"میرا... خیال ہے... اگلے ہفتے تک... کراچی کے لیے
تو... مال تیار ہو جائے گا۔" میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔
"جی۔"
منٹ بھر کو پھر خاموشی چھا گئی۔
"شالیں... بھی تیار ہو رہی ہیں..."
"جی۔"
میں نے ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھا اور اسے گہری
نگاہوں سے اپنی طرف دیکھتے پا کر ہڑبڑا گئی۔
"بس... یہ... یہی... بات... کرنا تھی مجھے..."
"اجازت؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"ہاں... نہیں... ہاں... ٹھیک ہے..."
"میں جا سکتا ہوں؟"
میں نے خائف نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور
ششدر کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت
تھی اور لبوں پر کچھ ایسی مسکراہٹ جیسے وہ میرا مضحکہ اڑانے
کی کوشش کر رہا ہو۔
"بیٹھیے۔" مجھے اپنی آواز شکستوں سے چور محسوس ہوئی۔
وہ پھر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی کہنی میز پر ٹکائی اور
اسی ہاتھ کے انگوٹھے سے بائیں آنکھ کو اور درمیانی انگلی سے
دائیں آنکھ کو دباتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
خاموشی کے تالاب میں پھر اسی نے کنکری پھینکی: "آپ
کچھ پریشان نظر آتی ہیں؟"
میں نے آنکھوں پر سے انگوٹھا اور انگلی ہٹائی اور تڑپ
کر اس کی جانب دیکھا۔

"وہ میری والدہ ہیں اور یہ حق رکھتی ہیں۔"

"لیکن اگر میں یہ کہوں کہ میں کسی تیسرے آدمی سے بات نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے تیور بدل کر کہا۔

"وہ تیسرا آدمی نہیں، میری ممی ہیں۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"آرام سے... آرام سے... کیا آپ نہیں جانتیں کہ زیادہ غصہ اعصاب کو مجروح کر ڈالتا ہے؟"

"کام کی بات کیجیے۔" میں نے قدرے درشتی سے کہا۔

"میں کام ہی کی بات کر رہا ہوں۔ ہاں تو قصہ تھا حویلی کے بٹوارے کا۔"

ممی کی ہدایات بھول بھال کر میرا لہو کھولنے لگا۔

"حویلی کا بٹوارا ممکن نہیں ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"وہ تو ہوگا کیوں کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔"

میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"بات یہ ہے عالیہ صاحبہ! کہ اس حویلی پر اب میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ آپ کا ہے۔ میں تو اب تک تکلف سے کام لیتا رہا ہوں ورنہ اصولاً تو مجھے اس حویلی میں آزادانہ گھومنا پھرنا چاہیے۔"

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ پہلی بار اس نے مجھے میڈم کے بجائے عالیہ صاحبہ کہنے کی جسارت کی تھی۔

"ہم دونوں ایک دوسرے سے تعاون بھی کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے الجھنیں بھی کھڑی کر سکتے ہیں۔ میں مرد ہوں اور راستوں کے پیچ و خم سے بخوبی واقف بھی۔ آپ خاتون ہیں اور راہوں کے نشیب و فراز سے نابلد۔ میں پریشانیاں بھی جھیل جاؤں گا اور راستوں کے پیچ و خم سے بھی بخیریت نکل جاؤں گا، آپ الجھ جائیں گی۔"

"دھمکی دے رہے ہیں آپ؟" میں نے غصے سے اسے دیکھا۔

"جی نہیں، راستے کی دشواریوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"ہمیں پریشان کر کے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔"

"تو پھر؟"

"دیکھیے، یہ اگر، مگر اور پھر قسم کے الفاظ معاملات کو سلجھانے کے بجائے الجھا دیتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ میں اس حویلی میں اپنے حصے کی نشاندہی چاہتا ہوں اور اگر اس ضمن میں آپ تعاون نہیں کریں گی تو مجھے مجبوراً قانون کا سہارا لینا پڑے گا۔"

"اوہ!" میں نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سیدھی سی بات ہے۔ ٹھنڈے دل سے سوچیں گی تو راستہ آپ ہی آسان ہو جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا میرے کمرے سے نکل گیا۔

میں خود کو رنج و غصے کی ایک ناقابل بیان کیفیت سے دوچار پا رہی تھی۔ میرا خیال تھا ممی یہ ساری بات سن کر کھول اٹھیں گی لیکن میری توقعات کے برعکس انھوں نے بڑے تحمل سے کہا۔ "بیٹا! نرمی اور رسانیت سے بات کرو۔ ایک آدھ روز میں پھر بات کرنا اس سے۔ پتھر پر پانی بوند بوند بھی ٹپکتا ہے تو شگاف ڈال دیتا ہے۔"

"ممی! وہ بدتمیز آدمی ہے۔ میں اس سے بات نہیں کر سکتی، آپ خود کریں بات۔"

"جب اس نے تم سے صاف کہہ دیا کہ وہ تیسرے آدمی سے بات نہیں کرنا چاہتا تو پھر... کیا تم یہ چاہو گی کہ وہ تمھاری ماں سے کوئی بدتمیزی کرے۔"

"ہرگز نہیں، اگر اس نے آپ سے کوئی بدتمیزی کی تو میں اسے قتل کر دوں گی۔"

"بیٹا! آرام سے... پیار سے... بزرگوں نے کہا ہے ہمارا غصہ ہمیں کھاتا ہے جب کہ نرمی دوسروں کو کھاتی ہے۔"

"مجھے اس سے نفرت ہے ممی!"

"میں جانتی ہوں۔"

"پھر بھی آپ مجھے مجبور کر رہی ہیں کہ میں اس سے نرمی اور پیار سے بات کروں۔"

"مجبوری ہے میری جان!"

"کیسی مجبوری؟"

"کہ تمھاری کاکا تمھیں اس سے جوڑ گئی ہیں۔"

"اس سے تو بہتر تھا کہ کاکا پوری حویلی اسی کے نام کر دیتیں۔"

"تو کیا اب تم اس حویلی کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جاؤ گی؟"

یہ کیسا سوال کر دیا تھا ممی نے۔ حویلی سے تو مجھے عشق تھا۔ حویلی چھوڑ دینے پر آمادگی سراسر اس عشق کی تکذیب ہوتی۔

دن وہ یوسف ادبی ڈیوٹ
سرونیٹ کی تفسیر بنا اپنے
ذائقہ منصبی نبھانے کو حاضر تھا اور مجھے اس کی ڈھٹائی پر حیرت
ہو رہی تھی۔ کل تو اچھی خاصی گرما گرمی ہو گئی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو
کئی روز منہ پھلائے پھرتا۔ تفریس نے بھی تو پھلا ہی رکھا تھا
جب کہ گرما گرمی دونوں جانب ہی سے ہوئی تھی۔ فرق تھا تو یہ
کہ وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھ کر بات کر رہا تھا اور میں
بار بار رنج و غصے کی رو میں بہتیاں کھاتی رہی تھی۔

دو دن چپ چاپ گزر گئے۔

تیسرے دن اس نے از خود ابتدا کی۔ کراچی کے لیے مال
تیار ہو چکا تھا۔ پیکنگ کی جا رہی تھی کہ وہ میرے دفتر
میں آ پہنچا۔

"میڈم! پیکنگ آپ کے خیال میں کب تک مکمل ہو
جائے گی؟"

"کل شام یا پھر پرسوں تک۔" میں نے رکھائی سے جواب
دیا۔ اس کی جانب سے میرے دل میں غبار بھرا ہوا تھا۔

"مجھے امید ہے کہ کراچی کی پارٹی کو ڈیلیوری دینے کے
بعد جب میں واپس آؤں گا تو اس وقت تک آپ سوچ بچار
کر چکی ہوں گی۔"

"کیسی سوچ بچار؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"حویلی کے بٹوارے کے سلسلے میں۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ زیریں لب کا بایاں
گوشہ اوپر تلے کے دانتوں کے بیچ دبائے وہ زیر لب مسکرا رہا
تھا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے انتہائی زہر لگی۔ لیکن ممی کی ہدایت نے
میرے دل میں پاؤں پسارتی نفرت کا دامن تھام لیا۔

"بیٹھیے۔" میں نے بادل ناخواستہ کہا۔

وہ میرے روبرو بیٹھ گیا۔

"ممی نے وکیل صاحب کے توسط سے آپ کو جو پیشکش
کی تھی آپ اس پر غور کیوں نہیں کرتے ہو؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"کیوں؟" میں نے ابرو چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں کا کیا سوال، میں خود ہی ایسا کرنا چاہتا اس
پیشکش پر۔"

"یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔"

"زیادتی آپ کر رہی ہیں۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ میرا حق غصب کرنے کی کوشش۔"

"غلط فہمی ہے آپ کو۔"

"قطعاً نہیں، آپ کا رویہ ثابت کرتا ہے کہ آپ میرا حق
غصب کرنے کے درپے ہیں..." اس کے تیور بھی لڑتے
نظر آ رہے تھے۔ وہ پل بھر کو رکا پھر بولا۔ "دیکھیے آپ اور میں ایک
ہی کشتی کے سوار ہیں۔ آپ کی رضا شنی اگر آپ کو اپنی زندگی
ہی میں حویلی کے نصف حقوق ملکیت گفٹ کر گئی ہیں۔ تو حویلی
کے نصف حقوق ملکیت وہ مجھے وصیت کر گئی ہیں۔ اس وصیت
کا وہ شرعی اور قانونی استحقاق رکھتی تھیں میری معلومات کے
مطابق مرحومہ کے نام زرعی اراضی، نقد رقوم اور زیورات کی
مجموعی مالیت حویلی کے نصف حقوق ملکیت کے دو تہائی سے
بھی زائد بنتی ہے..."

"یہ آپ کو کس نے بتایا؟" میں نے تیور بگاڑ کر پوچھا۔

"جس نے بھی بتایا ہے غلط نہیں بتایا ہے۔" وہ پورے
وثوق اور اعتماد سے بولا۔

"مجھے تو یہ وکیل صاحب کی شرارت لگتی ہے۔" غصے
میں میں نے وکیل صاحب کی بزرگی کا لحاظ بھی نہ رکھا۔

"وکیل صاحب تو انتہائی شریف آدمی ہیں۔"

"اور کون بتا سکتا ہے آپ کو یہ سب کچھ؟"

"ایسی باتیں چھپی کب رہتی ہیں؟"

"اچھا آپ کو ان ساری باتوں سے مطلب؟ یہ ہمارے
ذاتی معاملات ہیں۔" میں نے بگڑ کر کہا۔

"مجھے انکار نہیں مگر آپ اپنے ذاتی معاملات کے دائرے
میں دوسروں کے معاملات بلکہ دوسروں کے حقوق سمیٹنے کی کوشش
مت کیجیے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تیوری چڑھائی۔

"مطلب یہ کہ شاید آپ ہرگز پسند نہیں کریں گی کہ میں
حویلی کے بٹوارے کے لیے پولیس یا عدالت کی مدد حاصل
کروں۔ میں جانتا ہوں گاؤں میں آپ لوگوں کی بڑی عزت
ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اسی دوران میں آپ کے بہت
سے عزیز رشتے دار بھی رہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر آپ
کے بہی خواہ اور ہمدرد ہوں گے تو یہ تماشا دیکھنے
والے بھی ہوں گے۔ حویلی کے سلسلے میں [illegible]
والی الجھنیں اور [illegible] انھیں آپ رشتے کا [illegible]
کر سکتے ہیں کیا آپ پسند کریں گی کہ ایسا ہو..."

میں نے تمام سے [illegible] وحشت کے ساتھ اس کی بات
سنی۔ اپنی باتوں سے وہ مجھ کا صحیح تک رہا تھا۔

اپنے ہونٹوں پر طاری ہو جانے والی لرزش اس سے پنہاں

رکھنے کے لیے میں نے انھیں باہم بھینچ لیا۔

"باہمی مفاہمت ہمارے راستے آسان کر دے گی جب کہ مزاحمت الجھنیں اور خلفشار پیدا کرنے کا موجب بنے گی۔"

"آپ... مجھے... ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"جی نہیں۔" برجستہ جواب ملا "میں تو آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

مجھ سے کچھ نہ بن پڑا تو میں نے دونوں کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور جھلا کر بولی "میں کچھ سمجھنا نہیں چاہتی۔ آپ چلے جائیں یہاں سے۔"

انگلیوں کے درمیان جھروکوں سے میں نے اسے کھڑے ہوتے دیکھا پھر اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی، بولے، "اگر آپ کی مراد اس کمرے سے ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔"

ممی نے اس روز کی روداد سنی تو بولیں "بیٹا! خوشامد سے کام لو، عاجزی اور مسکینی سے بات کرو۔"

"ممی! اب صبر اور برداشت کی انتہا ہو چکی ہے۔ وہ بدتمیز آدمی ڈھٹائی کا مظاہرہ کر رہا ہے، دھمکیوں سے کام لے رہا ہے اور آپ مجھے خوشامد، عاجزی اور مسکینی سے کام لینے کی تلقین کر رہی ہیں۔ آپ عدالت سے رجوع کیوں نہیں کرتیں؟"

"جان! صبر سے اور برداشت و تحمل سے کام لو۔"

"بہت ہو چکا صبر... خدا کرے چلا جائے اس کا سامان اٹھوا کر باہر نہ پھنکوا دیا ہو تو میرا نام عالیہ نہیں۔"

"ایسی حماقت بھی نہ کر بیٹھنا۔"

"کیوں؟ اس میں حماقت کیسی؟"

"وہ سیدھا پولیس اور کچہری کا رخ کرے گا۔"

"کرنے دیں۔ اچھا ہے نا کسی طرح تو بات پولیس کچہری تک پہنچے۔ آپ تو لگتا ہے ڈر گئی ہیں اس سے۔"

"ڈرنے کی بات نہیں۔"

"پھر؟"

"بات پولیس کچہری تک پہنچے گی تو حویلی کی ایک شراکت دار کی حیثیت سے تمھیں بھی کچہری جانا پڑے گا اور یہ مجھے کسی قیمت پر گوارا نہیں۔"

"کچہری چلے جانے میں کیا حرج ہے۔ انصاف کی خواہش میں لوگ کچہری جایا ہی کرتے ہیں۔ میرے چلے جانے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟"

"بیٹا! عزت دار گھرانوں کی بہنیں، بیٹیاں عدالتوں، کچہری نہیں جایا کرتیں۔"

"مائیں تو جا سکتی ہیں نا؟"

ممی آن کی آن میری بات کی گہرائی میں چلی گئیں۔

"بیٹے جان! میں تمھیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی، ورنہ میرے لیے تیمور سے نمٹنا کوئی مشکل بات نہیں۔"

دو روز بعد جب وہ کراچی جانے کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو میں نے اس سے بڑی ملائمت سے کہا "اگر آپ ممی کی آفر پر غور کر لیں تو آپ کے حق میں بہت اچھا رہے گا۔"

"اچھا! وہ کیسے؟"

اس نے کچھ اس طرح مسکراتے ہوئے پوچھا جیسے کسی بچے سے اس کی معصوم اور بچگانہ بات کی توضیح چاہی جاتی ہے۔ گو مجھے اس کی مسکراہٹ زہر لگی مگر پھر بھی میں نے بڑے تحمل سے کہا "آپ کو اتنی رقم مل جائے گی کہ جس سے آپ شہر میں اچھا بھلا مکان بھی خرید سکیں گے اور اپنا کوئی بزنس بھی شروع کر سکیں گے۔"

"اس مخلصانہ مشورے پر میں آپ کا شکر گزار ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے اس نیک نیتی سے دیے گئے مشورے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔"

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کیوں؟"

"کیوں کہ مجھے شہر کے تصنع آمیز ماحول کی نسبت گاؤں کی سادہ اور پرکار فضا زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

"اچھا تو اس رقم سے آپ گاؤں ہی میں کوئی اچھا سا مکان خرید لیجیے گا یا زمین خرید کر اس پر مکان تعمیر کروا لیجیے گا۔"

"اور روزگار کا کیا بنے گا؟ میرا مطلب ہے روزگار کی صورت کیا رہے گی؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ تو نیم آمادگی کی گواہی دے رہا تھا۔

"وہ کوئی مسئلہ نہیں۔ کام کرنے والوں کے لیے مواقع کی کہیں بھی کمی نہیں۔ پارٹ ٹائم جاب کے طور پر آپ موجودہ جاب بھی برقرار رکھ سکیں گے۔" میں نے قدرے گرم جوشی سے کہا۔

وہ زیر لب مسکرا دیا اور اپنی دونوں ہتھیلیاں میز پر ٹکاتے ہوئے تھوڑے جھک کر اپنی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے بولا "ایک بات بتائیں گی؟"

"جی۔"

"آپ مجھے یہاں سے نکال دینے کے در پے کیوں ہیں؟"

"کیوں کہ آپ کا یہاں رہنا ہمارے لیے مشکلات پیدا

ہو سکتا ہے۔"

"کیسی مشکلات؟"

"ایک اجنبی مرد کے حویلی میں رہنے سے ہماری نیک نامی پر حرف آسکتا ہے۔"

"حویلی میں تو میں اب بھی رہ رہا ہوں۔"

"مگر کسی دوسری حیثیت سے۔"

"آپ میری اسی حیثیت کو برقرار رکھیے، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"پلیز! آپ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔" میں گڑگڑانے کی حد تک رسانیت سے بولی۔

"آپ سمجھائیں، میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔" وہ میز پر سے اپنی ہتھیلیاں اٹھاتے ہوئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"آپ بیٹھیے تو ذرا۔"

"شکریہ۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"دیکھیے..." میں نے دھیمے سروں میں کہا۔ "ہماری نیت صاف تھی اسی لیے ہم نے حویلی کی ملکیت میں آپ کی شراکت کو قبول کر لینے میں کسی تردد سے کام نہیں لیا حالانکہ ہم چاہتے تو تردد کر سکتے تھے..."

"ہم سے آپ کی مراد؟" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"ممی اور میں۔"

"آئی سی..." وہ معنی خیز انداز میں زیر لب مسکرا دیا۔

"ممی کی نیک نیتی دیکھیے کہ وراثت نامہ حاصل کرنے کے لیے انھوں نے وکیل صاحب کے توسط سے اخبار میں اطلاع عام کا جو اشتہار شائع کروایا تھا اس میں واضح طور پر درج تھا کہ حویلی کے نصف حقوق ملکیت رعنا آنٹی آپ کو وصیت کر گئی ہیں، اور اس پر کم از کم ممی کو کاکا کے ترکے کی وارث ہونے کی حیثیت سے کوئی اعتراض نہیں۔ نیت میں خدانخواستہ فتور ہوتا تو ممی ایسا کیوں کرتیں؟" آخری جملے پر میں نے تائید طلب نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

"جی، آپ درست فرماتی ہیں۔" اس نے بلا جھجک تائید کی۔

"اپنے پرایوں میں سے بہت سوں کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے۔ کل ہی کی بات ہے انشد وسایا ہماری برادری کے کسی فرد سے یہ خبر سن کر آنے کے بعد دبی زبان سے ممی سے اس خبر کی تصدیق چاہ رہا تھا لیکن ممی سے تو اس کی ہمت پڑتی نہیں..."

"اچھا تو اس حد تک ڈرتے ہیں ملازم آپ کی ممی سے؟"

مجھے اس کی معنی خیز مسکراہٹ ایک بار پھر زہر لگی تاہم میں نے اپنے جذبات پر قابو رکھا اور اس کی مداخلت سے منقطع ہو جانے والا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جن کو ابھی معلوم نہیں ہوا ہے، جلد یا بدیر انھیں بھی پتا چل ہی جائے گا اور حویلی میں آپ کی رہائش ان سب کو ہم پر انگلیاں اٹھانے اور باتیں بنانے کا موقع دے گی۔ اسی لیے ممی چاہتی ہیں کہ آپ حویلی میں اپنے حصے کی نقد رقم لے لیں تاکہ کسی کو باتیں بنانے کا موقع نہ ملے۔"

"اس مسئلے کا ایک حل یہ بھی تو ہے کہ حویلی کا بٹوارا کر لیا جائے۔ میرا خیال ہے بٹوارے کے بعد تو کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہیں ملے گا۔"

"لوگ پھر بھی باتیں بنائیں گے۔"

"آپ کہہ دیجیے گا کہ یہ آپ کی مرحومہ آنٹی کا فیصلہ تھا، پھر بھی کوئی کچھ کہے تو اسے اپنے جوتے کی نوک پر رکھیے۔"

"برادری والوں کو جوتے کی نوک پر رکھنا اس قدر آسان نہیں ہوتا۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"بہر حال، وہ آپ کا مسئلہ ہے، میں تو آپ کو مشورہ ہی دے سکتا ہوں۔"

"کیا آپ اپنے حصے کی رقم لے کر حویلی میں اپنی شراکت سے دستبردار نہیں ہو سکتے؟"

"بار بار یہ سوال کر کے آپ مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔ میں جو فیصلہ ایک بار کر لیتا ہوں، اس پر قائم بھی رہتا ہوں۔ حویلی کی ملکیت میں اپنی شراکت سے میں کسی قیمت پر بھی دستبردار نہیں ہوں گا۔"

تب ہی قدموں کی چاپ سنائی دی اور میں نے خاموشی اختیار کرنا بہتر جانی۔ چند لمحوں بعد الف دین کا چہرہ کمرے کے دروازے پر پڑے پردے کے پیچھے سے جھانکا اور اس نے ڈرائیور کے ٹیکسی لے کر آنے کی اطلاع دی۔

"بھیجو اسے۔" میں نے کہا۔

"مجھے اجازت؟" تیمور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "سفر کے دوران ممی کی آفر پر غور و خوض کیجیے گا۔"

"بالیہ صاحبہ! حویلی میری اور آپ کی مشترکہ ملکیت ہے، آپ کی ممی کو اس سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے۔"

"پلیز!" میں نے تیکھی تیوروں سے اسے دیکھا۔

"ممی کی تکرار مجھے اچھی نہیں لگتی... جو بات کرنا ہے اپنے بل بوتے پر کریں۔ ہمارے معاملے میں آپ کی ممی کون ہوتی ہیں دخل دینے والی۔ مقابلے پر آنا ہے تو آپ خود کیوں نہیں آتیں مقابلے پر؟"

اس کے تیور، اس کا انداز، اس کے الفاظ مجھے ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار کر گئے تھے۔ ڈالے کے مخصوص بھاری جوتوں کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب تر ہوتی سنائی نہ دے رہی ہوتی تو شاید میں بھٹک پڑتی۔ مجھے دھتکار کر اس نے اچھا نہیں کیا تھا۔ جی کا سمجھانا بجھانا دھرا رہ گیا۔

زندگی میں پہلی بار میں نے اپنی خودمختاری کا اس قدر بے باکی سے استعمال کیا کہ جی سے مشورہ لینا تو کجا میں نے ان کا آشیرواد لینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

تیمور کے کراچی جانے کے بعد دوسرے ہی دن میں مختلف دستکاریوں پر استعمال ہونے والے خام مال کی خریداری کے بہانے اللہ وسایا کو لے کر شہر گئی۔ میرا شہر جانا خلاف معمول ہرگز نہ تھا۔ خام مال کی خریداری کے لیے گاہے گاہے شہر جانا رہتا ہی تھا۔ شہر پہنچنے کے بعد میں ایڈووکیٹ احسان ملک سے ملی جن سے میری ایک مرتبہ حویلی کے مسئلے پر بذریعہ فون بات ہو چکی تھی اور ان سے تیمور کی حویلی کی ملکیت میں شراکت کے خلاف عدالت سے رجوع کرنے کے سلسلے میں تفصیلات طے کیں۔ جب سے تیمور نے مجھے للکارا تھا میرا اندر اس کے خلاف انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ کیا حق پہنچتا تھا... اس دو ٹکے کے آدمی کو جی کے لیے اہانت آمیز الفاظ استعمال کرنے اور مجھے للکارنے کا۔ اب میں اس کے مقابلے پر ڈٹ گئی تھی تاہم مقابلے کا باقاعدہ آغاز ہونے تک میں اپنے اس اقدام کو جی سے راز رکھنا چاہتی تھی کیونکہ تیمور سے نمٹنے کے ضمن میں جی کے رویے کے پیش نظر مجھے یقین تھا اگر وہ تیمور کی حویلی میں شراکت سے اسے کچھ دے دلا کر پیچھا چھڑانے کی بات کریں گی اور عدالت کی مدد حاصل کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کریں گی۔ عدالت سے تیمور کی طلبی تک اس امر کو پوشیدہ رکھنے کی خاطر مجھے ایڈووکیٹ احسان ملک کو اعتماد میں لینا پڑا۔ پھر جلدی جلدی بازار سے سامان خریدنے کے بعد گاؤں واپس لوٹتے ہوئے میں نے اللہ وسایا کو بھی اعتماد میں لے لیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ وکیل سے میری ملاقات کا فی الحال کسی سے تذکرہ نہ کرے۔

"بی بی! میرے کو کچھ نہیں آتی کہ اپنی رعنا بی بی صیب ایک انجان بندے کو حویلی کا مالک کیوں بنا گئی ہیں؟" اللہ وسایا حوصلہ پا کر بولا۔

"یہ تو ہم میں سے کسی کو بھی پتا نہیں۔" میں نے دلگیر لہجے میں کہا۔

"پتا کرنا تھا ناجی۔ اپنی بڑی بی بی صیب جی بھی کچھ ڈرتی لگتی ہیں اس سے۔"

"جی کی نرمی ہی نے تو کام بگاڑ دیا ورنہ اب تک تو عدالت تک معاملہ پہنچے بھی دن ہو گئے ہوتے۔"

"یہ اپنے نادر وکیل صیب کیا کہتے ہیں بی بی جی؟"

"امید تو بہت دلائی ہے انھوں نے۔ کہتے ہیں عدالت میں اس سے بس ایک ہی بات کریں گے کہ پیسے اور حویلی چھوڑ دے۔"

"اچھا جی۔"

"مگر دیکھو فی الحال تم جی سے یا کسی اور سے وکیل صاحب سے میری ملاقات کا ذکر نہ کرنا۔ بشیراں سے بھی نہیں۔ تمھیں پتا ہے نا کہ وہ پیٹ کی کتنی کچی ہے۔ فوراً جی کو بتا دے گی۔" میں نے ایک بار پھر اسے سمجھایا۔

"آپ بے فکر رہیں جی۔ بات اللہ وسایا سے کہہ دی، کنوئیں سے کہہ دی، ایک ہی بات ہے جی۔"

"تم مرد بھروسا کیے جانے کے لائق تو نہیں ہو مگر مجبوراً..." میں نے پچھلی نشست سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اللہ وسایا کے سر کے عقبی حصے اور شانوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے جی ہی جی میں سوچا۔

ایڈووکیٹ احسان ملک نے بھی خوب تیزی دکھائی یا شاید یہ اس تگڑی فیس کا کمال تھا جو میں نے تیسرے چوتھے دن ہی شہر کے اگلے پھیرے میں ان کی نذر گزاری تھی۔ میری جانب سے بتوسط ایڈووکیٹ احسان ملک میرے رقیب روسیاہ تیمور عالم کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا گیا۔

اس دوران تیمور کراچی، حیدر آباد، اندرون سندھ اور وہاں سے واپسی پر بہاول پور اور بہاول نگر کے کاروباری دورے پر رہا اور گاہے گاہے فون پر مجھ سے رابطہ قائم کر کے موصولہ نئے آرڈرز سے باخبر کرتا رہا۔ اس کی گاؤں واپسی تک لاہور سے گرم شالوں کی مانگ پر کشیدہ کاری کا کام مکمل ہو چکا تھا اور پارٹی اس سلسلے میں ایک دو مرتبہ رابطہ بھی قائم کر چکی تھی۔ بمشکل چھتیس گھنٹے حویلی میں قیام کے بعد وہ تیار شالوں کی کھیپ لے کر لاہور چلا گیا اور جب وہاں سے واپس آیا تو عدالت سے اس کے نام طلبی آ چکی تھی۔

جی کو پتا چلا تو وہ زندگی میں پہلی بار مجھ پر اتنی خفا ہوئیں جتنا کہ مجھے گمان بھی نہیں تھا۔

"یہ تم نے کیا حماقت کی؟"

"جب آپ کچھ نہیں کر رہی تھیں تو مجھی کو کچھ کرنا تھا۔" میں نے کہا۔

"انتہائی بے وقوفی کی تم نے۔ اگر مجھے عدالت ہی میں جانا ہوتا تو میں وراثت نامہ لیتے ہوئے حویلی میں اس کی شراکت پہ اعتراض نہ کر دیتی۔ میں دعویٰ کر سکتی تھی کہ آدھی حویلی کی قیمت رعنا کے کل ترکے کے نصف سے بھی زیادہ ہے اور اسی بنیاد پر لڑ سکتی تھی۔"

"ممی! آپ نہیں جانتیں، وہ کتنا خراب آدمی ہے۔ آپ کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔"

"کہنے دیتیں، مجھے اس سے کیا فرق پڑتا۔ برا بھلا کہنے سے تو لوگ اچھے اچھوں کو باز نہیں رہتے۔ بادشاہوں کو برا بھلا کہتے ہیں۔"

"مگر میں کسی کو یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ آپ کو برا کہے۔"

"احمق ہو تم۔" ممی نے جھنجھلا کر کہا۔

میں نے ہڑبڑا کر ممی کی جانب دیکھا۔ ان کی خفگی نے میری آنکھیں بھگو دیں۔

"اس نے مجھے چیلنج کیا تھا... کہہ رہا تھا ہمت ہے تو آپ خود مقابلے پر کیوں نہیں آتیں۔ حویلی کی ملکیت میں میری شراکت آپ سے ہے آپ کی ممی تو نہیں۔"

"اور تم اونچ نیچ اور راستے کی مشکلات کی پروا کیے بغیر خم ٹھونک کے میدان میں اتر آئیں۔" ممی نے درشتی اور تلخی سے کہا۔

مجھے ممی کے لہجے کی تلخی سے دکھ پہنچا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے میں نے ممی کی طرف دیکھا اور پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ "تو کیا حویلی کے بٹوارے پر آمادہ ہو جاتی؟"

"یہ کون کہہ رہا ہے؟"

"تو پھر؟"

"میں نے تمھیں سمجھایا تھا کہ اس سے نرمی، رسانیت اور عقل سے بات کرنا ہوگی۔"

"میں نے کوشش کی تو تھی۔"

"مگر صبر نہ کر سکیں۔"

"مجھے نفرت ہے اس سے اور دنیا کے ہر مرد سے۔"

"مگر میں نے تمھیں سمجھایا تھا کہ کبھی کبھی مردوں کو مجبوراً، مصلحتاً یا ضرورتاً برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

"آئی ایم سوری ممی! آپ کی یہ منطق کم از کم تیمور کے معاملے میں میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں نہ اسے مجبوراً برداشت کر سکتی ہوں، نہ مصلحتاً، نہ ضرورتاً۔"

"میں نے تمھیں جو آزادی اور خود مختاری دے رکھی ہے، تم نے اس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔"

میرا دل بھر آیا۔ یہ کیا کہہ رہی تھیں ممی! ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا سکتی تھی میں؟

"ممی! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" ممی ترش ہو کر بولیں۔

میں نے ممی کے خفگی سے عبارت چہرے کی جانب دیکھا اور الجھ کر رہ گئی۔

"ممی! مجھے تیمور سے نفرت ہے۔ مجھے دنیا بھر کے مردوں سے نفرت ہے لیکن چوں کہ دنیا بھر کے مردوں سے لڑنا میرے بس میں نہیں، اس لیے میں تیمور سے لڑ کر اسے شکست دے کر آپ کے اور کاکا کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا تھوڑا بہت حساب برابر کر دینا چاہتی ہوں۔ کیا آپ کو یاد نہیں، پاپا نے کیا کیا تھا آپ کے ساتھ؟ آپ جو مجھے تیمور کے ساتھ نرمی اور رسانیت سے کام لینے کا مشورہ دیتی رہی ہیں، کیا بھول گئیں آپ کہ کاکا کو ایک مرد ہی نے تو بے رحمی سے دھوکا دیا تھا؟ کیا آپ بھول گئیں کہ آپ نے مجھے مردوں سے نفرت کرنا سکھایا ہے؟ پھر کیوں کر میں وہ ساری باتیں بھول کر تیمور سے نرمی کا رویہ رکھ سکتی ہوں؟ آپ کو تو مجھے شاباش دینا چاہیے کہ میں نے پھر بھی بہت برداشت سے کام لیا مگر... اب... اب میں برداشت نہیں کر سکتی۔ مردوں نے ہم سے زندگی کی خوشیاں چھینی ہیں۔ میں تیمور سے اس کا وہ حق چھینوں گی جو کاکا کسی غلط فہمی میں اسے دے گئی ہیں بلکہ سچ پوچھیے تو ہم چھین بھی کب رہے ہیں، ہم تو اس کی قیمت لگائیں گے۔"

میں جذبات کی روانی میں بہتی چلی گئی۔

"تم پرانی باتوں کو لے کر بیٹھی ہو اور جو میں نے تمھیں اب سمجھایا تھا اسے اہمیت نہیں دی تم نے۔"

"ممی! پرانی باتیں تو سدا ہمارا دامن تھامے چلتی رہتی ہیں۔"

میں نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ آگ میں کودی ہو تو آپ ہی خود کو بچانا بھی۔ میں تو اب میدان میں آؤں گی نہیں۔"

میں نے تڑپ کر ممی کو دیکھا۔ ان کا رویہ میرے لیے ناقابل فہم تھا۔ بیچ منجدھار میں وہ میرا ساتھ چھوڑ جانے کی بات کر رہی تھیں۔

عملاً بھی ممی نے ایسا ہی کیا۔ میں بالکل تنہا رہ گئی۔ تیمور خم ٹھونک کر میدان میں آگیا۔ اس نے اعلیٰ پائے کے ایک وکیل کی خدمات حاصل کر کے نہ صرف مجھے بلکہ میرے قانونی مشیر ایڈووکیٹ احسان ملک کو بھی حواس باختہ ہو جانے پر مجبور کر دیا

کیونکہ فریقِ دوم کی بابت ان کے استفسار پر میں نے انھیں یہی بتایا تھا کہ وہ انتہائی معمولی سی حیثیت کا ایک پڑھا لکھا آدمی ہے۔ میرے وکیل صاحب اس گمان میں تھے کہ اپنی معمولی مالی حیثیت کے باعث فریقِ دوم بھاری فیس والے کسی وکیل صاحب کی خدمات حاصل کر سکے گا لیکن پیش آمدہ صورتِ حال نے ایڈووکیٹ احسان ملک اعوان کی سوچ کو بوکھلا کے رکھ دیا۔ تاہم اس معرکے سے قطع نظر اپنے فرائضِ منصبی وہ بدستور انجام دیتا رہا۔ یہ اور بات تھی کہ ان دنوں اس کے اور میرے مابین انتہائی محتاط اور سرسری بات چیت ہو رہی تھی۔

اس روز ہفتے کا آخری دن تھا کارکن عورتوں کو ہفتہ واری اجرت ادا کیے جانے کا مقررہ دن۔ تیمور دو دن سے غائب تھا دو روز قبل عدالت میں پیشی بھگتا نے شہر گیا تھا اور اس وقت تک واپس نہ لوٹا تھا۔ میں خوش تھی اور جی ہی جی میں اس کے کبھی واپس نہ لوٹنے کی دعا کر رہی تھی مگر مصیبت کہہ کے کب آتی ہے۔

سرِ شام جب میں عورتوں کو اس روز دی جانے والی ہفتہ واری اجرت کا حساب کتاب کرنے میں منہمک تھی میری سماعت سے اس کی آواز ٹکرائی۔

"حاضر ہو سکتا ہوں؟"

یا تو وہ دبے پاؤں آیا تھا یا پھر میں اپنے کام میں اس قدر منہمک تھی کہ مجھے اس کے آنے کی خبر اس کی آواز سے ہوئی۔ میں نے چونک کر دروازے کی سمت نگاہ اٹھائی۔

"حاضر ہو سکتا ہوں جی؟" اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"جی آئیے۔"

وہ آگے بڑھا میری میز تک پہنچا اور اس نے ایک لفافہ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے اسے کسی نئے آرڈر پہ محمول کیا۔

"جی! کیا ہے یہ؟"

"اسٹے آرڈر۔" وہ یوں مسکرا دیا جیسے مدِ مقابل کو زک اور بے بس پانے والے اپنی قوت کے بل پر مسکرا دیا کرتے ہیں۔

"اسٹے آرڈر؟" میں اپنی وحشت اس سے پنہاں نہ رکھ پائی۔

"جی ہاں۔ اب میں اس حویلی میں رہنے کا قانونی استحقاق رکھتا ہوں۔ کم از کم اس وقت تک جب تک کہ عدالت آپ کی حسبِ منشا فیصلہ نہیں دے دیتی۔"

میں اکا تو تو لو نہیں کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔

"اب آپ شوق سے مقدمہ لڑتی رہیے۔"

اس کے طنز بھرے لہجے نے مجھے شدید ذہنی اذیت سے دوچار کر دیا۔ ابرو چڑھا کر میں نے اس کی طرف دیکھا اور زہر خند لہجے میں بولی۔ "آپ کے اسٹے آرڈر لے لینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دیکھتی ہوں کتنے دن رہ سکتے ہیں آپ یہاں۔"

دونوں ہاتھ میز کے کنارے پر ٹکاتے ہوئے وہ جھک گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ "مجھے للکارئیے مت ورنہ..."

"ورنہ کیا؟" میں نے تیز تیکھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"بہت بری طرح پھنس جائیں گی آپ۔"

"ارے جائیے بہت دیکھے ہیں آپ جیسے۔" میں نے حقارت سے کہا۔

"ہاہ۔" وہ منہ اوپر کر کے یوں ہنس دیا جیسے میں نے بے حد احمقانہ بات کہہ دی ہو پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ بہت سوں کی بات کرتی ہیں ارے..." وہ پل بھر کو تھما اور اپنے سینے کو ٹھونکتے ہوئے بولا۔ "اس ایک تیمور سے نمٹ کر دکھا دیں تو جانوں گا۔"

میں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا جواب میں وہ انتہائی ڈھٹائی سے مسکرا دیا۔ مجھ سے کچھ بن نہ پڑا تو میں دانت بھینچتی اور مٹھیاں بھینچتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے تم سے نفرت ہے۔" میں نے پوری شدت کے ساتھ کہا۔ شدید ہیجانی کیفیت سے میرا دم پھول رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ مجھ سے آپ کی نفرت کا بنیادی سبب میرا مرد ہونا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مرد ذات سے آپ کی نفرت کا سبب کیا ہے اور... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کے دل میں اس نفرت کا بیج بونے کا سہرا کس کے سر جاتا ہے۔"

مجھے اپنا سر گھومتا محسوس ہوا۔

"اپنی اوقات میں رہ کر بات کرو... تم... تم حد سے زیادہ بڑھ رہے ہو۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"جی نہیں بلکہ سچ پوچھیے تو میں تو ان لوگوں کے خلاف ہوں جو کسی بھی معاملے میں حد سے زیادہ بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ جو بھول جاتے ہیں کہ زندگی تو اعتدال اور توازن کا نام ہے۔ جہاں یہ توازن بگڑ جائے وہیں تباہی اور موت ہے۔ آپ جو یہ دکان سجا کے بیٹھی ہیں اس حویلی میں اور خوش ہیں کہ گاؤں کی عورتوں کے لیے آپ نے نئی راہیں کھول دی ہیں کبھی سوچا آپ نے کہ خود آپ کے لیے واپسی کتنی مشکل ہو سکتی ہے؟"

اب برداشت کی انتہا ہو چکی تھی اور میرے اعصاب چٹخنے لگے تھے۔

"شٹ اپ!" میں چلائی مگر خود اپنی آواز مجھے کسی اندھے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

"چلائیے مت ورنہ میں آپ سے زیادہ اونچی آواز میں چلا سکتا ہوں۔"

"دفع ہو جاؤ... گیٹ لوسٹ۔" میں نے اپنی آنکھوں کو پوری شدت سے بھینچتے اور مٹھیوں کو جکڑتے ہوئے کہا۔

"زیادہ پریشان نہ ہوں۔ ابھی تو میں نے اسے آرڈر ہی لیا ہے۔ غصے کو سنبھال کے رکھیے مستقبل میں کام آئے گا اس وقت جب عدالت خود مجھے آدھی حویلی کا قبضہ دلوائے گی۔ سوچ لیجیے آپ کی اس دکان کا کیا بنے گا جو آپ نے حویلی کی نچلی منزل پر سجا رکھی ہے۔ آپ اسے اٹھا کر اوپر لے جانا پسند کریں گی یا خود بیچ آنا؟"

"یہ کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔ تمہیں تمہارے حصے کی قیمت تو مل سکتی ہے مگر حویلی تمہیں نہیں مل سکتی۔"

"میں حویلی کی نہیں آدھی حویلی کی بات کر رہا ہوں۔"

"تمہیں حویلی میں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہیں ملے گی۔"

"میڈم! میں تو پورا کا پورا اندر ہی موجود ہوں۔" اس کے لہجے میں تمسخر اڑانے والی کیفیت تھی۔

"چند دن... صرف چند دن کی بات ہے مسٹر... پھر میں تمہیں دھکے دے کر نکلوا دوں گی۔"

"شکر ہے آپ نے اپنی ممی کا ڈراوا دینا تو چھوڑا۔"

"ممی تم جیسے دو ٹکے کے آدمیوں کے منہ لگنا پسند نہیں کرتیں۔"

"شاید ڈرتی ہیں۔"

"شٹ اپ۔"

"کچھ اور؟"

"بس چند دن کی بات ہے۔"

"یہ تو آنے والا وقت بتائے گا کہ چند دن کی بات ہے یا ہمیشہ کی۔"

"چلے جاؤ... چلے جاؤ یہاں سے اور مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔"

"میڈم! حویلی کا معاملہ تو خیر ہمارا آپس کا معاملہ ہے، اپنا ملازم و ماتحت ہونے کے ناتے تو آپ کو میری صورت دیکھنا ہی پڑے گی۔" اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اس کی زیرِ لب مسکراہٹ مجھے زہر لگ رہی تھی۔

"نہیں ہے مجھے تمہاری خدمات کی ضرورت۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"سوچ لیں۔" وہ قدرے اترا کر بولا۔

"سوچ لیا ہے۔"

"اوکے... ." اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ "تو میرے بقایاجات؟"

"تمہارے بقایاجات تمہیں مل جائیں گے۔"

"کب حاضر ہوں آفس اس سلسلے میں؟"

"کوئی ضرورت نہیں ہے حاضر ہونے کی۔ میرا ملازم پہنچا دے گا تمہارے بقایاجات۔" میں نے انتہائی غصے کے عالم میں کہا۔

"جی بہتر لیکن ایک سوال آپ کی سوچ بچار کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں کہ آپ کی ممی مردوں کی بدترین مخالف ہوتے ہوئے بھی میرے مقابلے پر کیوں نہیں آئیں؟"

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ مڑا اور تیزی سے میرے کمرے سے نکل گیا۔

میں ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔ میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ ممی کا بھیدی کیوں کر بن بیٹھا تھا اور جو سوال وہ بقول اس کے میری سوچ بچار کے لیے چھوڑ گیا تھا اس کا مطلب کیا تھا؟

مشکل یہ تھی کہ میں اس کی اس تازہ ترین بکواس سے ممی کو بھی آگاہ نہ کر سکتی تھی۔ تیمور کے خلاف میرے عدالت سے رجوع کرنے کو انھوں نے میری خود سری اور خود مختاری کی انتہا پر محمول کرتے ہوئے نہ صرف ناپسندیدہ سمجھا تھا بلکہ مجھ سے سفارتی تعلقات بھی محدود کر لیے تھے۔ میں خود ہی کوئی بات کرتی تو مختصر جواب دے دیتیں ورنہ از خود تو مجھ سے شاذ ہی بات کرتیں۔ ممی کی خفگی میرے لیے روح سوز ثابت ہو رہی تھی۔ عجیب مشکل میں پڑ گئی تھی کہ ایک جانب مجھے ممی کی بے رخی اور خفگی کا دکھ سہنا پڑ رہا تھا اور دوسری طرف تن تنہا تیمور کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کی وہ دبی دبی سی مسکراہٹ جو مجھے میرا تمسخر اڑاتی محسوس ہوتی تھی برداشت کرنے کے لیے فولاد کا جگر ہونے کی ضرورت تھی۔ اس کی تازہ ترین، کڑوی کسیلی، تیکھی اور جلا کر رکھ دینے والی باتیں جلے پر نمک چھڑکنے کے مصداق نہیں۔ افسوس کہ میں ممی سے بھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ اگر کہتی تو مجھے یقین تھا کہ ان کا جواب وہی ہوتا جو میں پہلے ہی دو تین بار سن چکی تھی یعنی۔

"آگ میں کودی ہو تو آپ ہی خود کو بچاؤ بھی۔ تم نے

بری دی ہوئی آزادی اور خود مختاری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔"

اُف میرے خدا! زندگی اتنی کٹھن ہو جائے گی یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

اگلی صبح میں نے تیمور کے بقایا جات ایک لفافے میں رکھ کر اللہ وسایا کے ذریعے اسے بھجوا دیئے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی بھی بہانے وہ اپنی صورت دکھانے اور اپنی باتوں سے میرا جی جلانے میرے سامنے آ پہنچے۔

ممی کو اس کے عدالت سے اسٹے آرڈر لے لینے کی خبر ملی تو انھوں نے مجھے تسلی دینے کے بجائے خاصے تلخ لہجے میں کہا: "یہی ہونا تھا۔ وکیل صاحب پہلے ہی بتا چکے تھے۔"

"لیکن اب ہو گا کیا؟"

"ہونا کیا ہے، جو کیا ہے اسے بھگتو۔"

"ممی! مجھے آپ کی ہمدردی کے دو بول چاہئیں، مشورہ چاہیے، طعنے نہیں۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"مقدمہ واپس لے لو۔"

"ناممکن۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا: "میں کسی قیمت پر پیچھے نہیں ہٹوں گی۔"

"تمھاری اسی خودسری نے یہ دن دکھایا ہے۔"

"ممی! آپ... آپ اسے خودسری سمجھتی ہیں؟" میں روہانسی ہو گئی۔

"ہاں، اولاد جب ماں کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کرے تو وہ خودسری ہی ہوتی ہے۔"

"کتنے دن تو میں کوشش کرتی رہی مگر وہ فرمانے پیچھا پھر... پھر میں کیا کرتی۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"میں نے تمھیں نرمی، درسانیت اور احتیاط سے کام لینے کو کہا تھا اور تم نے گرمی اور عجلت کا مظاہرہ کیا۔"

"ایک بات بتایئے ممی! اس سے ڈرنے کی وجہ...؟"

میری جھلاہٹ نے مجھے کسی قدر ناخلفی پر مجبور کر دیا۔

"کیا مطلب؟" ممی نے مجھے تیز تیکھی نگاہوں سے دیکھا۔

"مطلب یہ کہ آپ اس سے خائف کیوں ہیں؟"

"میں... میں بھلا کیوں خائف ہونے لگی؟"

"وہ تو یہی سمجھتا ہے بلکہ یہی کہتا ہے۔"

"کیا کہتا ہے؟" ممی نے قدرے گھبرا کر کہا۔

"اس نے مجھ سے اس سوال پر غور کرنے کے لیے کہا تھا کہ آپ مردوں کی بدترین مخالف ہوتے ہوئے بھی اس کے مقابلے پر کیوں نہیں آئیں۔"

مریض (ڈاکٹر سے): ڈاکٹر صاحب! مجھے نیند نہیں آتی۔

ڈاکٹر: "اچھا، کیا کام کرتے ہو؟"

مریض: "میں موٹر مکینک ہوں۔"

ڈاکٹر: "اچھا تو اس میز کے نیچے لیٹ جاؤ نیند آ جائے گی۔"

"تمھیں اس کی اس قسم کی بکواس پر توجہ نہیں دینا چاہیے تھی۔"

"میں نے قطعاً ایسا ہی کیا۔"

حالاں کہ میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ شاید میں اس کی اس بات کو نظر انداز کرنا بھی چاہتی تو نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ممی کا دبا دبا سا محتاط رویہ مجھے اس سوال پر غور و خوض کے لیے مجبور کر رہا تھا۔

بہر حال میرا یہ فیصلہ اٹل تھا کہ میں اس سے خائف ہو کر پیچھے نہیں ہٹوں گی۔

اگلے چند ماہ اس کے اور میرے مابین ایک خاموش اور سرد سی جنگ میں گزرے۔ اللہ وسایا جو کچھ عرصہ اس کے ساتھ رہ کر کام کو کسی حد تک سمجھ چکا تھا، اس کی جگہ میرے ساتھ کام کر رہا تھا۔ دیکھنے کو تو میں تیمور کی جگہ کوئی نیا آدمی بھی ملازم رکھ سکتی تھی مگر ان الجھے ہوئے مکدر حالات میں میں نے کسی نئے شخص کو ملازم رکھنا بہتر نہ سمجھا۔ میں پہلے اس محاذ سے فراغت حاصل کر لینا چاہتی تھی جس پر کہ میں ان دنوں ڈٹی ہوئی تھی۔

زیریں منزل پر واقع حویلی کے اس کمرے پر جسے ہم کبھی گول کمرے کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے تیمور کا قبضہ بدستور تھا۔ صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کے درمیان جب میرے نیچے اترنے کا وقت ہوتا تو وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیتا اور اکثر کمرے سے باہر برآمدے میں نکل آتا۔ میں نے نیچے اترنے کے معینہ وقت میں ردو بدل کر کے بھی دیکھا مگر اس کے معمول میں کچھ فرق نہ آیا۔ ناچار میں نے جبڑے باہم بھینچے تختے سیدھا کیے نظر رخ میں ہر بار ایسے نیچے اترنے اور اسے قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے انتہائی نخوت سے اس کے سامنے سے گزر جانے کو اپنا معمول بنا لیا۔ ایسے موقعوں پر وہ کبھی کبھار دھیرے سے کھنکار دیتا۔ مجھے اس کی کھنکار میں بھی طنز و تمسخر کی کیفیت محسوس ہوتی۔

ایسے موقع پر میرا تن بدن سلگنے لگتا۔ رگ رگ میں آگ سی دوڑ جاتی۔ مجھے وہ اپنا بدترین دشمن و رقیب محسوس ہوتا تھا۔ جب وہ حویلی سے باہر جاتا تو اس کمرے کو جس پر اس کا قبضہ تھا باہر سے مقفل کر جاتا۔ کبھی کبھی وہ کئی کئی دن تک حویلی سے غائب رہتا۔ ایسے دنوں میں اس کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نادر حویلی کے سبزہ زار پر اور پائیں باغ میں ٹہلتی رہتی۔ ممی نے تو اشد ضرورت کے سوا نیچے اترنا تقریباً ترک ہی کر دیا تھا۔ کہیں باہر جانا ہوتا تو وہ زینہ اتر کر نیچے آنے کے بعد سیدھی حویلی کے برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب کھڑی گاڑی کا رخ کرتیں جو الشدو سایانے پورٹیکو سے یہاں لا کھڑی کی ہوتی تھی۔

میں نے سن رکھا تھا کہ زمین اور جائیداد کے مقدمے شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتے ہیں۔ ایک بار سلسلہ چھڑ جائے تو برسوں چلتا رہتا ہے مگر تیمور اور اس کے وکیل نے خدا جانے کون سا منتر پڑھ کے پھونکا کہ آٹھ ماہ کے اندر ہی فیصلہ بھی ہو گیا۔

فاضل عدالت کے فیصلے کے مطابق حویلی کو تیمور کی اور میری مشترکہ ملکیت قرار دیتے ہوئے مجھے پندرہ دن کے اندر اندر حویلی کی زیریں منزل کے ان کے ایک کمرے میں تیمور پہلے ہی رہائش پذیر تھا تیمور کے حق میں خالی کر دینے کی ہدایت کی گئی تھی۔ حویلی کے پورٹیکو، لان، پائیں باغ اور احاطے کے سلسلے میں ہمیں باہمی افہام و تفہیم سے بٹوانے کا حق دیا گیا تھا۔ حویلی کا صدر دروازہ تیمور میری مرضی سے استعمال کرنے کا مجاز تھا تاہم میرے متفق نہ ہونے کی صورت میں اسے عقبی جانب ایک دوسرا دروازہ نکال لینے کی ہدایت کی گئی تھی۔ عدالت نے تیمور کو اور مجھے ایک دوسرے کے حق میں دستبردار ہو جانے یا اپنا حصہ دوسرے کو فروخت کر دینے کا مجاز بھی قرار دیا تھا۔

عدالت کا یہ فیصلہ میری شکست کے مترادف تھا اور شکست بھی ایسی جس نے مجھے بوکھلا کے رکھ دیا تھا۔ حویلی کی زیریں منزل پر تو ہمارا دستکاری مرکز قائم تھا جسے میں نے شب و روز محنت کر کے اس مقام تک پہنچایا تھا کہ گاؤں کی تقریباً ڈیڑھ سو عورتوں کی روزی اس مرکز سے وابستہ تھی۔ اس کارخانے کو اوپری منزل پر منتقل کر دینے کا کوئی سوال ہی نہ تھا کیوں کہ دستکاری مرکز کے پھیلاؤ کے بعد حویلی کی زیریں منزل کے کمروں کا سامان بھی اوپر منتقل کر دینے سے بالائی منزل پر واقع تمام کمرے اسباب سے بھر گئے تھے ایسے میں دستکاری مرکز کی مشینوں اور کارکنوں کے کام کرنے کے لیے جگہ بھلا کہاں نکل سکتی تھی۔ بظاہر آثار یہی نظر آتے تھے کہ مجھے اس مرکز کو بند کر دینا پڑے گا یا پھر کہیں اور منتقل کر دینا ہو گا۔ کہیں اور منتقل ہونے کا مطلب بہت سوں کو اپنے اوپر ہنسوانا تھا اور دستکاری مرکز بند کر دینے کی صورت میں میں گاؤں کی عورتوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی اور وہ مرد جن کی عورتوں کو میں ان کے مقابلے پہ لے آئی تھی انھیں تو مجھ پہ ہنسنے اور میرا مذاق اڑانے کا کھلا موقع مل جاتا۔

انتہائی سراسیمہ و مضطرب میں منتظر تھی کہ کب وہ فتح مندوں کی طرح گردن اکڑائے، آنکھوں میں جیت کا خمار لیے میری شکست کا مذاق اڑانے میرے سامنے آتا ہے اور مجھے اس دکان کو سمیٹنے کا نوٹس دیتا ہے جو بقول اس کے میں سجائے بیٹھی تھی۔ ان گاؤں کی عورتوں کی بہبود اور معاشی خود کفالت کے لیے قائم کردہ اس دستکاری مرکز کو جسے ہم نے "بہبود مرکز" کا نام دے رکھا تھا اس نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں دکان ہی تو کہا تھا۔

وہ خود تو میرے سامنے نہ آیا تاہم وکیل صاحب کے توسط سے مجھے اس کی جانب سے یہ پیغام ملا کہ اگر میں حویلی میں اپنا حصہ اسے فروخت کرنا چاہوں تو وہ اسے خریدنے کو تیار ہے۔ اس کے اس پیغام نے مجھے ناقابل بیان اذیت سے دوچار کر دیا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس دو ٹکے کے آدمی کو جو کل تک میرا ملازم ہوا کرتا تھا یہ مجال کیوں کر ہوئی تھی۔ ممی کا بے لاگ تبصرہ اس پر مستزاد ثابت ہوا۔

"بڑوں کی بات نہ ماننے اور اپنی من مانی کرنے کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔"

مجھے افسوس ہوا کہ ممی میرے اس اقدام کو جو میں نے حویلی کو ایک اجنبی شخص کی دستبرد سے بچانے کے لیے اٹھایا مسلسل میری خودسری اور من مانی پر محمول کر رہی تھیں۔ میں نے تو بہرحال نیک نیتی ہی سے کوشش کی تھی، ہار جیت مقدر کی بات ہے۔ ممی میری نیک نیتی اور جرأت کو مستقل ایک فاش غلطی قرار دیے جا رہی تھیں۔ اور ایک ایسے موقع پر جب کہ میں انتہائی پریشان تھی مجھے تسلی دینے کے بجائے الٹا ڈانٹ ڈپٹ رہی تھیں۔ ممی کے رویے کے پیش نظر مجھے اس نئے محاذ پر بھی تنہا ہی مقابلہ کرنا تھا۔ غصے اور حقارت سے میں نے اس کی وہ پیش کش جس نے مجھے اس کی مالی حیثیت کے بارے میں بھی حیران و متذبذب کر دیا تھا یکسر رد کر دی۔

مجھے یقین تھا کہ اس محاذ پر منہ کی کھانے کے بعد وہ

بلا [illegible] عدالت کے فیصلے کے بموجب حویلی میں اپنے حصے کا قبضہ لینے کے لیے براہِ راست مجھ سے رجوع کرے گا۔

لیکن اس سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی [illegible] اضطراب نے اس وقت حیرت کا روپ دھار لیا جب ایک روز اللہ دوسایا نے مجھے بہبود کے حویلی سے سامان سمیت چلے جانے اور اس کمرے کو کھلا چھوڑ جانے کی اطلاع دی جس میں وہ قیام پذیر تھا۔ اس کا یوں چلا جانا مجھے ناقابلِ [illegible] ممی نے سنا تو اشتیاق سے متوجہ ہوئیں اور اس [illegible] کو انھوں نے کسی نئی افتاد کا پیش خیمہ قرار دیا۔

"لگتا ہے اب ہمیں اس منحوس گھر کو خیرباد ہی کہہ دینا چاہیے۔" ممی نے کہا۔

"ممی! آپ اس حویلی کو منحوس کہہ رہی ہیں!" میں نے حیرانی سے انھیں دیکھا۔

"اور نہیں تو کیا، کیا ملا ہے ہمیں اس حویلی میں رہ کر سوائے دکھوں کے۔ اب میں کوئی نیا دکھ، نیا عذاب نہیں سہنا چاہتی اس سے پہلے کہ وہ شخص ہمارے لیے کوئی نئی آزمائش بن کر آئے بہتر ہوگا کہ ہم اس حویلی کو چھوڑ دیں۔"

"حویلی کو چھوڑ دیں؟" میں نے بے یقین نگاہوں سے ممی کی جانب دیکھا۔

"ہاں۔"

"اور ہم جائیں گے کہاں؟"

"کہیں بھی۔ خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ ہم کسی بھی ایسی جگہ چل کر رہیں گے جہاں کوئی ہمیں پریشان کرنے نہ آسکے۔"

"مثلاً کہاں؟"

"کہیں بھی۔ مثلاً کراچی اور... وہاں ہم کوئی بڑا سا مکان خرید لیں گے..."

"اور یہاں جو سب کچھ ہے؟"

"اراضی ہم فروخت کر دیں گے۔ باقی جو کچھ ہے ساتھ لے چلیں گے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے بہت ہے ہمارے لیے۔ میرا مطلب ہے ہم دونوں کے لیے۔ اللہ دوسایا اور شیراں کو بھی ہم اپنے ساتھ لے چلیں گے۔"

"اور بہبود مرکز کا کیا بنے گا جسے میں نے شب و روز محنت سے سینچا ہے؟"

"وقف کر دو اسے۔"

"ممی جی پلیز ایسی سنگ دلی نہ دکھائیں، گاؤں کی بے شمار عورتوں کی روزی اور خوشحالی وابستہ ہے اس مرکز سے۔"

"اس مرکز کو تو ویسے بھی ختم ہو ہی جانا ہے۔"

ممی کی اس بات پر بے اختیار میری آنکھیں بھر آئیں۔ یہ بات تو میں بھی جانتی تھی کہ بہبود مرکز کی بقا اب خطرے میں نظر آرہی تھی مگر یہ بھی سچ تھا کہ یہ مرکز میری اقلیم تھی اور اپنی اقلیم کو لٹتے، بکھرتے اور فنا ہوتے کون دیکھ سکتا ہے۔

"اب ہمیں جلد از جلد اس حویلی کو چھوڑ دینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا یوں چلا جانا بے معنی نہیں ہو سکتا۔"

"ممی جی! آپ تو اس قدر گھبرا رہی ہیں جیسے آگ میں گھر جانے والے دہشت زدہ ہو جایا کرتے ہیں۔"

"اس سے کوئی بعید نہیں، وہ اسے آگ بھی لگا سکتا ہے۔"

"نہیں ممی مفت مل جانے والی لاکھوں کی جائیداد کو وہ آگ نہیں لگا سکتا۔"

"بے وقوف ہو تم! آگ لگا دینے کا مطلب سچ مچ آگ لگا دینا ہی تو نہیں ہوتا۔"

"اچھا تو آپ آگ لگا دینا محاورۃً استعمال کر رہی ہیں؟"

"وہ کوئی بھی کھیل کھیل سکتا ہے ہمارے ساتھ۔"

"دیکھ لیں گے۔" میں نے دلیری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

"تمھاری اسی خودسری نے ہی یہ دن دکھائے ہیں۔"

"اوہو ممی! کیا [illegible]" میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔

"مجھے بتائے بغیر عدالت میں جا پہنچیں اور پھر بھی پوچھتی ہو کہ کیا کیا ہے میں نے۔"

میں جو ممی کے لاڈ پیار اور محبت کی عادی تھی گزشتہ کئی ماہ سے ممی کی خفگی اور کڑوی کسیلی ڈانٹ پھٹکار سنتے سنتے رنج و ملال کی انتہائی حدوں پہ جا پہنچی تھی۔

"دوسروں کے سامنے تماشا بننے سے بہتر ہے کہ ہم حویلی چھوڑ دیں۔" ممی نے پھر کہا۔

"وہ تو خوش ہو گا کہ پوری حویلی مفت ہاتھ آ گئی۔"

"جہنم میں جائے وہ اور جہنم میں جائے حویلی بھی۔" ممی نے تڑخ کر کہا۔

ذرا دیر کو تو مجھے ممی کی دماغی صحت مشکوک سی محسوس ہوئی۔ گو حویلی کے نصف حقوق ملکیت ہی میرے نام تھے مگر یہ نصف ملکیت بھی لاکھوں کی جائداد تھی اور اس سے قطع نظر حویلی ممی کی پرانی یادوں کا مسکن تھی اور اپنی قلبی کیفیت کے حوالے سے تو میں یہی سمجھی تھی کہ حویلی ممی کو بھی اسی قدر بلکہ شاید اس سے زیادہ عزیز ہو گی جتنی کہ مجھے تھی۔ مگر میرا اندازہ غلط ثابت ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"ممی! میں اس حویلی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" ممی نے تیوری پربل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں کہ مجھے حویلی سے پیار ہے۔ یہاں نانی اماں اور ممّا کی یادیں بسی ہیں۔ میرا بچپن یہاں گزرا ہے۔ حویلی میرا گھر ہے اور میں اس گھر کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"حماقت کی باتیں مت کرو۔"

"مجھے افسوس ہے ممی کہ میں یہ کہنے پہ مجبور ہوں کہ حماقت تو یہ ہو گی کہ ہم اپنا گھر چھوڑ کر چلے جائیں اور ایک اجنبی شخص کو جس نے ہمارا سکون درہم برہم کر دیا، لاکھوں کی جائداد مفت نذر کر دیں۔"

"بعد میں وکیل صاحب کے توسط سے تم اپنا حق ملکیت کسی کو بھی فروخت کر دینا۔"

"نہیں ممی! میں حویلی سے ایسی جذباتی وابستگی رکھتی ہوں کہ میرے لیے اس میں اپنی شراکت کو کیش کروا لینے کا تصور بھی ناممکن ہے۔"

"تمہاری اس ضد کو میں سرکشی اور خود سری نہ کہوں تو پھر کیا کہوں؟" ممی نے تلخی سے کہا۔

"نہیں ممی! یہ سرکشی اور خود سری نہیں ہے۔"

"تو پھر؟"

"کیا آپ یہ سننا چاہتی ہیں؟"

ممی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ چند ثانیے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔ "ہاں۔"

"مجھے حویلی سے پیار ہے اور مردوں سے نفرت..... شدید نفرت تھی..... تیمور بھی مرد ہے اور مجھے اس سے بھی نفرت ہے... جس شخص سے مجھے نفرت ہے اس کے رحم و کرم پر میں ایک ایسی چیز کیوں کر چھوڑ کر کہیں اور جانے کا حوصلہ کر سکتی ہوں جو مجھے بے حد عزیز ہے... آپ کیا سمجھتی ہیں؟ میں نے اس سے ہار مان لی ہے؟ ہرگز نہیں... میں اس سے اس وقت تک لڑتی رہوں گی جب تک کہ پوری حویلی ہماری ملکیت نہیں بن جاتی۔"

"اوہ!" ممی نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا اور بے حد پریشان نظر آنے لگیں۔

ممی کو پریشان دیکھ کر میرا دل پھر پگھلنے لگا۔ میں ان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور میں نے اپنا سر ان کے گھٹنے پہ ٹکاتے ہوئے کہا۔ "ممی! کیا آپ مجھے مردوں کے مقابلے میں اتنا ہی مضبوط اور حوصلہ مند نہیں دیکھنا چاہتی تھیں؟"

ممی کچھ نہیں بولیں۔

میں ممی کے قدموں میں بیٹھ کر عجیب راحت اور طمانیت کا احساس کر رہی تھی۔

تیمور کو حویلی سے گئے دو ڈھائی ماہ گزر چکے تھے۔ ایک روز مجھے تیمور کے وکیل کی جانب سے جوابی رسید کے ساتھ ایک رجسٹرڈ مکتوب بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ اس مکتوب کا متن کچھ یوں تھا۔

محترمہ عالیہ نادر صاحبہ!

السلام علیکم۔

میرے موکل تیمور عالم صاحب جن کے ساتھ آپ کے مقدمے کا کچھ عرصہ قبل ہی فیصلہ ہوا ہے، حویلی کے حقوق ملکیت میں اپنی شراکت سے آپ کے حق میں دستبردار ہونے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ براہ کرم آپ اس ضمن میں ضروری کارروائی کے سلسلے میں اپنی اولین فرصت میں مجھ سے رجوع فرمائیں۔ بہتر ہو گا کہ پہلے آپ فون پر رابطہ قائم فرما لیں۔

آپ کا مخلص

عبدالصمد علی (ایڈووکیٹ)

اس مکتوب نے مجھے ایک نئی کشمکش میں ڈال دیا کس قدر

حیران کن اور مشکوک نظر آتی تھی یہ بات کہ ایک ایسا شخص جو کاکا کی موت کے بعد سے اب تک ممی کے اور میرے لیے پریشانی کی بہت بڑی وجہ بنا رہا تھا جس پر میری لجاجت اور منت کا کوئی اثر نہ ہوا تھا جس کی علامت نے مجھے ممی کی خفگی مول لینے پر مجبور کر دیا تھا جو عدالت میں میرا حریف بنا رہا تھا میرے حق میں حویلی میں اپنی شراکت سے دستبردار ہونے پر کیوں آمادہ ہو گیا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس کے وکیل کے اس مکتوب کے پیچھے کوئی بہت بڑی سازش، کوئی ایسا منصوبہ کارفرما تھا جس کی گرد تک بھی میرا ذہن نہ پہنچ پا رہا تھا۔ گزشتہ تجربات کے پیش نظر مجھے اندازہ تھا کہ ممی اس خبر سے اور متوحش ہوں گی اور انھیں مجھ پر اظہار خفگی کا ایک نیا موقع مل جائے گا۔ عین ممکن تھا کہ حویلی چھوڑنے کے جس ارادے کا انھوں نے ابھی صرف اظہار ہی کیا تھا اس سلسلے میں وہ تشویش ناک حد تک سنجیدہ ہو جائیں۔ ممی کی پریشانی میں اضافہ اور ان کی خفگی کے خوف سے میں نے تیمور کے وکیل کی جانب سے ملنے والے اس خط کو ممی سے راز رکھنا ہی بہتر جانا۔ ویسے تھی خوب تماشے والی بات کہ جس شخص سے خائف ہو کر ممی اپنی آبائی حویلی تک کو خیرباد کہنے کا ارادہ کیے بیٹھی تھیں، وہ خود ہی حویلی سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر چکا تھا ...کیا ایسا ممکن تھا؟

اگلے چند دن میرا دل لمحہ لمحہ کسی نئی افتاد کے خدشے سے پتے کی طرح کانپتا رہا۔

تیمور کو حویلی سے گئے تیسرا مہینہ شروع ہی ہوا تھا کہ حویلی میں قائم بہبود مرکز کے پتے پر مجھے بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ ایک بڑا سا دبیز لفافہ جس کے ساتھ جوابی رسید بھی منسلک تھی موصول ہوا۔ لفافے کے نچلے دائیں گوشے اور جوابی رسید پر بھیجنے والے کا نام ایم اے نائیک درج تھا اور پتا لاہور کے ایک خوش پوش علاقے کا تھا۔ میں نے اسے کسی پارٹی کے مراسلے پر محمول کرتے ہوئے رجسٹری وصول کر لی اور جوابی رسید پر دستخط کر کے مذکورہ رسید ڈاکیے کے حوالے کی۔ ڈاکیے کے جانے کے بعد میں نے لفافہ چاک کیا تو اس کے اندر سے ایک اور لفافہ برآمد ہوا۔ اس لفافے کو کھولنے پر کوئی ہائر کے مطبوعہ لیٹر پیڈ کے اٹھارہ اوراق پر مشتمل ایک موٹا خط برآمد ہوا۔ ہر ورق کے ایک جانب لکھا گیا تھا جبکہ پشت سادہ تھی۔ پیشانی پر اسٹائل بائیں جانب انگریزی میں ملک کلب جی لاہور، طبع تھا۔ تاریخ کے لیے مخصوص جگہ پر پانچ دن قبل کی تاریخ درج تھی۔ خط کا متن کچھ یوں تھا۔

عالیہ بی بی! سلامت باشد۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گی۔ یہ خط میں آپ کو انتہائی باوثوق ذریعے سے یہ جان لینے کے بعد ارسال کر رہا ہوں کہ حویلی آنے والی ڈاک براہ راست آپ ہی کو پہنچائی جاتی ہے۔ تاہم احتیاطاً میں اس خط کے ساتھ جوابی رسید منسلک کر رہا ہوں تاکہ اس رسید کی واپسی پر اس رسید پر موجود دستخط دیکھ کر خط آپ تک پہنچ جانے یا آپ تک نہ پہنچ سکنے کا اندازہ لگایا جا سکے۔ احتیاطاً میں نے اس خط کی کئی فوٹو اسٹیٹ نقول بنوالی ہیں تاکہ اگر جوابی رسید سے یہ گمان ہو کہ خط کسی اور نے وصول کیا ہے تو میں اس کی نقل آپ کو ارسال کر سکوں۔ بفرض محال وہ بھی آپ تک نہ پہنچ سکی تو اس خط کی نقل کسی اور ذریعے سے آپ کو پہنچوانے کی کوشش کروں گا۔ اگر وہ بھی آپ تک نہ پہنچ سکنے کا احتمال ہوا تو میں خود حویلی آؤں گا۔ شاید آپ حیران ہو رہی ہوں کہ ایک اجنبی آدمی جوابی رسید پر آپ کے دستخط دیکھ کر کیوں کر یقین سے کہہ سکتا ہے کہ دستخط آپ ہی کے ہیں یا آپ کے نہیں۔ میں آخر کون اور کب تو رسید پر

آپ کے نام کے دستخط کر سکتا ہے یا پھر یہ کہ ایک اجنبی آدمی خود حویلی آسف کی بات اس قدر بے تکلفی سے کیوں کر کر سکتا ہے تو قصہ دراصل یہ ہے کہ میرے پاس ایک ایسا مراسلہ ہے جس کے توسط سے تمہاری جوابی رسید پر موجود دستخط آپ ہی کے ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق کر سکتا ہوں اور جہاں تک حویلی آنے کا تعلق ہے تو حویلی میرے لیے کوئی اجنبی جگہ نہیں، وہاں میں کئی مرتبہ آ چکا ہوں اگرچہ یہ خاصی پرانی بات ہو چکی ہے۔

غالباً آپ حیران ہو رہی ہیں کہ یہ شخص کون ہے۔ لفافے کے نچلے دائیں گوشے اور جوابی رسید پر جو آپ ڈاکیے کے حوالے کر چکی ہیں بھیجنے والے کا نام ایم اے نائیک درج ہے ایم اے نائیک مسعود عالم نائیک کا مخفف ہے ویسے لوگ میرے اس نام سے کم ہی واقف ہیں۔ میں والدین کے دیے ہوئے اس نام کے بجائے اس نام سے پہچانا جاتا ہوں جو میں نے اپنی نوجوانی کے دور میں اپنے لیے خود پسند کیا تھا غالباً اس نام کو آپ نے بھی یاد رکھنے کی کوشش کی ہوگی محمود ظفر۔

جی ہاں میں وہی محمود ظفر ہوں جس سے آپ کی رعنا آنٹی کی شادی ہونے والی تھی لیکن افسوس کہ وہ شادی نہ ہو سکی... کیوں؟ یہ ایک تلخ قصہ ہے۔ آئیے آج میں آپ کو اس داستان کے ان گوشوں سے آگاہ کروں جو آپ کی نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔

میں، محمود ظفر ملتان کے ایک زمیندار گھرانے کا فرد ہوں۔ مجھے روپے پیسے کی کبھی کمی نہیں رہی۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا اور ہے۔ مجھ سے بڑی ایک ہمشیرہ تھیں جن کی شادی میرے پھوپھی زاد بھائی سے ہوئی تھی اور گاؤں کی عمومی روایت کے مطابق میری شادی بھی میری مرضی کو اہمیت دیے بغیر میری پھوپھی زاد بہن سے ہو گئی تھی گویا یہ وٹے سٹے کی شادی تھی۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ سال کے درمیان تھی اور میری بیوی چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ شادی کے وقت میں میٹرک پاس تھا شادی کے کچھ عرصہ بعد میں مزید

تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لاہور چلا آیا، ماسٹرز کیا۔ ایم اے کی ڈگری لی اور اس دوران شہر میں مجھے ایسا جی لگ گیا کہ میں نے مستقلاً شہر لاہور ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا زمینداری سے مجھے کوئی رغبت نہ تھی۔ نت نئے ماڈلز کی کاروں کا مجھے کریز تھا چنانچہ اسی شوق کو میں نے اپنا کاروبار بھی بنا لیا اور وسط شہر میں کاروں کا ایک بڑا شوروم کھول لیا۔ میری والدہ نے ملتان چھوڑ کر لاہور میں آ بسنا پسند کیا۔ میری بیوی جس سے میں ساری عمر ذہنی رفاقت نہ پا سکا مہینہ بھر شہر میں میرے ساتھ رہتی تو دو مہینے ملتان میں رہنا پسند کرتی جہاں اس کا میکہ بھی تھا۔ اسی باعث میں نے اپنے بیٹے کو بورڈنگ ہاؤس میں رکھنا پسند کیا۔

بی اے کرنے کے کئی سال بعد مجھے ماسٹرز ڈگری لینے کا شوق سوجھا تو میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ وہیں میری ملاقات آپ کی آنٹی سے ہوئی۔ ان سے ملنا میرے لیے زندگی کا ایک نیا باب کھل جانے کے مترادف تھا زندگی کے ساتھ ساتھ تحصیل علم کا سلسلہ بھی جاری رہا اور آپ کی آنٹی سے میری جذباتی وابستگی میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ایم اے فائنل کے آخری دنوں میں ہم دونوں اپنے دلوں کے اس فیصلے پر باہم متفق ہو گئے کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ میں پہلے ہی نہ صرف شادی شدہ تھا بلکہ ایک بیٹے کا باپ بھی تھا۔ آپ حیران ہو رہی ہیں؟ جی ہاں یہ حقیقت ہے کہ جن دنوں میں ایم اے فائنل ایئر میں تھا اس زمانے میں میرا بیٹا پندرہ سولہ برس کے لگ بھگ تھا اور میں تقریباً چھتیس سال کا تھا۔ آپ کی آنٹی میری ازدواجی حیثیت سے بخوبی واقف تھیں۔ وہ اس تضاد سے بھی آگاہ تھیں جو میرے اور میری بیوی کے مابین تھا۔ وہ میری بیوی سے مل بھی چکی تھیں اور ہماری ازدواجی زندگی میں موجود دراڑوں کو بھی انھوں نے محسوس کیا تھا۔ اس محبت کے سبب جو آپ کی آنٹی مجھ سے رکھتی تھیں، وہ میری پہلی بیوی کی موجودگی میں بھی مجھ سے شادی کرنے پر

آمادہ تھیں۔ مگر انھیں یقین تھا کہ ان کی والدہ ایک شادی شدہ شخص سے ان کی شادی کرنے پر ہرگز آمادہ نہ ہوں گی۔ انھیں برادری والوں کے انگلیاں اٹھانے اور باتیں بنانے کا خوف بھی تھا کیونکہ برادری والوں سے تعلقات جیسا کہ آپ کی آنٹی مجھے بتایا کرتی تھیں کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھے۔ غالباً آپ کی نانی صاحبہ رعنا کے لیے برادری والوں کے کئی پیام رد کرچکی تھیں اور اسی بات کو برادری کے وہ چند گھرانے جنھیں مایوس کیا گیا تھا اپنی انا کا مسئلہ بنائے بیٹھے تھے اور آپ کی نانی اور ان کی تعلیم یافتہ بیٹی یعنی رعنا کو نیچا دکھانے کے کسی موقع کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے اور...

پھر سے شادی کے سلسلے میں آپ کی آنٹی کو سب سے زیادہ خطرہ اپنی بڑی ہمشیرہ یعنی آپ کی والدہ کی جانب سے مخالفت کا تھا۔ رعنا کو یقین تھا کہ ان کی والدہ کی طرح ان کی ہمشیرہ بھی ایک شادی شدہ شخص سے ان کی شادی پر ہرگز آمادہ نہ ہوں گی۔ لیکن یہ بھی طے تھا کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

ایم اے فائنل کے امتحانات سے فراغت کے بعد شہر سے گاؤں جاتے ہوئے رعنا نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ شادی کرے گی تو صرف مجھ سے ورنہ کسی سے بھی نہیں۔ رعنا نے ایم اے کے نتیجے کے بعد دوبارہ شہر آنے اور مجھ سے مل کر میری اپنے اہل خانہ سے ملاقات کا پروگرام مرتب کرنے کا وعدہ بھی کیا اور اس وقت تک مجھے راز داری سے کام لینے اور عجلت کا مظاہرہ نہ کرنے کا پابند کرگئی۔ مجھے فون پر رابطہ قائم کرنے یا خط وغیرہ لکھنے سے بھی منع کیا۔

گھر پہنچنے پر رعنا کو گھر کے حالات بہت بدلے ہوئے ملے۔ اپنی ہمشیرہ کو اس نے بہت تنگ دل پایا۔ رعنا ان حالات میں ایسی گھبرائی کہ ایم اے کے نتیجے کے بعد بھی حسب وعدہ شہر نہ آسکی۔ نہ ہی فون کیا نہ کوئی خط لکھا۔ غالباً وہ اس معاملے میں پوری احتیاط اور راز داری سے کام لینا چاہتی تھی۔ نتیجہ آنے کے بعد میں کافی دن رعنا کے شہر آنے کا منتظر رہا لیکن

جب انتظار مشکل ہوگیا تو میں خود رعنا سے ملنے گاؤں جا پہنچا اور تب مجھے معلوم ہوا کہ رعنا خاصی پریشان تھی۔ آپ کے والد کی بے وفائی کا آپ کی والدہ پر بہت بڑا نفسیاتی اثر پڑا تھا۔ وہ مرد ذات سے متنفر ہوچکی تھیں اور رعنا کو بھی مردوں سے متنفر ہی دیکھنا اور شادی سے باز رکھنا چاہتی تھیں۔ واضح رہے کہ یہ بات مجھے رعنا نے خود بتائی تھی۔ رعنا کا خیال تھا کہ ان بدلے ہوئے حالات میں اس کی ہمشیرہ یعنی آپ کی والدہ اسے ایک شادی شدہ مرد سے تو کسی قیمت پر بھی شادی نہ کرنے دیں گی۔ چنانچہ باہمی مشورے سے رعنا نے اور میں نے طے کیا کہ میں رعنا سے شادی کی درخواست لے کر اس کی والدہ سے ملوں اور ان پر یہ ظاہر کروں کہ میری منگنی، میری پھوپھی زاد بہن سے ہوچکی ہے مگر میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنی پسند کی لڑکی یعنی رعنا سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اپنے اہل خانہ خصوصاً والدہ کی ناراضگی یا خاندان والوں کی طرف سے کسی رکاوٹ کے خدشے کے تحت نکاح خاموشی سے کرنا چاہتا ہوں، رخصتی بعد میں دھوم دھام سے کریں گے تاکہ نکاح ہو چکنے کے پیش نظر میرے خاندان والے مجھے میری پسند کے بغیر شادی کرنے پر مجبور نہ کرسکیں۔ رعنا کا اور میرا خیال تھا کہ نکاح ہوجانے کے بعد ہم اصل حالات اپنے گھر والوں پر عیاں کردیں گے اور انھیں کسی نہ کسی طرح منانے کی کوشش کریں گے۔

چنانچہ باقاعدہ طے شدہ پروگرام کے تحت میں ایک بار پھر حویلی آیا۔ رعنا کی والدہ صاحبہ سے ملا۔ انھیں اپنی باتوں سے متاثر کرنے کی کوشش کی اور رعنا سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ آپ کی والدہ کی ناگواری اور خفگی ہوں کی کڑی منزل سے بھی گزرا۔ آپ کی نانی کو اس رشتے کی قبولیت میں تردد ہوا۔ رعنا نے مجھ سے آپ کی والدہ یعنی اپنی آپا کے اس رشتے کے مخالف ہونے کا ذکر بھی کیا مگر بالآخر آپ کی نانی نے مجھے اپنی فرزندی میں لینے پر آمادگی ظاہر کردی۔ نکاح حسب پروگرام خاموشی سے ہونا قرار پایا۔ نکاح ہونے تک اس بات

کو اپنے گھر والوں پر ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد کی مجھے کوئی پروا نہ تھی۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ میرا مطلب ہے آپ کی آنٹی اور میں لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

کسی بدخواہ نے اس کی خبر میری والدہ، بیوی اور سسرال والوں کو پہنچا دی جہاں میری بڑی بہن بھی بیاہی ہوئی تھیں۔ میرے سسرال تک یہ خبر پہنچی تو میرے چاروں برادرانِ نسبتی آگ بگولا ہو گئے۔ میرے بہنوئی نے میری بہن کو طلاق دینے کی دھمکی دی اور عین اس روز جب مجھے رعنا کو اپنے نکاح میں لینے کے لیے آپ کے گاؤں آنا تھا، میری والدہ، بیوی جو اُن دنوں ملتان میں ہی تھیں اور برادرانِ نسبتی لاہور آ گئے۔ میری والدہ نے اپنی بیٹی کا گھر بچانے کی خاطر اپنا دوپٹہ میرے قدموں میں ڈال دیا۔ یہ میری آزمائش کی انتہا تھی۔ بے شک میں رعنا کا طلب گار تھا مگر ماں میرے لیے کعبہ تھی۔ ماں نے مجھ سے دوسری شادی نہ کرنے کا وچن لیا جو مجھے دل پر پتھر رکھ کر دینا پڑا۔ میں جانتا تھا رعنا کو بہت دکھ ہو گا مگر...... میں بھی مجبور تھا۔ ہو سکتا ہے، عالیہ بی بی آپ کو میری یہ بات گراں گزرے مگر زندگی میں کبھی کبھی ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب ہم سارے راستے کال کوٹھری کی طرح مسدود پاتے ہیں۔ آپ مجھے بزدل بھی کہہ سکتی ہیں اور عہد شکن بھی...... اپنی بزدلی اور عہد شکنی کی سزا میں نے اپنے لیے یہ تجویز کی کہ کبھی رعنا کو اپنی صورت نہ دکھاؤں گا۔ وہ لاکھ حقیقت آشنا سہی اور میری مجبوری بھی بجا مگر اپنی مجبوری کی خاطر ایک لڑکی کو عین وقت پر یوں تنہا چھوڑ جانا مرد ہونے کے ناتے مجھے زیب نہ دیتا تھا۔ مجھے اپنی کم ہمتی اور عہد شکنی پر ملال تھا مگر میں نے کیا نا...... ویسے میں اپنی جگہ بہت حیران تھا کہ جو ہر قدم میں انتہائی رازداری اور احتیاط برتتے ہوئے اٹھ رہا تھا اس کی بھنک میری والدہ اور سسرال تک کیوں کر پہنچ گئی تھی مگر اس بھید کو کھلنے میں کئی برس لگے مگر بالآخر یہ بھید کھل ہی گیا کہ یہ خبر میرے گھر اور سسرال پہنچانے والی ذات شریف آپ کی والدہ تھیں۔ جی ہاں عالیہ بی بی آپ کی والدہ ماجدہ۔

کیا آپ جاننا چاہتی ہیں کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا اور کس طرح کیا؟ یہ بات تو آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں کہ آپ کے والد کی بے وفائی نے آپ کی والدہ کو اس قدر تنگ دل کر دیا تھا کہ وہ مردوں کے نام ہی سے نفرت کرنے لگی تھیں۔ اپنی اسی نفسیاتی کیفیت سے انھوں نے رعنا کو بھی متاثر کرنے کی حتی الوسع کوشش کی۔ وہ رعنا کی نہ صرف مجھ سے بلکہ کسی سے بھی شادی کرنے کے حق میں نہ تھیں جب کہ آپ کی نانی جان جلد از جلد رعنا کی ذمے داری سے سبکدوش ہو جانے کی خواہاں تھیں۔ یہ رعنا کی جانب سے شادی سے مسلسل انکار نے انھیں کافی پریشان کر رکھا تھا۔

جب رعنا نے مجھ سے شادی پر آمادگی ظاہر کی تو انھوں نے ایسے پیچیدہ حالات میں بھی جو کہ میں نے ان کے سامنے پیش کیے تھے، مجھ سے رعنا کا نکاح کر دینا منظور کر لیا۔ اپنی دور اندیشی اور طویل تجربۂ زندگی کے پیش نظر ان کے لیے اس جذباتی وابستگی کو تاڑ لینا مشکل نہ تھا جو مجھے رعنا سے اور رعنا کو مجھ سے تھی۔ میرے ”نیز و اقربا“ سے لازوال کے پیش نظر آپ کی نانی صاحبہ نے میرے بارے میں شہر سے کوئی چھان بین نہیں کروائی بلکہ میری بابت رعنا کی رضا اور اس کی پسندیدگی ہی پر بھروسا کر لینے پر اکتفا کیا۔ غالباً ان کے اطمینان کے لیے یہی بہت بڑی بات تھی کہ میں واحد شخص تھا جس سے شادی کرنے پر رعنا نے آمادگی ظاہر کی تھی۔

گو آپ کی والدہ میرے اور رعنا کے سنجوگ کے حق میں نہ تھیں مگر اپنی والدہ کے سامنے ایک نہ چلتی دیکھ کر آپ کی والدہ کو بحالت مجبوری راضی ہونا ہی پڑا۔ اپنی اس شکست پر انھوں نے ان حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جن کو میں نکاح کی تقریب میں اپنے کسی عزیز کو شامل نہ کر سکنے کا پیشگی جواز بنا چکا تھا۔ میں نے ملتان میں اپنی والدہ اور دیگر عزیزوں کا پتا ایک سے بھی گریز کیا تھا تاہم رعنا کی جانب سے اس یقین دہانی پر کہ میرے بارے میں شہر سے کوئی

جہان زیب منگوانے کے سلسلے میں وہ جلد حالات
سنبھالے رہے گی۔ میں نے لاہور میں، بچے
شو روم اور گھر کے فون نمبر آپ کی نانی جان کو
دے دیے تھے اگرچہ بقول رعنا کے جہان زیب
کروانے کا نہ تو کوئی امکان تھا اور نہ ہی کوئی
ایسا قریبی فرد تھا جس کے سپرد یہ ننھے جان کی ذمہ داری کی
جا سکتی پھر بھی میں نے نکاح کی تاریخ مقرر ہوتے
ہی اپنی بیوی کو ملتان بھجوا دیا۔ یہ کوئی غیر معمولی امر
نہ تھا۔ وہ دوسرے تیسرے ماہ فرمائش کر کے
ملتان جاتی رہتی تھی۔ اس بار بھی اس کے فرمائش
کیے بغیر ہی اسے ملتان لے گیا تھا اور کچھ دنوں
کو اپنی والدہ کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ جہانزیب بورڈنگ
میں تھا گھر میں، میں رہ گیا یا میرا ملازم جس کے توسط سے آپ
کی والدہ نے اپنے بھروسے کے ایک آدمی کے
ذریعے ملتان میں میری والدہ اور بہن کا پتا معلوم
کر کے انھیں میرے حد درجہ رازداری سے متوقع
نکاح کی خبر دینا چاہی لیکن میرے ملازم کے
توسط سے ایک نئی صورت حال ان کے
سامنے آئی یعنی میرا شادی شدہ ہونا۔ گویا آگ
لینے گئے اور پیغمبری مل گئی کے مصداق تھا۔
میری بدقسمتی کہ میں نے بیوی کو تو ملتان چھوڑ آیا تھا
مگر میں نے اپنے گھر کے ملازم کو کسی قسم کے
حفاظتی احکامات جاری نہ کیے تھے۔ میں نے
دانستہ ایسا کیا تھا کیوں کہ میں گھر کے ملازم کو بھی
اس بات سے اس وقت تک لاعلم رکھنا چاہتا
تھا جب تک کہ مجھے رازداری برتنے کی ضرورت
نہ رہ جاتی۔

میرے خلاف حاصل شدہ اس نکتے کو
آپ کی والدہ نے بھرپور چالاکی سے استعمال
کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ اگر انھیں اپنی بہن
رعنا اور والدہ سے ہمدردی ہوتی تو یہ بات
خاموشی سے اپنی والدہ کے علم میں لا کر وہ اس
سلسلے کو وہیں ختم کروا سکتی تھیں۔ رعنا اور
میں زندگی کے اس نئے رُخ سے سمجھوتے
کی کوئی نہ کوئی صورت نکالنے کی کوشش کر لیتے
مگر آپ کی والدہ صاحبہ نے ایسا کرنے کے بجائے
اپنی والدہ اور بہن کو تماشا بنا دینا بہتر جانا شاید
اس لیے کہ رعنا کی شادی کا فیصلہ ان کی مرضی
کے خلاف کیا گیا تھا۔ آپ کی والدہ نے اپنی انا
کی تسکین کے لیے کیا کیا گُل کھلائے، سنیے۔

ایک جانب تو انھوں نے کمال ہوشیاری
سے میری والدہ، بیوی اور سسرال والوں کو
خبر بھجوا دی کہ میں فلاں دن، فلاں وقت، فلاں
جگہ فلاں لڑکی سے دوسری شادی کرنے جا رہا ہوں
دوسری جانب انھوں نے اپنی والدہ اور بہن کو
آخری وقت تک اس مکروہ کھیل سے بے خبر رکھا
جبکہ وہ اپنی انا کی تسکین کے لیے کھیل رہی تھیں پھر
میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میں پہلے ہی لکھ چکا
ہوں یعنی [illegible]۔ مجھے آپ کی
امی کو اپنا بنانے کے لیے حویلی آنا تھا، میری والدہ،
بیوی اور تین عدد برادرانِ نسبتی جن میں میرا سگا
بہنوئی بھی شامل تھا لاہور آ دھمکے۔ میں نے
حتی الامکان سرکشی دکھائی، ماں کو علیحدگی میں
بہلانے پھسلانے کی کوشش کی کہ زندگی کی ہر
خوشیوں پر کچھ حق میرا بھی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف
ہے کہ میں اس عورت کے ساتھ زبردستی بیاہ
کیے جاؤں جو مجھے دوسرے [illegible]
محسوس ہوتی ہے۔ بیوی کو بھی میں نے تخلیے
میں اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ اسے یقین دلایا
کہ میں اس کے ساتھ کبھی کوئی ناانصافی نہیں
کروں گا۔ مگر وہ سب ایک طرف ہو گئے اور میں
تنہا رہ گیا۔ میری آواز نقار خانے میں طوطی کی
آواز بن کر رہ گئی۔ میری والدہ نے داماد کی
اس دھمکی کے پیش نظر کہ اگر میں نے دوسری
شادی کی تو وہ میری بہن کو بھی طلاق دے دے گا،
اپنا دوپٹہ میرے قدموں میں ڈال دیا اور میں
بے بس ہو کر رہ گیا۔ ان حالات نے مجھے رعنا
کا سامنا کرنے اور اسے اپنی صورت دکھانے
کے لائق نہ چھوڑا۔ کس منہ سے جاتا میں اس کے
سامنے لیکن پھر ایک روز میں نے فون کیا۔ فون
آپ کی والدہ نے ریسیو کیا۔ مجھے جس قدر برا بھلا
کہہ سکتی تھیں کہا اور جب میں نے رعنا سے بات
کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے جواب
دیا۔ رعنا کو تم سے نفرت ہو چکی ہے میں نے

کہ میں اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ حالات نے مجھے بے حد مجبور کر دیا تھا۔ میرے گڑگڑانے اور منت سماجت کرنے پر آپ کی والدہ نے رعنا کو فون پر بلا تو دیا لیکن رعنا کی آواز میں میں نے جو کچھ سُنا وہ مجھے جیتے جی مار دینے کو کافی تھا۔ مجھے یاد ہے اس نے کہا تھا آپ آئندہ فون کرنے کی زحمت نہ فرمائیں۔ حالانکہ میں دوسری شادی نہ کرنے کا وچن دے ہی چکا تھا۔ اپنی مجبوری، بزدلی، بد عہدی کے نتیجے میں راندۂ درگاہ بھی قرار پایا۔

کئی برس بعد کا ذکر ہے... میں اپنی بیوی کی بلڈ شوگر ٹیسٹ رپورٹ لے کر شہر کی ایک لیبارٹری سے نکل رہا تھا کہ رعنا سے ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ اپنے بلڈ ٹیسٹ کے سلسلے میں وہاں آئی تھی۔ رعنا کا بدلا ہوا روپ دیکھ کر مجھے صدمہ پہنچا۔ میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ وہ اتنی بدل چکی ہوگی۔ رعنا نے مجھ سے نظر بچا کر گزر جانے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی راہ روک لی۔ وہیں لیبارٹری کے ایک گوشے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر میں نے اپنی مجبوریوں کا احوال سنانے سے پہلے رعنا کا حال احوال پوچھا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا: "زندہ ہوں اور خوش ہوں۔" میں نے مذاقاً کہا "میرا خیال تو یہ تھا کہ تم کسی اچھے سے آدمی سے شادی کر کے کئی بچوں کی ماں بھی بن چکی ہوگی۔" رعنا نے شاکی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہا: "کیا یہ طے نہیں ہوا تھا ہمارے مابین کہ میری شادی اگر ہوئی تو صرف تم سے ورنہ کسی سے بھی نہیں۔"

رعنا کی زبانی مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ میری بد عہدی کے صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کی والدہ اسی رات جہان سے گزر گئی تھیں۔ میں نے سر جھکا کر کہا: "تب تو تم مجھ سے نفرت کرنے میں حق بجانب ہو۔" میری اس بات کی رعنا نے وضاحت چاہی تو میں نے کہا: "جب میں نے تم سے فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو تمہاری بہن نے مجھ سے کہا تھا رعنا کو تم سے نفرت ہو چکی ہے کیونکہ تم ہماری والدہ کے قاتل ہو۔" رعنا نے مجھے دیکھا اور بولی "جنہیں محبوب کے روگ لگے ہوں وہ ایسے نہیں ہوتے جو اپنی محبتوں کو نفرتوں میں بدل دیتے ہیں۔" میں نے وضاحت چاہی تو رعنا کا جواب یہ تھا کہ وہ مجھ سے نفرت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے رعنا کی اس بات پر حیران ہوتے ہوئے فون پر سرد مہری دکھانے اور ملاقات پر آمادہ نہ ہونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا "میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں اپنے سسرال والوں سے کوئی زک پہنچے۔" میں جو رعنا سے اس اتفاقی ملاقات سے قبل اس گمان میں رہا تھا کہ رعنا میری مجبوریوں سے ناآشنائی کے سبب مجھ سے متنفر ہو چکی تھی اس کی اس بات پر چونکا اور میں نے اس سے پوچھا کہ اسے یہ خدشہ کیوں کر ہوا تھا کہ میرے سسرال والوں کو خبر ہو چکی تھی اور وہ مجھے زک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ جواب میں رعنا نے اس رات میرے چھوٹے برادرِ نسبتی کی جانب سے لکھے گئے خط کے حویلی پہنچائے جانے کا تذکرہ کیا۔ مجھے حیرانی بھی ہوئی اور اپنے سسرال والوں بالخصوص مذکورہ برادرِ نسبتی پر بالا ہی بالا یہ چال چلنے پر غصہ بھی آیا اور دل ہی دل میں اسے بُرا بھلا کہنے لگا۔ اس کے سوا میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ رفتارِ زمانہ مجھے اور رعنا کو پامال کر ہی چکی تھی۔ اب کسی سے شکوہ و شکایت یا پوچھ گچھ گڑے مردے اکھاڑنے کے مترادف ہوتی۔

رعنا سے یہ ملاقات گویا تجدیدِ مراسم تھی۔ پھر ہم بارہا ملے۔ فون پر بھی گاہے گاہے ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کر لیتے۔ پریم راگنیاں سننے اور سنانے کا دور تو ہم سے دغا کرتا بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ رعنا مجھے فون کرنے کے لیے گھر کا فون استعمال کرنے کے بجائے یا تو کالج کا فون استعمال کرتی یا نزدیک ہی واقع پبلک کال بوتھ سے فون کرتی۔ آپ کی گلی کو ہماری ان ملاقاتوں اور فون پر ہونے والی باتوں کی کانوں کان خبر نہ ہو سکی شاید اس لیے کہ اس وقت تک آپ کی والدہ کو رعنا کی جانب سے مکمل اطمینان ہو چکا تھا کہ اب وہ کسی مرد کو قابلِ اعتبار یا لائقِ بھروسا نہ گردانے گی۔

باہر آنے جانے کے سلسلے میں رعنا کو پوری خود مختاری اور آزادی حاصل تھی۔ رعنا نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور ان دنوں سیاہ رنگ کی ایک ٹو سیٹر رعنا کے زیر استعمال تھی۔

عالیہ بی بی! ان دنوں رعنا سے جب بھی میری ملاقات ہوئی میں نے اسے آپ کے بارے میں انتہائی متفکر پایا۔ وہ آپ سے بے حد پیار کرتی تھی وہ آپ کو دکھ سے عبارت تاریک انسانوں کی سی زندگی بسر کرتے دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ آپ کی ان ذہنی الجھنوں سے بہت خوفزدہ تھی جو آپ کے ذہن میں آپ کی والدہ کے اثر سے پیدا ہو چکی تھیں — اسے ڈر تھا کہ مرد ذات کے خلاف وہ نفرت جو آپ کی والدہ نے آپ کے ذہن میں داخل کر دی تھی آپ کی زندگی کو مایوسی اور ناکامی سے دوچار نہ کر دے۔ اسے خدشہ تھا کہ حالات بدستور رہے تو آپ کے ذہن کی گتھیاں کبھی نہ سلجھ سکیں گی۔ وہ آپ کو اس گرداب سے نکلتے دیکھنے کی متمنی تھی لیکن اس ضمن میں اسے اپنی بے بسی کا بھی شدت سے احساس تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بقول اس کے مرد ذات کے خلاف نفرت کی اس خاردار باڑھ کا قلع قمع کیوں کر کیا جائے جو آپ کی والدہ آپ کے قلب و ذہن کے گرد کھڑی کر چکی تھیں۔ رعنا کو اپنی زندگی کے مختصر ہونے کا احساس بھی تھا۔ وہ شہر کے کئی بڑے ڈاکٹروں سے رجوع کر چکی تھی اور ان میں سے کوئی اسے امید نہ دلا سکا تھا۔ سب اس کی زندگی سے مایوس تھے مگر اس صبر و استقامت کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی جس سے رعنا نے اس مہلک مرض کے آخری مرحلے تک اس کا مقابلہ کیا اور اپنی بیماری کو اپنے گھر والوں سے چھپائے رکھا۔

جن دنوں رعنا انتہائی استقامت کے ساتھ اس مہلک بیماری کا جسے بلڈ کینسر کہتے ہیں مقابلہ کر رہی تھی عجیب اتفاق تھا کہ انہی دنوں میری بیوی ذیابیطس کے خطرناک حد تک بڑھ جانے کے باعث بستر پر تھی۔ ذیابیطس کی اسی

بزم اطفال

"میرے امی ابو ہسپتال سے ایک چھوٹی بہن لائے ہیں۔" ایک بچے نے اپنی ٹیچر کو بتایا۔
"کیا وہ آپ کو اچھی لگتی ہے؟" ٹیچر نے پوچھا۔
"ہاں اچھی تو لگتی ہے۔" بچہ بولا۔ "لیکن اگر وہ لڑکا ہوتا تو زیادہ مزہ آتا میں اس کے ساتھ خوب کھیلتا۔"

"تو آپ اپنے ابو سے کہیے کہ وہ آپ کی بہن کو بدل کر آپ کے لیے بھائی لے آئیں۔" ٹیچر بولی۔
"اب اسے بدلا نہیں جا سکتا۔" بچے نے افسردگی سے جواب دیا۔ "اب تو ہم اسے پورے دن استعمال کر چکے ہیں۔"

ایک بچے نے اپنی ماں سے کہا۔ "امی! دیکھیے ہمارے گھر کے دروازے کے باہر ایک بہت بڑا کتا کھڑا ہے بالکل ہاتھی کے برابر۔"
ماں بولی۔ "بات کو بڑھا چڑھا کر بیان نہ کیا کرو۔ تمہاری اس بری عادت پر میں تمہیں پچاس کروڑ مرتبہ ٹوک چکی ہوں۔"

ایک روسی باشندہ سرمایہ دار حکومت کو گالیاں دے رہا تھا کہ کیا واہیات حکومت ہے۔
ایک پولیس افسر نے اسے پکڑ لیا۔ روسی باشندے کا رنگ ہرن ہو گیا۔
اس نے کہا: مگر میں تو امریکی حکومت کے بارے میں کہہ رہا تھا۔
پولیس افسر نے سر ہلاتے ہوئے کہا: ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو کیا، ہمیں نہیں معلوم کہ کون سی حکومت واہیات ہے۔

سعدیہ — حسین — شمسی — شہزاد اطہر

بیماری کے دوران اس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہو سکی۔ رعنا کو معلوم ہوا تو وہ مجھ سے ملنے یہاں آئی اور تب ہی پہلی بار اس نے میرے بیٹے کو جو ایم بی اے کرنے کے بعد میرے کاروبار میں میرا ہاتھ بٹا رہا تھا، دیکھا۔ میں نے اپنے بیٹے کو رعنا کے بارے میں بس اتنا ہی بتانے پر اکتفا کیا کہ وہ میری یونیورسٹی کے زمانے کی ایک دیرینہ دوست تھی۔ رعنا کو میرا بیٹا بہت پسند آیا۔ اگلی ملاقات پر رعنا نے مجھ سے کہا کہ اسے میرا بیٹا اتنا پسند آیا تھا کہ اگر اس کی کوئی بیٹی ہوتی تو وہ اس کی شادی میرے بیٹے سے کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتی۔ میں نے ہنس کر اس کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی کہ جب وہ یہ طے کر ہی چکی تھی کہ خود اس کی اپنی شادی اگر ہوئی تو مجھ سے ہی ورنہ کسی سے بھی نہیں تو ایسی صورت میں اس کی بیٹی اور میرے بیٹے کی شادی کیوں کر ممکن تھی۔ وہ میری بات سن کر مسکرا دی تھی مگر کچھ دکھ سے۔ میں نے کہا "دیکھو اگر میرا بیٹا تمہیں اتنا ہی اچھا لگا ہے تو سمجھو کہ اس وقت میں تمہاری بھانجی کے لیے جس کے بارے میں تم کسی درد مند ماں کی طرح متفکر رہتی ہو اپنے بیٹے کا رشتہ دے رہا ہوں، آخر بھانجی بھی تو بیٹی ہی ہوتی ہے" میری اس بات پر ایک لمحے کو تو رعنا کا چہرہ کھل اٹھا لیکن پھر وہ اداس ہو کر بولی "کاش! ایسا ہو سکتا محمود... حالات نے اسے اس قدر الجھا کر رکھ دیا ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں اپنی ماں کی طرح وہ بھی اس حویلی میں گھٹ گھٹ کر نہ مر جائے ...بہت کوشش کرتی ہوں اسے سمجھانے کی مگر وہ بُری طرح الجھی ہوئی ہے..... میں ڈرتی ہوں کہ اس مختصر سی مہلت میں جو کہ زندگی نے مجھے دے رکھی ہے اسے اس گرداب سے نکال بھی سکوں گی یا نہیں۔"

پھر اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل رعنا نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جس پر بالآخر مجھے بھی اس سے متفق ہونا پڑا تھا اپنی حویلی کے نصف حقوق ملکیت آپ کے نام منتقل کر دیے بقیہ نصف حصہ وہ میرے بیٹے کے نام وصیت کر دینا چاہتی تھی۔ آپ کی آنٹی کو یقین تھا کہ آپ حویلی سے جو جذباتی اور عملی وابستگی رکھتی ہیں، وہ آپ کو کبھی بھی حویلی نہ چھوڑنے دے گی۔ حویلی کو آپ کی اور میرے بیٹے کی مشترکہ ملکیت بنا کر وہ آپ دونوں کے مابین ایک سلسلہ، ایک رابطہ پیدا کر دینا چاہتی تھی۔ آپ کے گمبھیر نفسیاتی الجھاؤ کے باوجود وہ امید کا دامن نہ چھوڑنا چاہتی تھی اور آپ کے لیے زندگی کی الجھی ڈور کا ایک سرا کسی نہ کسی طور تلاش کر کے آپ کو تھما دینا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں اسے میرے بیٹے کو بھی اعتماد میں لینا پڑا تھا۔ اس نے اسے آپ کی والدہ کی ازدواجی زندگی کے المیے، مرد ذات سے آپ کی والدہ کے بدظن ہو جانے اور ان کے خیالات آپ کے ذہن میں نفوذ ہو جانے کی داستان تو سنائی مگر اس داستان سے خود اپنی ذاتی زندگی کے المیے کو حذف کر گئی۔ اس نے تیمور کو یہ بتانے سے گریز کیا کہ اس کی بھانجی کے ذہن پر خود اس کی ذاتی زندگی کے المیے نے بھی گہرے اثرات مرتب کیے تھے تاہم مجھے رعنا پہلے ہی بتا چکی تھی کہ آپ کو مردوں سے متنفر کرنے میں میری وعدہ شکنی نے بھی خاصا اہم کردار ادا کیا تھا۔

مگر رعنا نے اپنی وصیت ہر قانونی سقم سے بچا کر تیار کروانے کی کوشش کی تھی مگر اسے خدشہ تھا کہ آپ کی والدہ ایک غیر شخص اور وہ بھی ایک اجنبی مرد کو حویلی کی ملکیت میں آپ کا شریک تسلیم نہ کرنے کے لیے ہر حربہ آزمانے کی کوشش کریں گی۔ خوش قسمتی سے قدرت نے رعنا کی یہ مشکل خود ہی آسان کر دی۔ آپ کو سیلز اینڈ مارکیٹنگ کی اہلیت رکھنے والے ایک آدمی کی ضرورت تھی۔ رعنا نے بڑے تدبر سے کام لیتے ہوئے میرے بیٹے کو آپ کے پاس ملازم رکھوا کر حویلی میں اس کے لیے جگہ نکال کر اپنی زندگی ہی میں یہ حق بھی دلوا دیا تھا۔ اور تیمور میرا ہی بیٹا ہے۔ اگرچہ میرے لیے یہ ایک بہت

بھی بڑی آزمائش بلکہ بڑا سنگین کام تھا کہ میں اپنے
ناز و نعم کے پلے اکلوتے بیٹے کو جو میرے لیے اس
دنیا کی سب سے پیاری ہستی بلکہ یہ کہیے کہ حاصلِ
حیات ہے، غیر یقینی اور ایسے حالات میں جھونک
دوں جو خاصے پریشان کن بھی ثابت ہو سکتے تھے
مگر رعنا کی خاطر میں نے اس آزمائش میں کود پڑنے
کا حوصلہ کر لیا۔ اگرچہ میرا دل آمادہ نہ
تھا مگر میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ
اس دکھی عورت کا جس کا نام رعنا ہے، مجھ پر
ایک بہت بڑا قرض ہے۔ اس ستم کا قرض
جب وہ حویلی میں بیٹھی ہاتھوں پر مہندی لگائے
میرا انتظار کرتی رہی اور میں اس کے پاس پہنچ
نہ سکا تھا۔ اس قرض کو اتارنے کی اگر یہ صورت
ممکن تھی تو یہی سہی...... میرے بیٹے کے لیے
یہ امر بشرطیکہ وہ اسے سنجیدگی سے لیتا ہرگز
کوئی خوشگوار امر نہ ہوتا کہ اپنے باپ، اپنے
گھر، اچھے بھلے کاروبار اور آرام کی زندگی کو اپنے
باپ کی ایک دیرینہ شناسا کی ہمدردی اور
ایک ان دیکھی اجنبی لڑکی کی نفسیاتی گتھیوں کو
سلجھانے کی خاطر غیر معینہ مدت کے لیے غیر یقینی
حالات میں کود پڑے مگر اس نے اسے ایک......
ایڈونچر کے طور پر لیا۔ وہ حویلی میں ایک ملازم کی
حیثیت سے داخل ہوا، اپنی محتاط روی اور ذہانت
کے سبب اس نے آپ کو یہ شبہ بھی نہ ہونے دیا
کہ رعنا اس کے لیے اجنبی نہ تھی یا حویلی کے حالات
اس کے لیے انجانے نہ تھے۔ بعد کے حالات
سے آپ مجھ سے زیادہ بہتر طور پر واقف ہیں۔

میرا بیٹا جس نے حویلی میں اپنی ملازمت
کو ابتدا میں ایک دلچسپ اور حیرت انگیز تجربہ
زندگی سمجھا تھا اور رعنا کی وصیت کو بھی اسی
زمرے میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔ دن گزرنے
کے ساتھ ساتھ سنجیدہ ہوتا چلا گیا۔ ایڈونچر
اس کے لیے چیلنج بن گیا۔ حویلی کے حقوقِ
ملکیت میں اپنی شراکت کی قانونی حیثیت کی
بھی اس نے بالآخر توثیق کرا ہی لی لیکن اپنا حق
تسلیم کروا لینے کے بعد وہ اتنی ہی خاموشی
سے اس حویلی سے نکل آیا جتنی خاموشی اور
اجنبیت کے ساتھ وہ اس حویلی میں داخل ہوا

آنے کے بعد اس نے جو کچھ مجھے بتایا اس سے
تو میں یہی اندازہ کر سکا کہ وہ اس خیال پر مُصر ہے
کہ آپ نے خود کو محصور کر رکھا ہے، شدید ضرب
لگانے کے باوجود اسے توڑنے میں ناکام رہا۔
اسے رعنا کی وہ توقعات پوری نہ ہو سکنے کا بھی
افسوس ہے جو رعنا نے اس سے منسوب کی تھیں
ویسے میں جانتا ہوں کہ رعنا کی توقعات پر پورا
نہ اتر سکنے کا ملال تو محض ایک بہانہ ہے، اس
کے افسوس اور ملال کا اصل سبب کچھ اور ہے،
وہ لاکھ مجھ سے چھپائے، لاکھ بہانے کرے،
میں آخر کو اس کا باپ ہوں اور باپ بھی کیسا جو
محبت کے دکھ سے آشنا ہے۔ میرے لیے اپنے
بیٹے کی باتوں اور طور طریقوں سے یہ اندازہ کرنا
مشکل نہیں کہ وہ حویلی میں اپنی شراکت کا حق
جیت کر خود تو وہاں سے چلا آیا ہے مگر اپنا
دل وہیں ہار آیا ہے۔

اب میں ذرا اس داستان کی اس
گرہ کی عقدہ کشائی کر دوں جو رعنا کی موت
سے کچھ عرصہ قبل تک بھی میرے اور رعنا
کے لیے ایک معما بنی رہی تھی۔

حویلی میں آپ کی ملازمت اختیار کر
لینے کے بعد تیمور نے کچھ عرصہ تک بے حد
احتیاط کا مظاہرہ کیا۔ اگرچہ اس کا کام آؤٹ
ڈور نوعیت کا تھا مگر حویلی والوں سے اپنی
اصلیت چھپائے رکھنے کے لیے اسے حتی الامکان
احتیاط اور رازداری سے کام لینا تھا۔ اس
سلسلے میں رعنا نے اسے بے حد احتیاط کا پابند
کر رکھا تھا۔ ادھر بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ جب بھی
شہر آتا تو آپ اپنے ملازم اللہ دسایا کو اس کے
ساتھ کر دیتیں، شاید اس لیے کہ آپ ایک نئے
آدمی پر آنکھ بند کر کے بھروسا نہ کرنا چاہتی تھیں،
پھر جب تیمور آپ کا اعتماد حاصل کرنے میں
کامیاب ہو گیا تو صورت یہ ٹھہری کہ وہ جب
کسی پارٹی سے گفت و شنید کرنے، معاملات
طے کرنے یا وصولی کے لیے حویلی سے باہر جاتا
تو اللہ دسایا کی بخ اس کے ساتھ نہ ہوتی۔ وہ
لاہور آتا یا کہیں اور جاتا میرے پاس حاضری

دینا نہ بھولتا لیکن جب خام مال یا تیار شدہ اشیا لانے لے جانے کا مسئلہ ہوتا تو... اللہ وسایا بھی اس کی مدد کو ساتھ ہوتا۔ ایسے موقعوں پر تیمور مجھ سے ملنے کا موقع نہ پاتا اور مجھ سے ملے بغیر ہی چلا جاتا کیوں کہ آپ کی آنٹی نے اور میں نے تیمور کو سمجھا رکھا تھا کہ حویلی کے کسی فرد کے ساتھ خواہ وہ ملازم ہی کیوں نہ ہو، وہ میرے پاس آنے کی کوشش نہ کرے کیوں کہ اس سے اس کھیل کا بھید کھل جانے کا اندیشہ ہو سکتا تھا جو ہم آپ کو گرداب سے نکالنے کے لیے کھیل رہے تھے لیکن ہوا یوں کہ آپ کی آنٹی کے بستر مرگ پر پڑنے سے کچھ دن قبل تیمور کو آپ کی آنٹی کی زبانی میری ناسازئ طبع کی اطلاع ملی تو اتفاق سے وہ کسی پارٹی کو تھوڑا سا مال پہنچانے اللہ وسائے کے ہمراہ گاڑی میں شہر آ رہا تھا۔ ساری احتیاط اور رازداری بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ گھر چلا آیا۔ اللہ وسائے پر اس نے یہ ظاہر کیا کہ یہ اس کے کسی شناسا کا گھر ہے جس سے وہ ملنا چاہتا ہے۔ اللہ وسائے کو اس نے باہر گاڑی ہی میں بیٹھا رہنے دیا اور خود اندر آ گیا۔ میری طبیعت ناساز ضرور تھی مگر علالت کی نوعیت معمولی سی تھی۔ تیمور ذرا سی دیر میرے پاس ٹھہرا کہ گھر کے پرانے ملازم بشیر کو جسے تیمور سے بہت محبت تھی اور جسے تیمور کی گھر سے مسلسل اور طویل غیر حاضری کا سبب دوسرے شہر میں کاروباری مصروفیت بتایا گیا تھا اس کی حسب منشا خاطر مدارات کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ تیمور کے واپس جاتے وقت میں اسے رخصت کرنے کے لیے باہر نہ نکلا بلکہ باہر نکلنا تو درکنار میں اپنی کوٹھی کی اوپری منزل سے نیچے بھی نہ اترا۔ تیمور کی زبانی اللہ وسائے کے ہمراہ ہونے کی خبر سن کر میں نے محتاط رہنا ہی مناسب سمجھا کیونکہ میں اللہ وسایا کے لیے اجنبی نہ تھا۔ ماضی میں حویلی میں میری آمد و رفت کے سبب وہ مجھ سے واقف تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر بھولے سے بھی اس نے مجھے دیکھ لیا تو فوراً پہچان جائے گا پھر کچھ بعید از امکان نہ تھا کہ وہ تیمور کو اس شناسائی کے سیاق و سباق سے آگاہ کر دیتا جسے میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا بیٹا تصویر کا دوسرا رخ بھی سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اپنی عمر اور تیمور سے اپنے رشتے کا لحاظ رکھتے ہوئے پنہاں رکھنے کی کوشش کی تھی اور جس کو محض ایک دیرینہ دوست کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا۔ جب تیمور نے جانے کا قصد کیا تو گھر کے برسوں پرانے ملازم بشیر احمد نے اسے رخصت کرنے کے لیے نیچے تک اس کے ساتھ جانے کا ارادہ کیا۔ مگر تیمور نے اس سے بچنے کی خاطر اسے اپنے کمرے سے جوتوں کا براؤن جوڑا منگوانے کے بہانے اپنے کمرے میں بھیجا اور خود بہت عجلت میں مجھے سلام کرنے اور خدا حافظ کہنے کے بعد نیچے اتر گیا۔ بشیر جوتوں کا مطلوبہ جوڑا لے کر آیا تو تیمور کو غائب پا کر حیران ہوا اور میرے یہ بتانے پر کہ تیمور جا چکا ہے اور اب اگلی بار یہ جوتے لے کر جائے گا، چاہنے والوں کے سے شفقت بھرے انداز میں مسکرا دیا۔ وہ جوتے رکھ کر نیچے جانے کو تھا کہ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ بشیر کھڑکی کی طرف لپکا اور میں بھی بیٹے کو ایک بار پھر نگاہوں سے چومنے بشیر کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اللہ وسایا پر نظر پڑتے ہی بشیر بے ساختہ چونکا اور بولا: "صاحب جی! یہی تھا وہ بندہ!" میں نے نظروں سے اوجھل ہوتی گاڑی پر سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا: "کون سا بندہ؟" بشیر نے جواب دیا: "وہی جی جو فشان والوں کا بتانے گیا تھا جی مجھ سے.... آپ کو یاد ہے نا جی؟" میں چونک گیا۔ مجھے بھلا کیسے یاد نہ ہوتا۔ بشیر کے انکشاف نے پہلے مجھے ششدر کیا پھر ماضی میں دھکیل دیا۔

جب میری دوسری شادی کی تیاری کی خبر سن کر میری والدہ، بیوی اور برادران نسبتی مجھے رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے عین موقع پر لاہور آ پہنچے تھے اور انھوں نے رنگ میں

جھٹک ڈالا دیا تھا اس وقت فوری طور پر تو میں اپنے بدخواہ کے بارے میں کوئی اندازہ لگانے سے قاصر رہا تھا۔ آپ کی والدہ کی جانب میرا دھیان بھولے سے بھی اس لیے نہ جا سکا تھا کہ وہ تو نکاح کے انتظامات میں پیش پیش تھیں اور تاریخ طے ہونے کے بعد سے کئی مرتبہ شوروم کے نمبر پر مجھ سے بات کر چکی تھیں۔ ان سے ایک مرتبہ بھی گھر کے نمبر پر فون نہ کرنے سے میں رعنا کی اس یقین دہانی پر ایمان لا چکا تھا جو اس نے مجھے میرے بارے میں شہر سے جیالی نہیں یا کوئی پوچھ گچھ نہ ہونے کی بابت کروائی تھی مگر سارا پروگرام الٹ جانے کے بعد میں نے اپنے بدخواہ کی کھوج لگانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

اس کھوج کے نتیجے میں حالات و واقعات کی کڑیاں مل جانے کے باوجود اس شخص کا پتا نہ چل سکا تھا جو ایک روز میری عدم موجودگی میں لاہور میں واقع میری کوٹھی پر پہنچا تھا جس نے ملازم بشیر سے اس نے پہلے تو میری بابت استفسار کیا تھا کہ میں گھر پر موجود ہوں یا نہیں بشیر کا جواب نفی میں پا کر مذکورہ شخص نے خود کو میرا ایک ایسا عزیز ظاہر کرتے ہوئے جو کئی برس بعد سعودی عرب سے وطن پہنچا تھا میرے اہل خانہ کی بابت پوچھا تھا۔ بشیر نے جسے میں نے کوئی حفاظتی احکامات جاری نہیں کیے تھے اُسے بتا دیا تھا کہ بیگم صاحبہ یعنی میری بیوی ملتان گئی ہوئی ہیں ـــ باتوں باتوں میں وہ شخص بشیر سے ملتان میں میری والدہ اور میرے سسرال کا پتا بھی لے گیا تھا۔ بشیر جو ہمارا دیرینہ ملازم تھا اور کئی برس میری والدہ کے پاس ملتان میں بھی کام کر چکا تھا ملتان میں میرے گھر اور میرے سسرال دونوں گھروں سے بخوبی واقف تھا۔ اس شخص نے بشیر سے یہ کہا تھا کہ وہ عزیزداری کے ناتے میرے اہل خانہ سے ملنے ملتان جا رہا ہے جب میں بیوی کو والدہ کے پاس چھوڑ کر ملتان سے لاہور پہنچا تو بشیر نے اس شخص کی آمد کا تذکرہ میرے گوش گزار کیا تھا مگر میں رعنا سے شادی کے خیال میں اس حد تک مگن اور مسرور تھا کہ میں نے سعودی عرب سے آنے والے اس ناشناسا عزیز کی آمد کو کوئی خاص اہمیت نہ دی تھی۔ تاہم جب رعنا سے میری شادی نہ ہو سکنے والا واقعہ جگ ہنسائی کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچ چکا تو میں نے اپنے بدخواہ کی تلاش میں گزشتہ چند روز کے دوران پیش آنے والے جملہ حالات اور واقعات پر گہرے غور و تفکر کی ضرورت محسوس کی تھی۔ سب سے پہلے سعودی عرب سے کئی برس بعد وطن لوٹنے والے عزیز کا میری کوٹھی پر پہنچ کر میرے ملازم سے ملتان والوں کے پتے لے جانا اور اپنا کوئی اتا پتا چھوڑے بغیر میرے نام ملتان سے واپسی پر ملنے آنے کا مبہم پیغام چھوڑ جانا بھی خاصا معنی خیز لگا۔ والدہ اور سسرال والوں سے سعودی عرب سے آنے والے اس ناشناسا عزیز کی بابت پوچھا تو ان لوگوں نے قطعاً لاعلمی ظاہر کی۔

ادھر ملتان میں میری والدہ، بیوی اور سسرال والوں کو میری دوسری شادی کی مقررہ تاریخ، مقام اور وقت سے متعلق تفصیلی خبر تحریری پہنچائی گئی تھی۔ خبر رساں نے بجائے اسرار رویہ اختیار کیا تھا۔ ملتان میں ہمارے علاقے کے ڈاکیے کو وہ میری والدہ، بیوی اور بہنوئی کے نام بیک وقت تین علیحدہ علیحدہ خطوط والدہ مسعود عالم، زوجہ مسعود عالم اور برادر نسبتی مسعود عالم کے نام سے دے گیا تھا جو اس کی مکتوب الیہان کے ناموں سے عدم واقفیت کی واضح علامت تھے۔ لفافوں پر درج پتوں سے عیاں تھا کہ مکتوب نگار نے یہ پتے کسی ایسے اَن پڑھ اور سادہ لوح آدمی سے حاصل کیے تھے جو لیٹے ہنڈ مڑ کے تیسری گلی کا پانچواں مکان جیسا پتا ہی بتا سکتا تھا۔

میرے استفسار پر بشیر نے مجھے بعد میں سعودی عرب سے کئی برس بعد وطن واپس لوٹنے والے ناشناسا عزیز کو ملتان میں میری

والدہ اور سسرال والوں کے بھی اسی نوعیت کے پتے دینے کی تفصیل بتائی۔ میری والدہ، بیوی اور سسرال والوں کو موصولہ خطوط کے لفافوں پر مقاماتِ ابلاغ و ترسیل کی مُہروں کی عدم موجودگی بھی معنی خیز تھی۔ خطرہ ٹل جانے کا یقین ہوتے اور مجھ سے دوسری شادی نہ کرنے کا وچن لینے کے بعد جب میری والدہ اور سسرال والوں نے ملتان واپسی کے لیے رختِ سفر باندھا تو مجھے اور میری بیوی کو بھی چند دن کے لیے ملتان چلنے کی دعوت دی۔ میں ایک خاص مقصد کے تحت ان کے ساتھ ہو لیا۔ ملتان میں اپنے علاقے کے ڈاکیے سے میں نے اُن بے مُہر خطوں کی بابت استفسار کیا۔ جو اس نے میرے گھر والوں کو پہنچائے تھے تو ایک حیران کن صورتِ حال سامنے آئی۔ کار میں سوار کوئی شخص علاقے کے ڈاکیے کے پاس آیا تھا اور ان تین خطوں کو حفاظت کے ساتھ ان کو پہنچانے کے عوض اچھی بھلی بخشش دے گیا تھا۔ اور کام ذمے داری سے انجام دیے جانے کی صورت میں مزید بخشش کا وعدہ کر گیا تھا جو یقیناً بیٹھے بٹھائے کما جانے کے مترادف تھا۔

معمولی غور و خوض سے میری عدم موجودگی میں میری شہر والی کوٹھی پر سعودی عرب سے میرے ایک ناشناسا عزیز کا آنا، میرے ملازم بشیر سے اہلِ خانہ کی بابت پوچھ گچھ، ملتان میں نہ صرف میری والدہ بلکہ میرے سسرال والوں کے پتے پوچھنا، میری والدہ، اہلیہ اور بیٹوں کو میری شادی کے متوقع پروگرام سے مطلع کرنے کے لیے خطوط علاقے کے ڈاکیے کے توسط سے پہنچوانے کی خاطر اسے بخشش دینا اور کام ہو جانے پر مزید بخشش کا وعدہ کر جانا ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں محسوس ہوئیں تاہم ان کڑیوں کے باہم مربوط ہو جانے کے باوجود میں اس شخص کے بارے میں، جس نے یہ کھیل کھیلا تھا، فیصلہ کرنے سے قاصر رہا کہ وہ کون ہو سکتا تھا؟ آپ کی والدہ کی جانب میرا گمان نہ ہو سکنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس سلسلے کی ہر کڑی میرے بدخواہ کے مرد ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ایک ایسی خاتون جس کی ہمشیرہ کی زبانی میں اس کے مرد ذات سے نہ صرف خود متنفر ہو جانے بلکہ اپنی ہمشیرہ اور بیٹی کو بھی اس گرداب میں الجھا لینے کی داستان سن چکا تھا۔ اپنی بہن کی خوشیاں اپنے ایک مرد ملازم ہی کے توسط سے پامال کرنے کی کوشش کرے گی مگر برسوں بعد میرے ملازم بشیر نے اس شخص کی نشاندہی کر کے میرے ذہن میں کھلبلی مچا دی۔ تیمور کو کسی افتاد سے بچانے کی خاطر میں اگلے ہی دن آپ کے گاؤں پہنچا اور رعنا سے اس کے کالج میں ملا۔ رعنا کو میری غیر متوقع آمد پر انتہائی حیرانی ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ کل ایک ایسے شخص کا پتا چل گیا ہے جس کے بارے میں مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ ہماری خوشیاں خاک میں ملانے میں اس نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ وہ دُکھ سے مسکرا دی تھی پھر اس نے کہا تھا: "اگر تمھاری مراد اللہ دتا سے ہے تو تم سو فیصد یقین کر سکتے ہو۔" میں نے تعجب سے رعنا کو دیکھا اور وضاحت چاہی۔ اس نے آہستہ سے کہا: "ہاں اللہ دتا کے ذریعے ہی تمھارے پروگرام کی خبر تمھارے سسرال اور تمھاری والدہ کو پہنچائی گئی تھی۔" مجھے تعجب بھی ہوا اور رعنا سے اس امر کا شکوہ بھی کہ اس نے یہ بات مجھے اب تک کیوں نہیں بتائی تھی۔ میرے اس شکوے کے جواب میں مجھے رعنا کے یہ الفاظ کبھی نہیں بھولتے کہ "مسعود! ابھی بتانے دو نہ سہی تم تو یاد کرو گے کبھی کہ ایک سقراط ہی نہیں تھا جو اپنوں کے ہاتھوں خوشی خوشی زہر پی لینے کا حوصلہ رکھتا تھا۔" میں نے کہا: "اب تو مجھے اس خط کے بارے میں بھی شبہ ہو رہا ہے جو اس وقت میرے برادرِ نسبتی کے حوالے سے حویلی پہنچایا گیا تھا۔ پہلے تو گڑے مُردے اکھاڑنے کے خیال سے نہ پوچھا تھا مگر اب پوچھنا پڑے گا۔" میری اس بات پر رعنا کی جانب سے ایک اور حیران کن

جواب ملا: "نہیں، لہٰذا اب کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں، جو ہمارے مقدر میں تھا ہم بھگت چکے۔" میں اس بات کی توثیق کے لئے پر بضد رہا تو بالآخر رعنا کو بتانا ہی پڑا کہ مذکورہ خط بھی اسی کھیل کا ایک حصہ تھا جس نے میرے اور رعنا کے مابین ایک ایسی خلیج حائل کر دی تھی جو کبھی پاٹی نہ جا سکی تھی۔ رعنا کے اس انکشاف نے مجھے ایک نئے صدمے سے دوچار کر دیا میرے استفسار پر رعنا نے بتایا کہ یہ ساری صورتِ حال کچھ عرصہ بعد ہی اللہ وسائے کے توسط سے اس کے علم میں آ گئی تھی۔ "اصل حقیقت کا علم ہو جانے کے باوجود بھی تم مجھ سے ملیں کیوں نہیں...؟ شاید اس روز بعد زندگی میں ٹکراؤ نہ ہوتا تو تم تو ساری زندگی ہی رہ جاتیں؟" میں نے شکوہ کیا تو رعنا نے کہا: "فائدہ کیا تھا؟ تمہارے حویلی روانے سے پہلے میں یہ تو سمجھ ہی چکی تھی کہ ہمارے راستے ہر حال جدا ہو چکے ہیں۔" میں لاجواب ہو کے رہ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا: "کل تیمور نے یہ غلطی کی کہ اللہ وسائے کے ہمراہ گھر چلا آیا۔ اگرچہ اس نے تمہارے ملازم پر یہی ظاہر کیا کہ وہ اس گھر میں اپنے کسی شناسا سے ملنے آیا تھا اسے تیمور نے گاڑی ہی میں بیٹھا رہنے دیا تھا مگر مجھے قدر شبہ ہے کہ کہیں تمہاری بہن اللہ وسائے کے ذریعے یہ بھنک مل جانے پر کہ تیمور کا اس شخص سے کوئی تعلق ہے جسے انھوں نے اپنی بہن کی زندگی سے نکال پھینکا تھا تیمور کو کوئی زک پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔" رعنا نے میری بات سن کر کہا: "تم اطمینان رکھو ایسا نہیں ہوگا۔ اللہ وسایا آپا کے حکم پر میرے حق میں بہتری کے گمان میں جو کر گزرا سو کر گزرا مگر وہ میرے بھروسے کا آدمی ہے۔ جو کچھ اس نے میری بہتری کے گمان میں کیا اس کا اعتراف اس نے میرے روبرو کچھ عرصے بعد ہی کر لیا تھا اور جو کچھ وہ کر گزرا تھا اس پر اسے آج بھی پچھتاوا ہے۔" میں نے کہا: "تمہاری بہن نے جو کھیل ہمارے ساتھ کھیلا اس کا تو اب کوئی مداوا نہیں ہو سکتا لیکن تیمور پر اگر ذرا سی بھی آنچ آئی تو میں تمہاری بہن سے اگلا پچھلا سارا حساب بے باق کر لوں گا۔" رعنا نے مجھے اطمینان دلایا کہ تیمور پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ میرے ذہن میں رعنا کا قرض اتارنے کا خیال اگر شدت کا نہ ہوتا تو میں تیمور کو ایک منٹ بھی حویلی میں نہ چھوڑتا مگر مجھے رعنا سے کئے ہوئے اس وعدے کا پاس رکھ کر اس کا قرض اتارنے کی کوشش کرنا تھی کہ میں تیمور کو اس کی بیتائی ابھی ہوئی زندگی کی ڈور کا وہ سرا بن جانے کی اجازت دوں گا جس کو تھام کر آپ، میری مراد آپ سے ہے عالیہ بی بی...! اپنی زندگی کی الجھی ڈور کو سلجھا سکیں۔ آپ اسے ایک طرفہ خاموش معاہدہ بھی قرار دے سکتی ہیں۔ وہ رعنا سے میری آخری ملاقات تھی اس کے بعد تو تیمور کی زبانی رعنا کی شدید علالت اور پھر موت کی خبر ملی۔ میں اتنا بدنصیب تھا کہ اس کی تکفین و تدفین میں بھی شرکت نہ کر سکا تاہم مجھے اس کی موت کا جو دکھ ہوا وہ ناقابلِ بیان تھا۔ رعنا کی موت کے بعد ایک روز تیمور نے مجھ سے پوچھا: "ڈیڈی! کیا رعنا آنٹی وہی خاتون نہیں تھیں جن سے بقول میری امی جان کے آپ کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی؟" میں اس کے اس سوال کا جواب نفی میں نہ دے سکا تھا۔

رعنا کی موت کے بعد جب اس کی وصیت سامنے آئی تو آپ کی والدہ کو تیمور کی اصل حقیقت کے بارے میں تشویش لاحق ہوئی۔ ایسا ہونا یقینی تھا۔ انھوں نے وکیل صاحب سے تیمور کی اصلیت جاننا چاہی مگر وکیل صاحب نے مرحومہ سے کئے ہوئے عہد کی پاسداری کی اور تیمور کی اصلیت جانتے ہوئے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ آپ کی والدہ ابتدا میں حویلی میں تیمور کی شراکت تسلیم کرنے سے بھی گریزاں رہیں۔ وکیل صاحب سے تیمور کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکنے پر آپ کی والدہ نے اللہ وسایا کو تیمور کی نگرانی اور اس کی اصلیت معلوم کرنے پر مامور کیا مگر اللہ وسائے نے جسے

رعنا اس دنیا سے جانے سے پہلے تیمور کے بھروسے کا آدمی بنا گئی تھیں۔ اس بھرم کا پاس رکھا اور تیمور کی حقیقت جاننے کے باوجود آپ کی والدہ کو اس سے آگاہ نہیں کیا۔ ناچار آپ کی والدہ نے اس سلسلے میں اپنے ایک پرانے ملازم کی جسے وہ عرصہ ہوا سبکدوش کر چکی تھیں خدمات حاصل کیں اور بالآخر تیمور کی اصل حیثیت جاننے میں کامیاب ہو گئیں اور یہ جانتے ہی تیمور کی حویلی میں شراکت کے بارے میں ان کا رویہ یکسر بدل گیا تو وہ حویلی اس کی شراکت تسلیم کرنے میں جیل و حجت دکھا رہی تھیں یا وہ مفاہمت کی راہیں تلاش کرنے کے لیے شہر کے بڑے وکلا سے مشورے کرنے لگیں۔ شاید آپ یہ سوچیں کہ میں یہ بات اس قدر وثوق سے کیوں کر کہہ سکتا ہوں تو بی بی اگر آپ کی والدہ مرد ذات سے نفرت کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اپنی مطلب برآری کے لیے مردوں ہی کی خدمات حاصل کر سکتی تھیں تو ہم بھی کرائے پر کسی شخص کی خدمات حاصل کر کے آپ کی حرکات و سکنات اور ارادوں کی نگرانی کروا سکتے تھے تاہم آپ کی والدہ کی معاملہ فہمی کی داد نہ دینا ناانصافی ہو گی جلد ہی انھیں معلوم ہو گیا کہ تیمور اس شخص کا بیٹا ہے جس سے اپنی بس اور جدا کروانے کے لیے وہ ماضی میں ایک گہری چال چل چکی تھیں ان کا رویہ بدل گیا۔ وہ تاڑ گئیں کہ رعنا کا تیمور کو حویلی کی ملکیت میں ان کی بیٹی کا شریک بنا جانا بے معنی نہیں ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ رعنا نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا وہ حویلی کو آپ کی اور تیمور کی مشترکہ ملکیت بنا کر آپ دونوں کے مابین ایک تعلق پیدا کر جانا چاہتی تھیں مجھے یاد ہے کہ رعنا نے اپنے اس اقدام کی توجیہہ میں کہا تھا۔ محمود! مجھے یقین ہے کہ آپا اور عالیہ تیمور کو کسی قیمت پر حویلی کا شریک تسلیم نہیں کریں گی بہت اختلافات ہوں گے مگر میں ایک موہوم سی امید پر یہ سب کچھ کر رہی ہوں کہ شاید میرے بعد عالیہ کے تیمور سے حویلی کے معاملے پر اختلافات اور باہمی ٹکراؤ کسی مقام پر ان کے مابین الفت کو جنم دے جائیں۔ سنگلاخ زمینوں سے بھی تو سبزہ پھوٹ سکتا ہے اور میں نے سنا ہے شدید نفرت کی کوکھ سے ہی کبھی کبھی محبت جنم لے لیتی ہے...!

کاش! رعنا کی وہ موہوم سی امید بر آتی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ آپ کی والدہ نے تو مفاہمت کی راہیں نکالنے کی کوشش کی خلوص سے ہو کر ہی سہی مگر افسوس کہ ماضی میں ان سے سرزد ہو چکنے والی ایک لغزش نے ان کا راستہ بہت دشوار کر دیا۔ آپ کے دل کو مردوں کے خلاف ایک مضبوط قلعہ بناتے ہوئے وہ بھول گئیں کہ فطرت سے ٹکرانے والے خود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے ہیں۔

عالیہ بی بی! گو میں آپ کو سمجھانے کا کوئی حق تو نہیں رکھتا مگر کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ زندگی کا جو ڈھب آپ نے اختیار کر رکھا ہے وہ خلاف فطرت ہے۔ میں مانتا ہوں کہ آپ کی والدہ کو ایک مرد کی جانب سے آزار پہنچا مگر انھیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ دنیا بھر کے مردوں کو ناقابل اعتبار گردانا شروع کر دیں اور اس نفرت کو اپنی بہن اور بیٹی کے دل میں بھی اتارنے کی کوشش فرمائیں۔ رعنا کی سوچ متوازن تھی چنانچہ وہ ان کے دام میں نہ آسکی مگر آپ کا ذہن ناپختہ تھا آپ نے بلا کم و کاست اپنی والدہ کے اس اثر کو قبول کر لیا اور بلا سوچے سمجھے اس راستے پر چل پڑیں جو خلاف عقل بھی تھا اور خلاف فطرت بھی۔ اپنی والدہ کی ازدواجی زندگی کی ناکامی کے حوالے سے آپ نے ہر مرد کے بارے میں ایک ہی رائے قائم کرنے کی کوشش کی جو انصاف کے تقاضے کے برخلاف ہے۔ کسی ایک فرد کی خطا کی سزا کا اس قبیل کے تمام افراد پر اطلاق کر دینا انصاف تو نہیں۔ اگر آپ میری اس بات سے اتفاق نہیں کرتیں اور آپ کو اپنی رعنا آنٹی سے واقعی محبت تھی تو پھر آپ کو اپنی والدہ سے، اپنے آپ سے بلکہ ہر حقیقت

سے نفرت ہو جانا چاہیے کیوں کہ آپ کی امی کی زندگی کو ایک المیہ داستان بنا دینے والی بھی تو ایک خاتون ہی تھیں۔

تیمور کی اصل حیثیت سے آگاہی کے بعد آپ کی والدہ کا جو رویہ رہا وہ مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں۔ مگر آپ اس راستے سے واقف نہ تھیں جو آپ کی والدہ آپ کے لیے متعین کر چکی تھیں۔ تیمور خیر سے اپنا پکا رعنا آنٹی سے کیے ہوئے اس عہد کے ساتھ کہ وہ آپ کو.... جی! میری مراد آپ ہی سے ہے عالیہ بی بی! اس گرداب سے نکالنے کی حتی الوسع کوشش کرے گا، حویلی میں انسانی ڈرامائی انداز میں آپ کے ایک ملازم اور ماتحت کی حیثیت سے رہنے کو ایک چیلنج کے طور پر لینے کی کوشش کی تھی۔ آہستہ آہستہ اس صورت حال میں اضافہ ہوتا گیا پھر رعنا کے انتقال کے بعد جب حسن کی وصیت منظر عام پر آئی تو تیمور نے رعنا کی وصیت کے....

رد عمل کے طور پر پیدا شدہ صورت حال سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی۔ حویلی کی ملکیت سے اسے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے اس کے پاس۔ آپ کے رویے کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ بتدریج آپ نرم پڑتی جائیں گی یہاں تک کہ ایک روز جھک جائیں گی مگر ایسا نہ ہوا۔ جب آپ اس کے خلاف عدالت میں جا پہنچیں تو وہ ساری صورت حال جسے اس نے اب تک ایک دلچسپ تجربۂ زندگی سمجھ رکھا تھا ایک بیک اس کی انا کا مسئلہ بن گئی۔ اس نے جم کر اس چیلنج کا مقابلہ کیا اور بالآخر اس نے آپ کو شکست دے دی۔ مگر آپ کی شکست کو اس نے اپنی شکست کے طور پر تسلیم کیا کیوں کہ وہ رعنا سے کیے ہوئے عہد کو پورا نہیں کر سکا یعنی آپ کو گرداب سے نکالنے کا عہد.... تیمور کا بدلا ہوا طرز زندگی اور اس کے یوں بے رنگی چپ سی مگر اس امر کا اظہار ہے کہ وہ حویلی سے اپنے گھر تو واپس آچکا ہے مگر خود کو وہیں کہیں گم کر آیا ہے۔ اس کا یہ بدلا ہوا روپ میرے لیے پریشان کن ہی نہیں،

تکلیف دہ بھی ہے۔ والدین اور اولاد کا رشتہ عجیب جذباتی رشتہ ہوتا ہے۔ آدمی اپنے دکھ، پریشانیاں اور فکریں تو جوں توں سہہ لیتا ہے مگر اولاد کے چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیاں نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ رعنا کا یہ بول پرانا قرض، اس شام کا قرض جب وہ میرا انتظار کرتی رہی تھی، ادا کرنے کے لیے میں رعنا سے جو وعدہ کروں گا اس پر مجھے پچھتاوے کا احساس ہوگا۔ کاش، میں نے تیمور کو اس معاملے میں انوالو نہ ہونے دیا ہوتا۔

عالیہ بی بی! رعنا نہیں چاہتی تھی کہ آپ کو یہ سب کچھ معلوم ہو۔ بعض لوگوں کے دل دریا ہوتے ہیں مگر رعنا کا ظرف سمندر تھا۔ خوشیاں چھین کر جھولی میں دکھ ڈال دینے والی بہن کو بھی اس نے کوئی حرف شکایت زبان پر لائے بغیر چپ چاپ معاف کر دیا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اس کے بعد یہ واقعات کبھی منظر عام پر نہ لائے جائیں۔ وکیل صاحب اور تیمور کو اعتماد میں لینے کے لیے اس نے انھیں محض آپ کی والدہ کی ازدواجی زندگی کے المیے سے آگاہ کیا تھا اپنی ذاتی زندگی کے المیے کو اس نے دل کے نہاں خانوں ہی میں بند رکھا تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ رعنا کے انتقال کے بعد جب تیمور نے مجھ سے پوچھا کہ کیا رعنا ہی وہ خاتون تھیں جن سے کبھی آپ کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی تو میں نے اس کے اس سوال کا اثبات میں جواب دینے کے ساتھ جذبات کی روانی میں یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس شادی کو رکوانے میں کلیدی کردار اس خاتون نے ادا کیا تھا جس کی بیٹی کا وہ ان دنوں ملازم ہے ویسے جذبات کی روانی کے الفاظ تو میں تکلفاً استعمال کر گیا ہوں حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کو کسی متوقع پریشانی یا خطرے سے بچانے کے لیے یہ سب بتا دینا ضروری سمجھا تھا آپ کی والدہ کی سابقہ کارکردگی کے پیش نظر مجھے یہ خدشہ تو بہرحال تھا کہ وہ تیمور کا سیاق و سباق جاننے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گی مگر

یہ معلوم ہونے پر کہ یہ تو اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے خلاف انھوں نے بڑی کامیاب سازش کی تھی، وہ کوئی نہ کوئی چال چلنے کی کوشش ضرور کریں گی۔ ویسے رعنا کی خواہش تو یہ تھی کہ آپ کی والدہ کو تیمور کی اصل حقیقت کم از کم اس وقت تک بتائی نہ جانے دی جائے جب تک کہ اس کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو جائے جسے اپنی آنکھوں میں بسا کر اس نے حویلی کو آپ کی اور تیمور کی مشترکہ ملکیت بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ رعنا کو خدشہ تھا کہ اصل حیثیت سے آگاہ ہو جانے پر وہ اس دیوار سے بھی اونچی دیوار آپ کے اور تیمور کے درمیان کھڑی کر سکتی ہیں جو کبھی انھوں نے تیمور کے باپ اور اپنی بہن کے درمیان کھڑی کی تھی۔ مجھے دیواروں کی اونچائی کی بے شک کوئی پروا نہیں۔ نہ اس میں آپ کی والدہ کے تیمور کی اصلیت سے آگہی کو کوئی اہمیت دیتا ہوں۔ مسئلہ ہے تو یہ کہ آپ یعنی اسی لڑکی کو جس کی خاطر یہ ناٹک کھیلا جا رہا تھا، کیسے سمجھایا جائے کہ گرداب میں مسلسل چکر پھیریاں کھاتے رہنے سے اس کی بصارت الجھ گئی ہے۔ زندگی بدصورت نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ نظر جما کر دیکھ ہی نہیں پا رہی۔ وہ اپنا ہاتھ تو بڑھائے۔ کتنے ہی لوگ منتظر ہیں کہ وہ اپنا ہاتھ ان کی جانب بڑھائے تو وہ اسے پاتال میں اترنے سے بچا لیں۔ عالیہ بی بی! زندگی اتنی نامہربان اور بدصورت ہرگز نہیں جتنا کہ آپ سمجھتی ہیں۔ جس خول میں آپ محصور کر دی گئی ہیں، ذرا اس سے باہر نکلنے کی کوشش تو کیجیے۔ زندگی بہت شفاف، روشن، مہربان اور خوبصورت ہے، بالکل آپ کی رعنا آنٹی کے باطن کی طرح۔

میں معذرت خواہ ہوں عالیہ بی بی کہ میرے اس طویل خط نے جو بلاشک و شبہ میری جانب سے کسی کو لکھا جانے والا میری زندگی کا طویل ترین خط ہے، آپ کا بہت قیمتی وقت لے لیا مگر میرے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا۔ تیمور میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور سب سے بڑی آس ہے۔ اس کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں حتیٰ کہ اپنے بد سے

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ سچی محبت رکھنے والے محبت کی خوشبو کو خواہ وہ قرنوں کا سفر طے کر کے آ رہی ہو محسوس کر لیتے ہیں۔ آج صبح جب میں تیمور کو جگانے کے لیے اس کے کمرے میں گیا تو اس کی رائٹنگ ٹیبل پر رائٹنگ پیڈ کے پھڑپھڑاتے اوراق نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ قریب ہی قلم پڑا تھا۔ میں رائٹنگ پیڈ اور قلم کو ان کی مخصوص جگہوں پر رکھنے کو آگے بڑھا تو دیکھا رائٹنگ پیڈ کے ایک دو نہیں متعدد صفحات پر چھوٹے چھوٹے لاتعداد دل بنے تھے اور دل میں ایک تیر آر پار دکھائی دے رہا تھا اور دل کے بیچ، انگریزی حروف اے ایل اور ای واضح تھے۔ کیا اب بھی کچھ پوچھنے کی ضرورت رہ جاتی ہے تیمور سے؟

میرا دل کہتا ہے کہ بہت جلد مجھے ایک بار پھر حویلی آنا پڑے گا۔ اب کی بار میں نہ تو مایوس ہونا پسند کروں گا نہ کسی سازش کا شکار ہونا، کیوں کہ معاملہ میرے بیٹے کا ہے اور اپنے بیٹے کی خاطر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ بیٹے کی خاطر پہلی قربانی تو یہی دے رہا ہوں کہ آپ کی والدہ کو معاف کر رہا ہوں۔ پچھلا کھاتہ بند کر دینے کے بعد اب میں ایک نیا، بالکل نیا کھاتہ کھول رہا ہوں۔ مطلب کہ اب بالکل نئے سرے سے چلے گا۔ اگر یہ خط آپ تک پہنچ چکا ہے تو یقین کیجیے کہ آج کے بعد میں پھر کبھی کوئی پرانی بات آپ کے سامنے نہیں دہراؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ شاید میں یہ سب کچھ نہ لکھتا مگر اولاد کے سلسلے میں غالباً ہر آدمی ہی خود غرض ثابت ہوتا ہے۔ آپ کو اعتماد میں لینے کے لیے تصویر کا دوسرا رخ آپ کے سامنے پیش کرنا بہت ضروری تھا سو میں نے کر دیا۔ اگرچہ یہ پہلو خوشنما نہیں ہے مگر ہر اندھیری رات ایک روشن دن کی پیامبر ہوتی ہے۔

کیا میں یہ امید رکھوں عالیہ بی بی کہ آپ صنف مخالف کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کرنے کی کوشش کریں گی اور جب میں رعنا کی خواہش کی تکمیل کے لیے سوالی بن کر حویلی آؤں گا تو آپ کی نگاہوں میں میرے لیے نفرت نہیں ہوگی؟

آپ کی والدہ محترمہ سے انشاء اللہ جلد ہی ملاقات کرنے کی کوشش کروں گا۔

آپ کے لیے دعائیں۔ آپ کی امی صاحبہ کے لیے سلام و دعا رہا۔

فقط

محمود ظفر (مسعود ملک)

اس طویل مکتوب نے مجھے ایک ناقابلِ بیان ذہنی کوفت سے دوچار کر دیا۔ میرا ذہن سوکھے پتے کی طرح تکلیف دہ سوچوں کے تند و تیز تھپیڑوں کی زد میں تھا۔ مجھ پر ایک عجیب بے بسی کی کیفیت طاری تھی۔ نہ میں ہنس سکتی تھی نہ رو سکتی تھی۔ میری کنپٹیاں چیخ رہی تھیں اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے بھینچے ہوئے جبڑے پھر کبھی نہ کھل سکیں گے۔ رفتہ رفتہ میں پتھر کی بن چکی تھی۔

نہ جانے کتنی دیر میں یونہی گم صم بیٹھی رہی کہ اللہ وسائی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "بی بی! بڑی بی بی صاحبہ کھانے واسطے انتظار کر رہی ہیں جی آپ کا۔"

کاکا کی زندگی میں میں دوپہر کے وقت کھانا نیچے ہی منگوا لیا کرتی تھی اور یہ جاتی تو دوپہر کے کھانے کے نام پر کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹہ تو یقینی ضائع ہو جاتا تھا مگر کاکا کے بعد میں امی کی تنہائی کے خیال سے دوپہر کے کھانے کے لیے بھی اوپر جانے لگی تھی۔ امی کے سوا اب میرا رہ ہی کون گیا تھا۔

اللہ وسائی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ باہم بھینچے جبڑوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہوئے میں نے ایک گہری سانس کھینچی اور میری نگاہیں اللہ وسائی کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ جو کچھ لکھنے والے نے لکھا تھا اگر وہ واقعی سچ تھا تو اللہ وسائی کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ حویلی کا یہ ملازم اس حویلی کے اتنے گہرے رازوں کا امین ہوگا۔ امی تو کہتی تھیں، مردوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ وہ قابلِ بھروسا نہیں ہوتے، کمینوں کو تو وہ جوتے کی نوک پر رکھنے کی قائل تھیں۔ اگر لکھنے والے نے سچ لکھا تھا تو امی نے اللہ وسائی پر اعتبار کیوں کیا تھا؟ اسے قابلِ بھروسا جان کر وہ سب کچھ کیوں کروایا تھا۔ وہ کمینوں میں سے تھا اسے جوتے کی نوک پر رکھنے کے بجائے امی نے اسے رازداں کیوں بنایا تھا؟ میرا سر گھوم رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری دونوں کنپٹیاں کھل کھل ہو کر بکھر جائیں گی۔

"بی بی! بڑی بی بی صاحبہ جی کھانے واسطے یاد کر رہی ہیں جی آپ کو۔" اللہ وسائی نے پھر کہا۔

میں ٹکٹکی باندھے اللہ وسائی کو دیکھ رہی تھی۔

"بی بی! خیر تو ہے جی؟"

"ہاں!"

"بی بی!" اللہ وسائی نے خاصی تشویش سے مجھے کہا۔

"ہاں ہاں!" میں اپنے حواس ٹھکانے لانے کی کوشش کرنے لگی۔

"بی بی! آپ... آپ میرے کول اس طرح کیا دیکھ رہی ہیں جی؟ مجھ سے ناں کوئی بھول غلطی تو نہیں ہو گئی ہے جی؟" اللہ وسائی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے سرے باہم ملاتے ہوئے نیم خم ہو گیا۔

میرے جبڑے پھر بھنچ چکے تھے۔ میری نگاہیں اللہ وسائی پر مرکوز تھیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا اس سے ہر بات کی تصدیق یا تردید طلب کروں۔ اس سے پوچھوں کہ کیا وہ سب کچھ سچ تھا؟

"تم..... تم....." میرا دم گھٹنے لگا۔

"جی بی بی صاحبہ؟"

"تم..... تم جاؤ میں آتی ہوں۔" میں نے بدقت تمام کہا۔

"بہتر سرکار۔"

اللہ وسایا متذبذب سا کمرے سے چلا گیا اور مجھ پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ مٹھیوں کو پوری طاقت سے بھینچتے اور جبڑوں کو پوری شدت سے باہم بھینچتے ہوئے میں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ مجھے اپنے سینے اور حلق میں ہونے والی کچھ عجیب سی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ سانس باہر نکالتے ہوئے میں نے دھیرے دھیرے اپنی مٹھیاں کھول دیں۔ وہ طویل خط جس نے میرے ذہن کی دنیا تہ و بالا کر کے رکھ دی تھی اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے میں اوپر جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ اللہ وسائی سے کچھ پوچھنے سے بہتر تھا کہ میں امی سے مکتوب نگار کے بیانات کی تصدیق یا تردید کی طلب گار ہوتی مگر اس طرح ایک کمین کو غیر ضروری اہمیت دے جانے کا احتمال تو رہتا تھا اور وہ بھی ایک مرد کو۔

امی کھانے کی میز پر میری منتظر بیٹھی تھیں۔ میں میز کے کونے پر دھرے واش بیسن میں ہاتھ دھو کر کھانے کے لیے آ بیٹھی۔ اپنی پلیٹ میں انتہائی بے دلی سے سالن ڈالتے ہوئے میں نے ایک اچٹتی ہوئی نظر امی پر ڈالی۔ وہ سر تا پا سفید لباس میں ملبوس تھیں۔ ململ کا سفید دوپٹا انھوں نے مخصوص طریقے سے اپنے سر پر اوڑھ رکھا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس باوقار شخصیت کے پیچھے ایک ایسی کہانی چھپی ہوئی جس نے اس

وقت میرے ذہن میں بجلی سی چمک رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کوئی ایک فقرہ، ایک جملہ ایسا بولوں کہ ممی ہڑبڑا کر میری جانب دیکھنے پر مجبور ہو جائیں مثلاً "محمود ظفر تو یاد ہیں نا آپ کو؟ یا کیا آپ جانتی ہیں کہ تیمور دراصل کون ہے؟ یا یہ کہ آج ایک عجیب و غریب خط موصول ہوا ہے مجھے، یا یہ کہ کیا آپ کو پتا ہے کہ کاکا جی کا تیمور سے کیا تعلق تھا؟

میں کسی مناسب فقرے یا مناسب جملے کی تلاش میں اپنے ذہن کو ادھر ادھر دوڑا رہی تھی کہ ممی نے سلاد میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سالن پلیٹ میں نکال کر بیٹھ گئی ہو چپاتی، چاول کچھ تو لو۔"

میں نے قاب سنبھال لی۔

"آج کھانا بھی یاد نہیں رہا تھا؟"

"میں.... میں.... اوپر.... آ ہی رہی تھی...."

"کتنی دیر سے انتظار کر رہی تھی میں۔" ممی کے لہجے میں ہلکی سی شکایت تھی۔

"سوری۔" میں نے بڑے ہی رسمی سے انداز میں کہا۔

چپاتی دان سے چپاتی نکالتے ہوئے میں نے دزدیدہ نگاہوں سے ممی کی جانب دیکھا۔ سوال میری زبان پر آنے کے لیے مچل رہے تھے۔ تب ہی ممی نے میری طرف دیکھا اور غیر شعوری طور پر میرا ہاتھ میز کے کونے پر دھرے ہوئے بیگ کی جانب بڑھ گیا۔

"کیا بات ہے؟" ممی کے لہجے میں تشویش تھی۔

"جی.... کچھ نہیں....." میرا ہاتھ بیگ کو چھوئے بنا واپس آ گیا اور میرے لبوں کے گوشے پھڑکنے لگے۔ پھر کچھ دیر کو سناٹا چھا گیا۔ میں نے بے دلی سے یکے بعد دیگرے چھوٹے چھوٹے چند نوالے لیے ممی کی پلیٹ میں سلاد کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

"آپ... آپ کھانا نہیں کھا رہیں؟"

"کھا تو رہی ہوں۔"

"صرف سلاد۔"

"ہاں.... بس.... جی نہیں چاہ رہا... کئی دن سے طبیعت گری گری سی ہے۔"

میں نے نوالہ منہ میں لیتے ہوئے ممی کی جانب دیکھا وہ مضمحل اور اداس نظر آ رہی تھیں۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ ممی کے چہرے پر گلابی رنگ کی جگہ زردی نے لے لی ہے مجھے ان کی زرد روئی نے یک بیک ایک عجیب سے خوف اور پریشانی سے دوچار کر دیا ــــ میں جو ذرا دیر پہلے ممی کو مسودوں المعروف محمود ظفر کا خط دکھانے کے لیے کوئی مناسب صورت حال پیدا کر دینے کی جستجو میں تھی ممی کی زرد روئی نے مجھے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔

"تم بھی بس برائے نام ہی منہ چلا رہی ہو۔" ممی نے کہا۔

"جی.... جی نہیں.... میں تو کھا رہی ہوں۔"

"کہاں کھا رہی ہو؟"

"آپ.... آپ کے چہرے سے لگ رہا ہے کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔"

"شاید بڑھاپا اسی طرح آیا کرتا ہے۔ ڈرا ڈرا کر، سہما سہما کر۔"

"ڈرا کر؟" میں چونکی۔

"ہاں۔"

"کیسا ڈر؟"

"کہ اب وقت کم رہ گیا ہے۔"

"اوہ نو ممی!"

مجھے یوں لگا جیسے میرے منہ میں موجود نوالہ حلق میں پھنس کر رہ جائے گا۔

"بیٹا! تمہاری نانی اماں چلی گئیں، کاکا چلی گئیں بغیر اپنی باری کے۔ اب ہمیں بھی تو جانا ہے۔"

"پلیز ممی!" میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ منہ میں موجود نوالہ میں نے پانی کے سہارے نیچے اتارا اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"کیا بات ہے.... کھانے سے ہاتھ کیوں کھینچ لیا تم نے؟"

"آپ باتیں جو ایسی کر رہی ہیں۔"

"جان! پرانے پتوں کو جھڑ ہی جانا ہے ایک نہ ایک دن۔"

"ممی جی! پلیز، ایسی باتیں نہ کریں۔"

"اچھا نہیں کرتی مگر تم کھانا تو کھاؤ۔"

"بس کھا چکی۔"

"دو ہی نوالے لیے اور کھا چکی۔"

"بھوک ہی اتنی تھی۔"

میں نے ممی کی جانب دیکھا اور ان کی زرد روئی نے مجھے زیادہ شدت سے ڈرانے کی کوشش کی۔ ایک انجانے خوف نے میرا دل اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ کیا نانی اماں اور کاکا کی طرح.... خدانخواستہ ممی بھی....؟ میرا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا۔ میرے ذہن میں محمود ظفر کے خلاف نفرت کا الاؤ بھڑکنے لگا۔ پہلے اس نے کاکا کی زندگی میں زہر گھولا.... اب.... نہیں، نہیں.... میں اسے ممی کی اور اپنی زندگی میں زہر

نہیں کھولنے دوں گی۔" میں نے اپنے کپکپاتے ہونٹوں کو پوری شدت سے باہم بھینچتے ہوئے سوچا۔

"کیا بات ہے؟ کچھ پریشان نظر آ رہی ہو تم؟" ممی نے جوس کے گلاس کا کنارا اپنے زیریں لب سے مس کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"جی... جی نہیں..."

ممی نے پانی پیا اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے بولیں۔

"اب مجھے تمہارے اس کام سے وحشت ہونے لگی ہے۔"

میں نے چونک کر ممی کو دیکھا اور پوچھا۔ "کون سے کام سے؟"

"یہی تمہارا بہبود مرکز۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ یہ آج ممی کیسی بات کر رہی تھیں۔ بہبود مرکز کے سلسلے میں مجھے سب سے زیادہ اعانت اور حوصلہ افزائی ممی ہی کی طرف سے تو ملی تھی ورنہ ڈیڈی کا تو میری ان مصروفیات سے عاجز رہا کرتی تھیں جب میں ان سے اپنے مشن کے سلسلے میں طویل جذباتی مکالمات بولنے لگتی تو وہ میری حوصلہ شکنی پر اتر آتیں۔ ممی کی حوصلہ افزائی نہ ملتی تو کچھ بعید نہ تھا کہ ڈیڈی کی باتیں میرا حوصلہ پست کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتیں مگر آج... آج ممی بھی! میں نے گہرے استعجاب سے ممی کی طرف دیکھا۔

"سارا سارا دن تنہا پڑی رہتی ہوں بات کرنے کو ترس جاتی ہوں۔ زیادہ ہوا تو اٹھی، ٹہل لی یا پھر دریچے میں کھڑے ہو کر ادھر ادھر نظر دوڑالی اور بس۔"

"آپ نے برادری میں آنا جانا بھی تو ترک کر دیا۔"

"جب سے حویلی کا قضیہ چلا ہے، لوگوں کے الٹے سیدھے سوالوں کا سامنا کرنے سے بچنے کے لیے میں نے آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔"

"مگر کب تک یوں گوشہ نشینی اختیار کیے رہیں گی آپ؟"

"شاید ہمیشہ۔ کیوں کہ حویلی چھوڑنے میں تم میرا ساتھ دینے پر آمادہ جو نہیں ہوئیں۔"

"حویلی چھوڑ دینے سے کیا فرق پڑ جاتا ہے؟"

"نئی جگہ جا بستے اور نئے سرے سے زندگی شروع کرتے، جہاں لوگ ہمیں آزار پہنچانے تو نہ آتے۔" ممی کی آواز بوجھل تھی۔

میں نے بغور ممی کے چہرے کا جائزہ لیا وہ اداس اور مضمحل نظر آتی تھیں۔ میرا جی چاہا انہیں تیمور کے وکیل کی جانب سے موصول ہونے والے خط کی بابت بتا دوں، شاید اس خبر سے ان کے چہرے پر چھائے تفکر کے یہ بادل چھٹ سکیں مگر پھر اس خیال نے میری زبان روک لی کہ کیا ضمانت تھی کہ ممی

اس خبر سے خوش ہوتیں۔ اس خبر کو کسی نئی افتاد کا پیش خیمہ قرار دیتے ہوئے ان کی پریشانی بڑھ سکتی تھی، جو شخص عدالت میں ہمارے خلاف سینہ سپر رہا تھا اس کی اس عنایت پر آنکھ بند کر کے اعتبار کر لینا خود کو دھوکا دینے کے مترادف تھا۔

کچھ دیر ممی کے ساتھ گزار کر میں نیچے آ گئی۔ بیگ میری بغل میں دبا تھا۔ اپنے دفتر میں آ کر میں نے بیگ سے وہ خط نکالا اسے ایک دفعہ پھر پڑھا اور اپنی میز کی دراز میں رکھ کر دراز کو تالا لگانے کے بعد ایک راؤنڈ لینے کے لیے باہر نکل آئی۔ ادارے سے تیمور کے علیحدہ ہونے کے بعد سے بزنس خاصا مندا ہو گیا تھا۔ نیا آدمی میں نے قصداً نہیں رکھا تھا کہ کسی ایک کرائسس میں بیٹھ جانے سے قبل میں نیا آدمی رکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اللہ وسایا ہی کسے گزارا ہو رہا تھا۔ نئی پارٹیز اور نئے آرڈرز پکڑنا اس کے بس کی بات نہ تھی وہ تو چڑیا پر چڑیا بٹھانے کے مصداق محض پرانی پارٹیز ہی سے ربط ضبط رکھے ہوئے تھا۔ کام کم ہوتے دیکھ کر ممی کافی متفکر تھیں اور میں ان سے بھی زیادہ۔

○

کئی دن بعد مجھے تیمور کے وکیل کی جانب سے ایک اور رجسٹرڈ خط موصول ہوا۔ تیمور کے وکیل نے لکھا تھا۔

محترمہ عالیہ نادر صاحبہ!

السلام علیکم

ایک خط اس سے قبل بھی آپ کی خدمت میں ارسال کیا جا چکا ہے مگر آپ کی جانب سے نہ جواب موصول ہوا نہ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ جیسا کہ میں پہلے آپ کو مطلع کر چکا ہوں، میرے موکل تیمور عالم حویلی میں اپنی شراکت سے بغیر قیمت لیے آپ کے حق میں دستبرداری کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں ضروری کارروائی کے لیے آپ جلد از جلد رابطہ قائم فرمائیں۔

آپ کا مخلص

ایڈووکیٹ عبدالصمد حلبی۔

گزشتہ چند دن سے میں جس ذہنی کرب سے دوچار تھی، اس کا اندازہ میں ہی کر سکتی تھی۔ میرے قلب و ذہن میں جوار بھاٹے کی سی کیفیت تھی۔ اللہ وسایا کو سامنے پاتی تو میرا دل محمود ظفر کے خط کے ان اندراجات کی تصدیق یا تردید کے لیے ضدی بچے کی طرح مچلنے لگتا جن کے مطابق کاکا اور

محمود ظفر کے درمیان دیوار کھڑی کرنے میں اللہ وسایا ممی کا دست راست بنا رہا تھا مگر کیتوں سے محتاط رہنے کی تربیت اور مرد ذات سے نفرت کا احساس بچپنے دن کو آنکھیں دکھا کر منہ چھوڑ دینے کی تنبیہ کرتے گئے۔ ممی سامنے نہ ہوتیں تو دل کہتا: پوچھ تو سہی کہ اس خط میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ؟ اور جب ممی سامنے ہوتیں تو ان کے خشک چہرے پر نظر پڑتے ہی میرا دل مجھے جھنکارنے لگتا: یہ سب کچھ تیرا کیا دھرا ہے، نہ تو عدالت میں پہنچی ہوتی، نہ معاملہ طول کھینچتا۔ چپ چاپ آدھی حویلی اس کے حوالے کر دینا تھی یعنی نچلی منزل اسے دے دی جاتی اپنے گزارے کے لیے اوپر کا حصہ بہت تھا: میں دل کی یہ ڈانٹ پھٹکار سن کر بدحواسی ہونے لگتی۔ کاش! اب مجھے پتا ہوتا کہ اصل چکر کیا تھا اور کاکا مجھے کسی منجدھار میں چھوڑ گئی تھیں تو میں ہرگز ہرگز اسے سر پر کرنے کا موقع نہ دیتی۔ کیسی مشکل میں پھنس گئی تھی میں....

کوئی نہ تھا جسے بتا سنا کر مشورہ اور رہنمائی حاصل کی جا سکتی ممی کو تیمور سے میری مقدمہ بازی اور پھر عدالت کے فیصلے نے اس قدر مشتعل اور متفکر کر دیا تھا کہ اب میں انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اگرچہ دل نے بیچ بچاؤ کا کردار ادا کرنے کو بارہا آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

تیمور کے وکیل کی جانب سے موصول ہونے والے اس دوسرے خط نے میری پریشانی میں اور اضافہ کر دیا تھا کہ ممی کے ملال اور پریشانی میں اضافے کا خدشہ مجھے ان سے ان خطوط کا تذکرہ کرنے کی اجازت نہ دے رہا تھا۔ مقدمہ ہارنے کے بعد ایڈووکیٹ احسان ملک سے مشورہ کرنے پر میرا دل نہ ٹھکتا تھا۔ لے دے کر بس اپنے پرانے وکیل صاحب ہی بچتے تھے جن سے مشورہ کیا جا سکتا تھا لیکن محمود ظفر کے طویل مکتوب نے مجھے وکیل صاحب کے بارے میں بھی شش و پنج میں مبتلا کر دیا تھا۔ مذکورہ خط کے اندراجات کے مطابق تو وکیل صاحب بھی اس کہانی کا ایک ایسا کردار تھے جنھوں نے کاکا کو حویلی کے بٹوارے کے سلسلے میں اپنے قانونی مشوروں سے نوازا تھا اور کاکا کے انتقال کے بعد وکیل صاحب کے رویے کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات کچھ... بعید از قیاس بھی معلوم ہوتی تھی۔ کاکا کی وصیت سے ممی کو آگاہ کرنے کے بعد وکیل صاحب نے مجھ سے جو باتیں کی تھیں وہ مجھے ابھی حرف بہ حرف یاد تھیں... انھوں نے ممی کا حوصلہ اول روز تو پست کر دینے کی کوشش کی تھی اور تیمور کو ہوّا بنا دیا تھا کہ اور کم کی سکے سہی۔ ان کا بعد کا رویہ بھی اب غور کرنے پر خاصا معنی خیز محسوس ہوتا تھا۔ تیمور پر دباؤ ڈالنے کے بجائے وہ مستقل ممی کو مصالحت اور مفاہمت پر مجبور کرتے رہے تھے۔ تا آں کہ ممی نفسیاتی طور پر اس قدر دباؤ میں آ گئیں کہ تیمور سے خائف رہنے لگیں۔ اس کا سامنا کرتے گھبرانے لگیں بلکہ مجھے بھی اس کے مقابلے پر آنے سے باز رکھنے کی انھوں نے حتی الامکان کوشش کی اور جب میں اس کے للکارنے پر مقابلے کو سامنے آ گئی تو بجائے میرا حوصلہ بڑھانے اور ساتھ دینے کے ممی مجھ سے خفا ہو گئیں... مجھ سے ان کی یہ پہلی باقاعدہ اور تلخ ترین خفگی تھی اور جب فیصلہ تیمور کے حق میں ہو گیا تو بھی ممی نے معاملات کو الجھانے کا ذمے دار مجھی کو ٹھہرایا اور کئی ماہ تک مسلسل کوفت اور ذہنی دباؤ کے نتیجے میں ان دنوں بھی ہی مضمحل اور بیمار سی نظر آنے لگی تھیں۔ حالات کے مزید الجھنے اور ممی کی پریشانی میں اضافے سے بچاؤ کے لیے کسی سمجھ دار اور ہوش مند آدمی سے مشورہ لینا لازم ہو گیا تھا۔ ساری راہیں مسدود پا کر مجھے اپنے پرانے وکیل صاحب سے ہی رجوع کرنا پڑا۔ بدقسمتی سے مجھے کاکا کی طرح گاڑی چلانا ابھی نہیں آتی تھی۔ گھر سے تنہا نکلتی تو ممی کا شک و شبے میں مبتلا ہو جانا یقینی ہوتا۔ با دل ناخواستہ اور مجبوراً مجھے اللہ وسایا کے ساتھ ہی جانا پڑا۔ ممی کو میں نے یہی بتایا تھا کہ میں اپنے دستکاری مرکز کے لیے کچھ سامان خریدنے جا رہی ہوں۔

وکیل صاحب سے وقت طے کیے بغیر ان سے ملنے کے لیے جانا اور ان کا اپنے دفتر میں مل جانا بھی حسن اتفاق ہی تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت کوئی کلائنٹ بھی انھیں اپنے مسئلے میں الجھائے نہ بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وکیل صاحب خوش دلی سے مسکرائے۔

"اوہو! آج تو عالیہ بی بی تشریف لائی ہیں؟"

وکیل صاحب کی گرم جوشی اور ہجوم نے مجھے خفت سے دوچار کر دیا تھا۔ تیمور کے خلاف عدالت میں رجوع کرنے کے سلسلے میں میں نے وکیل صاحب تک سے مشورہ کرنے کی زحمت نہ کی تھی حالاں کہ مجھے کرنا چاہیے تھا۔ اول تو وہ نانا جان کے زمانے سے قانونی معاملات کے متعلق ہمارے خاندان کے مشیر رہے تھے۔ دوسری بات یہ کہ کاکا کی وصیت منظر عام پر لانے کے بعد وکیل صاحب نے یہ بطور خاص مجھ سے کہا تھا کہ اگر حویلی کے سلسلے میں فریق دوم یعنی تیمور سے میرا کوئی تنازعہ ہو تو وکیل صاحب میری مدد رہنمائی کو موجود ہوں گے مگر میں نے اپنی مرضی سے ایک نئے وکیل کا انتخاب کیا تھا۔ وجہ بہرحال یہی تھی کہ میں جانتی تھی

وکیل صاحب ممی کی طرح میرا حوصلہ بھی پست کر دیں گے اور قانونی نکات، رموز اور پیچ و خم سے خائف کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر میری بدقسمتی مجھے سر جھکائے وکیل صاحب کے روبرو لے ہی آئی تھی۔

"تشریف رکھیے۔" وکیل صاحب نے کہا۔ "کہیے کیسے آنا ہوا؟"

میں ہارے ہوئے جواری کی طرح ان کے روبرو بیٹھ گئی۔ دل کا درد دھوئیں کے بادلوں کی طرح میرے حلق میں امڈ آیا۔ میں خود کو بہت بے بس اور بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔

"ہاں عالیہ بی بی! کیسے آنا ہوا؟"

میں نے اپنے بیگ سے تیمو کے وکیل کی جانب سے موصولہ دونوں خطوط نکالے اور وکیل صاحب کی طرف بڑھا دیے۔ وکیل صاحب نے یکے بعد دیگرے دونوں خطوط پڑھے پھر عینک اتار کر میری سمت دیکھتے ہوئے مسکرا دیے اور بولے "ویری گڈ۔ یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔"

"نہیں وکیل صاحب!" میں اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہ پا سکی۔ "میں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"وکیل صاحب! آپ خود سوچیے جو شخص آٹھ نو ماہ تک عدالت میں میرے خلاف لڑتا رہا ہو کیا میں ان خطوط کو اس کی کسی گہری چال پر محمول کرنے میں حق بجانب نہیں ہوں گی؟"

"معاف کیجیے گا بی بی! پہل آپ کی طرف سے ہوئی تھی باوجودیکہ میں آپ کو اور آپ کی ممی صاحبہ کو جملہ امکانات سے آگاہ کر چکا تھا۔"

"وکیل صاحب! فریاد وہی کرتا ہے جو زیادتی کا شکار ہوتا ہے۔"

"مسائل افہام و تفہیم سے حل کیے جائیں تو زیادہ بہتر ہوتا ہے بی بی!"

"بہت کوشش کی مگر..."

"مگر کیا؟"

"اس نے ہماری نرمی کو کمزوری پر محمول کرنے کی کوشش کی۔"

"اور آپ اپنی ممی کی انگلی تھامے عدالت جا پہنچیں۔"

میں نے تلملا کر وکیل صاحب کی جانب دیکھا۔ ان کے لہجے سے مجھے گہرے طنز کی بو آ رہی تھی۔

"وکیل صاحب! وہ فیصلہ صرف میرا تھا۔ ممی کو تو اس وقت پتا چلا جب مقدمہ داخل کیا جا چکا تھا۔"

"کیا واقعی؟" وکیل صاحب نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

"جی ہاں، بلکہ ممی تو اب تک اس بات پر مجھ سے ناراض ہیں۔"

وکیل صاحب کچھ دیر کو سوچ میں پڑ گئے پھر بولے۔ "حیرت ہے!"

"ممی کی ناراضگی پر؟"

"جی نہیں، آپ کی جرأت اور آپ کی ممی کی بے خبری پر۔"

"ممی تو اس حد تک پریشان ہو چکی ہیں اس سانحے سے کہ بیمار نظر آنے لگی ہیں۔ آپ یقیناً حیران ہوں گے یہ سن کر کہ ممی کی پریشانی میں اضافے کے خدشے کے تحت میں نے یہ دونوں خطوط ممی کو اب تک نہیں دکھائے ہیں۔"

"اچھا!" وکیل صاحب نے حیرانی کا اظہار کیا۔ "ویسے میں سمجھتا ہوں کہ یہ خط دیکھ کر تو ان کی پریشانی رفع ہو جانا چاہیے کہ فریق دوم کچھ لیے دیے بغیر ہی حویلی میں اپنی شراکت سے دستبرداری پر آمادہ ہو گیا ہے۔"

"یہ آپ کا خیال ہے وکیل صاحب۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر میں یہ خط ممی کو دکھا دوں تو ان کی پریشانی [illegible] بڑھ جائے گی۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ ان خطوں کے پیچھے یقیناً کوئی گہری سازش کارفرما ہے۔"

"ہو سکتا ہے آپ کا خیال درست نہ ہو۔"

"بہرحال وکیل صاحب! سابقہ حالات کی روشنی میں تو میں اعتبار نہیں کر سکتی۔"

"کیا یہ فیصلہ ہے؟" وکیل صاحب نے گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"جی بالکل آخری فیصلہ۔" میں نے قطعیت کے ساتھ کہا اور کچھ دیر خاموشی کے بعد بولی۔ "وکیل صاحب! اب آپ مجھے مشورہ دیجیے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"بی بی! ایک وکیل کی حیثیت سے میرا کام تو ناممکنات میں ممکنات کی تلاش ہے۔ ہم مایوسی میں امید کی کرنیں تلاش کرتے ہیں لیکن جب آپ اعتبار کرنے پر آمادہ ہی نہیں تو میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ جب آدمی فیصلہ کر چکے تو پھر مشورے کی کیا ضرورت؟"

مجھے رنج و خفت کے ملے جلے احساس نے آ لیا۔ خفت اس امر پر کہ واقعی یہ حماقت ہی تو تھی کہ میں اپنا فیصلہ سنانے کے بعد وکیل صاحب سے مشورہ چاہ رہی تھی اور رنج اس امر پر کہ وکیل صاحب کے بقول اگر وکیل ہونے کے ناتے ان کا کام

تاہم کانات میں امکانات اور مایوسی میں امید کی کرنوں کی تلاش تھا تو وکیل صاحب نے ہمارے لیے امید کی کرنیں تلاش کرنے کے بجائے ہمارے حوصلے پست کر دینے کی کوشش کیوں کی تھی تاہم میں نے اس بحث میں الجھنا مناسب نہ سمجھا۔ وکیل صاحب کہلت نے باوجودیکہ ان کا لہجہ انتہائی شائستہ تھا مجھے دکھ پہنچایا تھا۔

"خیر آپ یہ بتائیے کیا پینا پسند کریں گی؟ چائے کافی یا لسی؟"

"کچھ نہیں وکیل صاحب۔" میں نے شکستہ دلی سے کہا "یہ سب کیسے ممکن ہے۔"

"وہ... جی بات دراصل یہ ہے کہ باہر گاڑی میں عثمہ لیلا میرا منتظر بیٹھا ہے۔"

"اگر آپ کہتی ہیں تو اسے اندر بلوائے لیتا ہوں۔"

"نہیں! وکیل صاحب! بس اب اجازت دیں! ویسے بھی میں ممی کو بتائے بغیر آپ کے پاس آئی ہوں کسی تذکرہ نہ کیجیے گا ان سے۔"

"اس رازداری کی کوئی خاص وجہ؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں، بس میں انھیں مزید پریشان نہیں دیکھنا چاہتی، پتا نہیں کیوں اب وہ ذرا سی بات پر بہت گھبرا جاتی ہیں۔ حالانکہ پہلے ایسا نہیں تھا۔"

وکیل صاحب نے ایک گہری سانس لی اور بولے "عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بیا ہوتا ہے انسان زود رنج ہو جاتا ہے بسا اوقات اس کے مزاج میں غیر معمولی تغیرات رونما ہوتے ہیں، ایسے تغیرات جن کا آپ گمان بھی نہیں کر سکتے۔"

میں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ وکیل صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے ممی کو کمزور پڑتے دیکھنا خواہ اس کے اسباب جو بھی تھے کم از کم میرے لیے ایک ناقابل گمان تجربہ تھا اور ان کی کمزوری کا یہی احساس مجھے ان سے اس خط کے اندراجات کی تصدیق یا تردید چاہنے کی اجازت نہ دیتا تھا جس نے گزشتہ کئی دنوں سے میرے ذہن میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔

وکیل صاحب کے اصرار پہ مجھے چائے پینا ہی پڑی اور باوجود تمام تر دل شکستگی کے مجھے ان کے سامنے سے مسکراتے ہوئے اٹھنا پڑا۔

"ایک منٹ عالیہ بی بی!" وکیل صاحب نے اپنی دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جی؟" میں ہمہ تن ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"آپ کی ایک امانت ہے میرے پاس غالباً اسے آپ کے حوالے کرنے کا وقت آ گیا ہے۔"

"امانت! کیسی امانت وکیل صاحب؟" میں نے تعجب سے کہا۔

وکیل صاحب نے اپنا بریف کیس کھولا اور بریف کیس کی ایک مخصوص جیب سے بالشت بھر لمبا ایک سفید لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"یہ کیا ہے وکیل صاحب؟"

"بی بی! رعنا بی بی مرحومہ آپ کے نام یہ لفافہ میری تحویل میں اپنی اس ہدایت کے ساتھ چھوڑ گئی تھیں کہ حویلی کی ملکیت اور اس کے بٹوارے کے سلسلے میں فریق دوم سے آپ کے کسی شدید تنازعہ کی صورت میں آپ کی یہ امانت آپ کے سپرد کر دی جائے۔"

"اس میں ہے کیا؟" میں نے لفافہ وکیل صاحب سے لے کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا سفید لفافے کے اگلے رخ پہ میرا پورا نام و پتا درج تھا اور پچھلا رخ لاکھ سے سربمہر تھا۔

"بی بی! یہ میں نہیں جانتا کہ اس میں کیا ہے اور جان بھی کیوں کر سکتا ہوں۔ آپ کی آنٹی یہ لفافہ مجھے جس طرح دے گئی تھیں یہ آج تک ویسے کا ویسا محفوظ پڑا تھا ایک وکیل کو کسی بھی قیمت پر اپنے موکل کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہیے۔ خدا گواہ ہے کہ نہ اس کے ملفوفات کے متعلق مجھے کچھ علم ہے نہ ہی رعنا بی بی مرحومہ نے مجھے کوئی اشارہ دیا تھا البتہ انھوں نے یہ ضرور کہا تھا کہ اگر عالیہ بی بی کا حویلی کے دوسرے شریک سے کوئی تنازعہ نہ ہو اور دونوں مل جل کر رہنے لگیں تو پھر اسے مع اس کے ملفوفات ضائع کر دیا جائے۔"

شاید کوئی نئی افتاد، میرے دل نے سرگوشی کی جی میں آیا وکیل صاحب سے پوچھوں۔ اگر آپ تیمور سے میرے اس تنازعہ سے قبل مر جاتے تو؟ مگر میں اپنا یہ سوال زبان پر نہ لا سکی۔ لیکن اگلے ہی لمحے وکیل صاحب کی معاملہ فہمی نے مجھے ششدر کر دیا۔

"اگر میں یہ ذمے داری نبھانے سے قبل ہی مر گیا ہوتا تب بھی یہ امانت میرے ماتحت وکیل صاحب کے توسط سے آپ تک اسی قدر حفاظت سے پہنچتی۔"

کیا وکیل صاحب کو الہام ہوتا ہے! میں نے بے حد حیرانی سے سوچا۔

"اچھا وکیل صاحب اب اجازت دیجیے گھر میں عمدہ بھی آ گئی ہو گی۔"

"کوئی نیا قصہ سنانے؟"

وکیل صاحب کی مسکراہٹ نے مجھے خجل کر دیا۔ تبھی شاید میں نے اپنی خجالت کو دباتے ہوئے کہا۔

وکیل صاحب کے دفتر سے نکلتے ہوئے میں مایوس؟ بلکہ ایک نئے تذبذب سے دوچار تھی۔ مایوسی اس امر پر کہ میں وکیل صاحب سے مشورہ اور مدد لینے آئی تھی اور خجالت لے کر لوٹ رہی تھی اور تذبذب اس بات پر کہ اس لفافے میں کیا تھا؟

باہر گاڑی میں اللہ وسایا میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ گاڑی سے نکلا اور انتہائی مستعدی سے اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ میرے لیے وا کر دیا۔ میں بیٹھ چکی تو اس نے دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا ادھر اس نے اسٹیئرنگ سنبھالا ادھر میں نے لفافہ چاک کیا۔ لفافے میں سے ایک خط برآمد ہوا۔ کاکا کی تحریر تھی میرے نام۔

جانِ کاکا!

دعائیں۔

جب تمھیں میرا یہ خط ملے گا اس وقت تک شاید تمھارے دل پر میری یادوں کے نشان بہت مدھم پڑ چکے ہوں گے بلکہ ہو سکتا ہے مٹ بھی چکے ہوں۔ وکیل صاحب کو میں نے ہدایت کی ہے کہ یہ خط صرف اسی صورت میں تمھارے حوالے کیا جائے جب حویلی کے دو مشترکہ مالکوں میں سے ایک دوسرے کے حق میں دستبرداری کا فیصلہ کر لے۔ مجھے یقین ہے کہ تم حویلی چھوڑنے کا حوصلہ نہیں کر سکو گی دستبرداری کا فیصلہ جب بھی ہوگا تیمور کی جانب سے ہوگا۔ اور وہ بھی انتہائی صورت میں کیوں کہ وہ مجھ سے وعدہ کر چکا ہے کہ ایسا جب بھی ہوگا کسی انتہائی صورت ہی میں ہوگا۔ اس خط کا تمھارے ہاتھوں میں پہنچ جانا ہی اس امر کی سب سے بڑی گواہی ہے کہ تیمور کو وہ انتہائی صورت درپیش آ چکی ہے۔ کاش! ایسا نہ ہوا ہوتا۔

میری جان! حویلی کی بابت میرے فیصلے سے تمھیں دکھ پہنچا تھا۔ کیوں میرا اندازہ درست ہے نا؟ مگر میں اپنے دل کی تمام تر سچائی کے ساتھ تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ میرا مقصد تمھیں یا آپا کو دکھ پہنچانا یا کسی الجھن میں ڈال دینا ہرگز نہیں تھا۔ میں نے تو یہ فیصلہ اس لیے کیا کہ تب تمھارے اور زندگی کی سچی خوشیوں کے بیچ حائل خلیج کو پاٹ دینے کی متمنی تھی۔ جان! جو راستہ تم نے اپنے لیے منتخب کر رکھا ہے اس کی ویرانی مجھے ان دنوں بھی ستایا کرتی تھی جب میں تمھارے پاس ہوا کرتی تھی۔ میں تو تمھارا راستہ خوش رنگ خوشبودار پھولوں اور جھلملاتے ستاروں سے آراستہ دیکھنا چاہتی تھی اور اگر مرنے کے بعد روحیں اپنے پیاروں کے دکھ سکھ سے آگاہ و آشنا رہ سکتی ہیں تو یقین کرو مرنے کے بعد بھی میری سب سے بڑی تمنا یہی ہوگی کہ میں تمھارے راستے میں کہکشاں بچھی دیکھوں۔ تمھارے راستے کے دونوں اطراف پھول ہی پھول ہوں اور تم مسکراہٹوں کے جگنو بکھیرتی سج سج کر اپنے راستے میں بچھی کہکشاں پر قدم دھرتی زندگی کی خوشیوں کو گلے سے لگاتی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہو، مگر تنہا نہیں، کسی کے ساتھ۔ تم میرا مطلب سمجھ گئیں نا؟

جانِ جی! یہ سچ ہے کہ تمھاری ممی کو تمھارے بابا کی طرف سے دکھ پہنچا تھا اور انھوں نے اس دکھ کو غیر معمولی شدت کے ساتھ اپنی روح میں اتار لیا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ تمھاری ممی کو تمھارے بابا سے بے اندازہ محبت تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ جب وہ لوگ جنھیں ہم اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہوں ہمیں دھوکا دے جائیں، ہمارا مان توڑ دیں تو ہم بکھر کر رہ جاتے ہیں۔ تمھاری ممی کے ساتھ یہی ہوا۔ تمھارے بابا کی بے وفائی نے انھیں بکھیر کر رکھ دیا۔ رنج اور وحشت کی شدت میں انھیں کچھ نہ سوجھا تو انھوں نے اپنے وجود کی یہ کرچیاں دوسروں کے راستے میں بچھا دیں۔ یہ ان کی ایک ایسی غلطی تھی جس سے میں نہ کبھی متفق ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔ اب یہ اور بات ہے کہ میں اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو مجھے تمھاری ممی سے تھی، کبھی کھلم کھلا ان سے اس مسئلے پر اختلاف نہ کر پائی۔

جانِ کاکا! میں تو اس بات کی قائل ہوں کہ اس دنیا میں کسی انسان کو ملنے والا کوئی دکھ اپنی نوعیت میں منفرد نہیں ہوتا۔ ہم سے پہلے

بہت سے اس کٹھن منزل سے گزر چکے ہوتے ہیں یا ہمارے بعد آنے والوں کو اس منزل سے گزرنا ہوتا ہے... پھر ایک مسلمان ہونے کے ناتے ہمارا ایمان ہونا چاہیے کہ خدا ہم پر ہماری سکت' ہماری حد سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا تو جب یہ طے ہے کہ ہمیں ملنے والے دکھ نہ تو اپنی نوعیت میں منفرد اور انوکھے ہوتے ہیں اور نہ ہی ہماری سکت سے باہر تو پھر جنونانہ حد تک اس دکھ کو نہ صرف اپنے اوپر طاری کر لینا بلکہ اپنی تیرہ بختی کے گھنگھور اندھیاروں کو دوسروں کے مقدر پر بھی مسلط کر لینا چہ معنی دارد؟

تمھارے پاپا اس دنیا کے پہلے مرد نہیں تھے جنھوں نے دوسری شادی کی اور پہلی بیوی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ نہ ہی تمھاری ممی مرد کے ہاتھوں دکھ اور بے وفائی کا صدمہ پانے والی پہلی عورت تھیں۔ ان سے پہلے اس دنیا کی ان گنت عورتیں اس پل صراط پر سے گزر چکی تھیں، گزر رہی ہیں اور نہ جانے ابھی کتنی اس راہ سے گزریں گی۔ تمھاری ممی نے یہ جانا کہ وہ اس راستے کی یکہ و تنہا مسافر ہیں۔ جھنجلا کر انھوں نے اپنے دکھ اوروں کی جھولی میں ڈال دیے تھے... تم چوں کہ براہ راست انھی کے اختیار میں تھیں اس لیے تمھیں زیادہ نقصان پہنچا۔ تم الجھ کر رہ گئیں اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہیں کہ تمھیں کیا کرنا ہے؟ زندگی کس طور گزارنا ہے؟ تمھاری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مسعود مرکز' جسے تم اپنی زندگی کا مقصد قرار دے بیٹھی ہو میرے نزدیک تو وہ ایک بھول بھلیاں ہے جس کے الجھے ہوئے راستوں میں تم ٹامک ٹوئیاں مارتی پھر رہی ہو اور ایک خودساختہ خوف تمھیں اس بھول بھلیاں سے باہر نکل آنے کا موقع ہی نہیں دیتا... تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ خوف کیا ہے؟ گڑیا! تم جو مردوں سے نفرت کا دعویٰ رکھتی ہو تمھیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ نفرت اور خوف میں فرق کیا ہے؟ تمھیں مردوں سے نفرت نہیں بلکہ تم ان سے خائف ہو۔ تم مردوں سے ڈرتی ہو۔ اپنی ممی کی ازدواجی زندگی کے حوالے سے تم مردوں سے خوف زدہ ہو۔ تمھارے ذہن میں یہ خوف کوڑیالے سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ گیا ہے کہ مرد عورت کو دھوکے اور دکھ کے سوا کچھ نہیں دیتے حالاں کہ یہ خیال غلط ہے۔ جان! ہر مرد نہ تو دھوکے باز ہوتا ہے نہ بے وفا بلکہ سچ پوچھو تو مرد کو عورت کی اوّل آخر پناہ گاہ سمجھتی ہوں۔ تم حیران ہو رہی ہو؟ شاید نہیں ہونا بھی چاہیے... تمھاری ایک غلط فہمی رفع کر دینا اس لیے ضروری سمجھتی ہوں کہ تمھیں الجھانے میں اس غلط فہمی کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ محمود ظفر دغا باز نہیں تھے۔ ان کی کچھ مجبوریاں تھیں جن کا ذکر میں ضروری نہیں سمجھتی' بہرحال یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ میری یہ بیماری جو مرض الموت ثابت ہونے جا رہی ہے میرے ایم اے فائنل کے امتحانات سے قبل ہی میری رگوں میں اتر چکی تھی۔ آئے دن بخار' پیروں کی پنڈلیوں میں اندر ہی اندر دکھن اور مستقل سر درد کو کئی مہینے تک یونیورسٹی کی رنگ برنگی ٹولیوں پر ٹالتے رہنے کے نتیجے میں ایک روز میں ڈپارٹمنٹ کے کوریڈور میں چکرا کر گر پڑی تھی۔ محمود ظفر مجھے اپنی گاڑی میں ڈال کر ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر چند دوائیں دیں اور خون کے چند مخصوص ٹیسٹ تجویز کیے۔ رپورٹ یہ تھی کہ سرطان خون کا آغاز تھا لیکن محمود نے اس مہلک بیماری کے باوجود مجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اور بات تھی کہ کچھ ناگزیر مجبوریوں نے محمود کی راہ روک لی۔ اب اگر میں محمود کی مجبوریوں کو فریب یا ریاکاری پر محمول کرتی تو کیا انصاف ہوتا؟ محمود کو اگر وعدہ شکنی کرنا ہی ہوتی تو وہ میرے شہر سے گاؤں آ جانے کے بعد گاؤں کا راستہ کیوں یاد کرتے؟ اسی لیے میں محمود کی عزت کرتی اور انھیں اپنا محسن سمجھتی رہی۔ عالیہ میری جان! ہم اگر یہ سمجھ لیں کہ زندگی ہمیشہ وہی نتائج ہمارے سامنے نہیں لاتی جن کے ہم خواہاں ہوتے ہیں۔ نتائج ہماری توقعات کے بالکل برخلاف بھی ہو سکتے ہیں تو ہم زندگی سے بالکل بددل اور

مایوس ہو جانے سے بچا سکتے ہیں۔ میں نے بھی کیا اور زندگی سے مایوس نہیں رہی۔

میری جان! تیمور کو میں نے اچھی طرح جانچا اور پرکھا ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس کے خلاف کسی بدگمانی کو دل میں جگہ مت دو۔ میں تم سے، اسے محض حویلی ہی میں نہیں، دل میں جگہ دینے کی سفارش بھی کروں گی۔ تم میری سفارش کا اعتبار کر سکتی ہو کم از کم اس محبت کو حوالہ بناتے ہوئے جو زندگی بھر مجھے تم سے رہی۔

اس خط کو بیٹی کاکا کی آخری راستے سے آخری صدا سمجھو لیں اس کے بعد رابطے کی کوئی کڑی باقی نہیں بچے گی۔ میری اس پکار پر اگر تم اپنے خول سے باہر نکل آئیں تو میں، بلکہ میری روح یہ سمجھے گی کہ تمہیں کاکا سے کچھ محبت تھی ورنہ...؟

دعائیں۔

تمہاری کبھی پلٹ کر نہ آنے والی

کاکا

کاکا کے اس خط نے مجھے شدید جذباتی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ خط پڑھتے ہوئے میری پلکیں بار بار بھیگتی رہیں۔ ختم ہی فقرہ تو گویا میرے حلق میں پھنس بن کر سما گیا۔ میرے لیے آنسوؤں کو پینا ممکن نہ رہا، آنسوؤں کی شوریدہ سر لہروں کو میں نے رومال میں جذب کرنا شروع کر دیا۔ یہ احساس کہ کاکا اب کبھی پلٹ کر نہ آئیں گی میرے دل کو مٹھی میں جکڑے لے رہا تھا۔ محض حویلی ہی نہیں، اپنا جملہ اثاثہ بلکہ خود کو بھی داؤ پر لگا کر میں کاکا کو پھر کبھی نہ پا سکتی تھی... کبھی ان کی صدا نہیں سن سکتی تھی۔ اوہ! ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جن سے ہم پیار کرتے ہیں وہ اچانک اور کبھی پلٹ کر نہ آنے والے راستوں پر کیوں ہو لیتے ہیں؟

اور کتنا حیرت انگیز تھا یہ انکشاف کہ محمود غضنفر کاکا کی بیماری سے بہت پہلے سے واقف تھے؟

کاش! ہم اپنے دکھوں میں اتنے نہ الجھ گئے ہوتے۔ کاکا کی شہر سے گاؤں واپسی پر ہم نے یہ جاننے کی زحمت بھی نہ کی کہ کاکا شہر سے اپنے ساتھ کیا علالتیں لائی تھیں؟ پھر کتنے برس وہ... چپ چاپ اس مرض سے نبرد آزما رہیں۔ یہ معجزہ تھا؟ یا خدا نے ہمیں مہلت دی تھی کہ شاید اس دوران ہم کاکا پر توجہ دے دیتے تو اس پچھتاوے سے بچ جاتے جو اس وقت میرا دل دبوچے رہا تھا۔

جذبات کی روانی میں میں یہ بھی بھول گئی تھی کہ اللہ دسایا اپنے سامنے آویزاں آئینے میں میرا عکس بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ شہر کی صاف ستھری، فراخ اور ہموار سڑکوں پر سے ہوتی گاڑی جب گاؤں کو جانے والے نیم پختہ اور غیر ہموار راستے پر نکل آئی تو میں نے اللہ دسائے سے کہا: "تمی سے وکیل صاحب کے پاس جانے کا ذکر نہ کرنا۔"

اللہ دسائے نے اپنے سامنے آویزاں آئینے میں دیکھا اور بولا: "بی بی! آپ نے میرے سے کچھ بولا؟"

"ہاں، میں کہہ رہی تھی تمی کو پتا نہ چلے کہ ہم وکیل صاحب کے پاس گئے تھے۔"

"جی بہتر ہے۔"

رستے کی دھول سے بچنے کے لیے میں گاڑی کی بائیں سمت کی کھڑکی کا شیشہ چڑھانے کے بعد دائیں کھڑکی کا شیشہ اوپر چڑھا رہی تھی کہ میرے کانوں سے اللہ دسائے کی آواز ٹکرائی۔

"بی بی! اجازت دیں تو ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں، کیا؟" میری نظریں بے اختیار آئینے پر جا ٹھہریں۔

"کوئی پریشانی ہے جی؟"

مجھے کیونکہ اپنے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہ دینے کی تربیت دی گئی تھی سو مجھے اللہ دسائے کی یہ جرأت ناگوار گزری۔

"اگر کوئی پریشانی ہے بھی تو تم کیا کر سکتے ہو؟" میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں جی۔ کر تو میں کچھ بھی نہیں سکتا۔ پر جی! جس کا نمک کھایا ہو اس کی پریشانی بندے کو پریشان تو کرتی ہی ہے نا جی!"

میں نے ایک گہری سانس لینے پر اکتفا کیا۔

"ویسے جی آپ تیمور باؤ کی طرف سے زیادہ پریشان نہ ہوں وہ اچھے آدمی ہیں۔"

میں نے بے ساختہ چونک کر سامنے آویزاں آئینے کی سمت دیکھا۔ اللہ دسائے کی نگاہوں کا عکس میری نگاہوں سے ٹکرایا۔ "تم... تم سے کس نے کہا کہ میں تیمور کی طرف سے پریشان ہوں؟"

"کسی نے نہیں بی بی!"

"تو پھر؟"

"گندم کھانے والا بندہ تھوڑی بہت عقل تو رکھتا ہی ہے جی!"

"اوہ... اوہ... یہ تم سے کس نے کہا کہ تیمور اچھا آدمی ہے؟"

"بی بی صیب! بندے کی تھوڑی پہچان رکھتا ہوں جی
یہ بھی۔"

میں نے اپنی نگاہیں آئینے پر مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔
"کیا تم جانتے ہو کہ وہ کون ہے؟ کس کا بیٹا ہے؟ اور کہاں
رہتا ہے؟"

اللہ وسایا چونکا اور کچھ گھبرا کر بولا "ناں جی، میرے کو
بھلا کیا معلوم!"

اس کا چونکنا اور گھبرانا میرے لیے گہرے معنی رکھتا تھا۔
میں نے بدستور آئینے میں نظر آنے والے اللہ وسائے کے نحیف
چہرے پر اپنی نظریں جمائے ہوئے کہا "اور اگر میں یہ کہوں کہ
تم تیمور کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو؟"

"نا جی ناں، آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"اچھا!"

"ہاں جی۔"

میں نے مصلحتاً خاموش ہو جانا بہتر سمجھا بقیہ راستہ
خاموشی سے کٹا مگر اس خاموشی کے دوران میں طے کر چکی تھی کہ
آج اللہ وسائے سے بات کروں گی۔

حویلی پہنچنے کے بعد میں نے اللہ وسائے سے کہا۔

"اوپر جانے سے پہلے ذرا تم میرے کمرے میں ہو جانا۔"

"بہتر جی!"

مجھے اپنے کمرے میں پہنچے پانچ منٹ بھی نہ گزرے
تھے کہ اللہ وسایا آ پہنچا۔ "جی بی بی صیب؟"

"بیٹھو۔"

اللہ وسایا چپ چاپ میرے روبرو ایک کرسی پر بیٹھ
گیا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا وہ کچھ
مضطرب سا نظر آ تا تھا۔ "ہاں، تو تمہارا خیال ہے مجھے اس سلسلے
میں غلط فہمی ہوئی ہے کہ تم تیمور سے اچھی طرح واقف ہو؟" میں
نے اللہ وسائے کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی۔" وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر بولا۔

"اور اگر میں یہ کہوں کہ میں سب کچھ جانتی ہوں؟"

اللہ وسائے نے چونک کر میری طرف دیکھا، اس کی
آنکھوں سے گھبراہٹ مترشح تھی۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے اگلی
ضرب پوری شدت سے لگانے کی کوشش کی۔ "میں جانتی
ہوں کہ تیمور کے بارے میں تمہیں بہت کچھ معلوم ہے۔ تم جانتے
ہو کہ وہ کون ہے کس کا بیٹا ہے اور کہاں رہتا ہے..."

"ناں جی، مجھے کچھ نہیں ہے پتا۔"

"مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش مت کرو۔ مجھے سب کچھ
معلوم ہو چکا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ برسوں پہلے تیمور کے باپ
کے گھر جو شخص ان کا سعودی عرب سے آنے والا رشتے دار بن کر
پہنچا تھا وہ تم تھے۔ ملتان جا کر محمود ظفر کی ماں، بیوی اور بہنوئی کے
نام ڈاکیے کو خط بھی تم ہی نے دیے تھے اور ان خطوں کو محمود ظفر
کے سسرال اور ان کی ماں اور بیوی کو بحفاظت پہنچانے کے بدلے
تم نے ڈاکیے کو اچھی بخشش بھی دی تھی۔ بے شک یہ سب کچھ
تم نے اس گمان میں کیا کہ شاید کاکا کی بہتری اسی میں تھی مگر کیا
تم انکار کر سکتے ہو کہ تم نے یہ سب کچھ نہیں کیا تھا؟"

اللہ وسائے کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا۔

"کیا تم انکار کر سکتے ہو؟" اب میں نے ذرا کڑک
کر کہا۔

"بی بی!" اللہ وسایا دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کے سرے باہم
جوڑتے ہوئے سر جھکا کر بولا۔ "بڑی بی بی صیب جی
کا حکم تھا جی، ہم کمین لوگ سرکار کے حکم کی تعمیل کے پابند
ہوتے ہیں جی۔"

گویا محمود ظفر نے اپنے خط میں بابت جو کچھ لکھا تھا
وہ غلط نہ تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ جب شام کاکا کا نکاح ہو نا تھا اُس

رات محمود ظفر کے بہنوئی کی طرف سے خط لے کر حویلی کون آیا تھا؟"

غالباً اللہ وسائے کو میری جانب سے اس سوال کی توقع نہ تھی۔ بے ساختہ چونک کر اس نے میری طرف دیکھا پھر بولا۔

"پتا نہیں جی۔"

"پتا نہ ہونے کی کیا بات، جو شخص حویلی آیا تھا اس سے تم نے یہ تو ضرور پوچھا ہوگا کہ وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے؟"

"وہ جی انہی کا کوئی بندہ تھا۔ میرا مطلب ہے ممو صیب جو، وکیل کے سسرال کا۔"

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے تمہیں پتا نہیں کہ وہ کون تھا اور اب تم کہہ رہے ہو کہ وہ انہی کا کوئی بندہ تھا۔"

"یہ میں اپنا ذاتی خیال ظاہر کر رہا ہوں جی۔"

"ہوں۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے گہری نگاہوں سے اللہ وسائے کو دیکھا پھر کہا۔ "ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ خط کوئی اور نہیں لایا تھا، تم خود لائے تھے۔"

"میں ... ؟ میں جی ..... ؟" اللہ وسائے نے ہڑبڑا کر کہا۔

"ہاں تم۔" میں نے پورے وثوق سے کہا۔

"بی بی! آپ کو کوئی غلط ..."

"نہیں۔" میں نے اللہ وسائے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے کوئی غلط فہمی نہیں، میں نے جو بات کہی ہے پورے وثوق سے کہی ہے۔"

دیگر حالات و واقعات کی روشنی میں شبے تکا لگانے کا حق بھی تھا مگر یہ تکا تیر بن کر نشانے پر جا لگا۔

اللہ وسائے نے لحظہ بھر کو میری طرف دیکھا پھر سر جھکا کر بولا۔ "بی بی! میرے کو پہلے ہی شبہ تھا کہ رعنا بی بی صیب آپ کو سب کچھ بتلا گئی ہیں۔ پر بی بی! میرا کیا قصور جی! ہم تو کمین لوگ ہیں جی، سرکار کے حکم کے پابند۔ میں نے رعنا بی بی صیب سے بھی ہتھ جوڑ کے یہی بولا تھا جی اور اب آپ سے بھی یہی بولتا ہوں۔"

محمود ظفر کے خط کی تصدیق ہو جانا میرے لیے ایک نئے ذہنی صدمے کے مترادف تھا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے اللہ وسائے سے پوچھا اور اس سے مجھے اپنی آواز آپ اجنبی لگی تھی۔

"بی بی! یہ سوال تو آپ بڑی بی بی صیب جی سے پوچھیں جی۔"

مجھے اللہ وسائے سے اس جرأت مندانہ جواب کی توقع نہ تھی۔

بہرحال! اس کے جواب نے میرے ذہن میں دیوانہ وار شور مچاتے اور بے ہنگم رقص کرتے سوالوں کو ان کا بوریا بستر سمیٹ دینے پر مجبور کر دیا۔

میرے دل میں ممّا کے خلاف احتجاج کی ایک شوریدہ سر لہر ابھری اور اسی دل نے جو گزشتہ کئی روز سے اس محبت کو جو میں نے ممّا کے لیے اپنے دل میں رکھی تھی، بے دخل کر دینے کے موقعے تاک رہا تھا، اس کمزور لمحے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا: 'بول، اب بھی کوئی جواز ہے تیرے پاس ممّا سے پیار کرنے کا؟'

میں نے اللہ وسائے سے کہا۔ "ٹھیک ہے تم جاؤ، مگر تم کسی سے کچھ نہیں کہو گے۔"

"کمین لوگ ہیں بی بی، حکم کی تعمیل کے پابند جی۔" اللہ وسایا اٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن ٹھہرو! ایک بات بتاؤ۔" میں نے اللہ وسائے کو روک لیا۔

"جی بی بی؟"

"کیا اب بھی تم کہو گے کہ تیمور کے بارے میں تم کچھ بھی نہیں جانتے؟"

اس نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا اور آہستہ سے بولا۔

"جانتا ہوں جی۔"

"اب تم جا سکتے ہو۔"

اللہ وسائے کے جاتے ہی دل نے پھر وہی سوال دہرایا۔ بہت دیر سر جھکائے بیٹھی رہی، سوچتی رہی، الجھتی رہی۔ پھر میں نے دل سے کہا: میرے پاس بس ایک ہی جواب ہے ممّا سے بدستور محبت کیے جانے کا کہ وہ میری ماں ہیں۔

اس روز اوپر جانے سے پیشتر میں ایک فیصلہ کر چکی تھی مگر ممّا کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کرنے کے لیے مجھے مناسب موقع تلاش کرنا تھا۔

کئی دن کسی مناسب موقع کی تلاش میں گزر گئے اور اسی دوران میری چھٹی حس نے مجھے احساس دلایا کہ ممّا بھی مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہیں۔ بالآخر ایک رات کھانے کی میز پر ممّا نے مجھ سے کہا۔ "بیٹا! مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔"

"مجھے ..... مجھے بھی ..... آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"اچھا!" ممّا نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھا پھر بولیں۔

"چلو پہلے تم ہی کہہ ڈالو۔"

"پہلے آپ بات کرلیں تو اچھا ہے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"نہیں، پہلے میں تمہاری بات سننا چاہوں گی۔" میں کہوں یا نہ کہوں کی کشمکش میں الجھ گئی۔

"ہاں، کہو۔" ممی نے مجھے متذبذب دیکھ کر کہا۔

"وہ... ممی جی.... آپ... آپ نے ایک دفعہ... حویلی... چھوڑ کر کہیں اور... چلے جانے کی بات کی تھی نا... ؟"

"ہاں کی تو تھی۔"

"میں نے اسی سلسلے میں ایک فیصلہ کیا ہے۔"

"فیصلہ ؟" ممی کے لہجے میں استعجاب آمیز سوالیہ کیفیت تھی۔

"جی۔"

"کیسا فیصلہ؟"

"میں..... میں اس حویلی کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ کہیں بھی جانے کو تیار ہوں۔"

"مگر یہ فیصلہ تو نہیں ہے۔ تم متفق ہو جانے والی بات ہوئی۔"

"ممی فیصلہ یہ کیا ہے میں نے کہ میں تیمور کے حق میں حویلی کی ملکیت سے دستبردار ہو جاؤں... آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا ؟"

ممی نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور کچھ دیر تک یک ٹک میری طرف دیکھتی رہیں پھر سر جھکا کر ایک ٹھنڈی سانس بھرنے کے بعد بولیں۔ "جب چھوٹے اپنے بڑوں کو اپنے فیصلے سنانے لگیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بڑوں نے اپنا بھرم کھو دیا ہے...." ممی نے پل بھر کو توقف کیا پھر بولیں۔ "مجھے یاد ہے یہی میز تھی اور کھانے کا یہی وقت... جب حق ری کا کا نے اسی حویلی کی بابت اپنے ایک فیصلے سے مجھے آگاہ کیا تھا۔ اس وقت مجھے گمان بھی نہ تھا کہ اس فیصلے کے پیچھے میرے بے جرم قرار پا جانے کا المیہ چھپا ہوا ہے اور آج.... آج اسی میز پر تم مجھے اپنا فیصلہ سنا کر مجھ پر اپنے اعتماد کے متزلزل ہو جانے کا فیصلہ سنا رہی ہو۔" لحظہ بہ لحظہ ممی کی آواز بوجھل سے بوجھل تر ہوتی چلی گئی۔

ممی کو رنجیدہ ہوتے دیکھ کر مجھے دکھ پہنچا۔

"یہ بات نہیں ہے ممی!" میں نے ممی سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہے میری جان!" ممی بہت دلگیر نظر آنے لگی تھیں۔ انھوں نے کچھ دیر توقف کیا پھر بولیں۔

"جب اولاد ماں سے نظریں چرا کر بات کرے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اولاد ماں سے کوئی بات چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"نہیں ممی..... ! ایسی... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے ممی کی جانب دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں مجھے آنسو جھلملاتے ہوئے دکھائی دیے۔ مجھے تاسف کے گہرے احساس نے آ گھیرا۔ "اگر آپ کو میری بات ناگوار گزری ہے تو مجھے اس کا دلی افسوس ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا قصور نہیں، قصور میرا ہی ہے اور جب قصور ہمارا اپنا ہو تو ہم کسی کو کیا دوش دے سکتے ہیں۔" ممی کے لہجے سے دلی ملال اور شکستگی عیاں تھی۔ ان کے دوسرے فقرے پر میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ تصویر حزن نظر آ رہی تھیں۔ اس سے پہلے میں نے انھیں اس قدر دل شکستہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کچھ دیر جان لیوا خاموشی محیط رہی پھر ممی نے اپنی دونوں کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں باہم پیوست کر کے ایک مسند سی بنائی اور اس پر اپنی ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔ "کبھی کبھی دانستگی یا نادانستگی میں ہم درست راستے سے انحراف کر کے کافی دور نکل آتے ہیں کہ اگر پیچھے پلٹ کر نقطہ آغاز پر واپس پہنچنا چاہیں تو پتا چلتا ہے کہ ہمارے پیچھے اتنے خار اگ آئے ہیں کہ واپس پلٹے تو پیر چلتے چلتے زخم بن جائیں گے۔" اتنا کہہ کر ممی نے دو پل کو توقف کیا پھر بولیں۔ "و میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔"

ممی کو اس قدر دل گرفتہ دیکھ کر میں نے بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور کہا۔ "کیا بات ہے ممی! آج آپ اس قدر رنجیدہ کیوں نظر آ رہی ہیں ؟"

"تھک گئی ہوں۔" ممی نے آہستہ سے کہا۔

"دراصل آپ پچھلے دنوں خاصی ڈسٹرب رہی ہیں۔ یہ اسی کا اثر ہے لیکن اب آپ ہر فکر کو ذہن سے نکال پھینکیں۔ حویلی کو خیرباد کہہ کر ہم کسی ایسی جگہ جا بسیں گے جہاں کوئی ہمیں پریشان کرنے نہ پہنچ سکے۔ بس ہم دونوں ہوں گے۔ اللہ میاں ہوگا اور ماسی بشیراں۔ کاکا کی طرح میں بھی اپنی زندگی آپ کے لیے وقف کر دوں گی۔ زندگی چین سے کٹ جائے گی۔" میں نے قدرے جوش و خروش سے کہا۔

"حویلی کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کیوں کر کر لیا تم نے ؟" سوال بہت ٹیڑھا تھا مگر میں نے پورے اعتماد سے

کہا: "بس ممی جی کر ہی لیا جو شے دکھ پہنچائے اور پریشانی میں اضافے کا سبب بن جائے، اس سے تعلق توڑ لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ حویلی کے قضیے نے آپ کو بیمار کر دینے کی حد تک پریشان کر دیا۔"

"مگر اب تو تمھیں خوش ہو جانا چاہیے۔"

"کیوں؟"

"تیمور نے تمھارے حق میں حویلی کی شراکت سے دستبردار ہو جانے کا فیصلہ جو کر لیا ہے۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

"آپ... آپ... سے... کس... نے کہا؟"

"جس روز تم اللہ وسائے کے ساتھ دستکاری کا سامان خریدنے گئی تھیں اسی روز تیمور کے وکیل کا فون آیا تھا۔ بتا رہے تھے کہ یہی اطلاع انھوں نے دو رجسٹریوں کے ذریعے بھی بھجوائی تھی۔ جوابی رسیدیں تو مل گئیں لیکن رابطہ قائم نہیں کیا گیا۔"

میں نے اپنے دونوں ہونٹ اتنی شدت سے بھینچ لیے کہ اذیت محسوس ہونے لگی۔

"رجسٹریاں آئی تھیں ان کی طرف سے؟"

میں جھوٹ بولنے کی ہمت نہ کر سکی۔ اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا مجھ سے ان رجسٹریوں کا پوشیدہ رکھا جانا اس امر کی دلیل نہیں کہ تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتیں؟"

"جی نہیں..." میں نے ہکلا کر کہا: "یہ بات نہیں ہے ممی! دراصل... میں نے وہ خط آپ کو اس لیے نہیں دکھائے کہ مجھے آپ کی پریشانی بڑھ جانے کا خدشہ تھا۔"

"چلو مانے لیتی ہوں مگر ایک بات بتاؤ تم نے اس کی پیش کش پر غور کرنے کے بجائے خود حویلی کی ملکیت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کیوں کر لیا؟" ممی نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"کیوں کہ تیمور کی یہ نام نہاد مہربانی مجھے کسی نئی افتاد کا پیش خیمہ معلوم ہوتی ہے۔ غور کرنے والی بات ہے کہ جو شخص عدالت میں ہم سے برسرپیکار رہا ہو وہ کیوں کر ہمارا بھلا چاہ سکتا ہے۔ تیمور کے وکیل کے ان خطوں کے پیچھے یقیناً کوئی بڑی سازش کارفرما ہے۔ اس کی سازش کا منہ توڑ جواب دینے کا بس یہی ایک راستہ نظر آتا ہے مجھے کہ ہم حویلی کو چھوڑ جائیں۔ آپ حویلی کے قضیے سے پہلے ہی اتنی پریشان ہو چکی ہیں کہ بیمار نظر آنے لگی ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ مزید پریشان ہوں۔"

"پریشانیوں کا کیا ہے بیٹا! یہ تو بہروپ بھر بھر کے ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔" ممی نے ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا۔

میں نے ممی کو کچھ زیادہ ہی رنجیدہ ہوتے پایا۔

"آج ایک پریشانی ہوتی ہے تو کل دوسری سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ آج ایک فکر تو کل دوسری۔" ممی نے مزید کہا۔

"آپ نہ تو پریشان ہوا کریں، نہ کسی بات کی فکر کیا کریں۔"

"کیا زندہ انسان کے لیے یہ ممکن ہے؟"

"حویلی کی فکر کو تو آپ ذہن سے نکال پھینکیں۔ بہت مشکل تھا میرے لیے حویلی کو خیرباد کہہ دینے کا تصور مگر میں نے ہمت کر ہی لی ہے۔ میرا خیال ہے حویلی چھوڑ دینے کے بعد آپ کی پریشانی ختم ہو جائے گی۔"

"نہیں یہ تمھارا خیال ہے۔ حویلی سے زیادہ فکر تو مجھے اب تمھاری ہے۔"

"میری بھی نہیں!"

ممی نے میری طرف دیکھا ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر بولیں: "بیٹا! وقت سے بڑا جابر حکمران کوئی نہیں۔ انسان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے تمھاری نانی اماں سے بڑے زعم سے کہا تھا کہ میں اپنی بیٹی کو مرد کے سہارے کے بغیر زندگی گزارنا سکھاؤں گی..."

"ہاں تو آپ نے غلط کب کہا تھا۔ دیکھیے نا، میں کتنی اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔" میں نے ممی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ممی نے میرے چہرے پر نگاہ کی اور بولیں: "یہ تمھارا خیال ہے مگر ایک ماں ہونے کے ناتے میں تمھارے لیے کتنی فکرمند رہتی ہوں، اس کا اندازہ بھی کچھ ہے؟"

"ممی جی! کیوں فکرمند ہوتی ہیں آپ؟ میں کتنی خوش اور مطمئن تو ہوں۔" میں نے ممی کے گلے میں اپنی باہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔

انھوں نے ایک لمبی سانس کھینچی پھر بولیں: "بیٹا! دوسروں سے تو ہم کم دھوکا کھاتے ہیں، خود اپنے آپ کو دھوکا زیادہ دیتے ہیں۔ خود فریبی ہم انسانوں کو لگا ہوا ایک بڑا روگ ہے جان! کبھی کبھی خود کو فریب دیتے دیتے ہم اتنی دور نکل آتے ہیں کہ واپسی مشکل ہو جاتی ہے۔ میں نہیں چاہتی بیٹا کہ تم اتنی دور نکل جاؤ کہ واپسی مشکل ہو جائے۔ اگرچہ دور

"تو تم اب بھی نکل آئی ہو عمر وا بیٹی! ناممکن نہیں ہے۔"

میں نے قدرے حیرانی سے ممی کی طرف دیکھا۔ ان کی تمہید مجھے اپنی سمجھ سے بالاتر محسوس ہو رہی تھی۔ انھوں نے میری مشکل تاڑ لی تھی۔

"بیٹی جان! کبھی کبھی بہت دور نکل آنے کے بعد ہمیں پتہ چلتا ہوتا ہے کہ وہ راستہ جس پر ہم چلتے چلے آ رہے تھے درست نہیں تھا۔ اور... دوسروں کی مشکلات کا احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب وہ مشکل خود ہمارے اپنے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ رعنا کے بارے میں امی کی پریشانی کا احساس مجھے اب ہوتا ہے، واقعی وہ پریشان رہتی ہوں گی۔ رعنا کی فکر ان کے ذہن پر یقیناً سوار رہتی ہوگی...." ممی نے چند لمحوں کے وقفے سے مزید کہا: "رعنا کے پاس کس چیز کی کمی تھی۔ روپیہ پیسہ، جائداد، علم، لیاقت سب ہی کچھ تو تھا۔ بیماری سے پہلے وہ دلکش بھی تھی۔ کہنے کو میں اس کی بہن اور تم اس کی بھانجی تھیں۔ ہمیں اس سے محبت کا دعویٰ بھی تھا مگر سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اس دنیا سے مایوس ہی گئی۔ محبت کا دعویٰ رکھنے کے باوجود ہم رعنا کے دکھ سے بے نیاز رہے۔ میں اپنی الجھنوں میں گھری رہی اور تم اپنی مصروفیتوں میں گم۔ اس کی موت کے بعد ہم چند دن رو کر چپ ہو رہے اور بس.... بیٹا! اگر رعنا کا اپنا گھر ہوتا، خاوند ہوتا، بچے ہوتے تو کیا وہ یوں چپ چاپ مرتی؟"

میں نے آنکھیں پھاڑ کر ممی کی جانب دیکھا۔ میں حیران تھی کہ آج وہ کس قسم کی باتیں کر رہی تھیں۔ میری اس حیرانی سے بے نیاز ممی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اگر رعنا کی اپنی اولاد ہوتی تو کیا وہ حویلی کے اس طرح حصے بخرے کرنے پر آمادہ ہوتی۔ شاید نہیں بلکہ مرتے دم تک اس کی خواہش ہوتی کہ اس گھر کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے، بندھا رہے۔ اپنی اولاد کے ہوتے وہ کسی اجنبی اور معمولی حیثیت کے آدمی کو اپنی حویلی کا آدھا حصہ کیوں وصیت کرتی بھلا۔ اس قسم کی حرکتیں وہی لوگ کرتے ہیں جن کو اپنے آگے پیچھے کسی رونے والے کا احساس نہیں ہوتا۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میں مال غنیمت سمجھ کر لٹا دینے کی حماقت نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ میری اولاد میری وارث کے طور پر موجود ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ ضائع نہ ہو بلکہ تمھارے کام آئے جب کہ رعنا نے کیا کیا؟ تم اچھی طرح جانتی ہو.... کیوں کہ وہ خود کو تنہا سمجھتی تھی۔"

"ممی جان! یہ آج آپ کس قسم کی باتیں کر رہی ہیں؟" میں نے کہا پھر چند لمحوں کے توقف سے میں نے پوچھا: "ممی! آپ تو اپنی بات کہہ چکیں اب آپ....؟"

ممی نے اپنا زیریں لب چند لمحوں کو دانتوں کی بالائی قطار سے دبایا پھر بولیں: "جوں جوں زندگی کے دن گزرتے جا رہے ہیں، میں اندر سے کمزور پڑتی چلی جا رہی ہوں۔ ہر نئے دن کا سورج مجھے زندگی کا ایک اور دن کم ہو جانے کی خبر سناتا ہے۔ مجھے تمھاری بہت فکر ہے۔ سوچتی ہوں میرے بعد تمھارا کیا ہوگا۔ میرے بعد تمھارا پرسان حال کون ہوگا۔ برادری والے تو آگے پیچھے ہم سے حساب بے باق کرنے کی کوشش کر لیں گے۔ اپنے بھی کب بخشتے ہیں۔ جو جس کے منہ میں آئے گا کہے گا۔ رعنا کے بارے میں تم نے خود دیکھا کہ لوگوں نے کیا کیا باتیں نہ بنائیں۔ ہر دل بھر اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ خود کو بہت تیرہ بخت سمجھنے کے باوجود بھی میں رعنا کے مقابلے میں پھر بھی خوش قسمت ہی رہی۔ دکھ پا کر بھی تمھارے سہارے زندگی گزار دی۔ میری طرف کسی نے انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ مجھے تمھیں بنا یا تمھارے پاپا نے مجھ سے خوشیاں ضرور چھینیں مگر میرے سر پر ان کے نام کا سائبان بدستور تنا رہا۔ تم میرے لیے جینے کی سب سے بڑی آس بنی رہیں اور آج بھی اتنے دکھ اور پریشانیاں جھیل چکنے کے باوجود بھی میں اس قدر مایوس نہیں ہوں جتنی مایوس اور بے بس رعنا اپنی زندگی کے آخری دنوں میں نظر آنے لگی تھی۔ اس کا مایوس اور بے رونق چہرہ میری نگاہوں میں پھرتا رہتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ مایوسی کی اس منزل سے خدانخواستہ کبھی تمھیں گزرنا پڑے۔ میں تمھیں بے امان اور غیر محفوظ چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔ میں تمھیں کسی محفوظ سائبان تلے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میں ابھی سمجھ بھی نہ پائی تھی کہ ممی کی ان باتوں کا مطلب کیا ہے مگر ممی کا یہ بدلا ہوا روپ میرے لیے انتہائی حیران کن تھا اور بہت تکلیف دہ بھی۔ میں نے کبھی بھولے سے بھی تصور نہ کیا تھا کہ ممی بیچ راستے میں میرا ساتھ چھوڑ کر مجھے یوں ششدر کر دیں گی۔ کس قدر تکلیف دہ تھا یہ احساس کہ میں اپنے راستے پر تنہا کھڑی رہ گئی ہوں اور ممی نے یک بیک راہ بدل لی ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ممی نے ایسا کیوں کیا تھا؟

اپنے اس سوال، اس حیرانی کا جواب مجھے بہت جلد مل گیا۔

ہفتے واری تعطیل کا دن تھا اور سہ پہر شام کا چولا پہننے کو تیار کھڑی تھی۔ میں دیر تک سونے کے بعد کچھ دیر قبل ہی جاگی تھی کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ یقیناً یہ ممی نہ تھیں۔ انھیں بھلا میرے کمرے کے دروازے پر دستک دینے کی کیا ضرورت

تھی۔ وہ تو دستک دیے بنا اندر آنے کا پورا حق رکھتی تھیں۔
"ہاں کون ہے؟" میں نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی پوچھا۔
"میں ہوں بی بی، بشیراں۔"
"اندر آجاؤ۔"
بشیراں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور بولی۔
"بی بی! بڑی بی بی صاحب جی آپ کو گول کمرے میں بلا رہی ہیں جی۔"
"خیریت تو؟"
"ہاں جی۔"
"کوئی آیا ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں جی۔"
"کون؟"
"وہ جی... کوئی مہمان آئے ہیں۔"
"کہاں سے؟"
"ساتھ والے گاؤں سے جی۔"
"کون لوگ ہیں؟"
"بی بی! نام شام تو مجھے نہیں پتا جی پر بی بی صاحب نے بولا ہے کہ آپ اچھی طرح تیار ہو کے آنا۔" میں سوچ میں پڑ گئی کہ آخر یہ کون سے ایسے مہمان تھے جن کے سامنے بلانے کے لیے امی نے مجھے بطور خاص اچھی طرح تیار ہو کے آنے کی ہدایت بھجوائی تھی۔
"اچھا تم جاؤ، میں آتی ہوں۔" میں نے بشیراں سے کہا۔
بشیراں کے جانے کے بعد میں بستر سے اٹھی۔ منہ ہاتھ دھویا، لباس تبدیل کیا، بال آراستہ کیے اور اپنے دونوں کانوں کی لووں پر پرفیوم اسپرے کرنے کے بعد گول کمرے کی طرف چل دی۔
امی کے ساتھ گول کمرے میں بیٹھے مہمان میرے لیے اجنبی نہ تھے۔ ان سے میں پہلے بھی مل چکی تھی۔ امی کی برادری کے کچھ لوگ قریب ہی ایک دوسرے گاؤں میں بھی مقیم تھے۔ چوہدری برکت علی بھی انھی میں سے تھے۔ رئیس آدمی تھے۔ برادری میں ان کے مربعوں، روپے پیسے اور اثر و رسوخ کی بڑی دھوم تھی۔ سیاست میں بھی عمل دخل رکھتے تھے۔ تین شادیاں کی تھیں۔ بڑی بیگم داغ مفارقت دے چکی تھیں۔ ان سے ایک بیٹا تھا۔ منجھلی بیگم تو ان کے گاؤں والی حویلی میں رہا کرتی تھیں، دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کی ماں تھیں۔ چھوٹی بیگم کراچی میں رہتی تھیں، ان سے دو بیٹیاں تھیں۔ چوہدری برکت علی کو میں نے پہلی بار تو نانا ابا کے انتقال پر دیکھا تھا۔ اس موقع پر وہ اپنی بڑی اور منجھلی بیگمات کے ساتھ آئے تھے۔ دوسری بار میں نے انھیں اس وقت دیکھا تھا جب چوہدری برکت کی بڑی بیگم کے انتقال پر امی پرسے کے لیے ان کے گاؤں گئی تھیں اور مجھے بھی اپنے ہمراہ لے گئی تھیں۔ ان دنوں میں تعطیلات میں گھر آئی ہوئی تھی۔ چوہدری برکت کی شاندار حویلی دیکھ کر میں ششدر رہ گئی تھی۔ ان کی حویلی کے آگے تو ہماری حویلی کچھ بھی نہ تھی۔ ان دنوں کاکا زندہ تھے۔ چوہدری برکت کے گاؤں سے واپسی پر جب میں نے کاکا کے سامنے چوہدری برکت کی حویلی اور ان کی امارت پر رشک و ستائش کا اظہار کیا تو کاکا نے کہا تھا "جان! ان سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں، پناہ مانگو، یہ لمبے ہاتھوں والے لوگ ہیں۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ یہ محض زمیندار ہی نہیں ہیں اور بھی بہت سے دھندے ہیں ان کے... کالے دھندے۔"
"کالے دھندے؟ آپ کا مطلب ہے اسمگلنگ؟"
"ہاں وہ بھی۔ ایک اسمگلنگ ہی تو کالا دھندا نہیں ہے۔"
"پھر؟"
"بہت کچھ کرتے ہیں یہ لوگ۔"
"مثلاً؟"
"اب تم زیادہ تفتیش مت کرو وکیلوں کی طرح۔ بس اتنا سمجھ لو کہ یہ ہم سے بہت مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ انسانوں کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں، ساری اہمیت اپنے مفاد کی ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر یہ دوسرے انسانوں کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔"
"کاکا جی! یہ ہمارے لگتے کون ہیں؟"
کاکا ہنس دیے تھے۔
"بیٹی تم ان کے گھر ہو آئیں، ان کی امارت سے اس قدر مرعوب ہو گئیں اور یہ بھی نہ جان سکیں کہ وہ تمھارے لگتے کون ہیں؟"
"امی نے اتنا تو بتایا کہ وہ ماموں ہوتے ہیں پر کس قسم کے ماموں؟"
"بھئی یہ تمھاری امی کی خالہ زاد بہن کے صاحبزادے ہیں اور اس رشتے سے یہ تمھارے ماموں ہوئے۔"
"ہوں! اب سمجھی۔"
چوہدری برکت کو میں نے تیسری دفعہ کاکا کے سوئم پر دیکھا تھا۔ اس بار وہ اپنی منجھلی بیگم کے ساتھ آئے تھے۔ اور اب اس وقت میں انھیں چوتھی بار دیکھ رہی تھی۔ ان کی منجھلی بیگم کے ساتھ گول کمرے میں چوہدری برکت اور منجھلی بیگم کے ساتھ ایک شوخ حسینہ بیٹھی ہوئی تھی جو

نظر حشمت علی سے جا ٹکرائی۔ وہ لبوں پر بڑی عجیب سی مسکراہٹ لیے مجھی کو دیکھ رہا تھا۔ بیگم برکت کا ہاتھ مجھے پہاڑ کی طرح وزنی لگ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کچھ دیر اور وہاں بیٹھی رہی تو پتھر کی ہو جاؤں گی۔ متوحش ہو کر میں یک بیک اٹھ کھڑی ہوئی اور کسی کو مخاطب کیے بنا کہا ”سوری! میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے“ اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

کچھ دیر بعد جب ممی مہمانوں کو رخصت کر کے میرے کمرے میں آئیں تو میں بستر پر اوندھی پڑی تھی۔ ان کے قدموں کی آہٹ نے مجھے آپ ہی پہچان کروا دی تھی۔

”منظر!“ انھوں نے آہستگی سے پکارا۔

”جی!“

ممی میرے نزدیک بیٹھ گئی تھیں۔

”بیٹا اوندھی کیوں پڑی ہو؟“

میں کچھ نہیں بولی۔ مجھے اپنے بالوں پر ممی کی انگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔

”تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا بیٹا!“

میں نے تڑپ کر ممی کی طرف دیکھا ”میں نے کیا برا کیا ہے ممی؟“

”گھر آئے مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک!“

میں اٹھ بیٹھی۔

”ایسے موقعوں پر بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔“

”کیسے موقعوں پر؟“ میں جان بوجھ کر انجان بن گئی۔

”جانتی ہو وہ لوگ کیوں آئے تھے؟“

”کیوں؟“

ممی کے ہونٹوں کے گوشے کپکپانے لگے یوں لگ رہا تھا جیسے الفاظ ان کے حلق میں گھٹے جا رہے ہوں۔

”کیوں آئے تھے؟“ میں نے اپنا سوال قدرے وضاحت سے دہرایا۔

”حشمت علی سے تمھارا رشتہ کرنے۔“

”اوہ نہیں... نہیں ممی... نہیں۔“ شدت جذبات سے میرا بدن لرزنے لگا۔

ممی نے اپنے ہونٹوں کو باہم بھینچتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا اور سر جھکا کر شکست خوردہ لہجے میں بولیں۔

”میں نے ان دنوں تم سے کہا تھا کہ میں تمھیں محفوظ اور مضبوط ہاتھوں میں دیکھنا چاہتی ہوں، چوہدری برکت برادری کے ہیں، اپنے ہیں، بزرگوں سے سنا ہے، بیٹیاں ماں سے کبھی تو جدا ہونی ہیں۔“

”پاپا بھی تو آپ کے فرسٹ کزن تھے۔“ میں نے تڑپ کر کہا۔

”اس قصے کو بھول جاؤ بیٹا!“

”کیا یہ ممکن ہے؟“

”اگر ممکن نہیں بھی ہے تو تمھیں کم از کم میری خاطر اس کو ممکن بنانا ہی پڑے گا۔ اچھے لوگ ہیں، خدا کا دیا سب کچھ ہے ان کے پاس۔ میں چاہتی ہوں جلد از جلد تمھارے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں، بڑی فکر رہتی ہے مجھے تمھاری۔“

”آپ میری فکر نہ کریں۔ میں بالکل مطمئن اور خوش ہوں۔“

”میں تمھاری ماں ہوں آخر کیسے فکر نہ کروں۔ میں نے تمھیں سمجھایا تھا اس دن کہ میں تمھارے لیے کتنی متفکر رہتی ہوں۔“

”مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ سب کچھ آپ نے مجھے اسی لیے سمجھایا تھا۔“

”بیٹا! اپنے پاپا کا قصہ تو تم بھول جاؤ، ساری پرانی باتیں بھلا دو۔“ ممی نے محبت سے کہا۔

”آپ کیا سمجھتی ہیں میرے لیے وہ سب کچھ بھلا دینا اسی قدر آسان ہے... نہیں ممی... ہرگز نہیں۔“

”جان! میری خاطر... اپنی ممّا کی خاطر...“ ممی نے لجاجت سے کہا۔

”نہیں... نہیں ممی... ! برسوں کا لکھا ایک دن میں نہیں مٹ سکتا۔“ میں نے پُرزور احتجاج کیا۔

”اوہ!“ ممی نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے اور بڑبڑائیں۔ ”وقت کم ہے، حشمت علی پندرہ بیس دن کے لیے آیا ہے۔ بھائی جی برکت اور ان سے زیادہ بھابی جی کی خواہش ہے کہ نکاح ہو جائے، رخصتی بعد میں دھوم دھام سے ہوتی رہے گی۔ بھابی جی کو خدشہ ہے کہ کہیں حشمت علی کی چھوٹی سالی اپنی بہن کے لیے نہ پھنسا لے۔ میری مرضی بھی یہی ہے کہ نکاح ہو جائے تاکہ میرا بوجھ اور فکر بھی کچھ کم ہو... مگر... تم اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہو۔“

”یہ ضد تو نہیں ہے ممی!“

”تو پھر اور کیا ہے؟“

”آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ مجھے مردوں سے نفرت ہے اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ کیوں۔“

”جان! سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔“

میں نے چونک کر ممی کی جانب دیکھا اور کہا ”یہ آپ کہہ رہی ہیں؟“

”ہاں...“ ممی نے سر جھکا کر کہا۔ ”مجھے اپنی غلطی کا اعتراف کر لینے میں کوئی عار نہیں... میں جانتی ہوں کہ تمھارے پاپا کی

طرح ہر مرد ہرجائی اور بے وفا نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی مانتی ہوں کہ تمہارے پاپا اس دنیا کے پہلے مرد نہ تھے جنھوں نے بیوی سے بے وفائی کی تھی اور... میں پہلی عورت نہ تھی جس نے خاوند کی بے وفائی اور دھوکے بازی کا صدمہ سہا تھا... ان گنت عورتوں نے یہ صدمہ سہا ہے اور سہہ رہی ہیں۔ وہ سب بھی میری طرح زود رنج اور جذباتی ہوتیں تو آج نہ جانے کتنی حرماں نصیب عورتوں کی بیٹیاں تمہاری طرح اپنی بدنصیب ماؤں کی تیرہ بختی اپنی جھولیوں میں سمیٹے زندگی کی ان گنت سچی اور حقیقی خوشیوں سے محروم بیٹھی ہوتیں۔ مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے بیٹا! مجھے اپنے مقدر کی نحوست کے سائے دوسروں کے مقدروں پر مسلط کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔"

"خالہ! آپ کی مراد مجھ سے اور کاکا سے ہے؟"

"نہیں... ممی چونکیں۔ "میں اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے بولیں۔ "اس معاملے میں بھلا میرا کیا دوش؟"

"آپ نے دوسروں کے مقدروں کا نام لیا اس سے میں یہ سمجھی کہ شاید آپ کاکا کی بات بھی کر رہی ہیں۔"

"اس کا مقدر تو آپ ہی خراب تھا۔" ممی نے کہا ان کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ممی مجھ سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"بے چاری کاکا۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"بیٹی! اب تو میں نے اعتراف کر لیا کہ سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے اور وہ راستہ جو میں نے تمہیں دکھایا تھا درست نہیں تھا۔ اب اور تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"میں تو کسی سے کچھ نہیں چاہتی بس اپنے راستے پر چلتے رہنا چاہتی ہوں۔"

"وہ غلط راستہ ہے۔"

"ہاں! اب تو یہ میرا راستہ ہمارا راستہ ہے اور میں اس راستے کی اتنی عادی ہو چکی ہوں کہ میرے لیے اب راستہ بدل لینا ممکن نہیں ہے۔"

"میری جان! یہ کوئی انوکھی اور غیر معمولی بات نہیں ہے کبھی کبھی ہم دانستہ یا نادانستہ غلط راستوں پر نکل پڑتے ہیں کبھی خود کو آزمانے کے لیے کبھی دوسروں کو آزمانے کے لیے اور کبھی ان راستوں کو آزمانے کے لیے... لیکن... پھر ہم صحیح راستے کی تلاش میں واپس پلٹ آتے ہیں۔"

"میں واپس نہیں پلٹنا چاہتی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"کیوں؟"

"کیوں کہ یہ راستہ جو آپ نے میرے لیے متعین کیا تھا خواہ درست ہو یا غلط میں اس کی اتنی عادی ہو چکی ہوں کہ مجھے یہ راستہ اچھا لگتا ہے اس سے اُنس ہے مجھے۔"

"بیٹا! تم گم ہو جاؤ گی۔"

"اچھا ہے نا میں گم ہو جانا چاہتی بھی ہوں۔"

"ممی کو تنہا چھوڑ کر؟"

"ممی! تنہا تو آپ مجھے چھوڑ گئی ہیں۔" میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا میری آنکھوں کے کنارے نم ہو گئے تھے۔ میں نے آنسوؤں کو حلق میں اتارا اور بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ "یک بیک آپ نے میرا ساتھ چھوڑا اور راہ بدل لی کیا یہ انصاف ہے؟"

"بیٹا! کبھی کبھی مجبوریاں، مصلحتیں یا ضرورتیں ایسا کرنا پڑتا ہے۔"

"یہ مجبوریاں، مصلحتیں اور ضرورتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ مجھے مردوں سے نفرت ہے۔"

"کاش، تم جان سکتیں کہ اس وقت تم کتنی بڑی مشکل میں ہو میں تمھیں اپنوں کی امان میں دینا چاہتی ہوں۔"

"میں کسی کی امان میں نہیں جانا چاہتی۔"

"میں تمھیں دشمن سے بچانا چاہتی ہوں۔"

"دشمن سے۔" میں نے تعجب سے ممی کی طرف دیکھا تھا۔

"ہاں۔"

"کہیں آپ کی مراد تیمور سے تو نہیں؟"

"ہاں، میں تمھیں اسی سے بچانے کے لیے اپنوں کی امان میں دینا چاہتی ہوں۔ اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔"

"مرد چاہے مرد ہوتا ہے کوئی اپنا ہو یا وہ اپنا ہو چاہے پرایا... مجھے نفرت ہے ان سب سے... سارے مردوں سے۔"

مجھ پر ہذیانی کیفیت طاری ہونے لگی۔

"عالیہ! میری جان! میں تمھاری بہتری چاہتی ہوں۔" ممی نے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ آپ میرا برا نہیں چاہ سکتیں۔"

"تو میں نکاح کی تاریخ طے کر دوں انھیں؟"

"خدا کے واسطے! مجھے مجبور نہ کیجیے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"عالیہ! بیٹی! میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں بہت فکر مند ہوں تمھارے لیے۔" وہ بے حد لجاجت سے بولیں۔

"آئی ایم سوری ممی!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"دیکھو! بھائی برکت بڑے اثر و رسوخ والے آدمی ہیں۔"

"ہوا کریں، ہمیں اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

"پڑے گا... ضرور پڑے گا... تم شادی کے بعد کراچی چلی جاؤ گی۔ میں خواہ کراچی میں رہوں یا یہاں، چوہدری برکت کی سمدھن بن کر رہوں گی۔ بڑا اثر و رسوخ ہے ان کا۔ تیمور کو تو وہ خرید کر پھینک دیں گے۔"

میں نے ممی کی جانب دیکھا۔ "ہاں بیٹا وہ بڑی پہنچ والے آدمی ہیں۔ تیمور تو ان کے لیے بڑی معمولی سی شے ہو گا۔ ایک ٹھوکر میں اسے راستے سے ہٹا دیں گے وہ۔ بھائی برکت کے بارے میں میں نے سنا ہے کہ زیادہ گڑبڑ کرنے والے کو وہ دوسرے جہان کا راستہ دکھا دیتے ہیں۔"

"تو آپ اسی لیے یہ رشتہ منظور کرنا چاہتی ہیں؟"

"رشتہ میں کیا منظور کروں گی، مہربانی تو بھائی جی برکت کی ہے کہ انھوں نے رشتہ منظور کیا۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"کافی دنوں سے میں سن رہی تھی کہ بھائی برکت اپنے بیٹے حشمت علی کا رشتہ برادری میں کرنا چاہ رہے ہیں۔ مجھے تمھاری فکر تھی تو میں نے خود ہی بھائی برکت سے بات کر لی۔ حرج بھی کیا تھا، اپنوں میں سب چل جاتا ہے۔"

"اوہ، تو گویا آپ نے مجھے ان لوگوں کے قدموں میں ڈال دیا۔ ممی! کیا میں اتنی ہی بے وقعت تھی؟" میں نے ملول ہو کر کہا۔

"وہ اپنے ہیں، تمھیں دشمن سے بچائے رکھنے کا یہی ایک راستہ تھا میرے پاس۔ تم ہاں کر کے تو دیکھو، بھائی برکت علی کے گھرانے سے ناتا جڑتے ہی میری ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ بھائی برکت خود نمٹ لیں گے تیمور اور اس کے حمایتیوں سے۔"

"حمایتیوں سے!" میں نے چونک کر ممی کو دیکھا۔

"ہاں، میرا مطلب ہے اس کے وکیل وغیرہ سے۔"

ممی کی اس بات پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ اپنے حریف سے میں خود نمٹ سکتی ہوں۔"

"بھول ہے تمھاری، مردوں سے نمٹنا اسی قدر آسان ہوتا تو تمھاری ماں اس وقت اتنی پریشان نہ ہوتی۔"

"مگر ممی آپ تو مجھے مردوں کے مقابلے میں مضبوط اور ناقابلِ تسخیر دیکھنا چاہتی تھیں۔"

"وہ میری بھول تھی۔ میں اپنی غلطی کا پہلے بھی اعتراف کر چکی ہوں، اب پھر کرتی ہوں۔"

میں بے بسی سے ممی کا منہ تکتی رہ گئی۔ کتنی آسانی سے انھوں نے یہ بات کہہ دی تھی مگر میرے لیے برسوں کے آشنا راستوں سے بے وفائی کرنا اتنا آسان نہ تھا۔

❀

اگلے چار پانچ دن ممی میرے کمرے اور گھر کا راستہ بند رہی۔ میں اوپر ہوتی تو وہی موضوع تھی، آتی تو ممی نیچے پہنچ جاتیں اور وہی موضوع چھیڑ دیتیں۔ میں مسلسل انکار کرتی رہی۔ مجھے اس کا حق بھی تھا۔ گزشتہ پندرہ برسوں سے میں سر جھکائے اسی راستے سے وفاداری نبھاتی چلی آ رہی تھی جو ممی نے مجھے دکھایا تھا اور جس پہ وہ مجھے چلتے دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس راستے کو چھوڑ کر میں یک بیک ایک نیا راستہ کیوں کر اختیار کر سکتی تھی۔ ممی کے اصرار نے مجھے اور میرے انکار نے ممی کو ... بالآخر تھکا ہی ڈالا۔

"تم ہاں کر دیا نہیں، میں ان لوگوں کو ایک ... روز میں نکاح کی تاریخ دینے کے لیے جا رہی ہوں۔"

میں نے سٹپٹا کر ممی کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا، "نہیں ممی آپ یہ نہیں کر سکتیں۔"

"کیوں؟ کیوں نہیں کر سکتی؟" ممی نے ناگواری سے کہا۔

"کیوں کہ میرے لیے یہ تصور بھی محال ہے۔"

"بھائی برکت کا بلا ناغہ فون آ رہا ہے۔ کب تک میں انھیں آج کل پہ ٹالتی رہوں گی۔ انھیں جلدی ہے۔"

"آپ انکار کیوں نہیں کر دیتیں؟"

"تمھارا دماغ خراب ہوا ہے۔ رشتہ ہم نے بھجوایا اور اب ہم ہی انکار کر دیں۔"

"آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں، میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ تم زیادہ سمجھ دار بننے کی کوشش مت کرو مجھے..." ممی بھڑک پڑیں۔ منہ پھیر کر آنکھیں پھیر لیں۔ "ایک حد ہوتی ہے نافرمانی اور سرکشی کی۔ میرا جینا تو تمھاری وجہ سے حرام ہو ہی گیا ہے، کیا چین سے مرنے بھی نہ دو گی۔"

"ممی... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ تمھارے باپ نے مجھ سے زندگی کی خوشیاں چھینیں اور اب تم میرا دم گھونٹ کر مجھے مار

دینے کے درپے ہو؟" ممی نے انتہائی سخت اور درشت لہجے میں کہا۔

میری آنکھیں بھر آئیں اور سینہ رنج سے بوجھل ہو گیا۔

"نہ تم اس بدبخت کے منہ لگتیں نہ وہ جان کو آتا۔ میں کہتی تھی اس سے مقدمہ لڑنے۔ دیکھ لیا انجام اپنی کج ادائی کا؟"

ممی نے اپنے کپکپاتے ہونٹوں کو پوری شدت سے باہم بھینچ لیا۔

"اب میں تمہیں مزید نافرمانی اور خودسری کی اجازت نہیں دے سکتی۔"

میری آنکھوں سے آنسو رخساروں پر ڈھلک پڑے۔

"تمہاری ضد مجھے رسوا کر دینے کے درپے ہے مگر... مگر تمہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

"کیا آپ اسے ضد سمجھتی ہیں؟" میں نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں اسے محض ضد ہی نہیں، خودسری، نافرمانی اور بدتمیزی سمجھتی ہوں۔" ممی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے مجھے خاصی ناگوار نگاہوں سے دیکھا۔

جذبات کی شدت سے میں سرتاپا لرزنے لگی۔

"یہ زیادتی ہے... یہ زیادتی ہے ممی... میں تو آج تک آپ ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتی رہی ہوں...؟"

"بکواس بند کرو۔" ممی چلا اٹھیں۔

ان کے لہجے کی درشتی نے میرے دل کو سخت صدمہ پہنچایا تھا۔

"میں... میں... خودسر... نہیں... ہوں۔" میں نے احتجاج کیا۔

"اچھا!" ممی نے کڑے تیوروں سے مجھے دیکھا پھر بولیں۔ "مگر جری تو بہت ہو تم۔"

میں نے ششدر ہو کر ممی کو دیکھا۔ ان کی بات اور ان کا لب و لہجہ میرے لیے تعجب خیز تھے۔

"عدالت جا پہنچیں، مجھے خبر نہ ہونے دی۔ تیمور کے وکیل کے دو خط وصول کر لیے، مجھے پتا نہ چلنے دیا۔ اور تو اور مجھے اپنی کاکا کی خبری صدا کی بھنک تک نہ پڑنے دی۔"

اب میرا سراسیمہ ہو جانا یقینی تھا۔

گویا ممی کاکا کا وہ خط دیکھ چکی تھیں جسے میں نے اپنی دانست میں ایک ایسی جگہ چھپا کر رکھا تھا جہاں ممی کی رسائی کا احتمال نہ تھا اور میں رات کی تنہائی میں اسے نکال کر بار بار پڑھ سکتی تھی۔

خدا کا شکر تھا کہ محمود ظفر کا خط میں نے اپنے جنرل میں میری کی ہدایات منتقل کر کے رکھا ہوا تھا ورنہ اس وقت اس کا طعنہ بھی سننا پڑتا۔ ممی کے تیور دیکھتے ہوئے میں نے کاکا کے خط کی بابت کوئی صفائی پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"میں نے تو سوچ لیا ہے کہ بھائی جی برکت کو پورا اختیار دیے دیتی ہوں... وہ خود سنبھال لیں گے سب کچھ... مجھے لیے ہاتھوں میں ان کے۔"

ممی کا لہجہ مجھے اجنبی لگا۔ کس قدر معنی خیز تھا ان کا یہ جملہ کہ وہ خود سنبھال لیں گے سب کچھ اور کس قدر درشت تھا ان کا انداز جیسے مجھے دھمکی دے رہی ہوں۔ کیا ممی نے واقعی مجھے دھمکی دینے کی کوشش کی تھی؟

ممی کا یہ روپ انتہائی حیرت انگیز بھی تھا اور میری پریشانیوں میں ایک نیا اضافہ بھی۔ پہلے ہی کیا کم پریشانیاں تھیں۔ حویلی کے مسئلے سے قطع نظر ان دنوں میں بہبود مرکز کے سلسلے میں بھی بڑی متفکر تھی۔ تیمور کی مرکز سے علیحدگی کے بعد کام بتدریج مندا پڑتا چلا گیا۔ اگرچہ اللہ وسایا کام کر رہا تھا مگر صورت حال دن بدن تشویشناک ہوتی جا رہی تھی۔ نئے آرڈرز ملنا تو در کنار پرانی پارٹیاں بھی دھیرے دھیرے ٹوٹتی چلی جا رہی تھیں۔ کئی عورتیں گھر بیٹھ چکی تھیں جو آ رہی تھیں وہ بھی کام کی کمی سے متفکر تھیں۔ دو روز قبل ہی بیبیاں کی سرکردگی میں پراندے اور ناڑے بننے والی عورتوں کا ایک وفد میرے کمرے میں آیا تھا اور انہوں نے کہا تھا۔

"بی بی! کام کم ہو گیا ہے جی، ہفتے بھر کے تیس چالیس بھی نہیں پڑتے۔"

"فکر مت کرو، تھوڑے دن کی پریشانی ہے، کام لانے والا بندہ آ جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

"بی بی! اللہ وسایا ہے تو جی، باہر آتا جاتا بھی ہے پر کام کیوں نہیں لاتا؟" گروپ لیڈر بیبیاں نے کہا۔

"وہ سیدھا سادہ بندہ ہے، تیار مال پارٹیوں کو پہنچا تو سکتا ہے لیکن نئے آرڈر لانے اور نئی پارٹیاں پکڑنے کے لیے تیز آدمی چاہیے۔ خدا نے چاہا تو جلد ہی نیا آدمی رکھنے جا رہے ہیں ہم۔"

"بی بی! تیمور باؤ جیسا بندہ ہونا چاہیے جی۔ کتنا کام لاتے تھے وہ، سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔" مذکورہ وفد کی ایک رکن نے کہا۔

"تیمور باؤ جیسا بندہ آسانی سے نہیں مل سکتا۔" ارشاد

سکتا۔

"کیوں؟ کیوں نہیں بے مل سکتا؟" بیداں ڈپٹ کر بولی۔

"تیمور باز کو بندے کو رام کرنا اور اس کا دل موہنا آتا تھا۔" ارشاد نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"ہاں یہ تو تھا۔" بیداں نے تائید میں گردن ہلائی۔

"بڑا چنگا بندہ تھا تیمور باز۔" تاجی بولی۔

"اچھا خیر! فی الحال تو تم لوگ کام کرو۔ کستی میں کچھ بندوبست میرا مطلب ہے کسی نئے آدمی کا بندوبست۔"

"تیمور باز جیسا بندہ مل گیا تو خیر ہی ہے؟" مقصودہ نے کہا۔

"مقصودہ! تیمور کوئی آسمان سے تو اترا نہیں تھا۔ خدا نے چاہا تو اس سے اچھا آدمی رکھیں گے ہم۔" میں نے تسلی دلائی اور یہی تقطیع ثابت ہوا۔

☆

اگلے روز جب میں کراچی کی ایک پارٹی سے تجدید معاہدہ کے لیے ایک اسی خط لکھنے میں مصروف تھی اللہ وسائے کی کھنکار نے میری توجہ کمرے کے دروازے کی جانب مبذول کرائی۔ وہاں اللہ وسایا کچھ متذبذب سا کھڑا تھا۔

"حاضر ہو سکتا ہوں بی بی صیب؟" اس نے مؤدبانہ پوچھا۔

"ہاں، آؤ۔ کیا بات ہے؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

اللہ وسایا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا میری میز کی دوسری جانب میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"ہاں کیا بات ہے؟"

اللہ وسائے نے چاروں اطراف دیکھا پھر مدھم سروں میں بولا۔ "بی بی صیب! بندہ اک ضروری بات کرنا چاہتا ہے جی۔"

"ہاں بولو کیا بات ہے؟"

اللہ وسائے نے ادھر ادھر اور گردن موڑ کر پیچھے دروازے کی جانب دیکھا پھر بولا۔ "اجازت ہے جی؟"

اسے اس قدر محتاط دیکھ کر مجھے تعجب بھی ہوا اور تشویش بھی۔ قلم کو قلمدان میں رکھتے ہوئے میں ہمہ تن اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"بی بی صیب" اللہ وسایا دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم جوڑتے ہوئے قدرے جھک کر دھیمے سُروں میں بولا۔ "آپ جی چودھری برکت ... ہوراں لوگوں سے بچنا جی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"مطلب یہ ہے جی کہ ہم حویلی کے نمک خوار ہیں جی۔ مالکوں کا نہ برا چاہ سکتے ہیں نہ برا دیکھ سکتے ہیں۔ ہم کمیں لوگ جی اپنے مالکوں کے دکھ سکھ سے بے خبر رہنا بھی چاہیں تو نہیں رہ سکتے جی! مالکوں کے گھر میں جو رہتے ہیں۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی بی بی کہ اپنی بی بی صیب جی کو کیا ہو گیا ہے۔ چودھری برکت ہوروں کے بارے میں تو ان کو سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ گندے لوگ ہیں جی وہ سب بی بی! معاف کرنا جی اپنے چودھری حشمت علی کے بارے میں تو میں نے اس کے گاؤں والوں سے سنا ہے جی کہ کراچی شہر میں اس کی کوٹھی میں قمار خانہ چلتا ہے۔ کمینے لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں جی کہ حشمت علی کے اپنے باپ کی شہری بیوی سے....." اللہ وسایا پل بھر کو تھما اور اس نے ایک بار پھر چار اطراف نگاہ دوڑانے کے بعد کہا۔ "بی بی! اپنی بڑی بی بی صیب جی کو پتا نہ چلے جی کہ یہ سارا کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے۔"

میں نے ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے اللہ وسائے کو دیکھا اور کہا۔ "تم اطمینان رکھو۔"

"وہ جی اپنی بڑی بی بی صیب جی اس وقت محمود ظفر صیب سے بات کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ باتیں آپ کے کان میں ڈال دوں۔"

"کیا کہا تم نے؟ امی کس سے بات کر رہی تھیں فون پہ؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"محمود ظفر صیب سے جی... لاہور سے فون آیا تھا ان کا..... میں نے ہی سنا یا تھا جی فون..... کل بھی آیا تھا جی فون ان کا۔"

"محمود ظفر کا فون!" میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

"ہاں جی۔ ویسے چنگے آدمی ہیں جی وہ۔"

"تمہیں کیا پتا کہ وہ چنگے ہیں یا.....؟" میں نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

اللہ وسائے نے پھر ادھر ادھر دیکھا اور بدستور آواز دھیمی رکھتے ہوئے بولا۔ "بی بی صیب! رب سوہنے کو دیکھا نہیں جی پر بندہ عقل سے تو اسے پہچانتا ہے نا جی۔ اپنی رعنا بی بی صیب بڑی عقل مند، سمجھدار اور ہشیار بی بی تھیں۔ بندے کی پہچان رکھتی تھیں اور کسی غلط بندے پر اعتبار کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ میرے کو پکا یقین ہے بی بی کہ رعنا بی بی زندہ ہوتیں تا تو چودھری برکت علی اور حشمت علی کو تو انھوں نے اس ارادے سے حویلی میں داخل ہی نہیں ہونے دینا تھا۔ چودھری حشمت علی کو رارا ری دے دیتے کہ ادھر آئیں۔ گندے لوگ ہیں جی وہ۔ اچھا... جی، بڑی بی بی صیب کو پتا نہ چلے کہ یہ سارا کچھ میں نے آپ کو

وسیلہ ہے۔" اللہ وسایا دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے لجاجت سے بولا۔

"نہیں پتا چلے گا انھیں۔" میں نے اللہ وسایا کو یقین دلا دیا۔

اللہ وسایا کے جاتے ہی میری جان پر بن گئی۔ چہرہ اگر واقعی کردار کا آئینہ ہوتا ہے تو چوہدری برکت علی اور ان کے صاحبزادے چوہدری حشمت علی کے چہروں کو تصور میں لا کر اللہ وسایا کے بیان سے متفق ہو جانا چنداں مشکل نہ تھا۔ کھڑے نقوش اور سرخ و سپید رنگت کے باوجود ان کے چہروں پر ایسی کرختگی تھی جو دیکھنے والے کو کچھ عجیب سا تاثر دیتی تھی۔

ذرا سے غور و فکر پر میری عقل اور دل بھی اللہ وسایا کے بیانات کی تائید کرنے لگے۔ کل ہی کی تو بات تھی ممی نے اسی موضوع پر بات کرتے ہوئے دھمکی دینے والے انداز میں کہا تھا "میں نے تو سوچ لیا ہے بھائی جی برکت کو پورا اختیار دے دیتی ہوں۔ وہ خود سنبھال لیں گے سب کچھ۔ بڑے لمبے ہاتھ ہیں ان کے۔"

اور ہاں یہ بھی تو کہا تھا انھوں نے کہ وہ بڑی پہنچ والے آدمی ہیں۔ تیمور تو ان کے لیے بڑی معمولی سی شے ہوگا۔ زیادہ گڑبڑ کرنے والے کو وہ دوسرے جہان کا راستہ دکھا دیتے ہیں۔

مجھے یاد آیا چوہدری برکت کی بڑی بیگم کے انتقال پر جب میں ممی کے ہمراہ ان کے گاؤں گئی تھی اور ان کی آن بان، شان و شوکت اور امارت سے مرعوب ہو کر واپس ہوئی تھی تو ممی نے کہا تھا۔

"ان سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں بیٹا! مانا کہ یہ لمبے ہاتھوں والے لوگ ہیں۔ بہت سے دھندے ہیں ان کے، کالے دھندے... بہت کچھ کرتے ہیں یہ لوگ۔ یہ ہم سے بہت مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ انسانوں کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ ساری اہمیت اپنے مفاد کی ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر یہ دوسرے انسانوں کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔"

لیکن ممی مجھے داؤ پر کیوں لگا رہی تھیں؟

کیا کسی طرح وہ چوہدری برکت علی کی رشتے دار ہونے کا ثبوت دینا چاہتی تھیں؟

میرا دماغ شائیں شائیں کر رہا تھا اور میری جان پر بن رہی تھی (کیسی مشکل میں گرفتار ہو گئی تھی میں)۔ حویلی کو کسی غیر کی دسترس سے بچانے کے لیے تو میں نے وکیلوں کے اور کچہری کے دروازے کھٹکھٹائے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ خود کو لمبے ہاتھوں والے کالے دھندوں والے وڈیروں کی دسترس سے بچانے کے لیے میں کس کا دروازہ...

کشمکش تھی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ممی کو آخر کیا ہو گیا تھا۔

اس روز میں رات ہو جانے کے بعد اوپر پہنچی۔

*

اگلے دن ہفتے وار کی تعطیل تھی۔ میں دن چڑھے تک بستر پر پڑی رہی۔ ناشتے کی میز پر ممی میرے ساتھ نہ تھیں، وہ... حسب معمول صبح ہی ناشتا کر چکی تھیں۔ ناشتے کے بعد میں اپنے کمرے میں جا گھسی اور دوپہر کو کھانے کے وقت ہی کمرے سے نکلی۔ ممی کھانے کی میز پر تھیں مگر انھوں نے کوئی بات کی نہ میں کچھ بولی۔ کھانا بہت خاموشی سے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد پھر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

سہ پہر کے وقت ممی میرے کمرے میں آئیں اور انھوں نے بڑے اجنبی سے لہجے میں کہا۔ "شام کو وہ لوگ آ رہے ہیں۔ عورتیں بھی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے حشمت علی کی سوتیلی بہنیں تم سے ملنے کی فرمائش کریں۔ ان کے سامنے کچھ گڑبڑ نہیں ہونا چاہیے۔"

میں ٹکر ٹکر ممی کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"اپنے لوگوں میں بس یہی ایک مشکل ہوتی ہے شادی بیاہ کے موقعوں پر کہ زیادہ تکلف برقرار نہیں رکھ سکتے۔ ویسے میں منع تو کروں گی مگر بیبا لی جی سیدھی سادی بے تکلف عورت ہیں۔ ہو سکتا ہے اصرار کریں اور جائیں تمھارے کمرے میں۔" میں نے محسوس کیا اب ممی کا لہجہ بدل گیا تھا۔ اجنبیت کی جگہ اب ملائمت اور نرمی نے لے لی تھی۔

میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے اور ہونٹوں پر لرزش سی طاری ہو گئی۔ ممی آگے بڑھیں اور انھوں نے میرے شانوں پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ "جان! سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ میں نے کچھ کہنے کو لب کھولنا چاہے لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ پاتی ممی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کرتے ہوئے بڑی عاجزی سے کہا۔ "بیٹا! خدا کی خاطر... ممی کی عزت کی خاطر..."

میں ممی کا منہ دیکھتی رہ گئی اور ممی مجھے حیران و ششدر چھوڑ کر میرے کمرے سے تیزی سے باہر نکل گئیں۔ تب مجھے بے اختیار محمود ظفر کا خیال آ گیا۔ شاید ان کی ماں نے بھی ان کے ساتھ جبر... انھیں یوں ہی بے بس اور مضطر چھوڑ دیا ہوگا۔ نہ جانے کتنی دیر میں پریشان و مضطرب بیٹھی رہی۔

یہ کون سا کھیل ممی کھیل رہی تھیں میرے ساتھ۔ کل ان کا رویہ کیا تھا اور آج کیا۔

تادیر میں اپنی سوچوں کے گرداب میں الجھی بیٹھی ہی رہی۔

نے فیصلہ کر لیا کہ فی الحال کچھ نہ کہوں گی لیکن عین موقع پہ اپنا فیصلہ سب کے سامنے کرمی کو بتا دوں گی کہ لڑکیاں بے جان کھلونے نہیں ہوتیں۔ میرے پاس بس اب یہی ایک راستہ رہ گیا تھا۔

ہر شام حویلی کے سناٹوں میں ہنگامے جاگ اٹھتے مگر میرا دل اندھیروں میں ڈوبا پڑا تھا۔ چوہدری برکت کی منجھلی بیگم ایک دو عورتوں اور اپنی تین عدد نوجوان بیٹیوں کے ساتھ میرے کمرے میں آ جاتیں اور ان لڑکیوں کی بھابی جی بھابی جی کی گردان سے مجرم بننے لگا۔ میں خاموشی سے ایک فیصلہ کر کے اسے دل ہی دل میں چھپا چکی ہوتی تو کچھ عجب نہ تھا کہ اس وقت جھلک پڑتی۔ میرا فیصلہ یہ تھا کہ میں نکاح کے وقت انکار کر دوں گی۔

❀

اگلے دن گاؤں کا نائی دن بھر چوہدری برکت علی کے ہاں سے آئی ہوئی مٹھائی تقسیم کرتا اور حشمت علی سے میری بات پکی ہو جانے کی نوید سناتا پھرا۔ تمی برادری کے چند قریبی عزیزوں کا گلی شام چوہدری برکت علی کے ہاں مٹھائی لے جانے کے بیے جو کرنے کے بعد مٹھائی کی تیاری کا آرڈر دینے شہر چلی گئیں۔ بتانے کو تو گاؤں کا حلوائی بھی عمدہ سے عمدہ مٹھائی تیار کر سکتا تھا مگر نانا بی جی چوہدری برکت علی کے ہاں سے آئی ہوئی شہری مٹھائی کے جواب میں شہری مٹھائی ہی لے جانا چاہتی تھیں۔ حویلی مرکز کی عورتیں مٹھائی کھاتے اور دن بھر مجھے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھتے رہے اور مبارک سلامت کے بعد کچھ دیر پہلے ہی جبی کے گئی تھیں۔ عورتیں بظاہر خوش تھیں مگر دن بھر مجھے ان میں سے بیشتر کے چہروں پر مستقبل کی فکر کے سائے لرزاں دکھائی دیتے رہے۔ متعدد عورتوں نے مجھ سے پوچھا۔

"بی بی! ہمارے کام کا کیا بنے گا جی؟"

"کام چلتا رہے گا۔" میں نے ہر ایک کو یہی جواب دیا۔

"پر جی آپ تو شادی کے بعد چلی جائیں گی اپنے سسرال۔" نورالنسا نے یاد کرایا۔

"تم فکر نہ کرو میں یہیں رہوں گی۔"

"بی بی! شادی کے بعد تو ساری لڑکیوں نے سسرال چلے جانا ہوتا ہے۔" جھجکتے ہوئے بولی۔

"تم فکر نہ کرو میں کہیں نہیں جاؤں گی یہیں رہوں گی۔"

"جو یہ بات ہے تو جی سانوں فکر کی ضرورت ہی کوئی نہیں ہے جی۔" جیداں نے کہا۔

"پر جی بی بی جی کام لانے والا کوئی نیا بندہ مقرر کریں گی آپ؟ اپنے تیمور باؤ جیسا۔" تاجی بولی۔

"اوئے وڈا ای چنگا بندہ کدا۔" سروری نے کہا۔

سروری کی اس بات نے مجھے ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ بلکہ اضطراب سے دوچار کر دیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ یہ عورتیں گاؤں بھر میں اس خبر کے عام ہو چکنے کے باوجود بھی کہ تیمور حویلی کے معاملے میں میرا حریف تھا میرے منہ پر اس کی تعریف کرنے میں ذرا تردد نہ کرتی تھیں۔ یہ یقیناً اس ماحول اور ان فضاؤں کا اثر تھا جس میں وہ بس رہی تھیں۔ شہر اور گاؤں میں یہی تو فرق ہے کہ شہر والے دل میں کچھ رکھتے ہیں زبان پر کچھ اور گاؤں کے سادہ اور بے ریا لوگ جو دل میں رکھتے ہیں وہی ان کی زبان پر بھی ہوتا ہے ماسوائے اکثر بڑے اور بھولے بھالوں کے۔

ورکرز کو رخصت کرنے کے بعد میں اوپر جا رہی تھی کہ طبیعت ایکدم گھبرا گئی۔ اوپر جاتے والے زینے کا پائین سے دھکے زینے کی ریلنگ تھام کر میں زینے پر ہی بیٹھ گئی۔ اپنی دونوں بانہوں کو سمیٹ کر میں نے بازو گھٹنوں کے گرد باندھ لیے اور سر ریلنگ سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ ذرا دیر قبل دل پر طاری ضرر کی جگہ ایک بے نام سی طمانیت نے لے لی۔ جی چاہا یونہی بیٹھی رہوں۔ سناٹا چھایا رہے اور عمر تمام ہو جائے۔

نہ جانے کتنی دیر میں اسی طرح بیٹھی رہی۔ کتنا سناٹا تھا۔ کی نشر و سلائی کے ساتھ گئی ہوئی تھیں۔ الف دین دوپہر کو ہی سے شام تک کی چھٹی لے کر کہیں گیا تھا اور ابھی تک واپس نہ لوٹا تھا۔ بشیراں اوپر تھی اور میں راہ گم کردہ تھکے ماندے مسافر کی طرح بیٹھی تھی۔

باہر گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ میرے دل نے مجھ سے کہا۔ اٹھ گئی ہی تو میں چاہنے کے باوجود اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ اس طرح بیٹھے رہنے میں عجیب سا سکون مل رہا تھا۔

کچھ دیر گزری پھر برآمدے کے مرمریں فرش پر قدموں کی چاپ ابھری۔ یہ غالباً اللہ رسا کے بھاری قدموں کی چاپ تھی۔ پھر سانسوں کو معطر کر دینے والی مردانہ خوشبو میری حس شامہ سے بغلگیر ہو گئی۔ شاید کوئی آیا تھا کیا عجب کہ چوہدری برکت علی ہوں۔ سو میں نے آنکھیں نہ کھولنا ہی غنیمت جانا۔ بعض دفعہ یوں ہوتا ہے نا کہ جیتے جی دنیا کے رنگ و بو سے ناتا توڑ کر بیٹھ جانے کو جی چاہتا ہے کچھ یہی کیفیت اس وقت میری تھی۔

پھر کوئی میرے نزدیک آ کر ٹھہرا۔ مانوس سی کھنک دار میرے کانوں سے ٹکرائی اور کسی نے کہا: "ہیلو عالیہ بی بی!"

میں نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں اور گھبرا کر ریلنگ تھامتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ گزشتہ سال میں جس شخص کو بھیجوں

اسمارٹ سی والا ایک ادھیڑ عمر شخص سنہری کمانی کی عینک آنکھوں پر جمائے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"کون؟ کون ہو تم؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ پہچانیں نہیں؟" وہ سوالیہ لہجے میں بولا پھر پل بھر کے توقف سے اس نے کہا: "وقت بھی تو بہت گزر گیا۔ میں... محمود ظفر ہوں۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا: "اوہ، آپ؟" بے اختیار میری زبان سے نکلا۔

وقت بھی انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔

کھچڑی بالوں والے اس ادھیڑ عمر شخص کو دیکھ کر کون یقین کر سکتا تھا کہ یہ اسی شخص کا بدلا ہوا روپ ہے جو برسوں قبل میری کالج سے ملنے حویلی آیا تھا۔ رفتارِ زمانہ ہی آدمی کے نقوش کو عجیب طریقے سے پامال کر دیتی ہے۔ محمود ظفر کا یہ روپ دیکھ کر مجھے شدید ذہنی دھچکا پہنچا۔

"کیسی ہیں بی بی؟" انتہائی نرمی سے پوچھا گیا۔

"جی ٹھیک ہوں۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"بری بات، جھوٹ نہیں بولتے اپنے بزرگوں سے۔"

میں نے گھبرا کر محمود ظفر کی طرف دیکھا۔

"خیر آپ سے تو بعد میں بات ہو گی، یہ بتائیں والدہ صاحبہ ہیں گھر پر؟" محمود ظفر نے بہت ہی رسان لہجے میں پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"کہاں گئی ہیں؟ اور کب تک واپسی متوقع ہے؟" ایک ساتھ دو سوال کیے گئے۔

میرا دل بھر آیا۔ کیا بتاتی میں محمود ظفر کو کہ امی کہاں گئی تھیں۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" کچھ دیر انتظار کے بعد کہا گیا۔

میں نے اپنے ہونٹوں کو باہم بھینچ لیا۔

"کچھ پریشان لگتی ہیں آپ؟"

"جی... نہیں..."

"میں نے کہا نا بزرگوں سے جھوٹ نہیں بولتے۔"

میں نے ذرا کی ذرا محمود ظفر کی طرف دیکھا۔

"اگر میری جگہ آپ کے والد ہوتے تو کیا آپ ان سے بھی اپنی پریشانی یونہی چھپاتیں؟"

میرا دل گویا کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ راکھ میں دبی چنگاری کو ہوائیں دے دی تھیں اس شخص نے۔ مجھے بابا یاد آ گئے۔ ایسی محبت اور شفقت تو انہی کے لہجے میں ہوا کرتی تھی۔ میں خود کو ایک دوراہے پر کھڑا پا رہی تھی اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ مجھے محمود ظفر سے نفرت کرنا چاہیے یا ان کے مشفق لہجے کو قبول کر لینا چاہیے۔

"سنا ہے آپ کی والدہ آپ کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہیں؟"

میں نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا اور نہ جانے کہاں سے آنسو شرارتی بچوں کی طرح اُدھم مچاتے میری آنکھوں میں آ گئے۔

"کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے؟"

میں تذبذب میں پڑ گئی۔ کیا مجھے انہیں بٹھانا چاہیے؟ اس سلسلے میں مجھے کسی کا خوف نہ تھا۔ کسی سے بغاوت کا فیصلہ تو میں بہرحال کر چکی تھی اور اس بڑے فیصلے کے مقابلے میں محمود ظفر کو اپنے گھر میں بٹھا کر ان سے بات کرنا بہت ہی معمولی بات لگتی تھی۔ خود سر، سرکش اور بدتمیز تو امی مجھے قرار دے ہی چکی تھیں۔ البتہ ڈر تھا تو مجھے خود اپنی طرف سے تھا۔ کیا محمود ظفر کے لہجے کی شفقت کو قبول کر لینا اپنے مقررہ راستے سے انحراف نہ ہو گا؟ کیا منحرف ہو جانے پر میں خود کو معاف کر سکتی تھی؟ خاصی دیر تذبذب میں رہنے کے بعد بالآخر میں نے محمود ظفر کو بٹھانے اور بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ زندگی واقعی بڑی جابر ہے۔ انسان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انا اور اصول دھرے رہ جاتے ہیں۔

محمود ظفر کو اوپر لے جانے کے بجائے میں نے نیچے ہی بنے دفتر کا کمرہ کھول کر اس میں بٹھانے کو ترجیح دی۔ روبرو بیٹھ جانے کے بعد محمود ظفر نے کہا:

"عالیہ بی بی! اس سے پہلے کہ میں آپ سے کچھ پوچھوں یا آپ سے کچھ کہوں، میں اس امر کی یقین دہانی کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ پر اسی قدر اعتماد کر سکتی ہیں جتنا کہ آپ نے کاظمی بیگ اور تیمور پر کیا۔"

میں نے پورے تحمل سے یہ بات سنی۔

کچھ دیر خاموشی اختیار کرنے کے بعد محمود ظفر نے کہا: "ایک بات پوچھ سکتا ہوں عالیہ بی بی؟"

"جی؟" میں نے دھیرے سے کہا۔

"کیا یہ شادی آپ کی مرضی سے ہو رہی ہے؟"

جی میں آیا کہوں، "آپ کو مطلب" لیکن عقل نے دامن تھام لیا۔ مجھے اس وقت واقعتاً کسی ایسے رہبر و رہنما کی ضرورت تھی جو مجھے بتا سکتا کہ وہ فیصلہ جو میں چپکے چاپ کر چکی تھی اور دل میں چھپائے بیٹھی تھی کیا وہ درست ہے؟ چنانچہ میں نے محمود ظفر کے سوال کے جواب میں نفی میں گردن ہلا دی۔

"گڈ۔" وہ بے ساختہ پرجوش لہجے میں بولے پھر گویا ہوئے:

"اس کا مطلب ہے! مجھے کچھ زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

میں اپنا زیریں لب دانتوں سے چبانے لگی۔

"ایک بات اور پوچھوں؟"

میں نے زبان سے کچھ کہنے سے گریز کیا تاہم اپنے تاثرات سے یہ ظاہر کر دیا کہ میں ان کی بات سن رہی ہوں۔

"عالیہ بی بی! آپ کے خیالات میں ابھی کچھ تبدیلی آئی کہ نہیں؟ میرا مطلب ہے... کیا آپ آج بھی یہی سمجھتی ہیں کہ ہر مرد ناقابلِ اعتبار اور مکار ہوتا ہے؟"

میں الجھنے لگی۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کرتے ہوئے میں نے شدید نگاہوں سے محمود ظفر کی طرف دیکھا۔ انھوں نے چند لمحے میرے جواب کا انتظار کیا پھر بولے: "آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا... کیا آپ اپنے موقف پر بدستور قائم ہیں؟"

"جی!" میں نے آہستگی سے مگر قطعیت کے ساتھ جواب دیا۔

"اللہ دسایا جیسے وفادار اور مخلص ملازم، وکیل صاحب جیسے بہی خواہ اور رازداں اور تیمور جیسے پاسدار جھوٹے ہوتے ہیں؟ اور... میں بھی آپ کا بہی خواہ ہی ہوں... بی بی! ہم سب ہی تو مرد ہیں اور آپ کو اس گرداب سے نکالنے کے متمنی ہیں۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اللہ دسایا جیسا ملازم میسر ہے وہ نہ ہوتا تو ہمیں خبر بھی نہ ہو پاتی اور آپ کی والدہ صاحبہ اس مرتبہ بڑی کامیابی سے ایک ایسا کھیل کھیل جاتیں جو میرے بیٹے تیمور کی دل آزاری اور مایوسی کا سبب بنتا۔ میں دو ہفتوں سے آپ کی والدہ محترمہ کو تقریباً ہر روز ہی فون کر رہا تھا۔ باقاعدہ پروگرام کے تحت وقت لے کر ملنا چاہتا تھا مگر وہ آج کل پر ٹال رہی تھیں۔ مجھے پتا تھا کہ اس ٹال مٹول کی آڑ میں وہ ایک نیا کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ویسے بی بی! بُرا مت مانئے آپ کی والدہ بڑی ہی تیز خاتون ہیں۔ مجھے تو وہ فون پر مستقل یہی کہہ رہی تھیں کہ ہم ساری تفصیلات رکھیں، عالیہ کو راضی کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ جیسے ہی راضی ہو گئی آپ کو حویلی آنے کی دعوت دوں گی اور دوسری طرف انھوں نے ایک ایسے شخص سے ناتا جوڑنے کا منصوبہ بنایا جسے وہ غالباً بہت خطرناک آدمی سمجھتی ہیں لیکن شاید وہ یہ بھول گئی ہیں کہ کمزور کردار انسانوں کا شریف انسانوں سے کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔ چوہدری برکت کمزور کردار کا آدمی ہے اس کا ثبوت ابھی نہیں ہے؟"

میں نے چونک کر محمود ظفر کی طرف دیکھا اور پوچھا: "آپ چوہدری برکت سے کیسے واقف ہیں؟"

"آپ کی کاکا کے توسط سے۔ آپ کی نانی جان کے انتقال کے بعد انھوں نے آپ کی کاکا کو شادی کی پیشکش کی تھی۔"

"یہ... یہ... آپ کو کس نے بتایا؟"

"آپ کی کاکا نے اور یہ غالباً واحد رشتہ تھا آپ کی کاکا کے لیے جس کا علم آپ کی ممی صاحبہ کو بھی نہیں... فون پر چوہدری صاحب نے خود اپنے آپ رشتہ کو پیغام دیا تھا۔ واضح رہے کہ اس وقت وہ تیسری شادی کر چکے تھے۔"

مجھے یہ سن کر حیرانی ہوئی۔ زندگی کیسے کیسے حیرت انگیز انکشافات سامنے لا رہی تھی۔

"اور... یہاں... جو کچھ ہو رہا ہے... میرا مطلب ہے اب اس کا علم آپ کو کیسے ہوا؟"

"میں نے کہا نا آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اللہ دسایا جیسا وفادار اور مخلص ملازم میسر ہے اس نے آج ہی اطلاع کروائی اور میں فوراً ہی یہاں آنے کو نکل لیا۔"

"مگر اللہ دسایا تو آج صبح سے ممی کے ساتھ ہے۔"

"ہوگا۔"

"تو پھر میں آپ کے اس بیان کو کیسے درست سمجھوں کہ اطلاع اس کے ذریعے ہی آپ کو ہوئی؟" میں نے کسی ہوشیار وکیل کی طرح جھٹ اعتراض نکالا۔

محمود ظفر دھیرے سے مسکرائے پھر بولے: "کیا آپ حقیقت جاننا پسند کریں گی؟"

"جی! میں سچ ہی سننا پسند کروں گی۔"

"اللہ دسایا نے یہ خبر آپ کے ملازم لڑکے الف دین سے بھجوائی تھی۔ اچھا سیدھا سادہ نوجوان نظر آتا ہے۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ پتا تلاش کرنے میں اسے دیر ہو گئی تھی۔ گاؤں بھی واپس لوٹنا تھا اور پہلی بار پیغام رسانی کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ ان ساری باتوں نے اسے کچھ پریشان کر دیا تھا مگر میں نے اسے تسلی دی تو کچھ پرسکون ہوا لیکن بی بی! براہِ کرم آپ اسے ڈانٹ ڈپٹ نہ کریں۔"

"اوہ... تو وہ اس لیے چھٹی لے کر گیا تھا۔"

"جی!" محمود ظفر کے ہونٹوں پر ہنوز مسکراہٹ تھی۔

"ابھی تک تو وہ واپس لوٹا نہیں۔"

"واپس آ چکا ہے جی! میرے ساتھ ہی آیا ہے مگر سارے راستے اس خوف سے منہ چھپائے بیٹھا رہا کہ کہیں بدقسمتی سے آپ کی ممی صاحبہ سے سامنا نہ ہو جائے۔ وہ بھی تو شہر ہی گئی

ہوئی ہیں نا؟"

"جی۔"

"شادی کے سلسلے میں انھوں نے آپ کی مرضی جاننے کی زحمت کی؟"

ایک ایسے شخص کا جس سے میں بے تکلف نہ تھی اس قدر نازک مسئلے پر سوال کرنا مجھے اچھا تو نہ لگ رہا تھا مگر اس کا مشفق لہجہ مجھے جواب دینے پر مجبور کر رہا تھا۔

"جی ہاں۔"

"آپ نے رضامندی ظاہر کر دی؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ... بس یونہی... میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔"

"ہاں ظاہر ہے ایک ایسی لڑکی جسے مرد سے نفرت کرنے کا سبق دیا گیا ہو، جس کے ذہن میں مرد کے خلاف نفرت ٹھونس دی گئی ہو، وہ شادی پر آمادگی کیوں کر ظاہر کر سکتی ہے اور آپ کی والدہ نے آپ کی مرضی کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا؟"

"جی۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"اور آپ نے شکست تسلیم کر لی؟"

"جی نہیں۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

میں ذرا دیر کو کشمکش میں پڑ گئی۔ پھر نہ جانے کیوں میرا جی چاہا کہ محمود ظفر کو سچ سچ بتا دوں۔ سو ایک گہری سانس لیتے ہوئے میں نے کہا۔ "ہار اور جیت کا مرحلہ ابھی نہیں آیا۔ اور اس مرحلے سے دوچار ہونے سے قبل آخری پتہ تو ابھی میرے ہی ہاتھ میں ہے۔"

محمود ظفر نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر بولے۔

"بی بی! ذرا وضاحت سے۔"

"بس اب اور وضاحت طلب نہ کریں۔ میں نے یہی بتا دیا بہت ہے۔"

محمود ظفر کچھ خجل سے نظر آنے لگے۔

"بی بی! ہار ہو یا جیت بس رسوائی نہیں ہونا چاہیے۔"

اب میرے خجل ہونے کی باری تھی۔ کس قدر گہری بات کہہ گئے تھے وہ۔ مجھے ان کی دانشمندی کا جی ہی جی میں قائل ہونا پڑا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا ممی کو بیٹھے بٹھائے یہ سوجھی کیا۔" میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو موڑ کر ایک مقام پر مرکوز کرتے ہوئے ان پر نظریں جما کر کہا۔

"بیٹھے بٹھائے تو نہیں سوجھی۔ انھوں نے باقاعدہ پلاننگ کی پھر یہ صورت حال منظر عام پر لائیں۔"

"میں... نہیں... نہیں..." میں نے کہا۔

"میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آپ کی ممی کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ آج نہیں تو کل رعنا کا وہ خواب جو اس نے آپ کے اور تیمور کے لیے دیکھا تھا شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے تیمور کا پتا کاٹ دینے کے لیے یہ اسکیم بنائی۔"

اگرچہ ممی کے بارے میں ایک غیر شخص کا یہ انداز گفتگو مجھے اچھا نہ لگ رہا تھا کچھ بھی سہی آخر کو وہ میری ماں تھیں مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ میں ہر قیمت پر ایسے ہاتھوں اور کالے دل والے لوگوں سے بچنا چاہتی تھی۔

"غلطی بہرحال کاکا کی بھی تھی۔"

"یعنی؟"

"کاکا کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ کسی کی زندگی پر اپنا فیصلہ ٹھونس جائیں۔"

محمود ظفر نے قدرے کڑے تیوروں سے مجھے دیکھا پھر بولے

"یہ تو آپ کو ماننا پڑے گا بی بی کہ رعنا کی نیت میں کوئی برائی نہیں تھی اس نے جو کچھ کیا نیک نیتی کے ساتھ کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آپ کی والدہ کی ازدواجی زندگی کی ناکامی کے منحوس سائے آپ کو بھی لے ڈوبیں جب کہ آپ کی والدہ کا رویہ ہمیشہ انتقامی کیفیت سے معمور رہا۔ رعنا کی خوشیوں کو انھوں نے محض اپنی انا کی تسکین کی خاطر خاک میں ملا دیا اور اب آپ کے نام میرا خط پڑھ کر وہ پھر ایک نئی سازش پر اتر آئی ہیں۔"

"وہ خط... آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ممی نے وہ خط پڑھا ہے؟"

"انھوں نے خود مجھ سے کہا۔"

"کیا!" انھوں نے آپ سے کہا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی.. انھوں نے خود مجھ سے کہا۔"

"مگر..."

"مگر کیا؟"

"وہ خط تو میں نے انھیں دکھایا ہی نہیں... وہ تو... اس میز کی دراز میں لاک ہے۔ اسے تو میں اوپر لے کر ہی نہیں گئی تھی۔ میں انھیں وہ خط دکھانا ہی نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی ممی نے مجھ سے اس خط کی بابت کوئی تذکرہ کیا۔"

"بی بی! انھوں نے مجھ سے خود کہا کہ ہمیں اپنے معاملات میں اپنے بچوں کو ملوث نہیں کرنا چاہیے۔ ان کو شکایت تھی کہ مجھے آپ کو وہ خط نہیں لکھنا چاہیے تھا... بہرحال میں نے اپنی اس غلط بیانی سے معذرت کر بھی لی تھی اور تب ہی انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ پرانے تمام اختلافات بھلا کر وہ آپ کو تیمور سے شادی پہ آمادہ کرنے کی کوشش کریں گی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس مرتبہ ایسا کھیل کھیلنے کی کوشش کریں گی۔"

"اوہ، میرے خدا! میرا سر گھومنے لگا۔

گویا کاکا کے خط کی طرح ممی وہ خط بھی دیکھ چکی تھیں۔ مگر کب؟ کیسے؟ خدایا! ممی کی رسائی کہاں کہاں تھی؟ کیا میرے لیے اپنا کوئی بھید بھی ان سے پنہاں رکھنا ممکن نہ تھا؟ غم و غصے اور بے بسی کے احساس سے مجھ پر ہیجانی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کو خاموشی چھا گئی پھر محمود ظفر کی آواز نے اس خاموشی کا سینہ چیرا۔

"بہرحال میں خوش ہوں کہ ہمیں دیر نہیں ہوئی ہے۔ ہم وقت پر پہنچ گئے ہیں اور جب آدمی کو دیر نہ ہو تو اس کا مطلب ہے خوش قسمتی اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہے۔ بی بی! آپ کی نانی بہت بڑا قرض چھوڑ گئی ہیں ہمارے اوپر اس قرض کو نبٹانے کی ایک ہی صورت ہے میرے پاس کہ ان کا خواب پورا کر دیا جائے۔ آپ کی ممی کو ایک محاذ پر تو شکست ہو ہی چکی ہے یعنی آپ کو مرد ذات سے متنفر کر دینے کے بعد اب وہ خود ہی آپ کا ہاتھ ایک مرد کے ہاتھ میں دینے پر آمادہ ہو چکی ہیں۔ اب دوسرے محاذ پر انھیں ہمارا سامنا اور مقابلہ کرنا ہے اور ہم اس مرتبہ بازی جیت کر رعنا کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا حساب بھی چکا دینا چاہتے ہیں...." وہ ذرا دیر کو رکے پھر انھوں نے ایک بڑا ہی عجیب سا سوال میرے سامنے رکھ دیا۔

"بی بی! آپ تو ساتھ دو گی نا ہمارا؟"

میں نے اپنے جبڑے باہم بھینچ لیے۔ بظاہر کتنی عجیب سی بات تھی کہ ایک غیر آدمی مجھ سے ممی کے خلاف ڈٹ جانے کا وعدہ لینا چاہ رہا تھا، مگر اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ یہ موقع اسے ممی نے خود فراہم کیا تھا۔

"بی بی! آپ اگر ساتھ دیں تو ہم جیت سکتے ہیں۔" محمود ظفر نے کہا۔

میں نے خاموشی پر اکتفا کرنا غنیمت جانا۔

"عالیہ بیٹی! ساتھ دیں گی نا آپ؟"

عالیہ بیٹی! یہ کیا کہہ دیا تھا انھوں نے اور کس قدر شفقت سے۔

چوہدری برکت علی نے بھی مجھے بیٹی کہا تھا مگر ان کے بیٹی کہنے اور محمود ظفر کے بیٹی کہنے میں کتنا فرق تھا۔ چوہدری برکت کے لہجے سے مجھے چاپلوسی اور ابن الوقتی کی بو آئی تھی اور محمود ظفر کا لہجہ گویا احساس اور شفقت میں ڈوبا ہوا تھا یا جیسے پھول کی مخملیں پنکھڑیوں پر صبح سویرے شبنم کے معطر و معطر موتی۔

قدرے توقف سے محمود ظفر نے کہا: "بی بی! میں آپ کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"پہلی بات تو یہ کہ آپ کا سوال غیر واضح ہے اور دوسری بات یہ کہ..." میں کہتے کہتے رک گئی۔

"بی بی! میرے سوال کا مطلب یہ ہے کہ آپ میرے بیٹے کے لیے انکار تو نہیں کرو گی نا؟"

"دیکھیے! اس سلسلے میں نہ تو ہاں کا کوئی سوال ہے نہ ہی نہ کا۔ اس سوال پر غور کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں سمجھتی میں۔"

"ایک بات کہوں بی بی آپ برا نہ منائیں۔ فطرت سے بغاوت کرنے والے کبھی نہیں جیت سکتے۔"

"بہرحال یہ میرا فیصلہ ہے۔" میں نے قطعیت کے ساتھ کہا۔

"اچھا دوسری بات آپ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"دوسری بات یہ کہ کیا آپ کسی بیٹی سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی ماں کے خلاف ڈٹ جائے؟"

"میں سمجھتا ہوں یہ ڈٹ جانا آپ کے اس فیصلے سے بہرحال بہتر ہو گا جس کا ڈھکا چھپا اظہار آپ نے ذرا دیر قبل ہی کیا تھا۔ بی بی! جرأت کر لینا رسوائی خریدنے سے بہرحال بہتر ہوتا ہے۔"

کس قدر کھرا وار کر گئے تھے وہ، میں پانی پانی ہو کر رہ گئی۔

"ویسے اگر سچ پوچھیے تو آپ کی ممی صاحبہ رحم کھائے جانے کے لائق ہیں بیٹی۔ وہ صد فی صد ایک نفسیاتی کیس ہیں۔ اپنی ازدواجی زندگی کے المیے کو انھوں نے مرد ذات کے خلاف نفرت کا ایک جواز بنا کر آپ کے ذہن میں ٹھونس دینے کی کوشش کی اور رعنا پر بھی خوشیوں کے دروازے بند کر دیے۔ اپنی انا کی تسکین کے لیے انھوں نے رعنا کو دکھ پہنچانے اور اپنی والدہ کی جان پر بن جانے والا کھیل کھیلنے سے بھی گریز نہیں کیا... حویلی کی بابت رعنا کے فیصلے کو انھوں نے ابتدا میں تسلیم نہیں کیا لیکن جب انھیں تیمور کی اصل حیثیت کا علم ہوا تو انھوں نے پچھلے سالوں پر پردہ ڈالنے کی خاطر مفاہمت کی راہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر آپ ان سے متفق نہ ہوئیں اور تیمور سے آپ کا زبردست تصادم ہوا، تیمور جیت کر بھی جیت نہ سکا اور ممی جذبات میں آ کر آپ کو وہ

سب کچھ لکھ بیٹھا جس کے بارے میں مجھے بعد میں احساس ہوا کہ مجھے آپ کو وہ سب کچھ نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ آپ کے بیان کے مطابق آپ نے تو اپنی والدہ کو مذکورہ خط نہیں دکھایا مگر آپ کی والدہ نے کسی نہ کسی طور سے پڑھ لیا۔ میں نے جب اپنے بیٹے کے رشتے کی بابت ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے مجھے تاریکی میں رکھتے ہوئے میرے اور میرے بیٹے تیمور کے خلاف انتقامی کارروائی کے طور پر آپ کا رشتہ برادری کے ایک ایسے شخص کے بیٹے سے کر دینے کی کوشش کی جس کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ منتقمانہ جذبات کی شدت میں آپ کی امی یہ بھی بھول گئیں کہ اس طرح وہ اپنی بیٹی کو جہنم کے شاید اس دوزخ میں دھکیل دیں گی جس کی تپش کو وہ خود تو شاید برداشت بھی نہ کر سکیں یہاں آتے ہوئے ہم چوہدری برکت علی کے گاؤں سے ہو کر آئے ہیں۔ الف دین تو کسی شناسا کے دیکھ لیے جانے کے خوف سے منہ لپیٹ کر پچھلی سیٹ پر پڑ گیا تھا۔ میں اور تیمور گاؤں کے ایک مسافر خانے میں جا بیٹھے اور دو چار مقامی لوگوں سے باتوں ہی باتوں میں چوہدری برکت علی کا ذکر بھی نکال لیا۔ ایسے ایسے انکشافات ہوئے چوہدری صاحب اور ان کے شہری بیٹے کے بارے میں کہ الاماں۔ حشمت علی صاحب تو ان گاؤں اس لیے آئے ہوئے ہیں کہ انھوں نے [illegible] کی کوشش کی تھی۔ موصوف ان دنوں حوالات میں ہیں اور چوہدری برکت علی اور حشمت علی گاؤں میں بیٹھے شہر میں اپنے اثر و رسوخ کو استعمال میں لا کر مجرم کو حوالات سے چھڑوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"میرے خدا! امی مجھے ایسے لوگوں میں جھونک دینا چاہتی ہیں۔" میں نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

"آپ اگر چاہیں تو میرے ان بیانات کی تصدیق بنفسِ نفیس چوہدری برکت علی کے گاؤں جا کر کر سکتی ہیں۔" محمود ظفر بولے۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ کاکا کا کہا میرے لیے ایمان کا درجہ رکھتا ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں کاکا مجھے پہلے ہی بتا چکی تھیں۔"

"اچھا!"

"جی ہاں۔"

"کیا مطلب؟"

"بس تفصیل رہنے دیجیے۔"

"چلیے رہنے دیتے ہیں۔ مگر یہ بتائیے کہ آپ طوفان کو سر پر چڑھ آنے کا موقع کیوں دے رہی ہیں؟ پہلے ہی بند کیوں نہیں باندھ دیتیں؟"

میں نے استفہامیہ نگاہوں سے محمود ظفر کی طرف دیکھا۔

"بی بی! جب یہ پتا ہے کہ وہ اچھے لوگ نہیں اور یہ بھی طے ہے کہ آپ ہاں نہیں کریں گی تو پھر یہ منگنیوں کا تبادلہ اور برادری میں اس خبر کا ڈھنڈورا پیٹنا چہ معنی دارد؟ امی صاحبہ سے دو ٹوک بات کریں۔ آپ جیتی جاگتی، عاقل و بالغ، پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی ہیں۔ حق ہے آپ کا اس فیصلے کے خلاف آواز اٹھائیے اور انھیں آپ آج ہی اپنا فیصلہ سنا دیجیے۔"

"میں جانتی ہوں امی فی الحال کچھ نہیں سنیں گی۔ اپنا فیصلہ سنانے کے لیے مجھے مناسب وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"تو کیا اس وقت تک وہ بے چارہ گاڑی میں بیٹھا سوکھتا رہے گا؟"

"کون؟" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"میری زندگی، میری جان، میرا بیٹا تیمور عالم ٹائیگر۔"

میں نے محمود ظفر کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی متانت سے مسکرا رہے تھے۔ ان کی مسکراہٹ نے مجھے بوکھلا کے رکھ دیا۔ کشمکش کے عالم میں، میں اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔

پھر میں نے اپنے بیگ سے چابیوں کا گچھا نکالا اور ان کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا؟"

"تیمور صاحب سے کہیے، دو چار دن میں ہم کمرے خالی کر دیں گے۔"

"بھئی، الیہ بی بی! یہ آپ کا اور تیمور کا داخلی معاملہ ہے میں تو اس کی سفارش لے کر آیا تھا آپ کے پاس۔ کیا سمجھیں؟ مجھے ان چابیوں سے کوئی سروکار نہیں۔"

میں نے میز کی دراز کھولی اور گول کمرے کی چابی بھی جو تیمور حویلی سے جاتے وقت الف دین کو دے گیا تھا، ان کے سامنے رکھ دی۔

"کیا یہ کوئی خاص چابی ہے؟"

"یہ اس کمرے کی چابی ہے جو تیمور صاحب کے زیرِ استعمال تھا۔"

"او آئی سی۔ بس میں یہ ایک چابی لیے لیتا ہوں۔ میں کیوں کہ اب تو ہم نے اس وقت تک یہاں سے ہلنا نہیں ہے جب تک کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ میرے ہوتے چوہدری برکت علی کی مجال نہیں کہ اپنے بیٹے کو لے کر یہاں آ جائے۔"

مجھے ایک نامعلوم سی تقویت اور تحفظ کا احساس ہوا لیکن ساتھ ہی مجھے یہ خیال ستانے لگا کہ اس شخص سے میرا کیا ناتا ہے جو میں پچھلے گھنٹہ بھر سے اس سے متعلق نوعیت کی باتیں کر رہی تھی۔ کیا یہ اپنے ناتے سے انحراف نہیں تھا؟

محمود ظفر نے چابیوں کا گچھا پڑا رہنے دیا بس وہی ایک چابی اٹھائی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

ممی کی واپسی بتیاں جل اٹھنے کے بعد ہوئی۔ وہ خاصی سراسیمہ اوپر پہنچیں اور انھوں نے بشیراں سے پوچھا: "احاطے میں گاڑی کس کی کھڑی ہے اور یہ نیچے گول کمرے کی بتی کیوں جل رہی ہے؟"

ماسی بشیراں نے دزدیدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر ممی کی جانب دیکھتے ہوئے بولی: "بی بی صیب جی! تیمور باؤ آئے ہیں جی اپنے ابے جی کے ساتھ۔"

"کیا؟" ممی متوحش نظر آنے لگیں۔

"ہاں جی تیمور باؤ آئے ہیں۔"

"کیوں؟"

"بی بی صیب جی! مجھے کیا پتا کیوں آئے ہیں۔"

"تم نے بھی نہیں پوچھا ان سے کہ کیوں آئے ہیں؟" ممی نے مجھ سے کہا۔

"جی نہیں۔"

"الف دین کے ذریعے بھجوایا ہوتا۔"

"الف دین شام تک کی چھٹی لے کر گیا ہوا تھا۔"

"بشیراں کو بھیجا ہوتا۔"

"میں نے نہ ضرورت سمجھی نہ مناسب جانا۔"

"کیوں؟"

"میرا خیال ہے آپ اچھی طرح جانتی ہیں کیوں۔"

"کیا جانتی ہوں میں اچھی طرح؟"

"یہی کہ عدالت کو اس کے حق میں فیصلہ دیے کافی دن ہو چکے ہیں۔ عدالت کے فیصلے کے مطابق حویلی کی زیریں منزل اسی کی ہے۔"

"مگر وہ اپنے باپ کو کیوں لایا ہے؟"

"وہ کسی کو بھی لا سکتا ہے ممی!"

ممی لاجواب سی نظر آنے لگیں۔

"اللہ وسائے تم ذرا نیچے جا کر جائزہ تو لو۔ بشیراں تم بھی جاؤ۔"

اللہ وسایا اور ماسی بشیراں کے جانے کے بعد ممی کا روئے سخن میری جانب ہوا: "کب آیا وہ؟"

"ممی جی آیا نہیں آئے کہیے کیوں کہ وہ دو ہیں۔"

"کس وقت آئے؟"

"شام کو۔"

"تم کہاں تھیں؟"

"نیچے ہی تھی۔"

"حویلی میں اجازت لے کر داخل ہوئے؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں؟"

"غالباً ضرورت محسوس نہیں کی ہوگی ویسے بھی ممی اپنے گھر میں داخل ہونے کے لیے کسی کو اجازت لینے کی بھلا کیا ضرورت۔ کیا ہم اجازت لے کر داخل ہوتے ہیں حویلی میں؟"

"یہ کیسے پتا چلا کہ ساتھ آنے والا اس کا باپ ہی ہے؟"

"ماں باپ تو آپ ہی پہچانے جاتے ہیں ممی! آپ کو یاد نہیں جب آپ میرے کالج آئی تھیں تو بہت سی لڑکیاں آپ ہی سمجھ گئی تھیں کہ آپ میری ممی ہیں۔"

"تم نے دیکھا اس کے باپ کو؟"

"جی ہاں۔"

"کیسا ہے؟"

"بہت بدل گیا ہے ممی!"

ممی نے ہڑبڑا کر میری طرف دیکھا اور بولیں: "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ گردشِ زمانہ نے اس کے نقوش بگاڑ دیے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شخص ہے جو کبھی کاکا کا طلب گار بن کر حویلی پہنچا تھا۔"

ممی ہکا بکا کچھ دیر میری صورت دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

"شکر ہے میں دوبارہ اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی فیصلہ کر چکی ہوں۔"

"نہیں ممی جی، ابھی فیصلہ کہاں ہوا ہے؟ فیصلہ تو ہوگا... اور غالباً آپ اس امر سے انکار نہیں کریں گی کہ فیصلے کا حق مجھی کو حاصل ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" ممی نے تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"میرا مطلب یہ ہے ممی کہ میں کوئی کھلونا نہیں ہوں جس سے آپ اپنی مرضی کے مطابق کھیلتی رہیں۔ آپ نے چاہا میں مرد کو اس دنیا کی ذلیل ترین، ناقابلِ اعتبار اور عیار مخلوق سمجھوں میں نے ایسا ہی کیا۔ آپ نے چاہا میں آپ کی زندگی کی تلخیوں کو سینے سے لگائے رکھوں میں نے وہی کیا۔ آپ نے حویلی کو خیرباد کہنے کی رائے دی میں مجبوراً اس پر بھی آمادہ ہو گئی۔ آپ نے کہا، پاپا بے وفا تھے، میں نے تسلیم کیا بے چون و چرا۔ آپ نے کہا تمھیں اپنی ممی اور کاکا کا بدلہ لینے کے لیے مردوں کے خلاف چٹان بن جانا ہے میں ڈٹ گئی۔ آپ نے جو راستہ میرے لیے متعین کیا،

میں اس پر سر جھکائے چپ بیٹھی رہی مگر... "آپ کا یہ فیصلہ مجھے تسلیم نہیں۔
میں مردہ نہیں ہوں کہ آپ کفن میں لپیٹیں اور زمین برد کر دیں۔
میں زندہ ہوں، میری بھی کچھ مرضی، کوئی خواہش ہو سکتی ہے۔"
ممی نے خوفزدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بڑبڑائیں:
"اچھا! تو وہ لمحہ آگیا ہے؟"
"جی ہاں فیصلے کا لمحہ آگیا ہے۔"
ممی ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر سر جھکائے
خاموش بیٹھی رہیں پھر انھوں نے ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے میری
طرف دیکھا اور بولیں: "یہ تم نہیں بول رہی ہو۔"
"پھر؟"
"وہ نصرت بول رہی ہے جو محمود ظفر نے اپنے خط کے
ذریعے تمھارے ذہن میں انڈیلنے کی کوشش کی تھی۔"
"جی نہیں، اگر ایسا ہوتا تو میں بہت پہلے بول چکی ہوتی۔"
"تو پھر؟"
"میں آپ کو اپنے ہونے کا احساس دلانا چاہتی ہوں۔
میں زندہ ہوں، میرا ایک وجود ہے، حیثیت ہے۔ میں سلیٹ نہیں
ہوں ممی کہ آپ جو چاہیں اس پر لکھیں اور جب چاہیں مٹا دیں۔"
ممی کی آنکھوں میں گہری وحشت اور خوف سا اتر آیا۔
انھوں نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا اور بڑی دیر یونہی
بیٹھی رہیں پھر انھوں نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور
تھکی تھکی سی آواز میں بولیں: "محمود ظفر کا خط پڑھ کر تمھیں مجھ سے
نفرت نہیں ہوئی؟" ممی کا یہ سوال میرے لیے حیران کن تھا۔ "ہوئی
نا...؟"
میں نے اپنے لب باہم بھینچ لیے۔ میں خود کو شدید بے بسی
سے دوچار پا رہی تھی۔ "بولو!"
بے اختیار میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں
سے ممی کو دیکھتے ہوئے پورے وثوق سے کہا: "ممی جی! میں چاہوں
بھی تو آپ سے نفرت نہیں کر سکتی۔ ماں باپ سے محبت کی جاتی
ہے نفرت نہیں۔ ماں تو آسمانی تحفہ ہے ممی اور تحفہ ہر صورت
قابلِ احترام ہوتا ہے۔"
"ماں باپ سے۔" ممی خود کلامی کے عالم میں بڑبڑائیں۔
"جی ماں باپ سے بھی۔" میں لمحہ بھر کو تھمی پھر میں نے
کہا: "ممی جی! غلطیاں انسانوں ہی سے ہوتی ہیں، فرشتوں سے
نہیں اور پاپا بہرحال انسان تھے۔ ہمیں ان کے ساتھ اتنا ستم
نہیں روا رکھنا چاہیے تھا کہ ان کے مرنے کے بعد بھی ہم
انھیں اچھے الفاظ میں یاد نہ کر سکے۔"
ممی چند لمحے تو ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہیں پھر
یک بیک انھوں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ
لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ یہ صورتِ حال میرے لیے
غیر متوقع ہی تھی اور تکلیف دہ بھی۔ ممی کو میں نے بہت کم
روتے دیکھا تھا۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر میں ممی کے قدموں میں جا
بیٹھی اور ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبوچتے ہوئے میں نے
انھیں اس محبت کا یقین دلانے کی کوشش کی جو میں اپنے دل
میں ان کے لیے رکھتی تھی۔
ممی کو پُرسکون ہونے میں خاصی دیر لگی۔ جب ان کے
آنسو تھم گئے تو میں نے بہت ہی محتاط انداز میں کہا: "ممی! کیا میں
آپ سے ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟"
انھوں نے قدرے تشویش کے ساتھ میری طرف دیکھا
پھر بولیں: "ہاں، پوچھو۔"
"اس خط کے بارے میں آپ کو کیسے پتا چلا؟ میرا مطلب
ہے میں نے تو اسی خیال سے کہ آپ اسے پڑھ کر پریشان ہو
جائیں گی اسے بہت احتیاط سے رکھا تھا۔ آپ نے کیسے
پڑھ لیا؟"
"کیا اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے؟" ممی نے بھیگی
ہوئی آواز میں کہا۔
"ہاں! میں جاننا چاہوں گی۔"
"اتنا حق تو مجھے ہے نا کہ میں تمھاری غیر موجودگی میں بھی
تمھارے دفتر میں جا کر بیٹھ سکوں۔"
میں نے اپنی عقل کے گھوڑے یکلخت دوڑائے اور فوراً ہی
ساری صورتِ حال میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ یعنی جس روز میں وکیل صاحب
سے مشورہ لینے گئی تھی اس روز ممی میرے دفتر میں جا کر بیٹھی ہوں
گی۔ اگرچہ میں باہر جاتے ہوئے اپنا دفتر مقفل کر جانے کی عادی
تھی مگر ڈپلیکیٹ چابیوں کا ایک گچھا اور بھی تو موجود رہتا
ہی تھا۔
ممی نے مجھے گہری سوچ میں دیکھا تو بولیں: "کیا مجھے اس کا
اختیار نہیں؟"
"آپ کو ہر بات کا اختیار ہے ممی جان! میرا بس چلے تو میں
اپنی جان بھی آپ ہی کے اختیار میں دے دوں، پر ممی..."
"پر کیوں نہیں؟" ممی کی نگاہوں میں سارے جہاں کی سی گہرائی اتر
آئی تھی۔
"میں... میں حشمت علی سے شادی نہیں کر سکتی۔"
ممی چپ رہیں اور میں نے ان کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے
ہوئے کہا: "وہ اچھے لوگ نہیں ہیں ممی! وہ لمبے ہاتھوں اور کالے دھندے
والے لوگ ہیں کیا آپ مجھے جہنم میں جھونک دینا پسند کریں گی؟"

اور بولے: "یہ سب کچھ آپ ہی کا ہے گا بیٹی!"

انھوں نے سر پر ہاتھ دھرا تو مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ جیسے سر پر سائبان سا تن گیا ہو۔

برآمدے کے مرکزی ستون کے نزدیک وہ تھم گئے اور انھوں نے مجھ سے پوچھا: "بی کے فیصلے کے خلاف آواز اٹھانے کا ارادہ کیا یا نہیں؟"

"بات ہو گئی ان سے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا! کب؟"

"رات کو۔"

"ارے! بہت عجلت دکھائی آپ نے تو۔"

"وقت جو بہت کم تھا۔"

"پھر کیا رزلٹ رہا؟"

"رزلٹ تو آج سامنے آئے گا۔"

"آپ نے کیا کہا؟"

"میں نے صاف کہہ دیا کہ میں حشمت اللہ سے شادی نہیں کر سکتی۔"

اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ یوں میں ایک غیر آدمی سے اپنے قطعاً نجی معاملے پر گفتگو کر رہی تھی۔ اور کسی معمول کی طرح اس کے سوالوں کے جواب دیے جا رہی تھی۔

وہ مجھ سے باتیں کرتے میرے دفتر تک آ پہنچے۔ اللہ دین حسب معمول دفتر کھول کر جھاڑ پونچھ کر چکا تھا۔ میرے ساتھ وہ بھی کمرے میں داخل ہو گئے اور مجھے اپنی کرسی پر بیٹھنے سے قبل انھیں بھی بیٹھنے کی دعوت دینا پڑی۔ میرے روبرو بیٹھ جانے کے بعد انھوں نے کہا: "عالیہ بی بی! وقت کی کمی کا خود مجھے بھی احساس ہے۔ میں فوری طور پر آپ کی والدہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا مل لوں میں ان سے؟"

"میں... میں کیا کہہ سکتی ہوں جی آپ کی مرضی۔"

"تیمور بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ میرا بیٹا ہے بلکہ وہ واقعی بہت خوبیوں کا مالک ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ اس کے ساتھ بہت خوش رہیں گی۔"

مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی۔

"عالیہ بی بی! یہ رعنا کی شدید خواہش تھی اور اسی ناتے اب یہ میری بھی دلی خواہش بن چکی ہے۔"

میری ٹھوڑی پر ہلکی سی لرزش طاری ہو گئی۔

"مل لوں نا میں آپ کی والدہ سے؟ کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا آپ کو؟"

نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے: "میرا خیال ہے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ... کیوں کہ میں الجھے راستوں پر چلتے چلتے خود بھی الجھ گئی ہوں شاید ابنارمل ہو گئی ہوں۔"

"میں تو تمھیں سپر نارمل سمجھتا ہوں اور جانتی ہو کیوں؟"

وہ آپ سے تم پر آ گئے تھے۔

میں نے اپنی آنکھوں میں ہلکورے لیتے آنسوؤں کی پروا کیے بنا ان کی جانب دیکھا۔ وہ بڑی شفقت سے مجھی کو دیکھ رہے تھے۔ میری نگاہوں میں ڈولتے سوال کو پڑھ کر وہ بولے۔

"میں تمھیں سپر نارمل اس لیے سمجھتا ہوں کہ تم رعنا کی بھانجی ہو۔ رعنا سے وابستگی رکھنے والی ہر شے مجھے اسپیشل محسوس ہوتی ہے۔"

میں ان کا منہ تکتی رہ گئی۔ واقعی محبت پر فرہاد، مجنوں، مہینوال اور رانجھے ہی کی اجارہ داری نہیں۔ اور بھی ہیں جو محبت کرنا اور محبت نبھانا جانتے ہیں۔

کمرے کی کھلی کھڑکی سے میں ایک کار کو حویلی کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ سکتی تھی۔ محمود ظفر صاحب نے بھی یہ منظر دیکھ لیا تھا وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا بی بی! ہمارا شہزادہ آ گیا ہے چلتا ہوں۔ بیٹا بڑا کنسا ہے۔ رات کی کسر بھی تو پوری کرنا ہے نا۔"

اوہو! تو گویا رات کو وہ واقعی جاگ رہے تھے۔

"تمھارے خیال میں دربار عالیہ میں ملاقات کے لیے کون سا وقت موزوں رہے گا؟"

"وہ جی... ابھی تو امی سو رہی ہیں۔"

"[illegible] تک۔"

"وہ بات تم کو لاشعور زیادہ مسلسل تھیں۔"
"حمید ورنہ کہ انسان کو زندگی نے یہی تحفہ دیا ہے۔"
وہ خاصی آزردگی سے بولے

جاتے جاتے انھوں نے مجھ سے کہا: "میں اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سال اللہ وسایا کو الرٹ کیے دیتا ہوں، جونہی وہ مجھے تمھاری تجویز کے جواب میں کچھ بتائیں گے، میں اور بیٹی حاضر ہو گا۔ آج کا دن فیصلے کا دن ہے اور ہاں تم سب کی گزارش نہیں کروں گی۔ ابھی تک پہلی ضد پہ قائم ہیں۔"

خدایا! اس شخص کا لہجہ تو مجھے مارے ڈال رہا تھا اور کتنی عجیب بات تھی کہ وہ اس گھرانے سے تعلق رکھتا تھا جس سے میں نفرت کا دعویٰ رکھتی تھی۔ وہ سارے دعوے دھرے رہ گئے تھے۔

واقعی وہ فیصلے کا دن ثابت ہوا۔ محمود ظفر نے جس عزم کا اظہار کیا تھا وہ کر بھی دکھایا۔ وہ جیت گئے۔ ممی بھی ہار گئیں اور میں بھی۔ ہتھیلی پر سرسوں جمائی گئی۔ اس تمام جب برادری کے وہ لوگ جنھیں ممی چوہدری برکت علی کے ہاں جانے کے لیے مدعو کر کے آئی تھیں حویلی پہنچے تو نکاح نامہ پڑھا جا رہا تھا۔ ممی کے پاس کوئی اور راستہ نہ رہ گیا۔ تب انھیں بھی راضی ہونا ہی پڑا کیوں کہ برادری والوں کو ہنسنے اور باتیں بنانے کا موقع جو نہ دینا تھا۔ رخصتی کے لیے ممی چند ماہ کا وقفہ رکھنا چاہتی تھیں مگر ظفر صاحب نے بمشکل ایک ماہ کی مہلت دی۔ ممی نے صرف ایک شرط رکھی اور وہ یہ کہ شادی کے بعد میں حویلی ہی میں رہوں گی۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ شاید خاندانی روایت بن چکی تھی مجھ سے پہلے میری ممی کی شادی کے موقع پر نانی اماں نے میرے بابا کے سامنے یہی ایک شرط رکھی تھی اور ممی سے پہلے نانی اماں کی شادی کے موقع پر میرے پرنانا نے بھی یہی ایک شرط میرے نانا کے سامنے رکھی تھی۔ میں نے صرف ایک شرط رکھی اور وہ یہ کہ اللہ وسایا کی خدمات اب صرف میرے اور بہبود مرکز کے لیے وقف رہیں گی۔ بہبود مرکز کے قائم رہنے کا فیصلہ ہم سب کا مشترکہ فیصلہ تھا۔ چوہدری برکت علی نے ممی کے زبان دے کر بدل جانے پر برافروختگی کا اظہار کیا جس سے ممی عورت ہونے کے ناتے کچھ خائف بھی ہوئیں مگر محمود ظفر صاحب اور تیمور نے ذرا پروا نہ کی بلکہ ممی کو بھی ہراساں نہ ہونے کی تلقین کی۔

جب میں حویلی کی بالائی منزل سے رخصت ہو کر زیریں منزل پر آنے لگی تو ممی نے میرا ماتھا چومتے ہوئے کہا: "میری جان! تمھاری کاکا نے تمھارے لیے تمھاری ممی سے بہتر سوچا۔"

گردی بوڑھے نے زبان بندی نہ کی ہوتی تو میں کہتی۔
"ممی! کاکا جی کے خواب کو تعبیر تو بہر حال آپ ہی نے دی ہے۔"

حویلی کا زینہ عبور کرتے ہوئے مجھے کاکا کے آخری خط کی یہ سطریں یاد آ گئیں۔

"زندگی ہمیشہ وہی نتائج ہمارے سامنے نہیں لاتی جن کے ہم خواہاں ہوتے ہیں، نتائج ہماری توقعات کے برعکس بھی ہو سکتے ہیں۔"

واقعی نتیجہ ہماری توقعات سے کس قدر مختلف رہا تھا۔ میرا مطلب ہے میری اور ممی کی توقعات سے۔

حجلۂ عروسی اسی کمرے میں آراستہ کیا گیا تھا جسے کبھی ہم ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے اور جہاں میں نے محمود ظفر صاحب اور کاکا کو پہلی بار یکجا بیٹھے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ رونمائی کے وقت تیمور نے بڑی خوب صورت چیز دی۔

سنہری ریگزین فائل میں جس کے بارے میں مجھے تیمور نے بعد میں بتایا کہ اس موقع کے لیے بطورِ خاص تیار کروائی گئی تھی حویلی کی ملکیت میں تیمور کی اپنی شراکت سے میرے حق میں دستبرداری کی دستاویز تھی جس کو باقاعدہ قانونی حیثیت دینے کے لیے مقررہ کارروائی سے گزرنا باقی تھا۔

ہیروں سے مرصع خوب صورت کنگن میرے ہاتھ میں پہناتے ہوئے تیمور نے پوچھا: "بھابی جی! اب تو مردوں سے نفرت نہیں ہے نا آپ کو؟"

میں نے اپنے دل میں جھانکا اور ششدر رہ گئی۔ کیا یہ وہی دل تھا جسے ممی نے مرد ذات کے خلاف ایک ناقابل تسخیر قلعہ بنا کر اس کے چہار اطراف خاردار باڑھ کھڑی کر دینے کی کوشش کی تھی؟

وہاں تو اب پھول کھلے پڑے تھے اور وہ ناقابل تسخیر قلعہ تسخیر کیا جا چکا تھا۔ کاکا کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے میں نے تیمور کو حویلی ہی میں نہیں اپنے دل میں بھی جگہ دے دی تھی۔

میں جی ہی جی میں کاکا کی دوراندیشی کی قائل ہوئی جا رہی تھی۔ حویلی کے سلسلے میں میرے اور تیمور کے مابین اختلافات بالآخر اسی طور ختم ہوئے تھے جس کی کاکا خواہاں تھیں۔

کاکا مرنے کے بعد بھی جیت گئی تھیں اور ہم زندہ رہتے ہوئے بھی ہار گئے تھے۔ شاید اس لیے کہ کاکا نے فطرت سے بغاوت کرنے اور اپنے دکھوں کے سائے دوسروں پر مسلط کر دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔

انسان کب آسودہ ہوتا ہے؟

جواب: جب اسے پیٹ بھر کر کھانے کے لیے روٹیاں مل جائیں۔

اُس کا نام انعام اللہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے انعام میں روٹیاں ہی روٹیاں دی تھیں۔ وہ خوب پیٹ بھر کر کھاتا تھا اور خوب سیر ہو کر پانی پیتا تھا۔ اسے کبھی اس بات کی فکر نہ ہوتی کہ لنچ یا ڈنر کے وقت کیا کھائے گا۔ ابھی سے لنچ میں مرغن غذائیں، تازہ پھل، خشک میوے، ٹھنڈے میٹھے مشروبات، دودھ، دہی، غرض طاقت سے اور توانائی سے بھرپور غذائیں اسے میسر تھیں۔ کلام پاک کی آیت اس نے پڑھی تھی: "اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟"

انسان کی آسودگی ہمیشہ سفر کرتی ہے۔ وہ کبھی ایک اسٹیشن پر نہیں ٹھہرتی۔ انعام نے محسوس کیا، پیٹ بھر کر کھانے اور خوب سیر ہو کر پانی پینے کے بعد بے شک وہ آسودہ ہوتا ہے، مگر کچھ دیر بعد بے چین سا ہو جاتا ہے۔ آسودگی روٹی کے اسٹیشن پر زیادہ نہیں رکتی۔ آگے چل پڑتی ہے۔ آگے چلتے چلتے اس کے پاؤں ڈگمگانے لگتے ہیں، جب تک اگلا اسٹیشن نہ آ جائے۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے پاؤں سے چلتی رہتی ہے۔ اسے ایک ذرا قرار نہیں آتا۔

پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ آخر انسان کب آسودہ ہوتا ہے؟

جواب: جب اُسے بے انتہا دولت مل جائے۔

انعام اللہ کو اللہ تعالیٰ نے بے انتہا دولت دی تھی۔ انکم ٹیکس والوں کو دکھائی ہوئی لاکھوں کی جائیداد ملک میں تھی اور ملک کے باہر لاکھوں پونڈ اور کروڑوں ڈالر مختلف بینکوں میں محفوظ تھے۔ وہ صبح پاکستان میں ناشتا کرتا تھا اور رات کا کھانا پیرس میں کھاتا تھا۔ دوسرے دن کا لنچ لندن کے کسی مہنگے ہوٹل میں کرتا تھا۔ پاکستان، ترکی، یونان، اٹلی، فرانس اور انگلینڈ کے بڑے بڑے شہروں میں اس کی محل نما کوٹھیاں تھیں۔ ہر کوٹھی میں دو چار مہنگی گاڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ وہ یورپ کے کئی فلائنگ کلبوں کا ممبر تھا۔ صرف آدھے گھنٹے کے نوٹس پر اس کے لیے ہیلی کاپٹر یا طیارہ چارٹرڈ ہو جاتا تھا۔

اسے اور کیا چاہیے تھا؟ آسودگی کے لیے سب کچھ موجود تھا۔ پتا نہیں کیوں اتنی آسودگی کے باوجود پھر بے چینی سی ہونے لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا آسودگی اپنی تکمیل کو نہیں پہنچی ہے۔ ابھی اس کا سفر جاری ہے۔

ایسے میں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان کب آسودہ ہوتا ہے؟

جواب: جب اسے بے انتہا محبت مل جائے۔

اللہ تعالیٰ نے جب بھی انعام کو دیا تو چھپر پھاڑ کے دیا۔

اُس روز محبت اس کے لیے آسمان سے اتاری گئی۔ وہ سمندر کی ساحلی ریت پر کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ نیلے امبر کی بلندی سے اُس کی طرف چلی آ رہی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو وہ آتے آتے بھی نہیں آئی۔ پرواز کرتے ہوئے قریب سے گزر گئی۔ وہ فلائنگ کائٹ کے راڈ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ قریب سے گزرنے کے دوران اس نے بھی انعام کو دیکھا۔ وہ نیکر اور جرسی پہنے ہوئے تھی۔ سمندر کی ساحلی دھوپ میں اس کا گورا بدن چم چم چمک رہا تھا۔ کیا غضب کا نظارہ تھا۔ تاب دید نہ رہی تھی۔ ویسے ساحلی ریت کے ذرے چمک رہے تھے، اور پھر وہ کرن کرن جگمگاتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ایسے میں وہ کچھ دیکھ سکا لیکن بہت کچھ دیکھنے کو رہ گیا تھا۔

وہ فلائنگ کائٹ کے سائے میں دُور تک لہراتی ہوئی گئی۔ انعام اسے سر اٹھائے دیکھتا رہا۔ اسے پھر قریب سے دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس کی یہ خواہش جلد ہی پوری ہو گئی۔ فلائنگ کائٹ ایک لمبا چکر کاٹ کر واپس آ رہی تھی۔ وہ ذہن کو چونکا دینے والا حسن اور دل کو دھڑکا دینے والی جوانی پھر نیچے مار کر اٹھنے والی تھی۔ وہ نظارہ کرنے کو سنبھل گیا۔ مگر قریب آنے کے بعد پھر اس کے چہرے کو جی بھر کے نہ دیکھ سکا۔ نظریں اس لڑکی کے گریبان پر اٹک گئی تھیں۔ اس گریبان سے ایک چابی لٹک رہی تھی اور وہ چابی نیچے گرنے ہی والی تھی۔

وہ کسی ایچی کی چابی ہوگی، کسی خزانے کی نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ ایسی چابی خزانے کے ساتھ لٹکا کر چھوڑی نہیں جاتی۔ انعام نے اُنگلی اٹھا کر اس کے گریبان کی طرف اشارہ کیا۔ پرواز کرنے والی نے پہلے تو سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ ایک اجنبی کیوں اشارہ کر رہا ہے۔ جب اس نے دوسری بار اشارہ کیا تو وہ مسکراتی ہوئی اس کے سر پر سے گزر گئی۔ اسی وقت چابی نیچے آئی۔ انعام نے ہاتھ اٹھا کر اسے کیچ کر لیا۔

وہ پرواز کرتی ہوئی دور جا رہی تھی۔ انعام نے چابی کو اُچھال کر دوبارہ کیچ کیا۔ پھر فلائنگ اسٹیشن کی طرف جانے لگا۔ ساحل پر خوب صورت عورتیں حسن و شباب کا چلتا پھرتا اشتہار بنی ہوئی تھیں۔ کچھ سمندر کی لہروں سے اور کچھ بوائے فرینڈز سے کھیل رہی تھیں۔ ہنستی کھلکھلاتی اِدھر سے اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ کچھ چھتریوں کے سائے میں ٹھنڈی ریت پر چادریں ڈالے چت لیٹی ہوئی

تھیں۔ وہ سیدھا چلا جا رہا تھا۔ کسی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ پرواز کرنے والی کو ایک بار دیکھنے کے بعد تمام نظارے پھیکے پڑ گئے تھے۔

جب وہ فلائنگ اسٹیشن پہنچا تو اس حسینہ کی پرواز کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ وہ واپس آ رہی تھی۔ انعام نے کاؤنٹ کنٹرولر سے پوچھا "یہ جو فلائی کرتی آ رہی ہے، کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟"

کنٹرولر نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس نے فوراً جیب سے دس ڈالر کا نوٹ نکال کر کنٹرولر کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ دل کا معاملہ ہے۔ میری مدد کرو۔"

وہ مسکرا کر بولا "لڑکی بہت خوبصورت ہے۔ اس کے پاس حسن ہے اور تمہارے پاس حسنِ نظر۔ اس کا نام میری دیوان ہے۔ انڈین عیسائی ہے۔ بمبئی سے آئی ہے۔"

"یہ میری نام بہت اچھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے میرے لیے ہی رکھا ہے۔"

"پوچھ کر دیکھ لو۔ وہ آ رہی ہے۔"

انعام وہاں سے دور چلا گیا۔ وہ اسٹیشن فیلڈ سے باہر آ رہی تھی، وہاں اور بھی لوگ آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولا "مس میری ہو؟"

وہ ہندی یا اردو زبان سن کر چونک گئی۔ اُسے پلٹ کر دیکھا۔ اس نے پوچھا "کیا میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم میری ہو؟"

"ہاں میرا نام..."

وہ بات کاٹ کر بولا "نام نہ بتاؤ۔ تم نے ہاں کہہ دیا، بس تم میری ہو۔"

وہ ذرا الجھ گئی۔ پھر گھوم کر جانے لگی۔ انعام نے ساتھ چلتے ہوئے کہا "میں تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسی رائے؟"

"یہی کہ میرے یقین کے مطابق تم میری ہی ہو؟"

وہ چلتے چلتے رک گئی پھر بولی "مسٹر! میرا پورا نام میری دیوان ہے۔"

"کچھ عجیب سا نام ہے جیسے کوئی شاعر پوچھ رہا ہو میری دیوان کہاں ہے؟ ویسے تم بھی حسین ہو۔ کسی شاعر کا دیوان لگتی ہو۔"

وہ پھر چلتے ہوئے بولی "میرے فادر کا نام دیوان مرزا تھا۔ تم [illegible] سے فری کیوں ہونا چاہتے ہو؟"

"تم نے اپنا نام بتایا۔ میں اپنا نام اور کام بتاؤں گا۔ ہم اسی طرح ساتھ چلتے چلتے فری ہو جائیں گے۔ میرا نام انعام اللہ ہے۔ میں اپنی محبت تمہیں انعام میں دینا چاہتا ہوں۔"

وہ بولی "گوشت پوست کا ایک مرد کہیں بھی مل جاتا ہے، وہ انعام تو نہیں ہوتا۔"

"میرے پاس دولت اور عیش و عشرت ہے۔"

"یہ دولت کب تک ساتھ دے گی؟"

"یہ پوچھو کیا ہم دولت کا ساتھ دے سکیں گے؟ جواب ہے، ساتھ نہیں دے سکیں گے۔ ہماری اور ہماری اولاد کی اولادوں کی نسلیں ختم ہوتی رہیں گی مگر دولت کبھی ختم نہیں ہوگی۔"

"ایسا کیا کام کرتے ہو کہ دولت بڑھتی ہی جاتی ہے؟"

"میں کچھ نہیں کرتا۔ آج تک فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میرے باپ دادا نے کوئی پچاس برس پہلے پوست کی کاشت کی تھی۔ ہمارے کھیتوں سے سیکڑوں من افیون بارہا جاتی تھی۔ انسانی تحقیق کچھ آگے بڑھی تو اب ہمارے کارخانوں میں افیون سے زیادہ ہیروئن تیار ہو کر ڈالر اور پونڈ کے حساب سے دولت میں اضافہ کر رہی ہے۔"

"اتنے دولت مند ہو تو دنیا کی کسی بھی حسین ترین لڑکی سے شادی کر سکتے ہو۔ میں بہت زیادہ حسین نہیں ہوں۔"

"مجھے اتنا ہی حسن چاہیے جتنا تمہارے پاس ہے۔"

"آدمی کا پیٹ بھرتا نہیں۔ جب وہ فاقے کرتا ہے تو دال روٹی ملنے پر صبر و شکر سے کھاتا ہے۔ روز دال روٹی ملنے لگے تو قناعت مر جاتی ہے، وہ گوشت روٹی کی تمنا کرتا ہے۔ جب وہ بھی ملنے لگے تو پھر طرح طرح کے کھانوں کے لیے للچاتا رہتا ہے۔ تم صرف میرے حسن پر اکتفا نہیں کرو گے۔ میرے بعد کسی اور قلوپطرہ کے لیے للچاؤ گے۔"

"میں چالیس برس کا ہوں۔ اگر حسن و شباب کا رسیا ہوتا تو اب تک کسی قلوپطرہ سے شادی کر چکا ہوتا۔ یوں اپنی جوانی کا [illegible] نہ کرتا۔"

وہ ایک کار کے پاس رک کر بولی "ہوں۔ تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔ میرے پاپا کہا کرتے تھے 'بیٹی! ہر انسان کے اندر ایک ایسی خواہش ہوتی ہے جس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ اس خواہش کو جس قدر پورا کرو، وہ اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے جیسا کہ ابھی میں نے کہا ہے۔ دال روٹی سے دل بھر جائے تو آدمی گوشت روٹی چاہتا ہے۔ وہ بھی ملنے لگے تو خواہش کچھ اور لذیذ کھانوں کے لیے مچلتی ہے۔'"

انعام نے پوچھا "تمہاری ایسی کون سی خواہش ہے جس کا پیٹ نہیں بھرتا؟"

میری نے سرد آہ بھرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا جیسے خود کو پرواز کرتے دیکھ رہی ہو۔ پھر اس نے کہا "میں بلند مقام حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ایسا مقام جہاں لوگ سر اٹھا کر مجھے دیکھیں۔ جب میں فلائنگ کاسٹیوم میں پرواز کرتی ہوں تو لوگ سر اٹھا کر مجھے دیکھتے ہیں۔"

"کوئی بھی پرواز کرے لوگ اسے دیکھتے ہیں۔"

بہت ہو گئے ہیں۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی تو بمبئی سے یہاں ہوتا یا حاصل کرنے نہ آتی اگر آتی تو سیٹھ کی پیشکش قبول کر لیتی۔"

"میں بچپن سے مادام کی باتیں مانتی آ رہی ہوں۔ آج تک مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ فائدہ ہی پہنچتا رہا۔ مثلاً یہی دیکھو اگر میں سیٹھ کی پیشکش قبول کر لیتی اور یہاں نہ آتی تو تم نہ ملتے۔ تم نے چار فلمیں پروڈیوس کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ یعنی مجھے چار کروڑ روپے دو گے۔ اب بتاؤ کیا مادام پر بھروسا غلط ہے؟"

"نہیں، تمہاری مادام پیری بالکل ٹھیک ہیں۔ آؤ کسی ریستوران میں چلتے ہیں۔"

وہ ایک ہوٹل کے ریستوران کی طرف جانے لگے۔ میری نے کہا "میں اپنی خواہش بتا چکی ہوں۔ تم بھی انسان ہو، تمہاری بھی ہزاروں خواہشوں میں سے کوئی ایک مخصوص خواہش ہوگی۔ مجھے بتاؤ۔ میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے تمہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہتی ہوں۔"

وہ سوچتا ہوا اس کے ساتھ تھوڑی دور چلتا رہا پھر بولا "یہاں تو میری ہر خواہش کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ بے انتہا دولت ہو تو کسی چیز کی کمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا تم سوچ سکتی ہو کہ کوئی انسانی خواہش مجھے بے چین رکھتی ہوگی؟"

"ہاں، تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ چالیس برس کے ہو گئے۔ میں نہیں جانتی کہ تم نے کسی عورت کی رفاقت کیوں نہیں حاصل کی۔ مگر میں سمجھتی ہوں تمہاری زندگی میں ایک محبت کرنے والی عورت کی کمی ہے۔ اور جس کی کمی ہوتی ہے اسی کی خواہش بے چین کرتی ہے۔"

"تم ایک حد تک درست کہتی ہو۔ مجھے ایک محبت کرنے والی کی ضرورت ہے۔ مگر میں کسی کے اندر جھانک کر اس کی سچی یا جھوٹی محبت کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ میری خواہش ہے کہ مجھے محبت کرنے والی ملے لیکن میری مخصوص خواہش یہ نہیں ہے کچھ اور ہے۔"

وہ ہوٹل کے سامنے میں آ کر ایک میز کے اطراف بیٹھ گئے۔

انہوں نے ویٹر کو آرڈر دیا۔ میری نے کہا "عجیب بات ہے۔ تمہارے پاس زمین جائداد ہے، عزت ہے، دولت ہے، دیکھا جائے تو سب کچھ ہے۔ ایک عورت نہیں ہے تم اسے بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہو۔ پھر تمہاری وہ مخصوص خواہش کیا ہے؟"

ویٹر نے بیئر کا ایک بڑا ڈبا اور دو گلاس لا کر رکھ دیے۔ میری نے ڈبا کھول کر دونوں گلاسوں میں بیئر انڈیلی پھر ایک گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ وہ گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ پینے کے بعد بولا "مجھے زندہ رہنے کی خواہش ہے۔"

"وہ تو تم ہو۔"

"میں نہیں جانتا میری زندگی کتنی ہے؟ جتنی بھی ہے میں اس سے زیادہ جینا چاہتا ہوں۔"

"کوئی اپنی زندگی سے زیادہ نہیں جیتا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میں مسلمان باپ کی بیٹی ہوں۔ پاپا بھی اسلامی عقیدے کے مطابق کہتے تھے کہ لوحِ مقدر پر ہماری موت تک کا حال لکھا ہوتا ہے۔ کاتبِ تقدیر نے جو دن، تاریخ اور وقت لکھ دیا ہے ٹھیک اسی کے مطابق ہماری موت ہوگی۔"

"یعنی تم مانتی ہو کہ زندگی اور موت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے؟"

"بے شک مانتی ہوں۔"

"اسی ایمانی حقیقت کے پیشِ نظر میری خواہش ہے کہ میں اپنی زندگی سے زیادہ زندہ رہوں۔ اپنی عمر سے زیادہ یہ دنیا دیکھوں۔ یہاں میں اپنی دولت لٹاتا رہتا ہوں۔ مجھے اس رنگ بدلتی ہوئی دنیا سے بہت محبت ہے۔"

"دنیا کی بڑی سے بڑی خواہش انسان اپنے زورِ بازو سے، ذہانت سے یا دولت سے پوری کرتا ہے لیکن تمہاری اس خواہش کی تکمیل تمہارے یا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔"

"خدا کے اختیار میں تو ہے؟"

"ہاں، مگر تم خدا کی مرضی نہیں جان سکتے۔"

"یہ درست ہے مگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسے علوم اور آگہی دی ہے جن کے ذریعے وہ مستقبل کی صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ یہ تمہارا ہی تجربہ ہے، تم نے مادام سونیکا کی پیشین گوئیوں کو صحیح ہوتے دیکھا ہے۔ میں نے بھی سوچا مجھے کسی نجومی کے ذریعے اپنے مستقبل کا حال معلوم کرنا چاہیے۔ میں کسی مستند نجومی کی تلاش کرتا رہا۔ مجھے دنیا گھومنے کی سہولتیں حاصل ہیں۔ ہر ملک، ہر شہر میں ایک آدھ نجومی ضرور ہوتا ہے۔ لیکن مجھے کسی پر بھروسا نہیں تھا۔ آخر ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والے نجومی سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں میری پچھلی زندگی کے ایسے ایسے حالات سنائے کہ میں دنگ رہ گیا۔ میں نے پوچھا 'کیا تم بتا سکتے ہو، میری موت کب اور کیسے ہوگی؟' اس نے میرا اور میرے والدین کا پورا نام اور میری تاریخ پیدائش پوچھی اور کہا 'دوسرے دن آؤ۔' میں وہاں سے چلا آیا۔ میں نے اس معروف نجومی سے اپنی خواہش کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا اگر مقدر میں میرے لیے مزید حیات ہوگی تو اس کا علم بھی ہو جائے گا۔ میں نے بڑی بے چینی سے وہ دن اور وہ رات گزاری۔ دوسرے دن اس کے پاس گیا تو اس نے مستقبل میں میری حیات اور موت کی ایک ایک بات کھول

کر رکھ دی۔"

انعام یہ کہہ کر خاموش ہوا پھر گلاس کو ہونٹوں سے لگا کر پینے لگا۔ نیری تجسس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے خالی گلاس میز پر رکھا تو وہ بولی "نجومی نے کیا بتایا تھا؟"

وہ ڈبا اٹھا کر خالی گلاس بھرنے لگا۔ نیری نے بے چینی سے کہا "یہ مناسب نہیں ہے۔ کسی کو تجسس میں مبتلا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے بتاؤ کیا تم اپنی حیات سے زیادہ جی سکتے ہو؟"

وہ نیری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "مجھے افسوس ہے۔ نجومی نے سختی سے تاکید کی ہے کہ میں اپنی حیات و موت کے بارے میں اپنی پیدا کرنے والی ماں کو بھی نہ بتاؤں۔ پلیز برا نہ مانو۔ اگر میری اچھی دوست بن کر رہنا چاہتی ہو تو کچھ نہ پوچھو۔"

وہ چند لمحوں تک اسے تکتی رہی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولی "اچھا ہوا تم نے شادی نہیں کی۔ اگر بیوی کو آدھی بات بتلاتے اور آدھی پیٹ میں رکھتے تو وہ مارنے مرنے پر آ جاتی۔ عورت خصوصاً اپنے مرد کے متعلق کوئی معلومات کبھی برداشت نہیں کرتی۔ میں بھلا کون ہوتی ہوں تمہاری اور تم میرے کون لگتے ہو، خواہ مخواہ پوچھ رہی تھی۔"

"تمہاری باتوں سے ناراضگی ظاہر ہو رہی ہے۔"

"تھوڑی دیر پہلے تم نے بہت بڑی پیشکش کی تھی۔ اگر اس پیشکش میں سنجیدگی ہے تو میں ناراض نہیں ہو سکتی۔"

"میں سنجیدگی سے وعدہ کرتا ہوں، میرے ساتھ رہو گی تو میری دولت سے تمہاری تمناؤں کی تسکین ہوتی رہے گی۔ چاہو تو تحریری معاہدہ کر لو۔ میں تمہیں چار فلموں کے لیے حسب ضرورت سرمایہ فراہم کروں گا۔"

"میں پہلے مادام مونیکا سے ملاقات کروں گی۔ پھر تحریری معاہدے کی بات کروں گی۔"

"اپنی مادام سے کب ملاقات کرو گی؟"

"آج رات کا کھانا ان کے ساتھ ہی کھاؤں گی۔"

"کل میرے ساتھ لنچ کرو۔"

"اپنا فون نمبر دو۔ مادام تمہارے حق میں فیصلہ سنائیں گی تو فون پر لنچ کی بات ہو گی۔"

وہ جیب سے قلم اور چھوٹی سی نوٹ بک کا کاغذ نکال کر نمبر لکھنے لگا۔ وہ بولی "صرف فون نمبر نہیں، اپنا اور اپنے والدین کا پورا نام اور صحیح تاریخ پیدائش بھی لکھو۔"

انعام نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی "میں نے بمبئی والے سیٹھ سے بھی اس کا اور اس کے والدین کا پورا نام اور تاریخ پیدائش لکھوائی تھی۔ اس کے بغیر مادام اپنا فیصلہ نہیں سنائیں گی۔"

انعام نے اپنا اور والدین کا پورا نام اور اپنی تاریخ پیدائش لکھ کر اسے دے دی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے کہا "ابھی میرا گلاس خالی نہیں ہوا ہے۔ بیٹھ جاؤ۔"

"آج کی ملاقات بس یہیں تک ہے۔ اگر تقدیر کو منظور ہوا تو کل ملیں گے۔"

"میں تمہارے فون کا کب تک انتظار کروں؟"

"کل صبح نو بجے بات کروں گی۔"

وہ آہ بھر کر بولا "افسوس! تو مجھے رات بھر نیند نہیں آئے گی۔"

"میں مجبور ہوں۔ مادام مونیکا کے پاس سے واپس آنے میں کافی رات ہو جائے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں ساری رات انتظار کروں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں جب بھی ہوٹل واپس آؤں گی تمہیں فون کروں گی۔"

"جان من! گلاس تو خالی کر لو۔ میں تمہیں کار تک چھوڑنے جاؤں گا۔"

"میں چاہتی ہوں تم یہاں بیٹھ کر مجھے جاتے ہوئے دیکھتے رہو اور مجھے ہاتھ سے پھسلتے ہوئے محسوس کرتے رہو۔"

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ انعام نے دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا۔ وہ بولی "میں نے پکڑنے کے لیے نہیں رخصت ہونے کے لیے ہاتھ پیش کیا ہے۔"

"میں تمہیں ایک کمال دکھا کر روک سکتا ہوں۔"

"کوئی جادو کا تماشا دکھاؤ گے؟"

"ہاں۔ آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں پانچ تک گنو پھر آنکھیں کھول دو۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"پھر حیران ہو جاؤ گی۔"

"اچھا دیکھتی ہوں، کس طرح حیران کرتے ہو۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ انعام نے اس کی ہیرے والی انگوٹھی انگلی سے نکال کر مٹھی میں چھپا لی۔ پھر بیٹھ کر پینے لگا۔ اس نے آنکھیں کھول کر پوچھا "کیا تم نے گلاس خالی کرنے کے لیے روکا ہے؟"

"میں نے تمہاری ایک چیز مٹھی میں چھپائی ہے۔ اور یقین کرو میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔"

"مجھے جھوٹوں سے سخت نفرت ہے۔ اگر تمہاری بات جھوٹی ہوئی تو یہ ہماری آخری ملاقات ہو گی۔"

"مجھے منظور ہے۔ بتاؤ اس میں تمہاری کون سی اہم چیز ہے؟"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اس کی مٹھی کو دیکھ کر بولی۔

"اتنی چھوٹی مگر اہم چیز کیا ہو گی جو مٹھی میں آ جاتی ہے؟"

وہ بہل گئی تھی۔ پرس کھول کر اس کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک ایک چیز کو دیکھنے لگی۔ پھر اسے چابی کا خیال آیا۔ اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ گریبان پر رکھا۔ انعام نے گلاس خالی کر کے ویٹر کو بل دیا۔ پھر کہا "اب تو مجھے کار تک چلنے دو گی؟"

وہ دوسری طرف گھوم کر گریبان ٹٹولنے لگی "میری چابی؟"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ انعام نے مٹھی کھول دی۔ وہ ہتھیلی پر سے چابی جھپٹ کر بولی "یہ تمہارے پاس کیسے آئی؟"

"آسمان سے آئی۔ تم پرواز کر رہی تھیں اور یہ گریبان کے اندر سے ٹپک کر میرے ہاتھوں میں آ گئی۔ جب ہاتھ آئی تو ذرا سی گرم تھی۔"

کیری نے گھور کر دیکھا پھر آگے بڑھ گئی۔ وہ ریستوران سے باہر آ کر اس کے برابر چلتے ہوئے بولا "یہ چابی ایک اشارہ ہے۔ اسے یاد رکھنا۔ تمہاری زندگی میں داخل ہونے کی چابی میرے ہی پاس ہے۔"

"تمہارا دعویٰ کس حد تک درست ہے یہ مادام موزیکا ہی بتائیں گی۔"

"اگر تم چاہو تو کل کسی جزیرے میں تفریح کا پروگرام بنایا جا سکتا ہے۔"

"تم صرف کل کی بات کر رہے ہو۔ میں ہر دن اور ہر رات تمہارے ساتھ سیر و تفریح کا پروگرام بنا سکتی ہوں۔"

اس نے خوش ہو کر کہا "سو آئی ایم لکی۔ میں کل کے لیے موٹر بوٹ ریزرو کرا لوں گا۔"

"اتنی جلدی نہ کرو۔ اگر مادام نے تمہارے خلاف فیصلہ سنایا تو؟"

اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "یہ مادام موزیکا شادی سے پہلے ساس کا رول ادا کر رہی ہیں۔"

وہ ہنستی ہوئی اپنی کار کے پاس آئی۔ پھر دروازہ کھول کر بولی۔ "یقیناً تمہارے پاس بھی اپنی کار ہو گی۔ ورنہ تو میں تمہیں ہوٹل تک لفٹ دے سکتی ہوں۔"

"کسی کو اس کے گھر تک پہنچانا نیکی ہے۔ ایسی ہی نیکیاں کرتے کرتے محبت ہو جائے گی۔"

وہ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ کیری نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا "مجھے یقین نہیں آتا کہ تمہارے جیسے دولت مند کی زندگی میں کوئی لڑکی نہ آئی ہو۔"

"میری دولت لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ تم اپنے حسن و شباب کی دولت ساتھ لیے پھرتی ہو مجھے یقین نہیں کرنا چاہیے کہ تمہاری زندگی میں لٹیرے نہیں آئے ہوں گے۔"

وہ ناگواری سے بولی "مجھے ایسی گفتگو پسند نہیں ہے۔"

"مجھے بھی ایسی گفتگو گراں گزرتی ہے۔"

"میں تمہاری زندگی میں آنے سے پہلے ہر طرح سے اپنا اطمینان کرنا چاہتی ہوں۔"

"تم مادام موزیکا کی اجازت کی محتاج ہو۔ وہ 'نہ' کہیں گی تو تم مجھ سے منہ پھیر لو گی۔ 'ہاں' کہیں گی تو مجھے قبول کر لو گی پھر تمہیں میرے متعلق چھان بین کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ تھوڑی دور تک خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی۔ وہ اپنی منزل کا راستہ بتا رہا تھا۔ پھر وہ بولی "میں دراصل یہ معلوم کرنا چاہتی تھی، کیا واقعی میں پہلی لڑکی ہوں جس کے لیے تم چار کروڑ روپے داؤ پر لگانے کو تیار ہو؟"

"ہاں، تم پہلی لڑکی ہو۔"

"دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ حسین لڑکیاں ہیں پھر تم نے ان پر داؤ کیوں نہیں لگایا؟"

"شاید اس کا جواب دے چکا ہوں۔ اول تو یہ کہ میری آنکھوں نے اور میرے دل نے صرف تمہیں ہی پسند کیا ہے۔ دوم یہ کہ میں بزنس مین ہوں نفع سوچ سمجھ کر ہی تم پر رقم لگانے والا ہوں۔"

"کیا میری خوبیوں میں جو رقم لگاؤ گے اس کا منافع تم لو گے؟"

"بے شک، تم صرف اپنی خواہش پوری کرنا چاہتی ہو۔ اتنی بلندی پر پہنچنا چاہتی ہو کہ لوگ سر اٹھا کر تمہیں دیکھتے رہیں اور سوتے جاگتے تمہاری آرزو کرتے رہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے لیکن اس طرح صرف خواہش کی تکمیل ہوگی جبکہ اپنے رکھ رکھاؤ اور جسمانی نمائش کے لیے بھی دولت چاہیے ہوگی۔"

"میری شریک حیات بن کر رہو گی تو میری دولت میں سے جتنا چاہو گی خرچ کرتی رہو گی۔"

"یعنی میرا کوئی ذاتی اکاؤنٹ نہیں ہوگا۔ میں اپنے اخراجات کے لیے تمہاری محتاج رہوں گی؟"

"یہ محتاجی ایک مدت سے ختم ہو گی۔ اگر تم عام عورتوں کی طرح چار دیواری میں رہو گی، صرف میرے ساتھ دنیا کی سیر کرو گی، باہر صرف میرے ساتھ رہو گی، کسی کے ساتھ تنہا ایک منٹ بھی نہیں گزارو گی اور میرے لیے بچے پیدا کرتی رہو گی تو میرے ساتھ اپنے بچوں کے ساتھ تمام دولت اور جائیداد کی مالک بن جاؤ گی۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ میں بچے پیدا کر کے اپنے بے مثال

حسن کو برباد نہیں کروں گی۔ اور تم بڑے تنگ نظر ہو، سوسائٹی کے معزز افراد سے ملنے سے روکتے رہو گے۔"

"جو دوسروں کی بیویوں سے دوستی کرتے ہیں، وہ معزز افراد نہیں ہوتے۔ ویسے میں تنگ نظر نہیں ہوں، صرف اپنے بچے پیدا کرنے والی بیوی کو پابند کرنا چاہتا ہوں تاکہ اپنے خون کا حساب مل سکے۔"

"تم بہت چھوٹی باتیں کرتے ہو۔"

"میں اس معاملے میں واقعی بہت چھوٹا ہوں۔ ویسے تم بچے پیدا کرنا نہیں چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔ تم ایک آزاد بیوی کی طرح رہو گی۔ جب چاہو گی مجھے چھوڑ سکو گی یا میں جب چاہوں گا تم سے پیچھا چھڑا لوں گا۔ میں ان حالات میں تمہیں ذاتی خرچ کے لیے ماہانہ پچاس ہزار روپے دیا کروں گا۔"

"میرا پچاس ہزار میں گزارا نہیں ہو گا۔"

"ہوٹل سے ماہانہ بیس ہزار روپے ملتے ہیں، اس میں تمہارا گزارا ہو جاتا ہے۔ پچاس ہزار میں تو عیش کرو گی۔ دنیا کے ہر بڑے شہر میں میری ایک کوٹھی اور دو کاریں موجود ہیں۔ تم جہاں جاؤ گی تمہاری رہائش اور آمدورفت کے اخراجات نہیں ہوں گے۔ میری ہر کوٹھی میں ملازم ہیں۔ کھانا پینا بھی مفت ہو گا۔ تم ہر ماہ پچاس ہزار کے نوٹوں کا بیٹی پیشما بنا کر چہرے کے سامنے لٹکتی رہو گی۔"

"بکواس مت کرو۔ تم سے بہتر تو وہ مارواڑی سیٹھ ہے جو کسی شرط کے بغیر دو کروڑ روپے دے رہا ہے۔"

"وہ دو کروڑ دو فلموں میں خرچ ہو جائیں گے۔ وہ فلمیں منافع بخش ہوں گی یا فلاپ ہوں گی، یہ کوئی نہیں جانتا لیکن اس بات کی ضمانت ہو گی کہ ہر ماہ بیٹھے بٹھائے مجھ سے پچاس ہزار ملتے رہیں گے۔ اور چار فلمیں میری رقم سے بنا کر اپنی نمائش کا شوق بھی پورا کر سکو گی۔ بس یہاں گاڑی روک دو۔ یہ دائیں جانب میری کوٹھی ہے۔"

وہ گاڑی روک کر بولی: "باتوں میں تو پتا ہی نہ چلا کہ میں رہائشی علاقے میں آ گئی ہوں۔ میں سمجھ رہی تھی تم کسی ہوٹل میں رہتے ہو۔"

"میں دنیا کے کسی شہر میں کرائے کی جگہ نہیں رہتا اور نہ کرائے کی کار میں گھومتا ہوں۔ تم مفت دے رہی تھیں تو تمہارے ساتھ اتنی دیر رہنے کے لیے چلا آیا۔ پیچھے میری اپنی کار موجود ہے۔"

میری نے سر گھما کر دیکھا۔ ایک قیمتی اور خوب صورت گاڑی آ کر رک گئی تھی۔ اسے انعام کا ڈرائیور لایا تھا۔ انعام نے کہا: "میں تمہارے فون کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔"

"تم پکے کاروباری ہو۔ تمہاری باتوں نے مجھے مایوس کیا ہے۔ میرے فون کا انتظار نہ کرنا۔ مایوسی ہو سکتی ہے۔"

"صرف تمہاری بات ہوتی تو مایوسی کا خدشہ تھا۔ لیکن فیصلہ تو مادام مونیکا سنائیں گی۔ اس لیے میں پُرامید ہوں۔ ہم کے گڈ بائی۔"

وہ اس کی کار سے نکل آیا۔ اپنی کوٹھی کے احاطے میں جانے لگا۔ میری اس خوب صورت کوٹھی کو دیکھ رہی تھی اور اندازہ لگا رہی تھی کہ بھارتی کرنسی کے مطابق سنگاپور کی یہ کوٹھی کم از کم دو کروڑ کی ہو گی۔۔۔ وہ کار اسٹارٹ کر کے اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئی۔

انعام نے اپنے بیڈ روم میں آ کر جوتے اتارے، لباس تبدیل کیا پھر بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا: "اللہ تعالیٰ چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔ میں نے آج تک جو چاہا مجھے ملتا رہا۔ مگر محبت نہیں ملے گی کیوں کہ میں حسین عورت سے کاروباری انداز میں محبت کا سودا کر رہا ہوں۔ ایسے میں عورت تو ملے گی مگر اس کی سچی محبت اور وفاداری نہیں ملے گی۔"

اس نے کروٹ بدل کر سوچا: "سچی محبت اور وفاداری ایک دولت مند کو شاید ہی کبھی ملے۔ کیوں کہ جو بھی آتی ہے اسے دیکھ کر نہیں، اس کی دولت کا منہ دیکھ کر آتی ہے۔ پھر یہ کہ دنیا کو اپنے حسن و شباب سے دیوانہ بنانے کی خواہش رکھنے والی کسی ایک مرد سے خوش نہیں رہتی۔ میرا دل اس پر آ گیا ہے اس لیے مجبور ہوں۔ مگر اسے اپنے بچوں کی ماں بنانے کی حماقت نہیں کروں گا۔ اچھا ہوا میں نے پہلے ہی دن کاروباری انداز میں گفتگو کی ہے۔ محبت ہو یا کاروبار، دو ٹوک بات ہونی چاہیے۔"

لیکن میری جسے دیکھ کر بھلا نہ پا رہا تھا، اسے خیالوں میں آنے سے روکنا ممکن نہیں تھا۔ انعام کوشش کرتا رہا کہ اس کے متعلق نہ سوچے، دوسری تفریحات میں خود کو گم کر دے۔ وہ شام کو کوٹھی سے باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی سنائی دی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا: "ہیلو، میں انعام بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف کسی نے کوڈ ورڈز ادا کیے۔ انعام نے ناگواری سے پوچھا: "اس کا مطلب کیا ہوا؟"

دوسری طرف سے آواز آئی: "سر، میں بنکاک کا ایجنٹ ہوں۔ کراچی ائیرپورٹ پر مال پکڑا گیا ہے۔"

"تم کون ہو؟ اور کس مال کی بات کر رہے ہو؟ تم نے جس انداز میں کوڈ ورڈز ادا کیے ہیں، اس سے پتا چلتا ہے تم کسی خطرناک گروہ سے تعلق رکھتے ہو۔ میں تمہیں وارننگ دیتا

ہوں، آئندہ میرا نمبر ڈائل کرو گے تو پولیس تمہیں رپورٹ کر دوں گا۔"
اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اُسے ایجنٹ پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ کبھی ایسی باتیں فون پر نہیں کرتا تھا۔ تمام ہوٹل اور بڑے بڑے شہروں کے ایجنٹ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کے باوجود بنکاک کے ایجنٹ نے ایسی حماقت کی تھی۔ یہ اس کی کوئی شدید مجبوری ہو سکتی تھی یا انٹیلی جنس والوں کی چال ہو سکتی تھی۔ وہ کوٹھی کے باہر آیا۔ ڈرائیور نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر کہا "سر! میں نے گاڑی اچھی طرح چیک کر لی ہے۔ آپ بیٹھ سکتے ہیں۔"

وہ بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے دروازہ بند کیا۔ پھر آگے بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ انعام نے کہا "مجھے ڈولفن پول تک پہنچا کر کسی ٹیلی فون بوتھ میں جاؤ۔ بنکاک کے ڈھنی مار کرے رابطہ قائم کرو۔ اس کم بخت نے فون پر رابطہ قائم کیا تھا۔ میں نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔"

"آل رائٹ سر! میں اس کی حماقت کا سبب معلوم کروں گا۔ کیا میں رپورٹ پیش کروں؟"

"ہوں۔ میں سُن رہا ہوں۔"

اس نے کہا "میں ٹیری کا نمبر سات سو سات میں ہے اور وہ مارواڑی سیٹھ دمنی رام پانچ سو پانچ میں ہے۔ اس ہوٹل کے کئی ملازم ہمارے زر خرید ہیں۔ آج سے اُن کے ایک ایک لمحے کی رپورٹ ملتی رہے گی۔ اب تک کی رپورٹ یہی ہے کہ ٹیری اپنے کمرے میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ دمنی رام سے بھی ہوٹل کے ڈائننگ روم میں ملتی ہے یا اس کے ساتھ کبھی کبھی کار میں گھومنے پھرنے جاتی ہے اور ڈھیر ساری شاپنگ کر کے واپس آتی ہے۔ ہماری کوٹھی کے پیچھے تیری گلی میں مادام موزیکا رہتی ہیں۔ وہ پورے مشرق بعید میں اپنے پُراسرار علوم کے باعث مشہور ہیں۔ لوگ ان کے عقیدت مند ہونے کے باعث ایسا کہتے ہیں یا پھر یہ درست ہے کہ ان کی پیشین گوئی کبھی غلط نہیں ہوتی۔"

انعام نے کہا "ان سے ملاقات کا وقت مقرر کرو۔"

"بہت مشکل ہے جناب! آج ان کے سیکریٹری کے پاس جانے سے دو چار مہینے بعد ملاقات کی کوئی تاریخ اور وقت مقرر ہو گا۔ مس ٹیری ہر سال ان سے ملنے آتی ہے۔ اور ایک برس پہلے ہی آئندہ ملاقات کا دن اور وقت مقرر کر لیتی ہے۔"

"ان کے سیکریٹری سے معلوم کرو۔ مادام موزیکا کتنے ضرورت مندوں سے ملاقات کریں گی۔ ان میں سے کسی ضرورت مند کو خرید لو۔ میں اس کی جگہ مادام سے ملاقات کروں گا۔"

ڈرائیور اسے ڈولفن پول کے پاس پہنچا کر چلا گیا۔ وہ ٹکٹ لے کر اندر گیا اور پول کے کنارے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہاں حُسن و شباب کے رنگا رنگ نظارے تھے۔ کچھ لڑکیاں بوائے فرینڈز کے ساتھ تھیں، کچھ تنہا تھیں۔ مختلف رنگوں کے سوئمنگ کاسٹیومز میں بے چین جوانی کا اشتہار بنی ہوئی تھیں۔ ان جوانیوں کو پھسلنے کے لیے سلپنگ بیڈ دور تک بنا ہوا تھا۔ وہ دور بلندیوں سے پھسلتی ہوئی آتی تھیں اور آخری سرے پر اُچھل کر پول کے پانی میں غڑاپ سے ڈوب جاتی تھیں۔ پھر اُبھر کر تیرتی ہوئی کنارے تک پہنچ جاتی تھیں۔ پول کے اندر تیرنے والی ہر جل پری میں ٹیری کی جھلک نظر آتی تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگتا تھا۔

دیکھنے کے لیے ڈولفن مچھلیاں بھی تھیں۔ وہ مخصوص اور کی آوازیں نکالتی ہوئی پانی سے اُبھرتی تھیں۔ فضا میں کئی فٹ کی بلندی پر جاتی تھیں پھر پانی میں آ کر ڈوب جاتی تھیں۔ یہ تماشا بڑا ہی دلچسپ تھا اور دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا لیکن انعام کو محسوس ہوا کہ وہ بے اختیار جل پریوں کو دیکھنے لگتا ہے اور جب ٹیری سے ان کا موازنہ کرتا ہے تو سب کی سب کم تر دکھائی دیتی ہیں۔

اس نے ڈرائیور کو ایک گھنٹے تک آنے کے لیے کہا تھا۔ جب وہ باہر نکلا تو گاڑی اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ ڈرائیور نے باہر آ کر اس کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ اندر جا کر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھالی۔ پھر گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "سر! ڈھنی مار کے ٹرانسمیٹر میں خرابی پیدا ہو گئی تھی، اس لیے فون پر بات کرنے کی حماقت کی تھی۔ وہ اپنی غلطی کی معافی مانگ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا آپ کو نقصان کی اطلاع

ندر سے جلد پہنچا دے۔ اس کا خیال تھا آپ اپنے ذرائع استعمال کر کے پکڑا ہوا مال چھڑا لیں گے۔"

"ٹھیک ہے اب کوئی کاروباری گفتگو نہ کرنا۔" وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر کار کی چھت کو تکنے لگا۔ چھت کی اُجلی سطح پر وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ بھی مسکرانے لگا۔

اس کا مزاج عاشقانہ نہیں تھا وہ پکا کاروباری تھا۔ اگر پکا عاشق ہوتا تو بہت پہلے ہی کسی کا محبوب ہوتا، پھر شوہر ہوتا پھر کئی بچوں کا باپ ہوتا۔ اُسے دولت کی بہتی ہوئی گنگا میں ہاتھ دھونے سے فرصت نہیں ملی تھی۔ حسین لڑکیاں اُسے نیند کی گولیاں لگتی تھیں۔ رات کو ایک کھائی، گہری نیند سوئے پھر صبح اٹھ کر اپنے کاروبار میں لگ گئے۔ کبھی کسی حسینہ کو دیکھ کر شاعرانہ انداز میں دل نہیں دھڑکا تھا۔ آج بھی نیری کو دیکھ کر دل بڑی طرح دیوانہ نہیں ہوا تھا۔ بس وہ اچھی لگی تھی۔ تجربے نے مشورہ دیا تھا کہ اُسے تنہا نہیں رہنا چاہیے اس لیے ایک شریک حیات کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے پہلی ہی ملاقات میں کاروباری گفتگو کی تھی۔

اس نے دو طرح کے معاملات پیش کیے تھے۔ ایک معاملہ یوں طے ہو سکتا تھا کہ وہ پوری طرح گھریلو بیوی بن کر چار دیواری تک محدود رہے۔ گھر سے باہر یا ملک سے باہر شوہر کے ساتھ جائے۔ کسی رشتے دار مرد سے یا اجنبی سے ایک منٹ کے لیے بھی تنہائی میں نہ ملے اور صرف اس کے لیے بچے پیدا کرے۔ اس طرح وہ اور بچے اس کی تمام دولت کے مالک ہوں گے۔ ورنہ دوسری صورت میں وہ اسے اپنے بچوں کی ماں نہیں بنائے گا۔ اس کے لیے چار فلموں میں سرمایہ لگائے گا۔ اور پچاس ہزار روپے ماہانہ دیا کرے گا۔

فیصلہ مادام مونیکا کی میٹنگ کے مطابق ہونے والا تھا۔ اس سے پہلے انعام فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ ایک طویل عرصے تک زندہ رہنے کے لیے اپنی تنہائی سے نکلنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ایسی شریک حیات کی ضرورت تھی جو دن رات اس کے ساتھ رہ سکے اور کبھی اس کا ساتھ نہ چھوڑے۔ اُسے یقین تھا جب نیری کو اربوں روپے کی حق دار بننے کا موقع ملے گا تو وہ جلد ہی اپنے نمائشی جذبوں سے توبہ کر کے اس کے بچوں کی ماں بننا شروع کر دے گی۔

ڈرائیور نے پوچھا۔ "سر! مادام مونیکا کے متعلق کچھ عرض کر سکتا ہوں؟"

"ہاں بولو۔"

"مادام چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک ہی ضرورت مند سے ملاقات کرتی ہیں۔ کل جو ضرورت مند ملنے والا ہے وہ کسی قیمت پر آپ کو یا کسی کو بھی اپنا نمبر دینے پر راضی نہیں ہے۔ دراصل مادام سے بڑے بڑے سرمایہ دار ملنے آتے ہیں۔ اسی لیے وہ بڑی رقم کے عوض بھی ملاقات کا وقت چھوڑنا نہیں چاہتے۔"

"کوئی بات نہیں کار کہیں روک کر اتر جاؤ۔ میں تنہائی چاہتا ہوں۔"

ڈرائیور نے کار ایک فٹ پاتھ سے لگا کر روک دی۔ باہر نکل کر ایک طرف ادب سے کھڑا ہو گیا۔ انعام گاڑی سے باہر نکل کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھا، گاڑی اسٹارٹ کی پھر اطمینان سے ڈرائیو کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسے کہاں جانا تھا، وہ خود نہیں جانتا تھا۔ وہ چاہتا تھا، ونڈو شاپنگ کرتے کرتے یا پیدل چلتے چلتے اتنا تھک جائے کہ بستر پر پہنچتے ہی نیند آ جائے۔ وہ نیری کے متعلق صرف اپنے مفاد کی حد تک سوچنا چاہتا تھا۔ ایک مجنوں بن کر اسے لیلیٰ بنا کر اپنے گلے میں ہڈی کی طرح اٹکانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے سمندر کے کنارے گاڑی روک دی۔ باہر آ کر اسے لاک کیا۔ جوتے اور جرابیں اتار کر گاڑی کی ڈگی میں رکھ دیں۔ پھر ٹھنڈی ریت پر پیدل چلنے لگا۔ دل ہی دل میں اعتراف کرنے لگا کہ عورت نشے سے زیادہ نشیلی اور زہر سے زیادہ زہریلی ہوتی ہے۔ اب چالیس برس کے بعد اس نے نیری کو اپنے مطلب سے ہی اپنا سے دیکھا تھا تو وہ پہلی بار اس کے مزاج کے برعکس رگ رگ میں پھیلتی جا رہی تھی۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق دعا مادام مونیکا کے ساتھ ڈنر کے ہوٹل پہنچ گئی ہو گی۔ اس نے واپسی کے لیے کار اسٹارٹ کی۔ کسی بوتھ سے فون کرنے کا ارادہ تھا پھر خیال آیا، دو عورتیں ملتی ہیں تو ان کی باتیں ختم نہیں ہوتی۔ وہ بات سے بات نکالتی چلی جاتی ہیں۔ لہٰذا دو گھنٹے بعد فون کرنا چاہیے۔ اس نے ایک بوتھ سے اپنے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ اس کا ڈرائیور بھی تھا، جاسوس بھی تھا اور پرائیویٹ سیکریٹری بھی۔ انعام نے حکم دیا۔ "مونیکا کے کسی ملازم یا ہوٹل کے ملازم کو خرید لو۔ معلوم کرو، نیری اس عورت کے ساتھ ہے یا اپنے کسی فرینڈ کے ساتھ؟"

جب دولت بے حد و حساب ہو تو دولت مند ہمیشہ دوسروں کو خریدنے کی بات کرتا ہے۔ وہ بڑی سے بڑی معلومات حاصل کرنے اور کسی کے گھر کے اندر تک کا راز معلوم کرنے کے لیے اس گھر کے ایک ایک فرد کو کرنسی کی بھاری گڈیاں دے کر کہتا ہے "آدمی ہوں یا گدھے، میں سب کو خرید سکتا ہوں۔"

وہ اپنے بنگلے میں واپس آ گیا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ ڈرائیور نے آ کر کہا "مس نیری ایک بنگلے میں مادام کے ساتھ

رہیں۔ ابھی دس منٹ پہلے ہوٹل پہنچی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ اب میں آرام کروں گا۔"

وہ چلا گیا۔ انعام نے ہوٹل کے نمبر ملائے۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد کہا "میں تمہارے انتظار میں جاگ رہا ہوں۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا، میں آگئی ہوں؟"

"بھلا مجھے کیسے پتا چلے گا۔ میں نے کئی بار ہوٹل فون کیا ہے۔ اگر اب بھی تمہاری رس بھری آواز سنائی نہ دیتی تو میں صبح تک تمہیں پکارتا رہتا۔"

"تم ایسے دیوانے نہیں ہو، جیسا ظاہر کر رہے ہو۔"

"کیا یہ بات مادام نے کہی ہے؟"

"آں؟" وہ ذرا جھجک گئی پھر سنبھل کر بولی "مادام اتنی جلدی کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہتیں۔ ابھی وہ تمہارا زائچہ تیار کر رہی ہیں۔"

"یعنی ابھی فیصلے کی گھڑی نہیں آئی ہے۔"

"انتظار اور ابھی اور ابھی..."

وہ ہنسنے لگی۔ انعام نے پوچھا "کیا تڑپانے میں مزہ آرہا ہے؟"

"تم اتنے بے چین کیوں ہو؟ کیا مجھ سے شادی بہت اہم ہے؟"

وہ بھڑک گیا۔ مادام یونیکا نے لیے فون پر تم سے میری کچھ اہم باتیں بتائی ہوں گی اور آئندہ کچھ بتانے کا وعدہ کیا ہوگا۔ اس نے جواب دیا "ہاں شادی اہم ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تم سے ہی ہو، کسی سے بھی ہونا چاہیے اور جلد سے جلد ہونا چاہیے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں اہم نہیں ہوں، شادی اہم ہے۔"

"تمہارے لیے بھی میں اہم نہیں ہوں، تمہارا تماشی جذبہ اہم ہے۔"

"وہ تو ہے۔ ہم ایک دوسرے کے سامنے کھل رہے ہیں۔"

"تم ذرا دیر سے سمجھ رہی ہو۔ میں نے تو پہلی ہی ملاقات میں تم سے کاروباری انداز میں بات کی تھی۔"

"میں تمہاری عاشقانہ باتوں میں الجھی رہی۔ کاروباری انداز پر توجہ نہیں دے سکی۔"

"اب مادام نے توجہ دلائی ہے۔"

"تم بار بار مادام کو درمیان میں کیوں لا رہے ہو؟"

"تم خوب سمجھتی ہو۔ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہو اور پتا نہیں کس مصلحت سے مادام کی پیشین گوئی مجھ سے چھپا رہی ہو؟"

"تم یہی سمجھتے رہو۔ میں کچھ نہیں چھپا رہی ہوں۔"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ تم مجھے پسند آگئی تھیں اس لیے میں تمہیں ہی شریک حیات بنانا چاہتا تھا۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ مجھے پیچھے دوڑاتی رہو گی اور میری دیوانگی بڑھتی رہے گی تو میں ایک عقل کی بات بتا دوں۔ کروڑوں روپے کمانے والے صرف اپنے منافع کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ میں کل تک انتظار کروں گا۔ پرسوں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد آج کی باتیں ایسے ہی بھول جاؤں گا جیسے ایک بڑے منافع کے آگے معمولی خسارے کو بھول جاتا ہوں۔"

"تم مجھے ایک معمولی سا خسارہ کہہ کر میری توہین کر رہے ہو۔"

انعام نے آگے کچھ نہیں سنا۔ ریسیور رکھ دیا۔ ایک شیشی سے دو خواب آور گولیاں نکالیں، انہیں پانی کے ساتھ حلق سے نیچے اتارا پھر بستر پر آکر آرام سے لیٹ گیا۔ ہیروئن کے دھندے میں اندھا دھند دولت آرہی تھی۔ کبھی نقصان کے اندیشے سے نیند نہیں اڑتی۔ البتہ دکھ بیماری میں کبھی نیند نہ آتی تو وہ گولیاں کھا لیا کرتا تھا۔ مگر آج دکھ نہیں تھا صرف بیماری تھی، محبت کی بیماری، وہ جو کسی عورت سے متاثر نہیں ہوتا تھا، آج بھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اس کے اندر حسن و شباب کی ہوا چل رہی ہے، یہ ہوا کہیں تیز آندھی میں نہ بدل جائے، اس اندیشے سے اس نے خواب آور گولیاں کھا لی تھیں۔ مگر تند و تیز آندھی کو صبح تک روکے رکھنے کے لیے گہری نیند میں ڈوب گیا تھا۔

دوسرے دن وہ شہر کے مختلف حصوں میں گھومتا رہا۔ کار خود ڈرائیو کرتا رہا تاکہ ڈرائیور کو کسی کی تلاش کا علم نہ ہو۔ اس کا خیال تھا، وہ کہیں نہ کہیں گھومتی پھرتی یا نیلے امبر کے سائے میں پرواز کرتی دکھائی دے گی۔ لیکن دوپہر تک مایوسی ہوئی۔ اس لیے سمندر کے کنارے ایک ریستوران میں پہنچ گیا۔ پھر چائے پیتے ہوئے سوچنے لگا "لعنت ہے میری پر۔ اب مجھے سنجیدگی سے ایک شریک حیات کے لیے کسی دوسری کو پسند کر لینا چاہیے۔"

ایسے ہی وقت ریستوران کے منیجر نے مائیک پر پوچھا "اگر اس ریستوران میں کوئی مسٹر انعام اللہ ہیں تو کاؤنٹر پر تشریف لے آئیں۔ ان کا فون ہے۔"

وہ کاؤنٹر پر آیا۔ پھر ریسیور کان سے لگا کر بولا "ہیلو میں انعام اللہ بول رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟"

"میں مارتھا بول رہی ہوں۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ کیا آپ یہاں کسی کے فون کا انتظار کر رہے ہیں؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ آپ یہ سوال کیوں کر رہی ہیں؟"

"اس لیے کہ میں تیری ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو فون

کرنے والی ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ اس فلرٹ چھوکری کا فون اٹینڈ نہ کریں۔"

"کیا میرے اٹینڈ کرنے سے آپ کو تکلیف پہنچے گی؟"

"جی ہاں۔ میں مادام مرینا کی دشمن ہوں۔ اس نے میرا گھر برباد کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں آئندہ اس کی پیشین گوئی درست نہ ہو۔ اس نے کیری کو بتایا ہے کہ تم اس کے دیوانے ہو چکے ہو۔ اگر وہ چاہتی ہے کہ تم اپنی آخری بھی رقم میں اضافہ کرو گے۔ جلد سے جلد شادی کرنا تمہارے لیے ضروری ہے اس لیے تم اس سے ضرور شادی کرو گے۔"

وہ بولا۔ "مادام مرینا بکواس کرتی ہے۔ میں ان میں سے نہیں ہوں جو شادی کرنے کے لیے اپنی محبوبہ کے پاؤں پڑتے ہیں یا ضرورت سے زیادہ رقمیں خرچ کرتے ہیں۔"

"مجھے آپ کی زبان سے یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے اگر آپ اپنی بات پر قائم رہیں گے تو مادام کی پیشین گوئی غلط ہو جائے گی۔"

دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا فون کرنے والی کو ریستوران میں اس کی موجودگی کا علم کیسے ہوا؟ ویسے علم جیسے بھی ہوا ہو اس اجنبی عورت کی یہ بات دل کو لگتی تھی کہ کیری اس سے دور رہ کر اپنا بھاؤ بڑھا رہی ہے اور وہ بے اختیار اس کے متعلق سوچنے لگا ہے۔ بے اختیار اس کی تلاش میں بھٹکنے لگا ہے۔ یہ بے اختیاری اور بے خودی بتا رہی تھی کہ وہ آخر کار اسے ہر قیمت پر حاصل کرے گا۔

وہ سوچنے کے دوران کاؤنٹر پر پہنچ گیا تھا۔ فون کی گھنٹی بجی تو چونک پڑا۔ دل نے تیزی سے دھڑکتے ہوئے کہا۔ "کیری بلا رہی ہے۔"

گھنٹی کی آواز اپنے معمول کے مطابق تھی۔ مگر فون شور مچاتا ہوا سا لگ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو مجھے کان سے اور ہونٹوں سے لگاؤ اور کیری کی آواز کو چوم چوم لو۔

منیجر نے آ کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف کی بات میں سنی۔ پھر ریسیور انعام کی طرف بڑھا کر کہا۔ "یہ آپ کے لیے ہے۔"

اس نے ریسیور لے کر کان سے لگایا پھر کہا۔ "ہیلو، میں انعام ہوں۔"

ایک سرد آہ سنائی دی۔ پھر وہ درد بھری آواز میں بولی۔ "تم انعام نہیں، عذاب ہو۔ مجھے بیمار کر کے چھوڑ دیا ہے۔"

"خیریت تو ہے؟"

"تم سے خیریت صبح اٹھ کر پوچھ سکتے تھے۔ رات کو باتیں کرتے کرتے اچانک فون بند کر دیا۔ کوئی بات ادھوری رہ جائے کوئی کام ہوتے ہوتے رک جائے یا کسی خواہش کو پورا ہونے سے پہلے کچل دیا جائے تو میں اضطراب میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ میرا دم الجھنے لگتا ہے۔ تم نے فون بند کر کے عذاب میں ڈال دیا تھا۔ میں تمہارا فون نمبر نہیں جانتی تھی۔ تم جہاں رہتے ہو اس علاقے کا نام بھول گئی تھی۔ پھر بھی ہوٹل کی تلاش کرتے ہوئے صبح چار بجے تک بھٹکتی رہی۔ واپس آئی تو بخار چڑھ گیا۔ ابھی تک بستر پر ہوں۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "بس اللہ بولو۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھا کھانے کا بل ادا کیا تیزی سے چلتا ہوا ریستوران سے باہر آیا پھر وہاں سے دوڑتا ہوا اپنی کار کے پاس پہنچا۔ حالانکہ ایسی جلدی بھی نہیں تھی۔ مجبوری نہیں تھی۔ مگر اسے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ وہ جب تک نہیں پہنچے گا کیری سانس نہیں لے سکے گی۔ خود وہ ڈرائیو کرنے کے دوران دیر تک سانس لینا بھول جاتا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ عورت کتنی خوب صورتی سے اپنے پیچھے دوڑاتی ہے۔ وہ اس کی طلب میں ابھی پہلے مرحلے سے گزر رہا تھا۔

وہ ہوٹل میں آیا پھر اس کے کمرے کے سامنے پہنچ کر کال بیل کا بٹن دبایا۔ چند سیکنڈ بعد ایک معمر خاتون نے دروازہ کھولا۔ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ "میں انعام ہوں۔ کیری سے ملنے آیا ہوں۔"

خاتون نے ناگواری سے کہا۔ "میرے سمجھانے کے باوجود تم مادام مرینا کی پیشین گوئی کو درست ثابت کر رہے ہو۔"

"اچھا تو آپ میڈم مارتھا ہیں۔ ایک اندازے سے کہہ سکتا ہوں کہ کیری آپ کی بیٹی ہے۔"

"ہاں بیٹی ہے۔ کیا تم اس کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتے؟"

"میں خود نہیں آیا۔ تمہارے خیال کے مطابق مادام کی پیشین گوئی کھینچ لائی ہے۔"

"یہ بکواس ہے۔ میں کسی مادام کو نہیں مانتی۔ میں نے ایک مسلمان دیوان مرزا سے شادی کی تھی۔ وہ کمبخت ایک بچی کا باپ بنتے ہی مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

"آپ کے تیور، آپ کی گرم مزاجی اور یہ پتھر مارنے والا لہجہ بتا رہا ہے کہ بے چارہ دیوان مرزا کیوں بھاگ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے آپ کی بیٹی مجھے بھاگنے پر مجبور نہیں کرے گی۔"

اندر سے کیری کی آواز آئی۔ "ممی! کون ہے؟"

"میں ہوں۔ آواز سے پہچان لو۔ مجھے صرف تمہارا نام یاد ہے۔ اپنا نام بھول گیا ہوں۔"

"اوہ لونانی! اندر آؤ۔ باہر کیوں کھڑے ہو؟"

انعام نے خاتون کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ ایک طرف ہٹ

گئی۔ شیری ڈبل بیڈ پر آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ انعام کو دیکھتے ہی مسکرا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ پاس آ کر اس کے ہاتھ کو تھام کر بولا۔ "کیسی ہو؟ ویسے بھلی ہو، تر و تازہ گلاب کی طرح کھل گئی ہو۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "کسی کی نظر لگنے سے کوئی بیمار ہو جاتا ہے اور کوئی کھل اٹھتا ہے۔ نظر نظر کی بات ہے۔"

"یعنی میں آ گیا ہوں تو اب ڈاکٹر نہیں آئے گا۔"

وہ پھر ہنسنے لگی۔ اس کی ممی نے ناگواری سے کہا۔ "میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ شیری نے روٹھ کر پوچھا۔ "تم نے فون کیوں بند کر دیا تھا؟"

"تم نے طعنہ دیا تھا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا صرف کسی ضرورت سے شادی کرنے پر مجبور ہوں۔"

"کیا یہ سچ نہیں ہے؟"

"میں بتاؤں گا سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے بشرطیکہ تم مادام مونیکا کی ایک ایک بات مجھے بتا دو۔"

وہ بولی۔ "مادام نے بتایا ہے، اگلے ماہ کی دس تاریخ کو تم پورے چالیس برس کے ہو جاؤ گے۔ یہ چالیس برس پورے ہونے سے پہلے تمہیں ایسے انتظامات کرنے ہوں گے کہ ہر پل، ہر لمحہ تمہارے ساتھ کوئی رہا کرے۔ کوئی مرد ہو یا عورت، ملازم ہو یا شریک حیات، ان سب کو باری باری اس طرح تمہارے ساتھ رہنا چاہیے کہ تم کسی لمحے بھی اکیلے نہ رہو۔ جس لمحے بھی تم اکیلے رہو گے، موت کا فرشتہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

انعام نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "میں مونیکا کی صلاحیتوں کو تسلیم کرتا ہوں۔ ایک برس پہلے ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والے نجومی نے بھی مجھے یہی بتایا تھا کہ میری موت چالیس برس کے لگ بھگ ہوگی اور ایسے وقت ہوگی جب میرے آس پاس کوئی نہ ہوگا۔ میں بے یار و مددگار تنہائی میں مروں گا۔"

وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا جیسے سانس رکنے کا اندیشہ ہو۔ موت کا خوف حاوی ہو گیا تھا وہ بستر سے اٹھ گیا جیسے بستر سے دور ہو گیا۔ بیڈ کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اگرچہ وہ نجومی بین الاقوامی شہرت کا حامل تھا، تاہم میں ایسی بات پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں پہلے بھی اس نجومی سے کئی ملاقاتیں کر چکا تھا۔ اس سے جو سوال کرتا تھا اس کا صحیح جواب ملتا تھا۔ وہ جو پیشین گوئی کرتا تھا، چند دنوں میں یا چند ماہ میں وہ درست ثابت ہوتی تھی۔ آخری بار میں نے کہا تھا، میں جلدی مرنا نہیں چاہتا، مجھے بتاؤ میری زندگی کتنی ہے؟ اس نے دوسرے دن بتایا تو میں نے پوچھا، میں کیسے یقین کروں؟"

اس نے جواب دیا۔ "یقین نہ کرو۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ میرے اندر موت کی بارودی سرنگ بچھا کر کہتے ہو، یقین نہ کروں۔ تمہاری ہر پیشین گوئی درست ہوتی ہے۔ میں یقین کیسے نہ کروں؟"

"چالیس برس پورے ہونے کے بعد تم یقین کرنے یا نہ کرنے کے لیے نہیں رہو گے۔ تمہارے بعد دوسرے لوگ میری پیشین گوئی کو تسلیم کریں گے۔"

میں نے پوچھا۔ "میری موت کیسے ہوگی؟"

"طبعی موت ہوگی۔ مگر بڑی کسمپرسی میں ہوگی۔ حد نظر تک تمہارے آس پاس کوئی نہ ہوگا۔ بعض لوگوں کی موت مخصوص انداز میں لکھی ہوتی ہے۔ کاتب تقدیر نے تمہاری موت تنہائی میں لکھی ہے۔"

"اگر میں تنہا نہ رہوں تو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ آدمی کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں تنہا ہو جاتا ہے۔"

"یہ انسان ہے جو ناممکن کو ممکن بناتا ہے۔ میں یہ انتظام کر سکتا ہوں جس کے بعد کبھی تنہا نہ رہوں۔ ہر لمحہ میرے ساتھ کوئی نہ کوئی رہا کرے گا۔" میں نے اصرار کیا۔

نجومی نے کہا۔ "انسان ہمیشہ موت سے لڑتا آیا ہے۔ تم بھی لڑنا چاہتے ہو۔ بے شک تمہیں طویل عمر کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔"

"یعنی اس طرح میری عمر طویل ہو سکتی ہے؟"

"عقل میں تو یہی بات آتی ہے کہ جب کاتب تقدیر نے تنہائی میں تمہاری موت مقرر کی ہے اور تم تنہا نہیں رہو گے تو پھر کیسے مرو گے؟ نہیں مرو گے۔ میعاد حیات بڑھ جائے گی۔ ملک الموت کسی اگلی غیر متوقع تنہائی کا منتظر ہوگا۔"

انعام نے اتنا کہہ کر سر جھکا لیا۔ شیری خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بولا۔ "یوں دیکھا جائے تو میں خود غرض ہوں۔ اپنی موت کا وقت ٹالنے، اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مگر دوسرے پہلو سے دیکھو، میں تنہائی دور کرنے کے لیے کسی کالی پیلی عورت کو گھر میں بٹھا سکتا ہوں۔ میں بد ذوق نہیں ہوں۔ اگرچہ شاعر نہیں ہوں مگر حسن نظر رکھتا ہوں۔ اس کا ثبوت تمہاری رفاقت ہوگی۔"

شیری نے پوچھا۔ "ایک شریک حیات کتنے گھنٹے تک تنہائی دور کر سکتی ہے؟ بیوی کی کئی مصروفیات بھی ہوتی ہیں۔ پھر یہ کہ میں فلموں میں کام کرنے جاؤں گی تو تم اکیلے رہ جاؤ گے۔"

"میرے دوسرے ملازم اور کنیزیں ہوں گی۔"

"ایک وقت میں ایک ملازم ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ گھبرا کر بھاگ جائے ایسے میں تم بالکل تنہا رہ جاؤ گے۔"

"میں نے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کیا ہے۔ ہر چوبیس گھنٹے میں چار ملازم ہمیشہ موجود رہیں گے۔ دوسرے چوبیس گھنٹے کے لیے جب تک دوسرے چار ملازم ڈیوٹی پر حاضر نہیں ہوں گے اس وقت تک پچھلی ڈیوٹی کرنے والے ملازموں کو چھٹی نہیں ملے گی۔ ان کے علاوہ چار چھ کنیزیں ہنگامی حالات کے لیے موجود رہا کریں گی۔"

"تم جیسے انتظامات کر رہے ہو، اُن کے پیش نظر شریک حیات کی ضرورت نہیں رہتی۔"

"اس کی بات درست ہے۔ میں چوبیس گھنٹے کنیزوں اور ملازموں کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ آئندہ میری عمر جتنی بھی ہو، میں اُسے خوبصورتی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک وفادار اور محبت کرنے والی بیوی چاہیے جو میری بے انتہا دولت کے ورثے وارث پیدا کرے۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں سدا بہار رہوں گی۔ بچے پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"شادی کے بعد بھی تم اپنے فیصلے پر قائم رہو گی تو پھر دو بیویاں ہوں گی۔ میں بچوں کے لیے دوسری شادی کرلوں گا یا تمہاری خاطر بچوں کا خیال ہی دل سے نکال دوں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولی "تم بہت اچھے ہو۔ میں تمہیں اتنی محبت دوں گی کہ تم بچوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرو گے۔"

"تو پھر ڈن؟"

"ڈن۔ مگر شادی کب ہو گی اور کہاں ہو گی؟"

"ہندوستان میں نکاح پڑھایا جائے گا کیونکہ دیکھا جا سکتا ہے۔ میں تمہیں دلہن بنا کر پاکستان لے جاؤں گا اور یہ شادی کب ہو گی یہ میں بعد ہی بتاؤں گا۔ ویسے بیس دن بعد یعنی اگلے مہینے کی دس تاریخ کو میری سالگرہ ہے۔ میں چالیس برس کا ہونے سے پہلے شادی کرلوں گا۔"

اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ پھر ڈرائیور سے کہا "میں پندرہ دن کے اندر مس شیری سے ہندوستان میں نکاح پڑھواؤں گا اور اسے شریک حیات بنا کر پاکستان لے جاؤں گا۔ پاکستان میں مس سائرہ سے رابطہ قائم کرو اور اس سے کہو کہ وہ اس سلسلے میں دونوں ملکوں کے سفارت خانوں میں ضروری کاغذی کارروائی پوری کرے۔"

اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ شیری نے پوچھا "یہ سائرہ کون ہے؟"

"میری پرسنل سیکریٹری ہے۔"

سائرہ کے ذکر پر اس کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ وہ اُسے خیالوں میں دیکھنے اور سوچنے لگا۔ شیری اسے تک رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بولی "کیا وہ بہت حسین ہے؟"

"آں؟" وہ خیالات سے چونک کر بولا "تم کچھ کہہ رہی ہو؟"

"میں پوچھ رہی ہوں، وہ کتنی خوبصورت ہے جس کے خیالوں میں کھو گئے ہو؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا "کیا تم جل رہی ہو؟ ابھی پاکستان جاؤ گی تو اسے ایک ہی بار دیکھو گی۔"

"دوسری بار کیوں نہیں؟"

"وہ اتنی بدصورت ہے کہ دوسری بار آنکھیں بند کر لو گی۔"

"تم نے اتنی بدصورت لیڈی سیکریٹری کیوں رکھی ہے؟"

"وہ ایک ڈیکوریشن پیس ہے۔ امیر کبیر لوگوں کے ڈرائنگ روم میں حبشی مرد یا عورت کا مجسمہ بھی ہوتا ہے۔ ایسے محل میں حسن ہے اور کشش ہے، رنگ ہے، خوشبو ہے، چاندنی اور سونے کی جگمگاہٹ ہے۔ ایسی جگمگاہٹ میں سائرہ چاند کے دھبے کی طرح اچھی لگتی ہے۔ ویسے وہ بہت سمجھدار اور معاملہ فہم ہے۔ ایک پرسنل سیکریٹری کی تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں۔"

وہ پھر شیری کے قریب آ کر بستر کے سرے پر بیٹھ گیا۔ وہ ذرا سی اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی "اب تم بے قابو ہو گئے۔"

"کیا نہیں ہونا چاہیے؟"

"میں شادی ہونے تک یہ مناسب نہیں سمجھتی۔ بمبئی کے ایک بینک میں میرا اکاؤنٹ ہے۔ میں اکاؤنٹ نمبر دے رہی ہوں، اس میں ایک بڑی رقم جمع کرادو اور شادی سے پہلے چار گواہوں کی موجودگی میں تحریری معاہدہ کرلو۔"

شیری نے اپنا اکاؤنٹ نمبر اور بینک کا نام لکھ دیا۔ وہ اس کے خوبصورت اور نازک سے ہاتھ کو چوم کر دل سے باہر آیا۔ ابھی وہ ہاتھ نہیں آسکتی تھی لہٰذا اس کے ہاتھ کو چوم کر

صبر کر لیا تھا۔

خوب صورت ہو یا بد صورت، گوری ہو یا کالی، اگر وہ ہاتھ نہ آنا چاہے تو اپنے آنچل کی ہوا بھی لگنے نہیں دیتی۔ ایک بار اس نے سائرہ کا ہاتھ پکڑا تھا۔ وہ دنگ رہ گئی تھی۔ ایک پرسنل سیکریٹری کی حیثیت سے اس کے کاروباری مزاج کو خوب سمجھتی تھی۔ وہ دولت اور شراب کو کبھی کبھی منہ لگاتا تھا۔ ان دو چیزوں کو اپنے گھر میں مستقل نہیں رکھتا تھا۔ ایسے حسن پرست دھندے کے باوجود گھر میں نہیں رکھتا تھا۔ کبھی دل بہلانے کا موڈ ہوتا تو حسین ترین لڑکی کا انتخاب کرتا تھا۔ اس روز سائرہ نے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے پوچھا "اس کا مطلب کیا ہے؟"

وہ سنجیدگی سے بولا "تم نادان نہیں ہو، مطلب خوب سمجھتی ہو۔"

"پلیز سر! میں نادان نہیں ہوں، ہوا یہ کہ آپ کی کارروائی سے دور رہ سکوں۔"

"میں تمہیں پچاس ہزار روپے ماہانہ دیتا ہوں۔"

وہ بولی "میری صورت پچاس ہزار کیا ہو، پیسے کی کمی نہیں ہے۔ یہ رقم آپ میری تنخواہ میں شامل کر دیتے ہیں۔"

"چلو یہی سہی۔ اپارٹمنٹ ٹائم کے دس ہزار دوں گا۔"

"میرے پاس حسن نہ سہی عزت تو ہے۔ پلیز! میری توہین نہ کریں۔"

"عزت اسے کہتے ہیں جو دنیا والوں کے سامنے بچی رہے۔ گھر کے اندر کوئی دیکھنے نہیں آتا۔"

"نو سر! عزت اسے کہتے ہیں جو گھر کے اندر بھی ہوس کی آنچ سے محفوظ رہے۔ آپ دنیا کی حسین ترین لڑکی کو خرید سکتے ہیں، مجھے نہیں خرید سکتے۔"

انعام اب تیری جیسی حسین ترین لڑکی کو حاصل کرنے والا تھا۔ اسے بس سائرہ کی یہ بات یاد آ رہی تھی۔ وہ چاہتا تو اسے جبراً حاصل کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے ہی اس نے وارننگ دی تھی "سر! آپ مجبور کریں گے تو میں ملازمت چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ یہ وارننگ بھی اثر نہ کرے گی تو میں جان پر کھیل جاؤں گی۔"

انعام نہیں جانتا تھا کہ وہ جان پر کھیل سکتی ہے یا نہیں؟ لیکن یہ نقصان برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر چلی جائے۔ وہ اس کے مزاج کو اور کاروبار کو بہت دور تک سمجھتی تھی۔ اس کی پارٹیوں کو بڑی کامیابی سے ڈیل کرنا جانتی تھی۔ اس نے کئی بار اس کے پیچیدہ مسائل کو بڑی ذہانت سے حل کیا تھا۔ کئی بار منافع بخش مشورے دیے تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس کے کاروباری رازوں اور ہتھکنڈوں سے بھی واقف تھی۔ اس کے جانے کے بعد انعام کسی اور کو رازدار بنانا نہیں چاہتا تھا۔ ایسی ذہین، معاملہ فہم اور قابلِ اعتماد لڑکی شاید اسے نہ ملتی۔ ان تمام حقائق پر غور کرنے کے بعد اس نے سائرہ کو سوری کہا اور وعدہ کیا کہ آئندہ اسے شکایت کا موقع نہیں دے گا۔

دوسری صبح اس نے بیدار ہونے کے بعد سوچا۔ کل رات مجھے کیا ہو گیا تھا؟ میں اس چڑیل کو اپنے خوب صورت بیڈروم میں کیوں لانا چاہتا تھا؟ کیا میرا دماغ چل گیا تھا؟ نہیں، میں صحیح الدماغ تھا۔ زیادہ پی بھی نہیں تھی۔ البتہ مستی میں تھا۔ کاروبار میں منافع بڑھتا جا رہا ہے۔ میں سائرہ کی خدمات سے خوش ہو کر اسے انعام دینا چاہتا تھا۔ اسے بازوؤں میں جکڑ کر اس کی عزت بڑھانا چاہتا تھا۔ جسے کوئی دیکھنا پسند نہیں کرتا اسے میں پیار کر لیتا تو یہ اس کی خوش نصیبی ہوتی۔ وہ ساری عمر میرے پیار اور میرے خلوص کو یاد کرتے کرتے گزار دیتی۔ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ایک گری پڑی لڑکی سے ہمدردی اور مہربانی کرو تو وہ اسے بے عزتی سمجھتی ہے۔

دراصل وہ اپنی اوقات بھول گئی تھی۔ میں نے ہاتھ پکڑا تو وہ خود کو میرے برابر سمجھ کر نخرے کرنے لگی۔ آئینے کو بھول گئی۔ خود کو حور پری سمجھنے لگی۔ یہ میری حماقت ہے۔ میں ایک گری ہوئی کو اٹھانے کے لیے گر پڑا۔ بس یہ پہلی اور آخری غلطی ہے۔ میں بگ باس ہوں، باس کی طرح رہوں گا۔

انعام اپنے بیڈروم سے باہر آیا تو دن کے دس بج رہے تھے۔ سائرہ اپنی کرسی پر بیٹھی میز پر رکھی ہوئی ایک فائل کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اس کے سیاہ جسم کے اوپر ہلکے زرد رنگ کا لباس یوں لگ رہا تھا جیسے رات کے بدن پر سورج نکل آیا ہو۔ اسکول کی بچیوں کی طرح اس نے بالوں میں زرد رنگ کا ربن باندھا تھا۔ اپنی دانست میں خوب صورت بن کر رہا کرتی تھی۔ یوں اسمارٹ بن کر بیرونی ممالک سے آنے والے اسمگلروں سے مال کا کھرا سودا کرتی تھی اور کامیاب رہتی تھی۔ اس کامیابی نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ شاید وہ خود کو خوبصورت اور پرکشش سمجھنے لگی تھی۔ یہ بھول گئی تھی کہ دنیا کے بیشتر حصوں میں ہیروئن کی طلب بڑھتی جا رہی تھی۔ اس میں اس کی کاروباری سوجھ بوجھ کا دخل نہیں تھا۔

انعام اس کے خلاف طرح طرح سے سوچنے لگا تھا لیکن مخالفت کے باوجود آخر تسلیم کرتا تھا کہ پولیس کے بڑے بڑے افسروں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں سے وہی نمٹا کرتی تھی۔ انعام اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لیے اکثر بیرونی ممالک کے

دوسرے پر رہتا تھا۔

وہ اپنے منتشر لباس کو سنبھالتے ہوئے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ انعام کو سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ اسے خشمگیں نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ اس دن سے وہ اُسے بُری طرح نظر انداز کرنے لگا تھا۔ اسے براہِ راست مخاطب نہیں کرتا تھا۔ اپنے کسی ملازم کے ذریعے کوئی اہم گفتگو کر لیتا تھا۔ جس طرح ممکن ہوتا اس کی اہمیت کو کم سے کم کرتا جاتا تھا۔

یوں ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک روز اس کی کرسی خالی نظر آئی۔ انعام نے سوچا کہیں کام سے گئی ہو گی۔ جب وہ دیر تک نہیں آئی تو اس نے ملازم سے پوچھا۔ جواب ملا "صاحب! وہ تو صبح سے نہیں آئی ہیں۔"

وہ ملک سے باہر جانے والا تھا۔ اسے سائرہ کی غیر حاضری گراں گزری۔ روانگی سے پہلے کچھ اہم معاملات پر گفتگو لازمی تھی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا اس کی میز پر آیا۔ وہاں ایک بڑے سے بند لفافے پر مسٹر انعام اللہ لکھا ہوا تھا۔ اس نے لفافے کو کھول کر کاغذات نکالے۔ ایک کاغذ پر استعفیٰ لکھا ہوا تھا۔ دوسرے کاغذ پر اس نے لکھا تھا: "جناب انعام اللہ صاحب! آپ کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ آپ نے مجھے دارالامان سے لا کر اتنا بڑا عہدہ دیا تھا جو کسی بہت ہی قابلِ اعتماد شخص کو دیا جاتا ہے۔ مجھ اکیلی کو چھ ہزار روپے ماہانہ، ایک بنگلہ اور ایک کار دی۔ مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ میرا خیال تھا میں نے آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا ہے لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ آپ کو مجھ سے ایسی شکایت ہے جسے آپ زبان پر نہیں لا سکے۔ اور زبان پر لے آئیں تو میں گھٹنے سے پہلے مرنا پسند کروں گی۔ ان حالات میں بہتر ہے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں۔ اگرچہ ملازمت چھوڑنے کا یہ اصول نہیں ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں اپنے تمام کام کا چارج دے کر جاؤں۔ آپ جانتے ہیں میں نے کبھی ایک پیسے کی بے ایمانی نہیں کی۔ میں نے اپنی تمام چیک بکس اور اہم کاغذات سیف میں رکھ دیے ہیں۔ سیف کی چابیاں اور مجھے عنایت کیے ہوئے بنگلے اور کار کی چابیاں بینک کے لاکر میں ہیں۔ لاکر کی چابی آپ کے بستر میں نرم گدے کے نیچے ہے۔"

اس نے آگے نہیں پڑھا۔ گرجتے ہوئے منیجر کو آواز دی۔ وہ بھاگتا ہوا آیا۔ ادب سے کھڑا ہو کر بولا "یس سر!"

"یس سر کا بچہ! تو نے مجھ سے یہ کیوں چھپایا کہ مس سائرہ ملازمت چھوڑ کر جانے والی ہیں؟"

وہ حیرانی اور پریشانی سے بولا "میں قسم کھاتا ہوں سر! خود مجھے آپ سے معلوم ہو رہا ہے کہ مس سائرہ یہاں سے چلی گئی ہیں۔"

"وہ آخر کہاں جائے گی۔ جاؤ اسے ڈھونڈ کر لاؤ۔"

اس نے فون کا ریسیور اٹھایا۔ منیجر جس طرح بھاگتا آیا تھا اسی طرح بھاگتا ہوا چلا گیا۔ اس نے نمبر ڈائل کیے۔ پھر رابطہ قائم ہوتے ہی بولا "سلطان پاشا! میری سیکریٹری سائرہ اچانک میرا کام چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ ہمارے تمام آدمیوں کو پورے شہر میں پھیل جانے کا حکم دو۔ ریلوے اسٹیشن، ائرپورٹ اور ہائی وے جیسے مقامات پر اچھی طرح تلاش کیا جائے۔ وہ ابھی شہر میں ہی ہو سکتی ہے۔ مجھے ہر پندرہ منٹ میں رپورٹ دو۔ اگر وہ مل جائے اور سیدھی طرح نہ آنا چاہے تو زبردستی اٹھا لاؤ۔"

اس نے سلسلہ منقطع کیا پھر دوسرے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد بولا "میری سیکریٹری سائرہ اچانک کہیں چلی گئی ہے۔ ریڈیو کے ذریعے اعلان کراؤ۔ سائرہ سے کہا جائے کہ لاکر اور سیف کی چابیاں نہیں مل رہی ہیں۔ وہ یہاں آئے اور دوسرے سیکریٹری کو باقاعدہ چارج دے کر جائے۔ یہی مضمون تمام اخبارات میں شائع کرنے کے لیے بھیج دو۔ اس کی تصویر بھی شائع ہونی چاہیے۔"

وہ ایک کے بعد دوسرے کو اور دوسرے کے بعد تیسرے کو مسلسل فون کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا پورے شہر کو بلکہ پورے ملک کو اس کی تلاش پر لگانا چاہتا ہو۔ وہ کالی پیلی سی لڑکی اس کے کاروبار کا اور اس کی زندگی کا اہم حصہ بن گئی تھی۔ وہ بیوی نہیں تھی، محبوبہ نہیں تھی، ایک معمولی رشتے دار بنائے جانے کے قابل بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود بہت اہم تھی۔

شام کو اطلاع ملی کہ وہ مل گئی ہے۔ مگر واپس نہیں آنا چاہتی ہے۔ اسے زبردستی اٹھا کر شہر نہیں لایا جا سکتا۔ اس لیے گھارو کے ڈاک بنگلے میں پہنچایا جا رہا ہے۔ انعام سنتے ہی شہر سے کار میں روانہ ہوا۔ رات کے آٹھ بجے ڈاک بنگلے پہنچا۔ برآمدے میں بڑے کڑیل مسلح جوان بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی اُٹھ کر سلام کرنے لگے۔ ڈاک بنگلے کے ایک کمرے کی کھڑکی اور دروازہ بند تھا۔ اس نے پوچھا "وہ کہاں ہے؟"

"صاحب! کمرے میں ہے۔ ہم نے باہر سے دروازہ بند کیا تو وہ اندر سے کھڑکی اور دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی ہے۔"

وہ برآمدے میں آیا۔ دروازے کے قریب منہ لے جا کر آواز دی "سائرہ!" تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد پھر آواز دی۔ "سائرہ! میں انعام اللہ ہوں۔ دروازہ کھولو۔"

اسے جواب نہیں ملا۔ پہلے اس نے دستک دی۔ پھر دروازہ پیٹنے لگا۔ "یہ کیا حماقت ہے۔ ایک تو دروازہ اندر سے

بند کر لیا ہے۔ دوسرے جواب نہیں دے رہی ہو۔ پلیز! دروازہ کھولو۔"

دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ وہ پریشان ہو کر بولا: "کہیں وہ احمق لڑکی جان پر تو نہیں کھیل گئی ہے۔ دروازہ توڑ دو۔ جلدی کرو۔"

دو جوان آگے بڑھ کر دروازے کو ٹکریں مارنے لگے۔ اُسے توڑنے کے دوران بھی اندر خاموشی رہی۔ وہ فرنیچروں کے وقت کا بلاک بنگلا بہت پرانا ہو چکا تھا۔ دروازے کمزور ہو گئے تھے۔ وہ جلد ہی ٹوٹ گیا۔ دھکا مارنے والے اس دروازے کے ساتھ اندر جا کر گرے۔ انعام نے کمرے میں داخل ہو کر دیکھا۔ وہ ایک کرسی پر گم صُم سی بیٹھی ہوئی تھی۔ سر گھٹنے سے یوں لگتا تھا جیسے بیٹھے ہی بیٹھے اللہ کو پیاری ہو گئی ہے۔ انعام نے پوچھا: "یہ کیا حرکت ہے۔ تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟"

اس نے خاموشی سے منہ پھیر لیا۔ انعام نے دوسروں کو وہاں سے جانے کے لیے کہا پھر سائرہ کے پاس ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ آہستگی سے بولا: "کیا اس طرح چھوڑ کر جاتے ہیں؟"

اسے کہنا چاہیے تھا کیا اس طرح ملازمت چھوڑ کر جاتے ہیں۔ لیکن اس نے صرف 'ملازمت' کا لفظ نکال کر اپنے فقرے میں اپنائیت پیدا کر لی۔ سائرہ نے اسے شوخی بھری نظروں سے دیکھا پھر کہا: "میں نے آپ کی رگ رگ کو سمجھنے کے بعد ہی آپ کے کاروبار کے پیچ و خم کو سمجھا ہے۔ آپ اپنائیت کی نہیں مطلب کی بات کریں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا: "میں تمھاری ذہانت کا قائل ہوں۔ میں نے ایک رات تمھارا ہاتھ پکڑ کر تمھاری توہین کی۔ پھر غلطی کا احساس ہوتے ہی سوری بھی کہہ دیا۔ اس کے بعد تمھیں کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ میں حیران ہوں کہ تم اچانک ملازمت چھوڑ کر کیوں جانا چاہتی ہو؟"

"آپ حیران نہیں ہیں۔ سب کچھ سمجھتے ہیں۔"

"ہاں، کاش! میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں۔ مجھے جانے کی وجہ بتاؤ۔"

"آپ انجان بنتے رہیں۔ میری زبان کچھ نہیں کہے گی۔"

"میں تمھارے دل کی بات کیسے جان سکتا ہوں؟"

"آپ سے میرے دل کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ میں آپ کے ہاں دماغی صلاحیتوں سے کام کرتی آئی ہوں۔"

اس نے ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر دیکھا پھر کہا۔ "یہاں بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔ آؤ چلیں۔"

وہ بیٹھی رہی۔ اس نے پھر کہا: "پلیز یہاں سے چلو۔"

وہ جھڑک کر بولی: "پلیز نہ کہیں۔ التجا نہ کریں۔ آپ کے پاس دولت ہے، طاقت ہے۔ مجھے یہاں سے بھی اٹھوا کر لے جائیں۔"

"میں جتنی نرمی سے بات کر رہا ہوں، تم اتنی ہی گرمی دکھا رہی ہو۔ جب کہ یہ اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اپنا کاروباری راز جاننے والوں کی عمر بھر پرورش کرتا ہوں۔ مگر وہ مجھے چھوڑ کر جانا چاہیں تو انھیں گولی مار دیتا ہوں۔"

"آپ دھمکی کیوں دے رہے ہیں۔ میں اسی لیے جا رہی ہوں کہ آپ مجھے گولی مار دیں۔ یا کسی سے قتل کرا دیں۔ میرے پیچھے کوئی رونے والا نہیں ہے۔ میں دارالامان سے اکیلی آئی تھی۔ آپ کی دنیا میں بھی اکیلی رہی اور اتنی بڑی دنیا سے بھی اکیلی جاؤں گی۔"

"تمھاری موت سے میری پریشانیاں بڑھ جائیں گی۔ تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں، پچھلے ایک ماہ سے میرا رویہ تمھارے لیے نامناسب رہا ہے۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

وہ سوچنے لگی۔ انعام نے کہا: "تم یہی چاہتی تھیں کہ میں اپنی غلطی اپنی زبان سے تسلیم کروں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ ... مم کی چلو، اب ضد نہ کرو۔ نا غصہ تھوک دو۔"

وہ جو منوانا چاہتی تھی اسے انعام نے مان لیا تھا۔ اب کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ اس کے ساتھ شہر واپس آ گئی۔ دوسرے دن سے پھر سیکرٹیری کے فرائض انجام دینے لگی۔ بعد میں انعام نے چپکے ہی چپکے دوسری قابلِ اعتماد سیکرٹیری کی تلاش کی لیکن ویسی کوئی نہیں ملی۔ وہ اندر ہی اندر اس سے بیزار رہنے لگا تھا۔ عجیب مصیبت تھی، بیزاری کے باوجود اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ جس شے سے جیسے چاہتا آیا تھا اسے حاصل کرتا رہا تھا۔ کسی دولت سے خرید لیتا تھا، کبھی طاقت سے مگر سائرہ دولت سے خریدی نہیں جا سکتی تھی اور اسے طاقت سے حاصل کر کے اپنا نقصان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صورت شکلی ایسی نہیں تھی کہ اسے بیوی بنا کر رکھا جاتا۔ وہ کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے ایک چیلنج بن گئی تھی۔

بات دراصل یہی تھی، وہ اس چیلنج کا جواب نہیں دے پا رہا تھا اس لیے جل رہا تھا، کڑھ رہا تھا۔ ایک لڑکی جو دو کوڑی کی بھی نہیں تھی اس نے سونے کے پلنگ پر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ بس اتنی سی بات اس کے رئیسانہ مزاج کو چرکے لگا رہی تھی۔

❋

بمبئی میں بڑی دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ وہاں بھی انعام کا ایک خوب صورت ترین بنگلا تھا۔ وہ میری کو اپنی دلہن بنا کر اسی بنگلے میں لے آیا۔ نکاح پڑھوانے سے پہلے میری نے اس سے چار کروڑ روپے کا تحریری معاہدہ کیا تھا۔ انعام نے اتنی بڑی رقم کی ادائیگی کے لیے شرط رکھی تھی کہ وہ یکمشت ادا نہیں کرے گا۔ فلم بننے کے دوران ضرورت کے مطابق ادائیگی کرتا جائے گا۔ اگر ایسے وقت میری قطع تعلق ضروری سمجھے گی تو یہ معاہدہ خود بخود منسوخ ہو جائے گا اور وہ آئندہ فلموں میں سرمایہ نہیں لگائے گا۔

بھلا بے شمار دولت، پوست کے کھیت اور ہیروئن کی فیکٹریوں کو کون چھوڑنا پسند کرتا ہے۔ میری بھی ایسی حماقت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے معاہدے میں یہ بھی لکھوایا کہ وہ اپنی خوشی انعام کے بچوں کی ماں بنے گی، لہٰذا وہ دوسری شادی کبھی نہیں کرے گا۔

معاہدہ کرنے کے باوجود میری نے سہاگ رات میں بہت پریشان کیا۔ وہ پاس آنے دیتی تھی مگر چہرے کو چھونے نہیں دیتی تھی۔ وہ بڑی دیر تک اسے محبت سے سمجھاتا، مناتا رہا۔ پھر جھنجھلا کر بولا "میں تمہارے جسم کے ایک ایک حصے کا مالک ہوں۔ تمہیں پیار سے سمجھا رہا ہوں، مجھے زبردستی پر مجبور نہ کرو۔"

وہ بولی "ذرا عقل سے کام لو۔ دنیا میرے چہرے کو دیکھ کر ہی میرے ہوش ربا حسن کی تعریفیں کرتی ہے۔ اگر اس پر ذرا بھی داغ دھبا یا ہلکا سا نشان پڑے گا تو میں سیکنڈ ہینڈ کہلاؤں گی اور یہ انسلٹ ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔"

"یعنی میں تمہارے حسین چہرے کو کبھی پیار نہیں کر سکوں گا؟"

"میں گردن سے نیچے تمہاری ہی تمہاری ہوں۔ چہرے کو ایک ڈیکوریشن پیس سمجھ کر دور سے دیکھو۔ گھر کے اندر اور باہر میرے ابھرتے حسن کو تمہارے ساتھ دیکھ کر لوگ تم پر رشک کریں گے۔ نمایاں میں رہوں گی، تعریفیں تمہاری ہوں گی۔"

"پھول صرف مہکنے کے لیے نہیں اور حسن صرف دیکھنے کے لیے نہیں ہوتا۔ اگر چہرے کو صرف نمائش کے لیے رکھنا ہے تو ابھی میری زندگی سے نکل جاؤ۔ میں بھی دوسروں کی طرح تمہارے حسن کو دور سے دیکھ لیا کروں گا۔"

"اچھا میں تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کروں گی۔ تم میری ایک بات مان لو۔ فلمیں مکمل ہونے تک میرے چہرے کو تروتازہ رہنے دو۔ تم چار کروڑ خرچ کرنے والے ہو۔ تمہیں اس کا بھرپور منافع ملنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میرا حسن سپرہٹ رہے تاکہ فلمیں بھی سپرہٹ ہوتی رہیں۔"

"مجھے نہ بہلاؤ۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری کی جتنی سپرہٹ ہیروئنیں ہیں، وہ سب تو جھک مار کر فلم بازار کے لیے آتی ہیں۔ میں تمہیں فیصلہ کرنے کے لیے آدھے گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو۔ میرے تمام حقوق دو گی یا سہاگ رات منانے سے پہلے ہی طلاق لینا چاہو گی؟"

وہ بہت بڑی جیتی ہوئی بازی ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے آدھے گھنٹے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ دوسری صبح وہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے چہرے کو دیکھتی رہی، دیکھ دیکھ کر روتی رہی اور رو رو کر کتنے ہی طرح کے لوشن لگاتی رہی۔ فون کر کے بمبئی کی سب سے معروف بیوٹی پارلر کی ایکسپرٹ کو بلایا۔ ایکسپرٹ نے اسے سمجھایا "سہاگن کا چہرہ ہر رات کے بعد کچھ اور کھل جاتا ہے۔ کبھی مرجھاتا نہیں ہے۔" مرجھانے کے اندیشے کو دور کرنے کے لیے اس نے یقین دلایا کہ وہ روز آ کر اس کے چہرے کو بیوٹیفائی کیا کرے گی۔

وہ دو دن تک آتی رہی۔ تیسرے دن انعام اسے پاکستان لے آیا۔ وہ بمبئی سے کراچی، پھر کراچی سے اس شہر گئے جہاں انعام اللہ کا آبائی مکان تھا اور کئی رشتے دار تھے۔ وہ اپنے لوگوں میں دلہن کے ساتھ دو دن رہا۔ میری پیار اور چار دیواری کی پابندیاں دیکھ کر گھبرا گئی۔ وہ انعام سے کہتی رہی "یہاں سے جلدی چلو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

انعام فکروں اور پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ گن گن کر دن گنتے گنتے چالیسویں سالگرہ کا دن قریب آ گیا تھا۔ وہ میری کے ساتھ کراچی پہنچا۔ سائرہ نے اس کی سالگرہ کے تمام انتظامات مکمل کر دیے تھے۔ پورے ملک سے بڑے بڑے اور اہم ترین لوگ اسے مبارکباد دینے آئے تھے۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ یہ اس کی آخری سالگرہ بھی ہو سکتی ہے۔ سائرہ اور دوسرے خاص ملازموں کو معلوم تھا، آج رات بارہ بجے سے موت ہر پل اس کی تاک میں رہنے والی تھی۔

دوسروں کی خوشیوں کی خاطر سالگرہ کا جشن منانے کے لیے شراب بھی تھی، شباب بھی تھا۔ رقص و موسیقی کا رنگا رنگ پروگرام بھی تھا۔ میری ہر محفل کی جان ہوتی تھی۔ اس محفل میں بھی وہ سب کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ لوگ انعام اللہ کے انتخاب کی داد دے رہے تھے۔ جو بہت زیادہ بے تکلف تھے وہ کہہ رہے تھے "بھئی انعام! تم بہت بڑے مسخرے ہو۔ اپنے محل میں خوبصورتی اور موسیقی کی زندہ مثالیں رکھتے ہو۔ ایک سے ایک بڑھ کر، ایک نگینہ ہے ایک پارہ ہے۔"

اس بات پر سبھی نے قہقہہ لگایا۔ انعام نے ائرپورٹ پر
ٹیری اور سائرہ کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا تھا۔ ٹیری نے
اسے دیکھ کر دل میں کہا: انعام نے ایک بار ٹھیک کہا تھا کہ میں سائرہ
کو دوسری بار دیکھنا نہیں چاہوں گی۔ سائرہ کا ڈر! یہ ایسا کالا چہرہ لے
کر زندہ کیسے ہے؟ میں ہوتی تو ایسی صورت میں ایک پل زندہ
نہ رہتی۔ دنیا والوں کو ہنسنے کا موقع دینے سے پہلے خودکشی
کر لیتی۔

محفل میں لوگوں کو ہنستے دیکھ کر ٹیری نے پوچھا: "سائرہ!
بتاؤ یہ لوگ کیوں ہنس رہے ہیں؟"

وہ مسکرا کر بولی: "میں بچپن میں مائنڈ کر لیا کرتی تھی کیونکہ نادان
تھی۔ اب نہیں ہوں۔ میرے ساتھ جو قدرتی سچائی ہے، اُسے
میں خوش مزاجی سے تسلیم کرتی ہوں۔"

"تم اپنی خوش مزاجی رہنے دو اور اس حقیقت کو سمجھو کہ
دیکھنے والوں کے ذوقِ حسن کو ٹھیس پہنچاتی ہو۔ میں نے کئی بار
کوشش کی کہ تمہاری طرف نہ دیکھوں لیکن تم میرے اور انعام کے
سامنے ہی آتی جاتی رہتی ہو۔ یہاں تمہاری موجودگی ضروری
تو نہیں ہے۔"

"میں یہاں ڈیوٹی پر ہوں۔"

"میں تمہیں چھٹی دیتی ہوں۔ گھر جاؤ، کل صبح استعفیٰ بھیج دینا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ مجھے دیکھ دیکھ کر آپ کی آنکھیں
دکھ رہی ہیں۔ میں آپ کی خواہش ضرور پوری کر دیتی مگر آپ
کے میاں صاحب مجھے نہیں چھوڑیں گے۔"

"کیا تم ان پر جادو کرتی ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منہ پھیر کر چلی گئی۔ ٹیری
نے انعام کے پاس آ کر کہا: "لوگ تمہاری پرسنل سیکریٹری پر ہنس
رہے ہیں۔ میں تو شرم سے زمین میں گڑی جا رہی ہوں۔ اسے
اس تقریب میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ تمہارے لیے صرف سالگرہ کی تقریب ہے لیکن
سائرہ ایسی تقریبات میں بڑے افسران اور سیاسی حضرات
سے لین دین کے معاملات طے کرتی پھرتی ہے۔"

"کیا یہ [illegible] آنکھوں کے سامنے رہا کرتی ہے؟"

"تمہیں اس سے دشمنی کیا ہے؟"

"مجھے [illegible] ہے [illegible] تو اس کی بدصورتی پر
[illegible] دوسرے اس کا مزاج آسمان پر رہتا ہے۔ بات ایسے
[illegible] ہے جیسے اس محل کی [illegible] پر حکومت کر رہی ہو۔"
[illegible] انعام [illegible] وہ بڑے فاتحانہ انداز
میں [illegible] چلی گئی۔ [illegible] کے اعتماد و غرور کے پیچھے کوئی

تو بات ہو گی؟"

"پلیز ٹیری! تم دوسروں کی نہیں میری فکر کرو۔ میری زندگی
کو خطرہ لاحق ہونے میں صرف تین گھنٹے باقی ہیں۔ بارہ بجے کے بعد
میں اپنی انتقامی صلاحیتوں کے ذریعے زندہ رہا کروں گا۔ میرے
لیے سوچو کہ میری تنہائی دور کرنے کے لیے تم کیا کچھ کر سکتی ہو؟"

وہ خاموشی سے اس کی صورت دیکھتے ہوئے سوچنے لگی: "جو
موت کے بالکل سامنے کھڑا ہوا اور چند سانسوں کی زندگی رہ گئی ہو،
ایسے شخص کی کیا حالت ہو گی۔ یہ کوئی دوسرا نہیں سمجھ پائے گا۔
ویسے انعام کا اندرونی خوف صاف ظاہر ہے۔ آج اس نے محفل میں
شراب نہیں پی ہے۔ ایک ملازم دوسرے ملازم سے کہہ رہا تھا۔
صاحب نے زندگی میں پہلی بار مغرب کی نماز پڑھی ہے۔ بیچارے
انعام کے پاس توبہ کے لیے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے بہت
تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔"

مجرانے کے بعد ٹی وی پر منشیات کے خلاف ایک دستاویزی
فلم دکھائی جا رہی تھی۔ تمام مہمان پی رہے تھے، کھا رہے تھے اور وہ
فلم دیکھ رہے تھے۔ سالگرہ کی دعوت میں شریک ہونے والے شہر
کے معززین، پولیس افسران، فلاحی اداروں سے تعلق رکھنے والے
سماجی خدمت گار اور زندگی کے مختلف شعبوں سے آنے والے
معززین شرفا سب ہی کسی نہ کسی طور ہیروئن کے دھندے میں
ملوث تھے۔

کوئی پوست کی کاشت کو قانون کی زد میں آنے سے
روکنے والا سرکاری افسر تھا۔ کوئی فیکٹری میں تیار ہونے والی
ہیروئن کا کوالٹی کنٹرولر تھا۔ ایسے باکمال سیاسی حکام اور انتظامیہ
کے سربراہ تھے جو اس زہر کو سرحد سے کشمیر کرتے تھے پھر پنجاب، بلوچستان
اور سندھ سے گزار کر کراچی اور بیرونی ممالک پہنچاتے تھے
اور اخبارات میں بیان دیتے تھے کہ منشیات فروشوں کو زہر پھیلانے
کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

وہ تمام لوگ ٹی وی پر فلم دیکھ رہے تھے۔ کچھ زیرِ لب مسکرا
رہے تھے۔ کچھ بے نیازی سے پینے میں مصروف تھے۔ دستاویزی
فلم کے ذریعے بتایا جا رہا تھا کہ منشیات کا [illegible] کس طرح پوری قوم کو
[illegible] بے حس اور بے غیرت بنا دیتا تھا۔ وہ ہیروئن کی
تباہ کاریوں سے پوری قوم کو آگاہ کر کے نیک کام کر رہے تھے۔ یہی
نیکی کرتے تھے اور بدی بھی کرتے تھے۔ چوری ان کا پیشہ تھا
ان کا فرض تھا۔

انعام دستاویزی فلم کے ایک منظر کو [illegible] دیکھ
رہا تھا۔ اس منظر میں ایک گھر کے دو جوان بیٹے [illegible] کے
ہو کر مر گئے تھے۔ اس کے بعد پورا گھر تباہ ہو گیا تھا۔ [illegible] جوانوں

کی موت دیکھ کر انعام کی سمجھ میں آرہا تھا کہ موت کیا ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ چالیس برس میں لوگوں کو طبعی اور حادثاتی موت مرتے دیکھ چکا تھا۔ اپنے کھیتوں اور فیکٹریوں سے سپلائی کی جانے والی ہیروئن کے ذریعے کتنے ہی لوگوں کے مرنے کی خبریں سنتا رہتا تھا لیکن اثر نہیں ہوتا تھا۔ پہلے اس سے اثر لینے کی کوئی بات نہیں تھی۔ موت تو ایک دن آنی ہے سب کو آنی ہے۔ مگر آج وہ نہیں چاہتا تھا کہ موت کا ایک دن جو معین ہوتا ہے، وہ آج ہو، کل ہو، اتنی جلدی ہو اور وہ اتنی جلدی مرنا نہیں چاہتا تھا۔

زندگی بہت خوب صورت ہے اور یہ زندگی بہت وفادار اور مخلص ہمسفر ہوتی ہے۔ ماں کے دودھ کی طرح آدمی کی آخری سانس تک ساتھ رہتی ہے۔ قدرت انسان کو طبعی موت دیتی ہے، حرام موت نہیں دیتی۔ یہ تو آدمی ہے جو آدمی کو حرام موت مارتا ہے۔ کبھی حادثات کے ذرائع پیدا کرتا ہے، کبھی جدید ترین ہتھیار ایجاد کرتا ہے اور کبھی منشیات کا زہر پھیلاتا ہے۔ جس طرح زندگی کو طول دینے کے لیے منشیات سے بچنا ضروری ہے اسی طرح انعام کے لیے تنہائی سے بچنا لازمی ہو گیا تھا۔

سالگرہ کی محفل تمام ہونے لگی۔ لوگ ایک ایک کر کے یوں جانے لگے جیسے مرنے والے کو تنہا چھوڑ کر جا رہے ہوں۔ آخر میں وہی ملازم رہ گئے جو صبح تک اس کی خواب گاہ کے دروازے پر حاضر رہنے والے تھے۔ اگر کیری باتھ روم جاتی اور خواب گاہ میں تنہا رہنے کا وقت آتا تو وہ دروازہ کھول کر کسی ملازم یا ملازمہ کو اندر بلا لیتا۔ صبح تک ڈیوٹی دینے والوں میں سائرہ بھی تھی۔ انعام نے کہا تھا: "تم اگر مناسب سمجھو تو کچھ عرصے تک میری کوٹھی میں مستقل دن رات رہو۔ میں اندر سے سہما ہوا ہوں۔ مجھے سہارا چاہیے۔ قابل اعتماد سہارا...."

رات کے ساڑھے گیارہ بجے وہ خواب گاہ کے اندر گیا۔ سائرہ دروازے کے باہر تھی اور کیری اندر۔ انعام ایزی چیئر پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔

کیری باریک سی نائٹی پہنتے ہوئے بولی: "کہاں کھوئے ہوئے ہو؟"

"ہاں؟" وہ چونک کر بولا۔ "تم نے کیا کہا؟"

"انعام، تم میری انسلٹ کر رہے ہو۔ میں اتنی دیر سے یہاں موجود ہوں اور تم نے میری ذرا تعریف نہیں کی۔ کیا یہ چار دن کی دلہن پرانی ہو گئی ہے یا بند دروازے کے باہر کوئی اور نظر آ رہی ہے؟"

مرزا غالب کے اشعار اور مصرعوں پر جہاں ہزاروں تضمینیں اور سیکڑوں پیروڈیاں لکھی گئی ہیں۔ وہیں بعض افراد نے یہ فن کاری بھی کی ہے کہ غالب ہی کی دو مختلف غزلوں یا اشعار سے مصرعے لے کر شعر بنائے ہیں لیکن کوئی شعر بے ربط نہیں ہوتا۔ مثلاً۔

نے ہاتھ باگ پہ ہے نہ پا ہے رکاب میں
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
کس کے دکھ کی دوا کرے کوئی

جان تم پر نثار کرتا ہوں
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ہو گئے مضمحل قویٰ غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

"پلیز شٹ اپ! میں بہت پریشان ہوں۔"

"خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ جب تک میں ساتھ ہوں اور کوئی بھی ملازم ایک آواز پر حاضر ہو سکتا ہے۔"

وہ بستر پر لیٹ کر انگڑائی لیتے ہوئے بولی: "پارٹی گھر کی اٹینڈ کرنی پڑی باہر کی۔ میں تھک چکی ہوں۔ ویسے بھی بہت رات ہو چکی ہے۔ بارہ بج رہے ہیں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔"

وہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹن ٹن کی آواز آرہی تھی۔ کوٹھی کے باہر نائٹ چوکیدار بارہ کا گھنٹا بجا رہا تھا۔ ٹن ٹن کی گونجتی ہوئی آواز کہہ رہی تھی: "زندگی کے چالیس برس پورے ہو چکے ہیں۔ آئندہ وہ اپنوں سے اور بیگانوں سے منافقت کی ایک ٹانگ، ٹانگ کر زندگی گزارتا رہے گا۔"

وہ سر جھکائے زیر لب کہہ رہا تھا: "اے اللہ! میری کیا مجال ہے کہ میں اپنی زندگی سے زیادہ جی سکوں۔ تو نے ہمیں مہلت دی

ہے۔ تو میرے لیے اور حوصلہ دیتا ہے' عمل کے لیے۔ یہ نصیب اچھا تو نے لکھا ہے کہ میں تنہائی کو ختم کر کے اپنے اندر بیگانے کو دن رات ہم نشیں بنا کر حیات کو طول دے سکتا ہوں۔ اس طرح سے قدرتی عمل میں کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔

"میں نے بہت غور کیا تو بات سمجھ میں آئی کہ مجھے انسان دوست بننا پڑے گا۔ اپنا مزاج بدلنا ہو گا۔ میں دوسروں کو کم تر سمجھتا تھا۔ اپنی تنہائی میں کسی حسینہ کو لاتا تھا پھر منہ کا مزہ بدلنے کے بعد اسے بھی دھتکار دیتا تھا۔ مگر اب خوب صورتی اور بد صورتی کا حساب جوڑنا پڑے گا۔ میرے لیے صرف وہی خوب صورت ہوگی، جو ہو گا جو تنہائی میں میری زندگی کی ضمانت دیتا رہے گا۔

"اور ایک بات جو سمجھ میں آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ تنہائی محبت سے دور ہوتی ہے۔ دولت سے ملازم حاصل کر کے میں انہیں ڈیوٹی پر لگا سکتا ہوں۔ مگر کتنے ملازم پوری ذمے داری اور وفاداری سے ڈیوٹی انجام دیں گے، اگر زلزلہ آ جائے یا سیلاب آ جائے تو سب اپنی اپنی یا اپنوں کی جان بچانے کے لیے بھاگ جائیں گے، میں تنہا رہ جاؤں گا۔"

اس نے سوچتے سوچتے سر اٹھا کر دیکھا۔ خیری سو چکی تھی۔ اس نے ہولے سے آواز دی۔ "کیا سو رہی ہو؟"

وہ بے خبر نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تھکن نے اسے سلا دیا تھا۔ یوں بھی وہ جسمانی فٹنس کے لیے رات کو جلدی سو تی تھی اور منہ اندھیرے اٹھ کر دوڑ لگاتی تھی اور یوگا کی مشقیں کرتی تھی۔

وہ اپنے معمول کے خلاف رات کو جاگ نہیں سکتی تھی۔ اس نے کہہ دیا تھا۔ "میں سو بھی جاؤں تو فرق نہیں پڑے گا۔ نیند میں زندہ رہوں گی اور تمہاری تنہائی دور کرنے کے لیے کسی بھی زندہ ہستی کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت میں سونے کے دوران بھی پوری کرتی رہوں گی۔"

وہ اپنی جگہ درست تھی۔ اس کے سامنے نیند میں سانس لے رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ عورت اندھی ہو تو دیکھ نہیں سکتی۔ خیری کی آنکھیں بند تھیں۔ ساتھی اگر گونگی ہو تو بول نہیں سکتی۔ خیری کے لب خاموش تھے۔ شریکِ حیات اگر بہری ہو تو سن نہیں سکتی۔ خیری کے کانوں تک انعام کی آواز پہنچ کر واپس آ رہی تھی۔ وہ سامنے تھی مگر نہیں تھی۔ وہ اپنی موجودگی سے موت کو ٹال رہی تھی مگر اپنے وجود سے زندگی کو نہیں بلا رہی تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک بڑے سائز کے ٹی وی کے پاس آیا۔ پھر اسے آن کیا۔ اسکرین پر بیڈ روم کے باہر ٹی وی لاؤنج کا منظر تھا۔ دو ملازم دروازے کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ ڈیوٹی دینے والوں کو سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ وہ چوبیس گھنٹے تک ایک ذرا نہ بیٹھیں۔ دروازے کے سامنے ٹہلتے رہا کریں۔ ان کا انچارج ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ چونکہ بیٹھا ہوا تھا اس لیے اونگھ رہا تھا۔

انعام نے چینل تبدیل کیا۔ اسکرین پر دوسرا کمرا نظر آیا۔ سائرہ ایک میز کے پیچھے بیٹھی کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ وہ مالک آن کے آہستگی سے بولا۔ "سائرہ!"

وہ فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "یس سر!"

"میں بہت پریشان ہوں۔"

"میں آپ کی پریشانی کو سمجھتی ہوں سر! حکم دیجیے میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"چار دیواری میں گھٹن سی ہو رہی ہے۔ میں لان میں ٹہلنا چاہتا ہوں۔"

"میں ابھی دیکھ کر آتی ہوں، سیکیورٹی والے کوٹھی کے اطراف موجود ہیں یا نہیں۔"

"میں ٹھیک دس منٹ بعد بیڈ روم سے باہر آؤں گا۔"

وہ کمرے سے باہر جا رہی تھی۔ اس نے چینل تبدیل کیا۔ سائرہ ٹی وی لاؤنج میں پہنچ کر انچارج کو جھنجوڑ کر سختی سے کہہ رہی تھی۔ "کیا تمہیں یہاں سونے کے لیے رکھا گیا ہے؟"

وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ عاجزی سے کہہ رہا تھا۔ "پتا نہیں کیسے آنکھ لگ گئی۔ اب ہوشیار رہوں گا۔"

"جب انچارج کی آنکھ لگ جائے اور اسے پتا نہ چلے تو ماتحتوں پر بھی ایسی غیر ذمے داری کا اثر پڑے گا۔ جاؤ چھٹی کرو۔ مہینے کی تنخواہ تمہارے گھر بھیج دی جائے گی۔"

وہ ہاتھ جوڑنے اور گڑگڑانے لگا۔ انعام نے ٹی وی آف کر دیا۔ وہ جانتا تھا سائرہ ان معاملات میں بہت سخت ہے۔ غیر ذمے داری یا کام چوری پسند نہیں کرتی ہے۔ وہ اس انچارج کو اب کوٹھی میں نہیں رہنے دے گی۔

وہ دس منٹ بعد کمرے سے باہر آیا۔ سائرہ سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ انچارج کی جگہ دوسرا ملازم ڈیوٹی پر آ گیا تھا۔ وہ سائرہ کے ساتھ چلتا ہوا لان میں آیا۔ سیکیورٹی گارڈز دور دور مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ سائرہ نے کہا۔ "آپ مضبوط قوتِ ارادی کے مالک ہیں پھر پریشان کیوں ہیں؟"

"سمجھ میں نہیں آتا میری قوتِ ارادی کو کیا ہو گیا ہے۔ میرے اندر یہ اندیشہ سر اٹھاتا ہے کہ کسی وقت بھی مالکی کی ضمانت ساتھ چھوڑ سکتی ہے۔ موت کسی وقت بھی دبوچ کر کہہ سکتی ہے کہ انسان تنہا آتا ہے اور ہزار انتظامات کے باوجود تنہا جاتا ہے۔"

وہ تھوڑی دیر تک شبنم آلود گھاس پر اس کے ساتھ چلتی رہی پھر بولی: "خدا کرے نجومیوں کی باتیں غلط اور مضحکہ خیز ہوں۔ آپ چالیس برس کے بعد بھی جی رہے ہیں۔ میرا ایمان کہتا ہے، آپ اس لیے جی رہے ہیں کہ کاتب تقدیر نے آپ کی لمبی عمر لکھی ہے۔"

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ مجھے تنہا رہنا چاہیے؟"

"میں یہ غلط مطلب لینے کو نہیں کہوں گی۔ ہم کسی جان لیوا بیماری میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ جان جا سکتی ہے علاج کراتے ہیں، دوائیں کھاتے ہیں اور جان لیوا مرض کو جان لینے سے روک دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ جان لیوا پیشین گوئی ہے۔ اگر کوئی ضروری نہیں کہ جان لے، مگر لے بھی سکتی ہے۔ احتیاط برتنے میں کیا حرج ہے۔ خطرہ چھوٹا ہو یا بڑا، صحیح ہو یا غلط اسے دور کرنے کی تدبیر آزماتے رہنا چاہیے لیکن زندگی حرام نہیں کرنا چاہیے۔"

"کیا میں اپنی زندگی حرام کر رہا ہوں؟"

"آپ صحیح وقت پر نہیں کھائیں گے۔ سونے کے وقت نہیں سوئیں گے، کام کے وقت کام نہیں کریں گے، صرف موت کا خوف کریں گے تو ایسی زندگی کا کیا فائدہ؟ ابھی میں چلتے چلتے آپ کے سامنے آپ سے پہلے مر سکتی ہوں۔ مگر میں موت سے خوف زدہ نہیں ہوں۔"

"میں یہ بات ہمیشہ سے جانتا آ رہا ہوں کہ موت کے خیال کو اپنے دماغ پر مسلط نہیں کرنا چاہیے۔ مگر میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا کہ یہ خیال کس طرح آپ ہی آپ مسلط ہونے لگا ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں۔ یہ تسلط رفتہ رفتہ کمزور پڑ جائے گا... ہمیں نئے مال کی ڈیلیوری کی بات کرنی چاہیے۔"

"کوئی کاروباری مسئلہ نہ چھیڑو۔ کسی طرح میرا دل بہلاؤ۔"

"آپ یہ بات اپنی دلہن سے کہیں۔"

"وہ سو رہی ہے۔ آج شادی کی پانچویں رات ہے۔ وہ سو رہی ہے اور تم جاگ رہی ہو۔"

"ملکہ سونے کے لیے اور کنیز جاگنے کی تنخواہ لینے کے لیے ہوتی ہے۔"

"تم گفتگو کی مٹھاس کو تلخی میں بدل دیتی ہو۔"

"ایسا نہ کریں کہ میں اپنی اوقات بھول جاؤں گی اور آپ اپنی حیثیت سے گر جائیں گے۔"

"میری حیثیت صرف اتنی ہے کہ میں سولی پر لٹکا ہوا ہوں۔"

"آپ زندگی کی بات کریں۔"

"ایک زندگی سو رہی ہے، دوسری زندگی زہر اگل رہی ہے، ایسے جینے سے موت اچھی ہے۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں ایسی دل چسپی سودائی گفتگو کر کے مجھے خوش فہمی میں مبتلا کر دیں گے؟"

وہ خاموش رہا۔ سائرہ بھی اپنی بات کا جواب سننا ضروری نہیں سمجھتی تھی۔ محل نما کوٹھی کے چاروں طرف باغ تھا۔ گویا وہ دونوں کوٹھی کا طواف کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ پائیں باغ میں کسی قدر تاریکی تھی۔ وہ تاریکی میں رُک گیا۔ سائرہ نے کہا: "ہمیں روشنی میں رُکنا چاہیے۔ میں نہیں چاہتی کہ لوگ میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کریں۔"

وہ بولا: "میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیسا فیصلہ؟"

"میں کسی کی رفاقت نہیں چاہوں گا۔ آؤ اندر چلتے ہیں۔ میں سب کو چھٹی دے دوں گا۔"

وہ جانے لگا تو وہ بولی: "میں نہیں جاؤں گی یہیں چلیے۔"

"تمہیں تاریکی میں رُکنا نہیں چاہیے۔ لوگ غلط رائے جو قائم کریں گے۔"

"آپ کام کی بات کریں۔ یہ اچانک کیا ہو گیا ہے؟ آپ تنہائی میں ساتھ رہنے والوں کی چھٹی کیوں کرنا چاہتے ہیں...؟"

"میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ دوسرے لفظوں میں کسی کی محتاجی نہیں چاہتا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ ابھی تو آپ موت سے خوف زدہ تھے؟"

"میری قوت ارادی واپس آ گئی ہے۔ مجھ سے اور کچھ نہ پوچھو۔ میری ایک بات کا جواب دو۔ کیا مرنے والے کی آخری خواہش پوری ہونی چاہیے؟"

"آپ نہیں مریں گے۔"

"کوئی دوسری بات نہ کرو، جواب دو، آخری خواہش پوری ہونی چاہیے یا خواہش کے ساتھ دم توڑ دینا چاہیے۔"

"مجرموں کی آخری خواہش پوری کی جاتی ہے۔ آپ تو ایک معزز انسان ہیں۔ خواہش ضرور پوری ہونی چاہیے۔"

وہ تاریکی میں اس لیے رُک گیا تھا کہ اس کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ خواہش کیسی ہی بُری ہو، وہ خوب صورت لگتی ہے۔ اسی لیے آدمی اسے پورا کرنے کے لیے مچلتا رہتا ہے۔

وہ جذباتی لہجے میں بولا: "میری آخری خواہش تم ہو۔ آؤ، میری دھڑکنوں سے لگ جاؤ۔"

وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ انعام نے کہا: "کیا تم مذاق سمجھ رہی

ہو۔ میں ابھی یہاں سے جا کر کسی کمرے میں تنہا بند ہو جاؤں گی۔ وہاں سے میری لاش باہر لائی جائے گی۔"

"مجھے یقین ہے آپ مذاق نہیں کر رہے ہیں۔ میں بھی وفاداری کی قسم کھا کر کہتی ہوں، آپ کے ساتھ اپنی بھی جان دے دوں گی لیکن ایک ملینہ خواہش پوری کر کے آپ کو آخری وقت گنہگار نہیں بناؤں گی۔"

یہ کہتے ہی وہ اس سے کترا کر جانے لگی۔ انعام دوڑ پڑا۔ پھر تیزی سے اس کے پیچھے جاتے ہوئے بولا "تم نے کتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔ تم واقعی بہت سمجھدار ہو۔ خدا کے لیے میری باتوں سے یہ نہ سمجھو کہ میں کس طرح تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ میں صرف تمہارے لیے، صرف تمہارے لیے تڑپتا ہوں۔"

وہ دروازے میں رک گئی۔ اپنا چہرہ سامنے کرتے ہوئے بولی "میرے پاس حسن نہیں ہے۔ صرف جوانی ہے جسے حاصل نہ کرنے کا غم آپ کو کھا رہا ہے۔ یہ غم اتنا شدید ہے کہ حسین لڑکی کے سامنے صرف مسکرا رہی اور میرے سامنے ہوس مسلط ہو رہی ہے۔"

"یہ غلط کہہ رہی ہو۔"

"آپ صحیح سمجھاویں۔ آپ میرے لیے اتنے ہی بے چین ہیں تو مجھ سے شادی کر لیں۔"

"آں؟ یہ۔۔ یہ۔۔ ابھی ممکن نہیں ہے ابھی تو میں نے ایک شادی کی ہے۔ اتنی جلدی دوسری شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں مناسب موقع دیکھ کر تمہیں شریک حیات بناؤں گا۔"

وہ خوش ہو کر بولی "آپ نے یہ کہہ کر مجھے خوش نصیب بنا دیا ہے۔ پہلے رات زیادہ ہو گئی ہے۔ اب آپ کو سو جانا چاہیے۔"

وہ کسی طرح ہاتھ نہیں لگ رہی تھی۔ اسے غصہ آ گیا۔ ایک دم سے بگڑ کر بولا "تم بہت چالاک بنتی ہو۔ میرا اخلاق ہوا اور مجھ پر اعتماد نہیں کرتی ہو۔ کیا میں تمہیں دھوکا دوں گا؟"

"ایسی ہی باتیں آپ پہلے بھی کر چکے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔ دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر چلی گئی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اچانک خوف طاری ہوا کہ تنہا رہ گیا ہے۔ اس نے دور تک نظریں دوڑائیں۔ سیکیورٹی افسر اس کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے دل ہی دل میں گالیاں دیں "ذلیل! کمینی! اپنی اوقات بھول جاتی ہے۔ چڑیل کی صورت لے کر سوسائٹی میں بیگم انعام اللہ کہلانا چاہتی ہے۔ میں اس کے سامنے تجھے خاک میں ملا دوں گا۔ مجھے ضد ہو گئی ہے۔ میں اس کو تنگے جیسی لڑکی کی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دوں گا۔"

وہ سیکیورٹی افسر کے ساتھ کوٹھی کے اندر آیا۔ پھر اسے جانے کی اجازت دے کر بیڈروم میں آ گیا۔ دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ نیری گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے ٹی وی آن کر کے دیکھا۔ سائرہ اپنے کمرے میں سر جھکائے ہوئے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اسے روتے دیکھ کر انعام کو ایسی تشفی ہوئی جیسے کسی کو جوتے مار کر ہوتی ہے۔

وہ ٹی وی کو آف کر کے بیڈ پر آیا۔ پھر حسن و شباب کی سانس لیتی ہوئی مورت کے پاس لیٹ گیا۔ نیری نیند کی حالت میں اور زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ وہ کروٹ بدل کر قریب ہو گیا۔

اس نے منہ پھیر کر دوسری طرف کروٹ بدلی۔ انعام کو غصہ آ گیا "جسے دیکھو وہی نخرے دکھاتا ہے۔ کسی کو ہمدردی نہیں ہے کہ میں موت کے پہلو میں سانسیں لے رہا ہوں۔"

"موت؟" وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نیری کی بے حسی نے پھر موت کی یاد دلا دی تھی۔ وہ تقریباً دو گھنٹے سے زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی کو بھولا ہوا تھا۔ "وہ کمینی سنڈر کی بچی بہت اچھی ہے۔ سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ صرف اپنی ذات کو ذہن پر مسلط کر دیتی ہے۔ وہ کالی یقیناً کوئی کالا جادو جانتی ہے۔"

وہ گوری کے پاس بیٹھ کر کالی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حسین سے پیار کر رہا تھا، کمین سے نفرت کر رہا تھا۔ اس کے پاس بیٹھا بیٹھا اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ عجیب دو عملی کیفیات سے دوچار ہو رہا تھا۔

دوسرے دن نیری نے کہا "میں نہیں جانتی تم رات کو جاگتے رہے تھے یا سوتے رہے تھے۔ ہاں ایک بات جانتی ہوں، نہ سونے سے موت آتی ہے نہ جاگنے سے موت بھاگتی ہے۔ تم نے حفاظتی تدابیر کی ہیں اس لیے زندہ ہو۔ آئندہ بھی زندہ ہی رہو گے۔ لہٰذا رات کو وقت پر سو جایا کرو۔ مجھے نیند کے وقت بور نہ کیا کرو۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا "میں اپنے قبیلے کی کسی لڑکی سے شادی کرتا تو وہ اپنی نیند کی نہیں میرے جذبات کی قدر کرتی۔"

"کیا مجھ سے شادی کر کے پچھتا رہے ہو؟"

"رات کو پچھتاتا ہوں۔ دن کو دنیا والوں کے سامنے تمہیں جیت لینے کا فخر حاصل کرتا ہوں۔"

انگلستان میں انتخابات کا دور دورہ تھا۔ جگہ جگہ انتخابی جلسے ہو رہے تھے۔ کنزرویٹو اور لیبر پارٹی میں سخت مقابلہ تھا۔ ایک حلقے میں کنزرویٹو کا بڑا زور تھا۔ ان کا جلسہ بہت کامیاب رہا۔ کچھ دنوں بعد اسی جگہ لیبر پارٹی نے جلسہ کیا لیکن لوگوں نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ لیبر پارٹی کا ایک پرجوش مقرر اپنی آتش بیانی سے حاضرین میں جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن جب ناکام رہا تو اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے حاضرین سے کہا۔

"حاضرین! میرا خیال ہے کہ اس جلسے میں کوئی کنزرویٹو موجود ہے۔"

ایک بوڑھا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں ارشاد! میں ہوں کنزرویٹو۔ فرمائیے کیا فرماتے ہیں؟"

لیبر پارٹی کے مقرر نے دریافت کیا۔ "میں پوچھتا ہوں آپ کنزرویٹو کیوں ہیں؟"

بوڑھے نے جواب دیا۔ "میں اس لیے کنزرویٹو ہوں کہ میرا باپ کنزرویٹو تھا، میرا دادا کنزرویٹو تھا، میرے اسلاف کنزرویٹو تھے۔"

لیبر مقرر نے جھنجھلا کر سوال کیا۔ "لیکن اگر آپ کے باپ دادا چور اُچکے ہوتے یا ڈاکو ہوتے تو؟"

بوڑھے نے جواب دیا۔ "تب پھر شاید لیبر پارٹی میں ہوتا۔"

[illegible]

وہ جلنے لگی۔ دنیا والے رشک کرتے ہوں گے کہ چاندی جیسی کھنکتی ہوئی جنسی انعام اللہ کی جیب میں رہتی ہے۔ اسے وہ جب چاہتا ہے خرچ کرتا رہتا ہے۔ در اصل سمجھنے والے وہ نہیں سمجھتے جو پانے والے سمجھتے ہیں کہ پا لینے کے بعد بھی بہت کچھ پانے کے لیے رہ جاتا ہے۔ وہ آسودگی نہیں ملتی جس کی تلاش میں انسان ازل سے بھٹک رہا ہے۔ حسن ضرورت سے کم ہو تو تشنگی رہتی ہے۔ بھوک ضرورت سے زیادہ مٹائی جائے تو بدہضمی ہو جاتی ہے۔ نہ کم ہو، نہ زیادہ ہو۔ آدمی اعتدال پسند ہو تو وقتی طور پر آسودگی ملتی ہے۔ اس کے بعد خیال آتا ہے کوئی پیاس رہ گئی ہے۔ تیری کا حسن گیلے صابن کی طرح پھسل پھسل جاتا ہے۔ اسی لیے وہ آسودہ نہیں کرتی تھی۔ سائرہ کی ضرورت سے جتنا انکار کرو وہ اتنی ہی ضروری ہوتی جاتی تھی۔ مگر کمبخت اپنی ذات سے آسودگی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اسی طرح چالیس برس کی زندگی نے آسودہ نہیں کیا۔ وہ اور جینا چاہتا تھا۔ اور جی کر آسودگی کا سراغ لگانا چاہتا تھا۔

تیری نے پوچھا۔ "بمبئی کب چل رہے ہو؟"

"چلیں گے۔ جلدی کیا ہے؟"

"واہ جلدی کیوں نہیں ہے۔ پہلی فلم شروع کرنی ہے۔ کہانی لکھنے والوں کو بٹھانا ہے۔ سبجیکٹ ڈسکس کرنا ہے۔ گانوں کی سچویشن نکال کر میوزک ڈائریکٹر کو سائن کرنا ہے۔ پتا ہے، بھارتی ہیرو کتنے مصروف رہتے ہیں۔ آج ایگریمنٹ کرو تو دو سال بعد شوٹنگ کی تاریخ دیتے ہیں۔ میں تو امیتابھ بچن کو سائن کروں گی۔"

"ریکھا کے ساتھ اس کا اسکینڈل چل رہا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی افواہ اُڑے گی تو میں کسی کو منہ نہیں دکھا سکوں گا۔"

"ان فلمی ہتھکنڈوں کو تم نہیں سمجھتے ہو۔ امیتابھ، جیتندر، راجیش کھنہ اور دھرمیندر جیسے سپر اسٹارز کے ساتھ میرا اسکینڈل چلے گا تو میں فلم ریلیز ہونے سے پہلے ہی مارکیٹ پر چھا جاؤں گی۔ ہندوستان کے ہر ڈرائنگ روم میں بحران کی طرح ہر پرچے میں میری تصویریں ہوا کریں گی۔"

"تم اپنے فلمی ہتھکنڈوں کو رہنے دو۔ میں اپنے وعدے کے مطابق تمہاری چار فلمیں بناؤں گا۔ اور وہ فلمیں میری مرضی کے مطابق بنیں گی۔ کسی بھی فلم میں تم نیکر پہن کر سمندر میں نہیں نہاؤ گی۔ کوئی ہیرو تمہیں سینے سے نہیں لگائے گا۔"

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ "بکواس مت کرو۔ فلم اور حقیقی زندگی میں فرق ہوتا ہے اور پھر ہندوستان میں ان باتوں کی بہت آزادی ہے۔"

"وہاں کا سنسر بورڈ ہیروئن کو آزادی دیتا ہے۔ مگر میں اپنی بیوی کو آزادی نہیں دے سکتا۔"

"دیکھو انعام! تم زبان سے پھر رہے ہو۔"

"میں نے جو زبان دی ہے اُسے پورا کروں گا۔ ہماری فلموں میں کوئی نیا ہیرو ہوگا اور وہ مسلمان ہوگا۔ یہ مت بھولو کہ تم پاکستان میں پیدا ہو کر آئی ہو۔ کسی ہندو سپر اسٹار کے ساتھ تمہارا اسکینڈل چلے گا تو پاکستانی قوم میرا قیمہ بنا دے گی۔"

"تم ہندوستانی اور پاکستانی قوم کو بیچ میں کیوں لا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ میں ہندوستان میں فلمیں بناؤں اور

پاکستان میں عزت وآبرو سے زندہ رہنا ہے۔"

"میری زبان نہ کھلواؤ۔ ہندوستانی فلمیں اتنی فحش اور بے ہودہ نہیں ہوتیں جتنا تمہارا سیروئن کا کاروبار ہوتا ہے۔ پھر تمہاری قوم تمہیں زندہ کیوں چھوڑ رہی ہے؟"

"اس لیے کہ اس دھندے کے ساتھ نہ میرا نام آتا ہے اور نہ میری تصویر کبھی شائع ہوتی ہے۔ تمہاری تصویریں شائع ہوا کریں گی اور تمہارے ساتھ میرا نام بھی آیا کرے گا۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے کہ تم شوہر کی حیثیت سے اپنی پبلسٹی کراؤ۔ میں فلم انڈسٹری میں کنواری کہلاؤں گی۔ میرا نام ثمیری الحامد اللہ سیس میں مادیہ ہوگا۔"

"میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ چار فلمیں میری مرضی سے بنیں گی۔ یہ فلمیں بزنس کریں گی تو میں مزید سرمایہ لگاؤں گا۔ ورنہ تم شریف عورتوں کی طرح گھر میں زندگی گزارو گی۔ منظور ہے تو میں بھی چلوں گا۔ ورنہ تم طلاق لے کر جا سکتی ہو۔"

اس نے گھور کر اس کو دیکھا۔ جب نظریں ملیں تو منہ پھیر کر ٹہلنے لگی۔ سوچنے لگی بری طرح پھنس گئی ہوں۔ اس دلدل سے نقصان اٹھائے بغیر نکلنا ہوگا۔ میں اس کی کروڑوں اور اربوں کی جائداد نہیں چھوڑوں گی اور چار فلمیں بھی بنواؤں گی۔ ابھی غصہ دکھانے سے کام بگڑ جائے گا۔ اسے بمبئی لے جا کر گھیر لوں گی۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے پاس آکر بیٹھ گئی۔ پھر نرمی سے بولی "میں خواہ مخواہ بحث کر رہی ہوں۔ تم کسی بھی بزنس کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہو۔ کروڑوں روپے تمہارے خرچ ہوں گے۔ تم اپنا نفع نقصان سمجھو گے۔ میں تو اپنے سماجی جذبوں کی تسکین کروں گی۔"

"یہ ہوئی عقلمندی کی بات۔ کل اس وقت ہم بمبئی میں ہوں گے۔ اب میرے ذاتی مسئلے پر بات ہو جائے۔ ایک فلم کئی مہینوں میں تیار ہوگی۔ میں شوٹنگ اور ریہرسل وغیرہ میں دن رات تمہارے ساتھ نہیں رہ سکوں گا۔ دوسرے لفظوں میں تم مصروف رہا کروگی تو میری تنہائی کیسے دور ہوگی؟"

"تم ایک اور لیڈی سیکرٹری اور دو باڈی گارڈز رکھ لو۔ بلکہ ایک درجن باڈی گارڈز کی ڈیوٹی بدلتے رہا کرو۔"

"کیا تنخواہ پر کام کرنے والے محافظ کسی برے وقت میں ساتھ دیں گے۔ مجھے ایسی ہستی کی ضرورت ہے جس پر میں اعتماد کر سکوں۔"

"تمہیں اندھا اعتماد کس پر ہے؟"

"صرف سائرہ پر۔"

وہ بھڑک کر بولی۔ "اوہ نو۔ فار گاڈ سیک اسے میرے ساتھ ہندوستان نہ لے جانا! میں اسے ایک منٹ برداشت نہیں کروں گی۔"

"وہ یہ ملک چھوڑ کر نہیں جا سکے گی۔ میری عدم موجودگی میں وہی یہاں کے اہم اور پیچیدہ معاملات کو سنبھالتی ہے۔ مجھے فیصلہ کرنا ہے کہ کاروبار اہم ہے یا میری زندگی۔ اگر زندگی اہم ہے تو وہ دُنیا کے ہر حصے میں میرے ساتھ رہے گی۔"

"اُسے اتنی اہمیت دیتے ہو اسی لیے وہ اتراتی ہے۔ اگر وہ بمبئی میں تمہارے ساتھ رہے گی تو میری انسلٹ ہوگی۔ لوگ باتیں بنائیں گے کہ تم اسے حسین بیوی پر ترجیح دے رہے ہو۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ثمیری نے کہا "تم ایک نہیں چار حسین اور تیز سیکرٹریز رکھ لو۔ میں اعتراض نہیں کروں گی۔ ابھی یہ نہ سوچو کہ کون قابل اعتماد ہے۔ انہیں رفتہ رفتہ پرکھتے رہو۔ اتنی بڑی دُنیا میں ایک سائرہ ہی وفادار نہیں ہے۔ برے وقت پر ساتھ دینے والے بہت مل جائیں گے۔"

بات معقول تھی۔ وہ دوسرے دن روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے سائرہ سے کہا "تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ میں ایک طویل عرصے کے لیے بمبئی جا رہا ہوں۔ تمہیں مجھ سے نجات مل رہی ہے۔"

سائرہ نے پریشان ہو کر کہا "آپ سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں کسی وقت بھی ملازمت چھوڑ سکتی ہوں۔ مگر میں آپ کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ آپ کے ساتھ دن رات رہنا چاہتی ہوں۔"

"تعجب ہے کل رات تم نے انکار کیا اور آج ایسی باتیں کر رہی ہو۔"

وہ سخت لہجے میں بولی "میں آپ سے عشق نہیں کر رہی ہوں۔ آپ کی جان بچانا چاہتی ہوں۔ آپ کی زندگی کو طول دینا چاہتی ہوں۔ پردیس میں کون آپ کا خیال رکھے گا؟ کوئی ڈیوٹی کے وقت سے زیادہ آپ کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔"

"میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کوئی ساتھ نہیں دے گا۔ کل رات میں نے غصے سے کہا "دور ہو جاؤ میری نظروں سے" اور تم دور ہو گئیں۔ کیا اسی طرح ساتھ دیا جاتا ہے؟"

"میں آپ سے جب بھی کوئی بات کرتی ہوں آپ اس بات کو ہوس کا رنگ دے دیتے ہیں۔ آخر آپ میری توہین کیوں کرتے ہیں؟ میں ایک بہت اہم مشورہ دینا چاہتی ہوں۔ کیا آپ سنجیدگی سے توجہ دیں گے؟"

"اچھی بات ہے میں سنجیدہ ہوں۔"

"خدا آپ کو لمبی عمر دے۔ ویسے زندگی کا کوئی بھروسا

نہیں ہے۔ آپ کل سے نماز پڑھ رہے ہیں، خدا کو یاد کرتے ہیں۔ بھٹکے ہاتھوں بندوں کو بھی یاد کریں۔ پاکستانی قوم کو ہیروئن سے نجات دلائیں۔ یہ اتنی بڑی نیکی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے تمام گناہوں کو معاف کر دے گا۔"

"یہ میرے دل کی بات کہہ رہی ہو۔ میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نیکی کمانا چاہتا ہوں۔ اپنے تمام پچھلے گناہوں کو معاف کرانا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں تم کیا مشورہ دیتی ہو؟"

وہ بولی: "امریکا اور پاکستان کی طرف سے مشترکہ اعلان ہوا ہے کہ جو اپنے پوست کے کھیتوں کو جلائے گا اور وہاں اناج اگائے گا، امریکا اس کے نقصانات پورے کرے گا۔ اُسے زرعی اور صنعتی شعبوں میں ہر طرح کی سہولتیں اور سرمایہ فراہم کرے گا۔ میرا مشورہ ہے آپ اپنے کھیتوں کو جلانے کا اعلان کریں۔ آپ ابتدا کریں گے تو دوسرے بھی آپ کے نقش قدم پر چلیں گے۔ یہاں سے منشیات کی لعنت ختم ہو جائے گی۔"

"سارہ! یہ لعنت تمہاری باتوں اور میرے ارادوں سے ختم نہیں ہوگی۔ اس میں بس پردہ دنیا کے بہت سے لوگ ہیں۔ ان سب کے مفادات شامل ہیں اس کاروبار میں۔ نہ بھی چاہوں تو یہ کام کرنے پر مجبور رہوں اور اگر میں نہ کروں گا تو کوئی اور کرے گا یہ کام۔"

"دوسروں کو کرنے دیں۔ آپ یہ کام نہ کریں... پلیز۔"

حاکم نے غصے میں دانت پیس کر کہا: "میں کھیتوں کو جلا کر کنگال ہو جاؤں گا۔ میری زندگی اور چالیس برس کی ہوگی۔ تم نے ٹھیک کہا۔ کاروبار ہو نیکی کرنے، نشے سے توبہ کرنے اور اپنے گناہ معاف کرانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنا دھندا چوپٹ کر دوں۔ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟ نیکی لازمی ہے تو میں پہلے سے بہت زیادہ نیک کام کروں گا۔ یہ کوٹھی کے سامنے جو بڑا سا میدان ہے، یہاں روزانہ چالیس من کھانا پکا کرے گا۔ غریبوں کے لیے لنگر عام ہو گا۔ مسجدوں اور مدرسوں کی تعمیر کے لیے فنڈ مقرر کر دوں گا۔ دینی اور نیک کاموں کے بہتیرے راستے ہیں۔ میں تمام راستوں پر چلوں گا مگر اپنا گھر جلا کر خدا کی ناشکری نہیں کروں گا۔ کیوں کہ کھیت اُسی کے ہیں۔ محنت کسانوں کی ہے مگر پوست کے دانے اس کی مرضی سے ہرے ہیں۔ یہ جو چالیس برس کے بعد مجھے نافل سانسیں مل رہی ہیں، یہ بھی وہی دے رہا ہے۔ اور یہ جو تم سے گفتگو کر رہا ہوں، اسی کی دی ہوئی ذہانت سے کر رہا ہوں۔ آج کے بعد کسی سرمایہ دار کو اس کے کاروبار میں آگ لگانے کا مشورہ کبھی نہ دینا۔"

"سر! میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ انسان کیا شے ہے۔ گناہ بھی کرتا رہتا ہے اور خدا کے پاس جانے سے ڈرتا بھی رہتا ہے۔

مجھ سے بھول ہوئی، آئندہ مشورہ نہیں دوں گی۔ صرف آپ کی زندگی کے لیے دعا کروں گی۔"

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ٹی وی لاؤنج میں رات کی ڈیوٹی دینے اور اس کی تنہائی دور کرنے والے موجود تھے۔ وہ اپنے بیڈروم کے سامنے آیا۔ اندر جانے سے پہلے دروازہ کھول کر دیکھا۔ کیری نہیں تھی۔ وہ تنہا خواب گاہ میں جانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے آواز دی: "کیری!" پھر جواب کا انتظار کیا۔ پیچھے گھوم کر دیکھا۔ لاؤنج میں ملازم موجود تھے۔ گھبرانے کی بات نہیں تھی۔ اس نے پھر دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا۔ بھلا کیری کہاں جا سکتی تھی۔ باتھ روم کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اندر شاور سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ چونکہ صبح ہی بمبئی کے لیے روانہ ہونا تھا اس لیے وہ ابھی غسل کر رہی تھی۔

وہ مطمئن ہو گیا۔ اندر آ کر دروازے کو بند کر دیا۔ آہستہ آہستہ باتھ روم کے دروازے پر پہنچ کر بولا: "آ جاؤں؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے کہا: "شاور تو بند کر دو۔ اس کے شور میں میری آواز تم نہیں سن رہی ہو یا پھر تمہارا جواب میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہا ہے۔ ویسے میں آ جاتا ہوں۔ اب ہمارے درمیان کوئی پردہ تو رہا نہیں ہے۔"

اس نے دروازے کو کھول کر ذرا سا جھانکا۔ بے اختیار خوف سے چیخ نکل گئی۔ وہ باتھ روم میں نہیں تھی۔ یعنی وہ بند کمرے میں تنہا تھا۔

پشین گوئی کے مطابق موت کا وقت آ گیا تھا۔ اس نے بیڈروم کے بند دروازے کی طرف دوڑ لگائی۔ مگر دو قدم پر ہی لڑکھڑا کر اوندھے منہ فرش پر گر پڑا۔ موت اسی طرح پہلے جھپٹتی ہے پھر اوپر اُٹھا لیتی ہے۔ وہ پورے یقین سے سمجھ رہا تھا کہ موت آ گئی ہے۔ اب اسے پشین گوئی کی حقیقت کو سمجھنے اور کلمہ پڑھنے کی مہلت مل رہی ہے۔

اس نے پہلا کلمہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا شروع کیا تاکہ مسافت کچھ لمبی ہو جائے۔ پڑھنے کے دوران دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔ کیوں کہ اٹھنے اور پیروں پر کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اسے پہلی بار پتا چلا کہ پہلا کلمہ مختصر ہوتا ہے۔ چونکہ دوسرے کلمے میں شہادت یعنی گواہی ہے اس لیے اسے پڑھتے ہوئے دروازے تک پہنچنے کا وقت مل جائے گا۔ مگر افسوس! ابھی ایک سے دوسرا کلمہ پڑھا ہو تو یاد رہے۔ وہ پڑھتے پڑھتے اٹک گیا پھر سے پڑھا پھر اٹک گیا۔ جب ڈوبنے والا ہاتھ پاؤں مار کر بھی تیر نہیں سکتا تو مدد کے لیے پکارتا ہے۔ مصیبت کے وقت کوئی اپنی دینی تربیت کے مطابق خدا کو پکارتا ہے۔ کوئی دودھ اور خون کے اثر سے ماں کو یا باپ کو آواز دیتا ہے۔ انعام نے بے اختیار چیخ کر کہا: "سائرہ!"

بند کمرے میں آواز گونجنے لگی: "سائرہ... رہ... رہ..."

سائرہ نے جواب دیا: "میں آپ کے قریب ہوں۔"

وہ چونک کر آس پاس دیکھنے لگا۔ وہ بولی: "آپ تنہا نہیں ہیں۔ جب تک میری سانس چل رہی ہے آپ کو تنہائی کا شکار نہیں ہونے دوں گی۔"

انعام نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اپنے کمرے سے روشندان کے ذریعے جھانک رہی تھی۔ موت کے فرشتے کو بتا رہی تھی کہ اس کا وجود ادھر بھی ہے ادھر بھی ہے۔ شاید اسی لیے موت کا فرشتہ آیا ہوگا مگر موت نہیں لایا ہوگا۔

وہ روشندان کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا: "سائرہ! وہیں رہنا۔ وہاں سے نہ ہٹنا۔ میں زندہ ہوں۔ مجھے زندہ رکھنا۔ وہاں سے نہ ہٹنا۔ مجھے دروازہ کھول کر باہر جانے دو۔ جب تک تمہارے پاس نہ آؤں وہیں موجود رہنا..."

وہ ہانپتے کانپتے اٹھ کھڑا ہوا۔ آگے بڑھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ سائرہ اسے ہمدردی سے دیکھ رہی تھی۔ اس پر ترس آ رہا تھا۔ وہ دروازے تک پہنچ ہی گیا تھا۔ اس نے اندرونی لاک ہٹا کر ایک جھٹکے سے دروازے کو کھولا۔ سامنے ثمیری کھڑی ہوئی تھی۔ وہ غصے سے گرجتے ہوئے بولا: "کہاں مر گئی تھی؟ مجھے کمرے میں تنہا مرنے کے لیے چھوڑ کر کہاں گئی تھی؟ کس سے پوچھ کر گئی تھی؟ مجھے بتایا کیوں نہیں کہ کمرا خالی ہے۔ تو میری دشمن ہے۔ میری جان کی دشمن ہے۔"

وہ ہذیانی انداز میں بول رہا تھا۔ اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ ثمیری خوف کے مارے چیخ رہی تھی: "چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔ میری کوئی غلطی نہیں ہے۔ تم سائرہ کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سوچا اتنی دیر میں پھول توڑ کر لے آؤں گی۔"

اس نے میدی ٹوکری میں ڈھیر سارے گلاب دکھائے۔

وہ پھر جھنجھوڑ کر بولا: "کیا میری میت کو ان گلابوں سے سجانا چاہتی تھی؟"

وہ خود کو چھڑا کر کمرے میں جاتے ہوئے بولی: "موت کے خوف سے پاگل ہو گئے ہو۔ کیا تم نے دیکھا نہیں؟ باتھ روم کا نل کھلا ہوا ہے۔ میں ٹب بھرنے کے انتظار میں باغ تک گئی تھی۔ تم نے دیکھا ہے کہ میں پانی میں گلاب کی پتیاں ڈال کر غسل کرتی ہوں۔ یہ روز کا معمول ہے۔ میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا ہے۔"

انعام نے کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ لاؤنج کے ملازموں کے علاوہ سیکیورٹی گارڈز بھی آ گئے تھے۔ ثمیری نے کہا: "اب تماشا نہ بناؤ۔ اندر آ جاؤ۔"

اسے اپنی غلطی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے باتھ روم میں کسی کی موجودگی کی تصدیق کیے بغیر خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ خود کو تنہا کرنے میں اپنا ہاتھ تھا۔ "اوہ خدایا! اگر سائرہ نہ ہوتی تو؟"

اس نے ناگواری سے ثمیری کو دیکھا۔ تیزی سے چلتا ہوا دوسرے دروازے پر آیا پھر اسے کھول کر سائرہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ روشندان کے پاس سے اترتے ہوئے بولی: "میں نے اس کھڑکی کے پاس سے آپ کی بیگم کو باغ میں دیکھ لیا تھا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہیں آپ تنہا کمرے میں نہ چلے جائیں۔ میں فوراً ہی میز اور کرسی کو دیوار سے لگا کر روشندان تک پہنچ گئی۔"

انعام نے اچانک ہی ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ اسے دونوں بازوؤں میں بھر کر بولا: "میں موت سے ڈرتا ہوں لیکن تم پر مرتا ہوں۔ تم نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے اور کسی کی نہیں۔"

وہ بول رہا تھا اور کالے رنگ کو سمیٹ رہا تھا۔ ایک بات کہتا تھا پھر سیاہی کو چومتا تھا۔ کبھی کالک کو آنکھوں سے لگاتا تھا کبھی کالک پر اپنا چہرہ رکھتا تھا۔ وہ کالی تھی تو کیا ہوا، محاورے کے مطابق منہ کالا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی دیوانگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی، مچل رہی تھی۔ بدنامی کے ڈر سے دھیمی آواز میں کہہ رہی تھی: "خدا کے لیے چھوڑ دیں۔ میرے پاس یہی ایک عزت ہے اور کچھ نہیں ہے۔ میری وفاداری کی اتنی بڑی سزا نہ دیں۔ خدا کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔"

روشندان سے ثمیری کی آواز آئی: "انعام! چھوڑ دو اسے۔"

اس نے چھوڑ دیا۔ پھر سائرہ کے قریب ہی کھڑا رہا۔ وہ لباس درست کر رہی تھی۔ بکھری ہوئی زلفوں کو سمیٹ رہی تھی۔ ثمیری

نظر نہیں آرہی تھی مگر اس کا دھیما سرد لہجہ سنائی دے رہا تھا۔ "تم نے ایک ملازمہ کو ہاتھ لگا کر میری سلطنت کی ہے۔ اگر کوئی ملازم یہاں آکر دیکھ لیتا تو میں کسی سے آنکھ نہیں ملا پاتی۔ تمہارا کوئی معیار ہے یا نہیں؟"

وہ ہانپتے ہوئے بولا "پہلے نہیں تھا۔ اب بنے اور کچھ سنو گی؟"

کیری کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ جلدی سے بولی "نہیں، آگے کچھ نہیں کہنا۔ تمہاری پسند میری پسند ہے۔ آج سے میں بھی سائرہ کی عزت کروں گی۔ آؤ کمرے میں آجاؤ۔ میں اکیلی ہوں۔"

اس نے بجھی بجھی نظروں سے سائرہ کو دیکھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ اسے ذرا سا کھول کر لاؤنج میں دیکھا۔ دو ملازم ایک دوسرے سے کچھ کہہ کر ہنس رہے تھے۔ انعام طیش میں آگیا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس پر انہیں ہنسی آرہی ہے۔ وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر آیا۔ ہنسنے والے فوراً چپ ہو گئے۔ اس نے غرا کر پوچھا "کس بات پر ہنس رہے تھے؟"

دونوں سر جھکائے کھڑے رہے۔ انعام تیزی سے چلتا ہوا سیکیورٹی افسر کے پاس آیا۔ پھر اس کے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر دونوں کو نشانے پر رکھتے ہوئے بولا "میں دوسری بار پوچھ رہا ہوں۔ تیسری بار نہیں پوچھوں گا۔ گولی مار دوں گا۔ میرے دھندے میں لاشوں کو غائب کر دینا معمولی سی بات ہوتی ہے۔ بولو کیوں ہنس رہے تھے؟"

ایک نے دوسرے کی طرف اشارہ کر کے کہا "جناب! یہ کہہ رہا تھا آپ عورت سے بچوں کی طرح ڈرتے ہیں۔"

دوسرے نے کہا "یہ جھوٹ کہتا ہے جناب! یہ بات اس نے خود کہی تھی اور الزام مجھے دے رہا ہے۔"

انعام نے کہا "بات کسی نے بھی کہی ہو۔ ہنسی دونوں کو آرہی تھی۔"

دونوں کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ وہ سہم کر ریوالور کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے کہا "جب تک موت کا یقین نہیں ہوتا، آدمی ہنستا رہتا ہے۔ میں قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد دو گولیاں چلیں گی اور تم دونوں مر جاؤ گے۔ سامنے دیوار کی گھڑی کو دیکھ لو۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگے "رحم کیجیے صاحب! ہم سے ہنسنے کی پہلی غلطی ہوئی ہے۔ پھر کبھی یہ غلطی نہیں کریں گے۔ بلکہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جائیں گے۔"

"میرے ہاں آنا ممکن ہے، جانا ممکن نہیں ہے۔ آج تک پولیس والوں کو میری کوٹھی سے کسی کی لاش نہیں ملی۔ تمہاری بھی نہیں ملے گی۔ ایک منٹ گزر گیا تو دو منٹ رہ گئے ہیں۔"

ایک نے گھبرا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ پھر چیخ کر کہا "یہ ظلم ہے۔ آپ کو ہماری جان لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ پھر کبھی نہیں آؤں گا۔"

وہ وہاں سے بھاگ کر جان بچانا چاہتا تھا۔ انعام نے ٹھائیں سے گولی چلا دی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ پھر ٹانگ پکڑ کر تکلیف سے کراہنے لگا۔ گولی ایک ٹانگ کو زخمی کرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اس نے کہا "اب ایک ٹانگ سے جا سکتے ہو تو بھاگو۔"

دوسرے کا خون خشک ہو رہا تھا۔ وہ گھٹنے ٹیک کر معافی مانگ رہا تھا۔ انعام کی لمبی عمر کے لیے دعا کر رہا تھا۔ انعام نے کہا "میں بھی کسی وقت مر سکتا ہوں۔ میری زندگی کے لیے یہ شرط ہے کہ تنہا نہ رہوں۔ تنہائی دور کرنے کے لیے تم لوگوں کا محتاج رہوں۔ اسی طرح میں تم دونوں کی زندگی کے لیے یہ شرط رکھتا ہوں کہ تیرہ منٹ کی زندگی میں بچوں کی طرح تماشا کرتے رہو۔ ایک سیکنڈ کے لیے چپ نہ رہو۔ اگر بچوں جیسی حرکتیں کرنے

"تمہاری زندگی کے اب صرف تین منٹ رہ گئے ہیں مسٹر طلعت!" پرائیویٹ ہسپتال کی نرس نے مریض کو بتایا۔

"کیا تم میرے لیے کچھ کر سکتی ہو سسٹر؟" مریض نے پُرامید نگاہوں سے نرس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ میں اس مختصر سے وقت میں تمہارا بل تیار کر سکتی ہوں۔" نرس نے اطمینان سے جواب دیا۔

میں کامیاب رہ گئے تو تم میں سے کسی کو گولی نہیں ماروں گا۔"

وہ فوراً ہی بچوں کی طرح رونے لگے اور طرح طرح کی حرکتیں کرنے لگے۔ میری اور سائرہ اپنے کمرے سے نکل آئی تھیں۔ تمام گارڈز سہمے کھڑے ہوئے تھے۔ انعام نے کہا: "دیکھو! کچھ دیر پہلے یہ اس بات پر ہنس رہے تھے کہ میں بچوں کی طرح موت سے ڈر رہا تھا۔ اب یہ موت سے ڈر کر بچوں کی طرح حرکتیں کر رہے ہیں۔ چپ ہو جاؤ گدھے کے بچو!"

وہ دونوں چپ ہو گئے۔ اس نے کہا: "ابھی پندرہ منٹ پورے نہیں ہوئے ہیں۔ میری دوسری شرط یہ ہے کہ تم دونوں مجھ پر حملہ کر کے یہ ریوالور چھین لو۔"

وہ دونوں بری طرح دہشت زدہ تھے۔ تھوک نگل کر ریوالور کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے کہا: "بچنے کی یہی صورت ہے۔ میرے ہاتھ سے ریوالور چھین لو گے تو زندگی مل جائے گی۔ مگر یہاں تک پہنچنے سے پہلے دو گولیاں چل جائیں گی۔ خوب سنبھل کر آنا۔"

ان میں سے ایک بری طرح خوف زدہ تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ نہیں پا رہا تھا۔ دوسرا ملازم ریوالور پر نظریں جمائے آہستگی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک قدم آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ انعام کی انگلی ٹریگر پر آتے دیکھ کر ٹھہر گیا۔ وہ منہ کے بل فرش پر گر پڑا۔ انعام نے کہا: "اسے کہتے ہیں موت کی دہشت۔ میں بھی اسی طرح اوندھے منہ گر پڑا تھا۔ دروازہ چند قدم کے فاصلے پر تھا اور میں اٹھ کر نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے موت نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی ہے یا کان پر ہتھیار رکھ لیا ہے یا میری شہ رگ کو چٹکی میں دبا لیا ہے۔ اور اب یہ تم اور تم کتے کے بچو ہنستے ہو۔ جینے کی خواہش نے اور موت کے خوف نے مجھے تماشا بنا دیا ہے اور تم نمک حرامو! ہنستے ہو۔ ہنسو۔"

اس نے دونوں کی طرف ریوالور کھینچ کر مارا پھر پاؤں پٹختا ہوا اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ میری نے اندر آ کر دروازے کو بند کیا۔ پھر اس کے پاس آ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی: "تم نے اچھا کیا انہیں گولی نہیں ماری۔ مگر ان کے ساتھ سب کو یہ سمجھا دیا کہ موت کا وقت مقرر ہو جائے تو وہ کس طرح حواس پر چھا جاتی ہے۔"

وہ گردن میں بانہیں ڈال کر بولی: "پھر بھی انعام! تمہیں ہوش میں رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تم سائرہ کے ساتھ بھی زیادتی کر رہے تھے۔ اس پر اب تمہیں شرمندہ ہونا چاہیے کیونکہ ابھی تم ہوش میں ہو۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا: "صرف شرمندہ ہونے سے بات نہیں بنے گی۔ وہ بہت وفادار لڑکی ہے۔ میں نے جو غلطی کی اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ ورنہ وہ ملازمت چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اس کے جانے سے مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔"

"اگر وہ جانا چاہے تو اسے کیسے روکو گے؟"

"میں ایک وفادار ملازم سے اس کی شادی کرا دوں گا۔ وہ ملازم مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گا اور سائرہ اپنے شوہر کی پابند رہے گی۔ اس طرح میری ملازمت کرتی رہے گی۔"

"یہ تم نے خوب سوچا ہے۔ اس کی جلد ہی شادی کر دو۔ یہ شادی جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔"

"میں دو چار دن میں اسے سہاگن بنا کر اس کے پاؤں میں زنجیریں پہنا کر بھی آؤں گا۔ کل تم تنہا جاؤ اور میرے آنے تک رائٹرز سے کہانیاں سن کر کسی اچھی کہانی کا انتخاب کرو۔"

"بہتر ہے، کہانی کا انتخاب کر دوں گی۔ اچھا، ابھی غسل کر کے آتی ہوں۔"

وہ گلابی کے اندر سے غسل کرنے چلی گئی۔ باتھ روم کے دروازے کو کھلا رکھا تاکہ وہ بیڈ روم میں تنہا نہ رہے۔ وہ سوچ رہا تھا کبھی کبھی تنہائی بھی مقدر بن جاتی ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جو کسی کو ہمیشہ ہم جلیس بنائے رکھتا ہو۔ چند لمحوں کے لیے بھی کسی کا ساتھ ضرور چھوٹتا ہے اور تنہائی کے وہ لمحے ہی موت کا بہانہ بن سکتے ہیں۔

دوسری صبح میری کی تسلی ہو گئی۔ انعام نے فون پر اپنے خاص ماتحت سے رابطہ قائم کیا پھر کہا: "آج رات بڑی رازداری سے سائرہ کا نکاح پڑھایا جائے گا۔ یہ بات سائرہ کو بھی معلوم نہ ہو۔ یہ شادی حفاظتی وجوہ سے ہو گی۔ ہمارے صرف قابلِ اعتماد بندے اس میں شریک ہوں گے۔"

اس نے پھر ریسیور رکھ کر سیکیورٹی افسر کو بلایا جو اس کے بیڈ روم میں تنہائی دور کرنے کے لیے کھڑا ہوا تھا۔ وہ پاس آ کر بولا: "میں تم پر اعتماد کرتا ہوں۔ ایک بہت ضروری شاپنگ کرنا چاہتا ہوں۔"

سائرہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ وہ اس کے لیے پیغام چھوڑ کر چلا گیا۔ شام کو واپس آیا تو وہ انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی پریشان ہو کر بولی: "آپ صرف ایک سیکیورٹی افسر کے ساتھ کہاں گئے تھے؟ اگر اس افسر کو حادثہ پیش آ جاتا یا وہ کسی طرح مر جاتا تو آپ تنہا رہ جاتے۔"

"سائرہ! رفتہ رفتہ تنہائی کا خوف کم ہوتا جائے گا۔ میں اعصاب کو مضبوط بنا رہا ہوں۔ میری پوری شخصیت اور بااختیار عمل کا اطمینان رہتا ہے کہ ایک ساتھی کا ساتھ چھوٹ جانے کا تو کوئی اثر نہ

نہیں پڑے گا۔ البتہ گھر میں اور رات کو بیڈ روم میں خوف آتا ہے۔"

"آج وہ لازماً آپ کے بیڈ روم میں رات بھر جاگتے رہیں گے۔"

"رات ہونے والی ہے۔ آؤ ذرا گھوم پھر آئیں۔"

وہ اس کا جواب سنے بغیر جانے لگا۔ وہ پیچھے آتے ہوئے بولی: "میں آپ کے ساتھ اکیلی نہیں جاؤں گی۔"

"مجھ سے ڈر لگتا ہے؟"

"نہیں مجھے اپنے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ میں آپ کے خیال سے کہہ رہی ہوں۔ دو چار باڈی گارڈز کو آپ کے ساتھ رہنا چاہیے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے باہر آ گئے۔ سیکیورٹی افسر اسٹیئرنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کسی حد تک مطمئن ہو گئی۔ کلفٹن کے بنگلے تک کچھ خاص لوگوں کو دیکھ کر اور اطمینان ہوا۔ وہ اسے ایک کمرے میں لے کر آیا۔ وہاں بستر پر دلہن کا سرخ جوڑا، چوڑیاں اور زیورات رکھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا: "انھیں پہن لو۔ ابھی ہمارا نکاح پڑھایا جائے گا۔"

وہ ایک دم سے چونک کر شدید حیرانی سے بولی: "ہمارا نکاح!"

"تمھیں حیرانی کیوں ہے؟"

"اس لیے ہے کہ کل سے آپ پوری طرح ہوش میں نہیں ہیں۔ کل میرے پاس آ کر جذبات میں بہک رہے تھے۔ یہ شادی کا فیصلہ بھی جذباتی ہو سکتا ہے۔"

"میں تم سے شریعت کے مطابق نکاح پڑھوا رہا ہوں۔ یہ تمھارے اطمینان کے لیے کافی نہیں ہے؟"

وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے نکاح نامے پر دولہا کی حیثیت سے اپنا نام لکھوایا تو سب کو حیرانی ہوئی لیکن کسی کو ایک لفظ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے کہا: "میں حیرانی کا سبب جانتا ہوں۔ ایک حسین ترین عورت سے شادی کرنے کے بعد ایک نہایت بدصورت لڑکی سے شادی کر رہا ہوں۔ ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ میں خود نہیں جانتا۔ تم سب میرے [illegible] ہو پھر بھی وارننگ دیتا ہوں اپنے سائے سے بھی اس شادی کا ذکر نہ کرنا۔ کسی کی زبان کھلے گی تو اسے میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

نکاح اور زیارت کو زمانے چھپنے کا مکمل [illegible] تھا۔ اس نے ناچ گانے کی بھی اجازت دی تھی۔ حجرے کے لیے ایک ہال الگ کر دیا گیا تھا تاکہ جشن بھی منایا جائے اور گارڈز صبح تک ڈیوٹی بھی ادا کرتے رہیں۔

وہ خواب گاہ میں آیا۔ سائرہ گھونگھٹ میں چھپی بیٹھی تھی۔ ہر لڑکی کے دل میں ایسی رات کا ارمان ہوتا ہے اور جب یہ رات آتی ہے تو وہ دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتی ہوئی دلہا کے قدموں کی آہٹ سنتی ہے اور سمجھتی ہے کہ آنے والا اس سے پیار بھری باتیں کرے گا اور گھونگھٹ اٹھا کر اس کی خوب تعریفیں کرے گا۔

اس نے آتے ہی خواب گاہ کی تمام بتیاں بجھا دیں۔ پھر گھونگھٹ کھینچ کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا: "یہ ٹھیک ہے۔ اب تم نظر نہیں آتی ہو۔"

سائرہ کے دل پر زبردست گھونسا لگا۔ سینے سے ہائے نکلی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی کو دیکھنے لگی۔ اندھیرا اچانک ہی اس پر چھا گیا تھا۔ اسے کچھ کہے سنے بغیر اپنی من مانی کر رہا تھا۔ نکاح کے دو بول سے آتے ہی ایک مختار بنا رہا تھا۔ اب وہ ایسا نہیں چھڑا سکتی تھی۔ اپنی انا کو قیمتی سرمایہ سمجھ کر اور عزت کو آخری پونجی کہہ کر اسے حیا کی تجوری میں چھپا نہیں سکتی تھی۔ جو ہو رہا تھا اور آئندہ جو ہونے والا تھا اس کے لیے وہ چپ چاپ خود کو جبراً تیار کر رہی تھی۔ یوں بھی اپنے برے مقدر کو ہر حال میں برداشت کرنے کے لیے حوصلہ پیدا کرنا ہی پڑتا ہے۔

پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ سائرہ کو صدیاں گزرتی لگ رہی تھیں۔ طوفان کتنا ہی شدید ہو آخر کار گزر ہی جاتا ہے۔ وہ ہانپتے ہوئے بولا: "اگر پہلے ہی میری بات مان لیتی تو کون سا دل ٹوٹ رہا تھا؟ کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی؟"

اس نے ایک ہاتھ مارا۔ تاریکی میں اندازے سے صحیح نشانہ لگا۔ نئی دلہن کے گال پر تڑاخ کی آواز ابھری۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی بدنصیبی کے بدترین لمحات میں بھی ایسا نہیں سوچ سکتی تھی جیسا کہ اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس نے چوٹی کو پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھینچا۔ وہ کھنچتی ہوئی آغوش میں چلی گئی۔ اس نے اسی طرح دبوچ کر کہا: "اب نخرے دکھا۔ اپنا بھاؤ بتا۔ ذلیل عورت! ایک موتی کی طرح سیپ میں بند ہو گئی تھی۔ میرے لیے پاسبان بن گئی تھی۔ مجھے بے چین کر دیا تھا۔ سوتے جاگتے، کھاتے پیتے اور قیمتی سے قیمتی چیز خریدتے وقت یہ ناکامی

جوتے کی طرح اتنی تھی کہ میں تجھے خرید نہیں سکتا۔ طاقت سے حاصل نہیں کر سکتا۔ اور محبت تو کبھی کر ہی نہیں سکتا۔ تو نے مجھے عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔"

اس نے دھکا دیا۔ وہ بستر پر ایک طرف اُلٹ گئی چونکہ وہ قریب تھے اس لیے اندھیرے میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر ہیں۔ وہ اس کی پیٹھ پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے بولا "تو ڈری نہیں۔ تو اتنی وفادار کیوں ہے؟ مجھے پاگل کیوں بناتی ہے؟ ہر دوسرے تیسرے دن لاکھوں روپے آتے ہیں۔ تو نہیں لیتی اور یہ بڑی مصیبت ہے۔ بیرونی ممالک کے بینکوں میں [illegible] میرے نام سے اکاؤنٹس ہیں۔ میرے جاسوسوں نے اچھی طرح چھان بین کی ہے۔ تیرا کوئی [illegible] نہیں ہے۔ تیرا [illegible] دار دوست [illegible] نہیں [illegible] ہے۔ چڑیل [illegible] تیرے لیے [illegible] ہے [illegible] تیری کسی کمزوری سے کھیل نہیں سکتا۔ لیکن میں [illegible] سے کھیل رہا تو کیا چیز ہے [illegible] اور تیری [illegible] کی بسی کرنے کے لیے تم نے شادی کر لی ہے۔ تو کیسی پارسا تھی بڑی پارسا بنتی تھی۔ میں تیری پارسائی کا جوتا تیرے سر پر مار رہا ہوں۔"

وہ جوتے مارنے لگا اور کہنے لگا "کل رات میرے دل میں یہ بات آئی کہ میں تجھ سے متاثر ہو رہا ہوں اور تیرا دیوانہ بن گیا ہوں۔ یہ دیوانگی کم کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ میں تیری خوب پٹائی کرتا رہوں۔ روز تجھے لات جوتے مارتا رہوں گا تو دل کی بھڑاس نکلتی رہے گی۔"

اس نے ایک لات ماری۔ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ اتنی دیر سے وہ کچھ نہیں بول رہی تھی۔ مار کھا کر تکلیف کے باعث کراہتی تھی پھر چپ ہو جاتی تھی۔ حالانکہ بہت تیز طرار تھی۔ اصول پرست تھی۔ کوئی غلط بات برداشت نہیں کرتی تھی۔ اسلام نے پہلی بار ہاتھ بڑھایا تھا تو وہ ملازمت چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ آج حالات یہ ہو گئے تھے کہ مار کھاتے ہوئے بھی اس کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی۔

وہ جھنجھلا کر بستر سے اٹھ گیا۔ زیرو پاور کی دھیمی لائٹ آن کر کے بولا "تو مجھے شرمندہ کر رہی ہے۔ لات جوتے کھا کر بھی ثابت کر رہی ہے کہ ہر حال میں وفادار رہے گی۔ میرا ہر ظلم برداشت کرتی رہے گی۔ مجھے نہیں چاہیے تیری محبت اور وفاداری..."

وہ پاؤں پٹختا ہوا باتھ روم کی طرف جانے لگا۔ وہ ایک دم سے اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے پیچھے دوڑ کر جانے لگی۔ اس نے باتھ روم میں پہنچتے ہی دروازہ بند کرنا چاہا۔ وہ چیخ کر بولی "رک جائیے"

وہ اتنی دور تھی کہ فوراً ہی اندر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ ہاتھ دروازے اور چوکھٹ کے درمیان آ گیا۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولی "مجھے اندر آنے دیجیے۔"

اس نے حقارت سے کہا "اتنی حسین نہیں ہے کہ یہاں تیز روشنی میں تیری صورت دیکھوں گا۔ ہاتھ ہٹا لے ورنہ..."

وہ تڑپ کر بولی "نہیں ہٹاؤں گی۔ دروازہ بند ہو گا تو آپ تنہا ہو جائیں گے۔"

اسلام کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ غصے میں سوت کو بھول گیا تھا۔ اب دروازے پر سے ہاتھ ہٹ گیا تھا۔ وہ اجڑی ہوئی دلہن تیز روشنی میں سر سے پاؤں تک دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایک رخسار پر انگلیوں کے نشانات دور سے نظر آ رہے تھے۔ تھپڑ پڑنے سے نتھ نے اسے زخمی کر دیا تھا۔ ناک کے پاس لہو کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے وحشت اور درندگی میں نتھ بھی نہیں اتاری تھی۔ اسے نوچنے کھسوٹنے لگا تھا۔ وہ اسے دیکھتا ہوا اور سوچتا ہوا آہستہ آہستہ قریب آیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر نتھ اتارنے لگا تو سائرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس نے نتھ اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ پھر کانوں سے جھمکے اتار دیے۔ گلے سے ہار الگ کیا۔ پھر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس پر جھک گیا۔ اسے اپنی دھڑکنوں سے لگاتا رہا۔ پھر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر بولا "میں اچھی طرح دیکھنا چاہتا ہوں کہ زندگی کا چہرہ کتنا پرکشش ہوتا ہے۔"

وہ باتھ روم سے نکل کر بیڈ روم میں آیا۔ سوئچ بورڈ کے پاس رک کر تمام لائٹس روشن کر دیے۔ اسے بازوؤں میں اٹھائے دوسری دیوار کے سوئچ بورڈ کے پاس آیا۔ تمام ٹیوب لائٹس آن کر دیں۔ کمرے میں روشنی کا جہاں جہاں سامان تھا، وہ وہاں وہاں اسے اٹھائے گھوم رہا تھا۔

ممبئی ائیرپورٹ پر سمیر نے دیکھتے ہی شکایت کی "بڑے سات دن بعد آئے ہو۔ کہاں رہ گئے تھے؟ کیا سائرہ کی شادی ہو گئی؟"

"ہو گئی۔ اسی لیے تو دیر سے آیا ہوں۔"

"اس کی شادی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"تعلق بہت گہرا ہے۔ وہ میری [illegible] رہی تھی۔ میں اپنا کاروبار سنبھال رہا تھا۔ [illegible] وہ [illegible] واپس آئی ہے تو

بحث یہ بھی ہے کہ تم بیوی بن کر نہ رہنا چاہو یا میں تمہیں طلاق دینا چاہوں تب بھی تمہاری چار فلموں میں سرمایہ لگاؤں گا۔"

"میں طلاق لینے کی حماقت نہیں کروں گی۔ میرے خیال میں ایک راستہ ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا جب تم کسی طرح راضی نہیں ہوگے تو تمہیں اس راستے پر چلاؤں گی۔ ایسی تدبیر بتاؤں گی کہ جس پر تم عمل کرو گے تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔"

"تدبیر بتاؤ۔"

"دیکھو تم چاہتے ہو کوئی ہیرو یا غیر مرد مجھے سینے سے نہ لگائے اور میں تمہاری غیرت کو تسلیم کرتی ہوں۔ اس لیے شوٹنگ اسٹاف کے سامنے تم مجھے سینے سے لگایا کرو گے۔"

"کیا تمہارا مطلب ہے مجھے فلم کا ہیرو بننا چاہیے؟"

"تمہارے جیسا سنجیدہ اور اکھڑ مزاج آدمی ہیرو نہیں بن سکتا مگر ہیرو کی ڈمی بن سکتا ہے۔ جس طرح فائٹنگ کے سین میں پیشہ ور فائٹر ہیرو کی ڈمی بن کر فضا میں قلابازیاں کھاتے ہیں، پہاڑوں سے گرنے اور ریل کی چھت سے چھلانگ لگانے کے خطرناک سین پکچرائز کراتے ہیں اسی طرح جس شاٹ میں مجھے سینے سے لگانے اور مجھ سے لپٹنے چمٹنے کا معاملہ ہوگا، اس شاٹ میں تم ہیرو کی ڈمی کے طور پر میرے ساتھ رہنا۔ کہو کیا خیال ہے؟"

"مجھے تو بہلانے والا آئیڈیا ہے۔ میں ڈمی بن جاؤں گا لیکن فلم دیکھنے والے تو یہی سمجھیں گے کہ ہیرو میری بیوی کے حسن و شباب سے کھیل رہا ہے۔"

"تم ہر بات میں کیڑے نکالتے ہو۔ ایسے تو بات نہیں بنے گی۔"

"بنے گی۔ تمہارا جو دل چاہتا ہے کرو۔ میں اولاد کے لیے دوسری شادی کر لوں گا۔"

"ہرگز نہیں۔ تمہارے بچے میں ہی پیدا کروں گی۔"

"تو پھر کرو۔"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد پھر سامنے بیٹھ کر بولی۔ "ہم بہر حال میں فلم شروع کریں گے اور ابھی میاں بیوی ہونے کا اعلان نہیں کریں گے۔ جب کبھی میرے پاؤں بھاری ہوں گے، ماں بننے کے آثار پیدا ہوں گے تو میں فلموں کا کام چھوڑ دوں گی پھر ہم پاکستان چلے جائیں گے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "یہ تم نے دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے۔ اب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلاؤ اپنے فلمی رائٹر کو۔"

اس روز فلم سازی کی ابتدا ہوئی۔ پھر وہ دن رات مصروف رہنے لگے۔ وہ معروف اسٹوری رائٹر، سپر ہٹ فلموں کے ہدایت کار اور موسیقار کی خدمات حاصل کر رہے تھے۔ بمبئی فلم انڈسٹری کی مشہور شخصیات سے ملاقات کر رہے تھے۔ کبھی انہیں اپنے ہاں مدعو کرتے تھے، کبھی ان کے ہاں تقریبات میں مہمان خصوصی بن کر جاتے تھے۔ اتنی مصروفیات کے باعث موت کا خوف کم سے کم ہوتا چلا گیا تھا۔ صرف اتنا یاد رہتا تھا کہ اسے تنہا نہیں رہنا چاہیے۔

وہ ہفتے میں ایک دو دن کے لیے کراچی جاتا تھا یا لندن، پیرس، یا فرینکفرٹ پہنچ جاتا تھا۔ جہاں جاتا تھا وہاں طے شدہ پروگرام کے مطابق سالگرہ پہنچ جاتی تھی۔ اس کے ساتھ دن رات گزارتی تھی پھر کراچی واپس پہنچ جاتی تھی۔ یوں دن ہفتے اور مہینے گزرنے لگے۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ چونکہ بہت بڑے بجٹ کی فلم تھی اس لیے بہت زیادہ رکاوٹیں پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ چاندی کے جوتے مارنے سے ہر کام ہو جاتا تھا۔ فلم دس مہینے میں مکمل ہو گئی۔ اس کی ڈبنگ ایڈیٹنگ اور بیک گراؤنڈ میوزک میں چار مہینے لگ گئے یعنی ایک برس دو ماہ میں پہلی فلم مکمل ہو گئی۔

اس فلم نے بی کلاس بزنس کیا۔ نہ نقصان ہوا نہ فائدہ لیکن ٹیری کو بہت فائدہ پہنچا۔ اس نے جس طرح بے لگام ہو کر اپنے جسم کی نمائش کی تھی اس کے نتیجے میں اس کی بڑی بڑی رنگین تصاویر شائع ہو رہی تھیں۔ اردو، ہندی اور انگریزی رسالوں میں اس کی ہوش ربا تصویروں کے ساتھ تعریفیں شائع ہوتی تھیں۔ بڑے فلم ساز اور ہدایت کار اسے اپنی فلموں میں آفر دے رہے تھے۔ بیرونی ممالک میں رہائش اختیار کرنے والے ہندوستانی کروڑ پتی اور عرب پتی اس سے ملنے کے خواہش مند تھے۔ انعام نے کہا۔ "میری ٹیری! کئی رئیس تمہارے دیوانے ہو رہے ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

وہ منہ بنا کر بولی۔ "میں بے وفا نہیں ہوں۔ تمہارے سوا کسی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں نے دوسری فلم کے لیے اس بار چار رائٹرز کو بلایا ہے۔ پہلی کہانی کمزور تھی اس لیے فلم بی کلاس تھی۔"

وہ اسے اپنی طرف کھینچ کر بولا۔ "ہم نے ایک فلم پیدا کر لی۔ بچہ کب پیدا ہوگا؟"

"یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، میں انکار نہیں کر رہی ہوں۔ تمہاری ہر بات مان لیتی ہوں۔ بس اب فلم کی بات کرو۔"

دوسری فلم کی کاغذی تیاریاں ہونے لگیں۔ ٹیری بڑے بڑے ہدایت کاروں کی فلمیں سائن کرنا چاہتی تھی مگر انعام منع کر دیتا تھا۔ ٹیری کی ماں نے سمجھایا۔ "بیٹی! نادانی کر رہی ہو۔ اب تمہارے لیے عرب پتی سرمایہ داروں کی کمی نہیں ہے۔ تم جسے چاہو انگلیوں پر نچا سکتی ہو۔ انعام سے آزادی حاصل کر کے بڑی بڑی فلمیں سائن کر سکتی ہو۔ کیوں اس کمبخت سے چپکی ہوئی ہو۔"

اس نے ماں کے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ "دنیا میں جتنے بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں انھیں اپنے کاروبار میں کبھی نفع ہوتا ہے، کبھی نقصان۔ صرف ہیروئن کا دھندا ایسا ہوتا ہے جس میں کبھی نقصان نہیں ہوتا۔ جس ملک میں منشیات فروشوں کو صرف جیل ہوتی ہے یا جرمانہ ہوتا ہے۔ اس ملک کے حکمران پس پردہ رہ کر سیاسی مفاد کے لیے اس دھندے کو فروغ دیتے ہیں۔ اس لیے انعام ایک ایسا رب پتی سرمایہ دار ہے جو کبھی دیوالیہ نہیں ہوگا۔ جس کے پاس ہمیشہ دولت بڑھتے رہنے کی ٹھوس ضمانت ہے۔ میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گی۔"

"بیٹی! تمھاری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ منشیات فروشوں کو جیل نہیں ہوگی یا جرمانہ نہیں ہوگا تو کیا پھانسی ہوگی؟"

"ہاں۔ ایسے کئی ممالک ہیں جہاں کوئی منشیات فروش پکڑا جائے تو اسے سزائے موت دی جاتی ہے۔ اسی لیے وہ ممالک منشیات کی لعنت سے محفوظ ہیں۔"

"انھیں جہنم میں جانے دو۔ تم ذرا عقل سے سوچو۔ اگر دوسری تیسری فلمیں فلاپ ہوں گی تو انڈسٹری میں تمھیں کوئی نہیں پوچھے گا۔ دوسری ہیروئنوں کی طرح جو پروڈیوسر اور ڈائریکٹر آجائے اسے لپک لو۔ جو سرمایہ دار ہاتھ پکڑنے آتا ہے اسے دیکھو۔ اگر تم کبھی ماں بننا چاہو گی تو انعام اپنی دولت اور اپنا کاروبار تمھارے نام کرے گا۔"

اس نے ماں کی باتیں ایک کان سے سنیں، دوسرے کان سے نکال دیں۔ دو سال بعد دوسری فلم بھی تیار ہو گئی۔ چھ ماہ بعد وہ ریلیز ہوئی اور بری طرح ناکام ہوئی۔ میری نے جھنجلا کر کہا۔ "تم فلمی کاروبار کو نہیں سمجھتے ہو۔ مجھے دوسری فلمیں سائن نہیں کرنے دیتے۔ فلم نگر کے بڑے بڑے لوگوں سے دشمنی مول لیتے ہو۔ ہماری فلم سخت زبردست تھی۔ لیکن انھوں نے ہمارے مقابلے میں امیتابھ، ونود کھنہ اور انیل کپور کی فلمیں لگا دیں۔ ان کے سامنے ہمارا ہیرو جھک مارتا رہ گیا۔"

وہ بولا۔ "کوئی بات نہیں، ایک برس میں ایک کروڑ ڈوب گئے۔ اُدھر میں نے چار مہینے میں چھ کروڑ کا مال سپلائی کیا ہے۔"

"تم اپنا منافع دیکھ رہے ہو۔ یہاں میری فلمی شہرت کا گراف نیچے جا رہا ہے۔"

"اسی لیے کہتا ہوں، میرا گھر سنبھالو۔ میرے کاروبار میں دلچسپی لو اور میرے بچے پیدا کرو۔ بتاؤ ہماری شادی کو ڈھائی برس گزر چکے ہیں۔"

"میں کیا کروں، بچہ میری مرضی سے ہوگا یا خدا کی مرضی سے۔"

"اگر میں تمھارا طبی معائنہ کراؤں تو خدا کی مرضی معلوم ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر بتائیں گے کہ تم ماں بن سکتی ہو یا قدرت تمھیں بانجھ رکھنا چاہتی ہے۔"

"اچھی بات ہے، میں ایک لیڈی ڈاکٹر سے معائنہ کراؤں گی۔"

وہ بولا۔ "میں نے لیڈی ڈاکٹر اینا شرما کی تعریفیں سنی ہیں۔ عورتوں کے معاملات میں اسے پچیس برس کا تجربہ ہے۔ اس سے وقت مقرر کرو۔ میں بھی چلوں گا۔"

اس نے فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا۔ دوسرے دن ڈاکٹر سے ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا۔ وہ کچھ پریشان ہو گئی تھی اور اپنی پریشانی انعام سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "معائنہ کل ہو جائے گا۔ پرسوں ہم چنبل کی گھاٹی میں جائیں گے۔ ہماری تیسری فلم کا ڈائریکٹر وہاں لوکیشن مارک کرنا چاہتا ہے۔ اسٹوری رائٹرز کو بھی لے جائیں گے۔ وہ اس علاقے کے مطابق کہانی لکھے گا۔"

"یہ چنبل کی گھاٹی کہاں ہے؟ کیا بائی ٹرین جانا ہوگا؟"

"وہاں ریل گاڑی نہیں جاتی ہے۔ بسوں اور دوسری گاڑیوں میں سفر کیا جاتا ہے۔ ہم ہیلی کاپٹر میں جائیں گے۔"

"تیسری فلم کے لیے جہاں کہو گی جاؤں گا۔ اگر لیڈی ڈاکٹر خوشخبری سنائے گی تو تمھارے لیے ایک ہیلی کاپٹر خرید لوں گا۔"

وہ خوش ہو کر گلے کا ہار بن گئی۔ دوسرے دن وقت مقررہ پر ڈاکٹر اینا شرما نے اس کا معائنہ کیا پھر پوچھا۔ "کیا تم پہلے بھی ماں بن چکی ہو؟"

"نہیں تو۔" اس نے گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "شادی کو ڈھائی برس ہو چکے ہیں۔ میرے میاں کو شبہ ہے کہ میں بانجھ ہوں۔"

"تم بانجھ نہیں ہو۔ میں پھر ایک بار پوچھ رہی ہوں کیا پہلے بھی ماں بن چکی ہو؟ دیکھو سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ اگر کوئی چھپانے کی بات ہو تو وکیل اور ڈاکٹر سے زیادہ کوئی رازدار نہیں ہوتا۔"

"آپ بضد کیوں ہیں۔ آپ کا معائنہ غلط ہو سکتا ہے۔"

"چلو تمھارے کہنے سے میں پچیس برس کے تجربات کو غلط کہہ دیتی ہوں۔ ویسے لیبارٹری ٹیسٹ اور الٹرا ساؤنڈ کا طریق کار کیسا رہے گا؟"

اس نے لیڈی ڈاکٹر کے ہاتھ کو جلدی سے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر پریشان ہو کر بولی۔ "میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ اگر آپ میری رازدار بن کر رہیں گی اور میری مرضی کے مطابق رپورٹ تیار کریں گی تو آپ کو منہ مانگی رقم دوں گی۔"

"پہلے رقم طے کرلو۔ معاملہ گمبھیر ہوگا تو پچاس ہزار لوں گی۔"

کیا بہت بڑا گھپلا ہے؟

"ہاں، میرا آدمی بچے چاہتا ہے اور میں اپنے جسمانی حسن کو غارت کرنا نہیں چاہتی۔ ڈھائی برس میں دو بار حمل ٹھہر گیا۔ میں نے دونوں بار اسقاط کرایا۔ آپ رپورٹ لکھ دیں کہ میں ماں بن سکتی ہوں۔ مگر اندر کچھ خرابی ہے۔ مسلسل علاج کرانا ہوگا۔ سال چھ ماہ بعد ماں بن سکوں گی۔"

"یعنی اور ایک برس ٹالنا چاہتی ہو۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"آپ میرا ساتھ دیتی رہیں گی تو میں اس کے بعد بھی کوئی نہ کوئی چکر چلاتی رہوں گی۔"

"میں پچاس ہزار لینے کے بعد ہی رپورٹ لکھوں گی۔"

"میں اپنے میاں کی موجودگی میں اتنی بڑی رقم نہیں لا سکتی تھی۔ اپنا پرس بھی ان کے پاس ویٹنگ روم میں چھوڑ کر آئی ہوں تاکہ انھیں کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ آپ میرے بعد جس مریضہ کو دیکھنے والی ہیں اس کا نام روزی ہے۔ وہ دراصل مریضہ نہیں ہے میری رازدار سہیلی ہے۔ میرے جاتے ہی وہ آئے گی اور پچاس ہزار ادا کر دے گی۔"

"تم بڑی زبردست پلاننگ کرتی ہو۔ کیا تمھیں یقین تھا کہ مجھے پچاس ہزار میں راضی کر لوگی؟"

"دولت جاتی ہے تو دکھ ہوتا ہے۔ آتی ہے تو بہت سے بگڑے کام بن جاتے ہیں۔ آپ شاید دو دن میں پچاس ہزار کماتی ہوں گی۔ آج کمانے ہی کے لیے بیٹھی ہیں۔ یہ پچاس ہزار آپ کو ایک منٹ میں مل رہے ہیں۔ پھر ایک عورت ہونے کے ناتے ایک عورت کے کام آ رہی ہیں۔ آپ نیکی کر رہی ہیں، کوئی جرم نہیں کر رہی ہیں۔"

وہ ڈاکٹر سے رخصت ہو کر ویٹنگ روم میں انعام کے پاس آ گئی۔ وہاں کئی عورتیں اپنی باری کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر کی سیکریٹری نے روزی کو اندر بلایا۔ اس نام کی ایک عورت اٹھ کر چیمبر میں چلی گئی۔ پھر دس منٹ میں ہی واپس آ کر کلینک سے باہر چلی گئی۔ سیکریٹری نے نیری کے ساتھ انعام کو بھی اندر جانے کے لیے کہا۔ وہ دونوں ڈاکٹر کے پاس آ کر میز کے دوسری طرف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے انعام سے کہا: "مسٹر! آپ کی بیوی ماں بن سکتی ہے۔ لیکن اندر کچھ خرابی ہے۔ اگر آپ علاج کراتے رہیں گے تو آپ کی مراد پوری ہو جائے گی۔ میں دوائیں لکھ دیتی ہوں۔ آپ انھیں ہر ہفتے چیک اپ کے لیے بھیج دیا کریں۔"

وہ نسخہ لکھتے ہوئے بولی: "کیا یہ آپ کی پہلی وائف ہیں۔ میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ آپ کی عمر زیادہ ہے۔"

"میں نے چالیس برس کی عمر میں شادی کی ہے۔ یہ میری پہلی وائف ہے۔"

"پھر تو آپ کو بھی معائنہ کرانا چاہیے۔ آپ بھی بانجھ ہو سکتے ہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا: "ہمارے خاندان میں مرد معائنہ نہیں کراتے۔ اولاد نہ ہو تو دوسری شادی کر لیتے ہیں۔"

"اگر دوسری سے بھی نہ ہو تو؟"

"تیسری کر لیتے ہیں، چوتھی کر لیتے ہیں۔ کسی نہ کسی سے اولاد ہو ہی جاتی ہے۔"

"اگر کسی سے نہ ہو تو؟"

"ایسا ہمارے خاندان میں کبھی نہیں ہوا۔ اولاد ضرور ہوتی ہے۔ اور جب ضرور ہوتی ہے تو میں آپ کی بات مان کر کیوں معائنہ کراؤں۔"

وہ نسخہ دیتے ہوئے بولی: "میں زبردستی نہیں کر رہی ہوں۔ یہ آپ میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ آپ ذرا باہر جائیں۔ میں انھیں دواؤں کے استعمال کا طریقہ بتاؤں گی۔"

وہ باہر چلا گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا: "تمھارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اپنے مرد کے پیچھے پڑ جاؤ۔ اس کا معائنہ ضرور کراؤ۔ اگر وہ بانجھ نکلا تو......"

نیری نے بات کاٹ کر کہا: "وہ بانجھ نہیں ہے۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں، دو بار ماں بنتے بنتے بچ گئی۔"

وہ مسکرا کر بولی: "کوئی ضروری تو نہیں کہ اسی کا بچہ ہو۔"

"او نو ڈاکٹر! میں ایسی نہیں ہوں۔ میں ان پر ہی اسپیل رہنا چاہتی ہوں۔ شوہر کو مجبوراً برداشت کرتی ہوں۔ کسی اور کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"پھر بھی تم اس کا معائنہ کراؤ۔ کسی دوسرے ڈاکٹر کو بھی پچاس ہزار دو گی تو وہ رپورٹ میں اُسے بانجھ لکھ دے گا۔"

"ہاں۔ یہ میں ضرور کروں گی۔"

وہ کلینک سے باہر آئی۔ انعام کے ساتھ کار میں بیٹھ کر معائنے والی بات چھیڑنا چاہتی تھی۔ مگر پچھلی سیٹ پر دو گارڈز بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے جھنجلا کر کہا: "جب میں ساتھ ہوتی ہوں تو گارڈز کو ساتھ کیوں لے جاتے ہو۔ میں جب بھی ذاتی معاملات پر گفتگو کرنا چاہتی ہوں، وہ آس پاس موجود رہتے ہیں۔"

"کیا تم نہیں چاہتیں کہ میں زیادہ سے زیادہ محفوظ رہوں؟"

"دن کے وقت راستوں میں، بازاروں میں کبھی تنہا نہیں رہو گے۔ میں ہر قدم پر ساتھ رہتی ہوں تو گارڈز کو ساتھ کیوں رکھتے ہو۔ کل یوں بھی پہلی کار میں زیادہ گنجائش نہیں ہوگی۔ میں ہوں، تم ہو، ڈرائیور اور ڈائریکٹر بھی ہوں گے۔ ہم میں سے کوئی تمھیں تنہا نہیں چھوڑے گا۔ پلیز اپنے ساتھ کوئی گارڈ نہ لے جانا۔"

اس کا حسن و شباب ہی تو پرکشش تھا۔ اس پر ہوشربا اداؤں نے انعام کے ارادے بدل دیے۔ وہ باہر تجربہ کار عورت جب قسم کھا لیتی ہے تو مرد کو اپنی جگہ سے ایک انچ ہلنے نہیں دیتی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ کل صبح تک انعام کو ڈاکٹر انیتا شرما سے نہیں ملنے دے گی اور نہ ہی فون پر بات کرنے کا موقع دے گی۔ اسے حیرانی تھی کہ چیمبر میں انعام اور لیڈی ڈاکٹر کیسے ایک دوسرے سے انجان رہنے کی ایکٹنگ کر رہے تھے اور وہ لیڈی ڈاکٹر اسے انعام کی نظروں سے گرانے اور اس کی بے شمار دولت سے محروم کرنے میں کوئی کسر چھوڑنے والی نہیں تھی۔ ویسے ڈاکٹر کو اس سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہو سکتی تھی۔ انعام نے لاکھوں روپے دے کر اس کی دشمنی خرید لی تھی۔ یعنی انعام اس پر شبہ کرتا آ رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد ماں نے دروازے پر دستک دی۔ پھر کہا: "بیٹی! رماکانت جی آ گئے ہیں۔ بہت اہم باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

"انہیں بٹھاؤ۔ ہم آ رہے ہیں۔"

انعام نے ناگواری سے کہا: "اس کمبخت کو ٹال دو۔ میں کسی سے نہیں ملوں گا۔ سچ پوچھو تو شادی کے ڈھائی برس بعد تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ پہلے والی دل و جان سے نثار ہو رہی ہو۔ تم سے دور ہونے کو جی نہیں چاہتا ہے۔"

"میں بھی آسانی سے تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ لیکن تمہاری فلم کے لیے میں رماکانت کو بھی آزمانا چاہتی ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی اسپلنڈر کہانی لایا ہو۔ اور پھر محبت کا مزہ تو دوسری پینے کے بعد آتا ہے۔ آج میں تھوڑی سی پیوں گی۔ تمہیں زیادہ پلاؤں گی۔ تاکہ۔ تاکہ۔۔۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ انہیں رماکانت سے ملنا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر بعد ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ رماکانت نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر کہا: "میں نے آپ لوگوں کو تکلیف دی۔ معافی چاہتا ہوں۔ دراصل ایک ایسا آئیڈیا ہاتھ آیا ہے کہ کئی پروڈیوسر مجھے بڑی بڑی آفر دے رہے ہیں۔ لیکن آپ نے اگلی فلم میں مجھے ڈائریکٹر لینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس لیے سوچا پہلے آپ کے سامنے آئیڈیا پیش کر دوں۔"

شیری نے کہا: "اچھا ہوا آپ آ گئے۔ ہم ابھی آپ ہی کی بات کر رہے تھے۔"

"آپ کی کرپا ہے کہ مجھے یاد کرتی ہیں۔"

انعام نے کہا: "آپ آئیڈیا پیش کریں۔"

"جناب! ایسے سننے میں مزہ نہیں آئے گا۔ مجھ غریب نے سات قسم کی اسکاچ وسکی کا انتظام کیا ہے۔ میں اپنے رائٹر کو وہیں بٹھا کر آیا ہوں۔ آپ کاک ٹیل پئیں گے تو کہانی سانپ کی طرح ڈنک مارے گی۔ اور کہانی بھی سانپوں کے موضوع پر ہے۔"

انعام جانا نہیں چاہتا تھا۔ شیری نے کہا: "چلنے میں کیا حرج ہے۔ ذرا آؤٹنگ ہو جائے گی۔ کاک ٹیل سے موڈ میں آئیں گے تو گھر واپس آ جائیں گے۔"

شیری نے گھر واپس آنے کی بات ایسی چٹخارے دار ادا سے کہی کہ وہ راضی ہو گیا۔ ماں نے کہا: "بیٹی! ایک ضروری بات ہے، سن کر جاؤ۔"

وہ ماں کے ساتھ اس کے کمرے میں آئی۔ ماں نے کہا: "رماکانت کنگال ہے۔ میں نے کاک ٹیل کے لیے اسے بارہ ہزار روپے دیے ہیں۔ تیری رقم مجھے دو۔"

"بارہ ہزار کے لیے جان کیوں نکل رہی ہے۔ کیا میں تمہاری ضرورت سے زیادہ دیتی نہیں ہوں؟"

اس نے خاص ملازم کو بلا کر کہا: "لیڈی ڈاکٹر انیتا شرما کے گھر جاؤ۔ اس سے کہو تمہیں صاحب نے بھیجا ہے۔ گھر کا فون خراب ہو گیا ہے۔ صاحب نے بیگم صاحبہ کی میڈیکل رپورٹ مانگی ہے۔ ڈاکٹر سے رپورٹ لا کر مجھ کو دے دینا۔ صاحب کو پتا نہ چلے۔ ہو سکے تو لیڈی ڈاکٹر کے فون کا تار بھی کاٹ دینا۔ اگر تمام کام میری مرضی کے مطابق ہو گیا تو ایک ہزار روپے انعام دوں گی۔ ابھی مجھ سے ہزار روپے لے جاؤ۔"

پھر اس نے ماں سے کہا: "یہ کام ہونے کے بعد تم شنکر دادا اور چھگن لال کے پاس جاؤ گی۔ ان سے کہو کہ وہ صبح سات بجے ہمارے بنگلے میں آ جائیں۔ شنکر ہدایت کار اور چھگن لال ڈائریکٹر بن کر ہمارے ساتھ جنگل کی پکنک میں جائیں گے۔ اور انعام کو جنگل کی کھائی سے زندہ واپس نہیں آنے دیں گے۔"

"شیری! تم کیا کرتی پھر رہی ہو؟"

"آخری بازی کھیل رہی ہوں۔ پنا کے کھیت میرے جواہرات اگل رہے ہیں۔ میں انعام کی بیوہ بن کر ہی ان کے مالکانہ حقوق حاصل کر سکتی ہوں۔ تم یہ کام سرانجام دو۔ اگر صبح تک ہم سے ذرا بھی چوک ہو گئی تو ہم پہلے کی طرح کنگال ہو جائیں گے۔ مجھے پھر کسی سرمایہ دار کو مجبوراً برداشت کرنا ہوگا اور میں کسی اور مرد کا سایہ اپنے بدن پر پڑنے نہیں دوں گی۔"

وہ ماں سے رخصت ہو کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ پھر انعام کے ساتھ رماکانت کے گھر چلی گئی۔ وہ اسے لیڈی ڈاکٹر سے دور رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ رماکانت کے ہاں کہانی سننے کے دوران وہ اسے پلاتی رہی۔ وہ پیتا رہا اور شیری سے سرگوشی میں کہتا رہا: "دیکھو! بالکل کاڈسٹ نہ کرنا۔ میں ہوش میں رہ کر تمہارے حسن کی شراب

چھپنا چاہتا ہوں۔"

لیکن رات گیارہ بجے تک وہ آؤٹ ہو گیا۔ میز پر کھانا لگایا گیا۔ وہ کھا نہ سکا۔ قے کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اسے پتا نہ چلا کہ گھر کیسے واپس آیا۔ صبح پانچ بجے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ تنہا بستر پر پڑا ہوا تھا۔ زیرو پاور کی روشنی میں کمرے کی ہر چیز دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہوش میں کہاں تھا؟ اسے یاد آیا! میری اسے پکار رہی تھی۔ اس کی یاد آتے ہی وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ بستر پر نہیں تھی۔ اتنی دیر بعد اپنی تنہائی کا خیال آیا تھا۔

اس نے خوف زدہ ہو کر آواز دی "میری! میری! تم کہاں ہو؟"

باتھ روم سے آواز آئی "میں یہاں ہوں۔ جلدی آؤ۔ غسل کر لو۔ ابھی لوکیشن دیکھنے جلد سے جلد نکلنا ہے۔"

وہ اطمینان کی سانس لے کر بستر سے اُترا۔ شراب کی زیادتی کے باعث سر گرد اور ذہن بوجھل سا تھا۔ اس نے فریج سے ٹماٹر جوس نکال کر پیا۔ پھر باتھ روم میں چلا گیا۔ میری نے کہا "ہم نے سلاوا سے آئیڈیا حاصل لیا ہے۔ چونی لال ماسٹر کے پاس بھی ایک نیا آئیڈیا ہے۔ ابھی وہ ڈائریکٹر شنکر کے ساتھ آ رہا ہے۔ وہ دونوں ہمارے ساتھ چنبل کی گھاٹی تک جائیں گے۔"

"تم کہانی کسی سے سنتی ہو۔ لوکیشن کسی کو دکھاتی ہو۔ اس طرح تمام کہانیاں کھچڑی ہو جائیں گی۔ کسی کا سر کسی کا دھڑ اور کسی کا پیر ہو گا۔"

"پھر کیا کرو۔ ہم اس بار دو دو جن کہانیوں کا رس نچوڑ کر ایک کہانی بنائیں گے۔ اس بار فلم ضرور ہٹ ہو گی۔"

وہ صبح آٹھ بجے روانہ ہوئے۔ چوبیس گھنٹے پہلے ہی ایک ہیلی کاپٹر چارٹر کر لیا گیا تھا۔ پائلٹ کے علاوہ چار افراد کی گنجائش تھی۔ انعام، میری، شنکر دلاوا اور چونی لال۔ اس لیے انعام نے کسی باڈی گارڈ کو نہیں لیا۔ وہ دن کے ایک بجے چنبل کے علاقے میں پہنچے۔ ہیلی کاپٹر کو ایک کھلے میدان میں اتار لیا گیا۔ وہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ڈاک بنگلا تھا۔ انھوں نے اپنا سامان وہاں رکھا۔ برائے نام دوپہر کا کھانا کھایا۔ پھر پائلٹ کو ڈاک بنگلے میں سامان کے ساتھ چھوڑ کر لوکیشن دیکھنے کے لیے چل پڑے۔

دور دور تک اونچی نیچی پہاڑیاں تھیں۔ کئی جگہ وارننگ کے لیے چھوٹے چھوٹے بورڈ نصب کیے گئے تھے۔ جن پر لکھا ہوا تھا کہ یہاں سانپ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ سپیروں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اجازت کے بغیر سانپ نہ پکڑیں۔ ورنہ ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔

انعام نے پوچھا "کیا اتنی خطرناک جگہ تک شوٹنگ کی جائے گی؟"

شنکر دلاوا نے کہا "فی الحال کوئی خطرہ نہیں ہے۔ دن کے

طاقت کے اشتہار

کہتے ہیں تیرہ سال سے اٹھارہ سال کی عمر بڑی خطرناک ہوتی ہے انسان کے جسم میں اسی عمر میں بڑے بڑے انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ عموماً نوجوان لڑکے اسی عمر میں بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور جنسی تسکین کے غیر فطری طریقے اپنا لیتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد خود کو کمزور سمجھنے لگتے ہیں۔ دیواروں پر کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرنے کے اشتہار دیکھتے ہیں۔ نیم حکیموں سے رجوع کرتے ہیں ان کا لٹریچر پڑھتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ ہم اپنی جوانی تباہ کر چکے ہیں۔ جبکہ ایسا نہیں ہوتا ہے — نوجوان لاعلمی کے سبب پریشان رہتے ہیں، ایسے لوگوں کو چاہیے کہ اپنا علاج کرانے سے پہلے جنسیات پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ ایسی بہت سی کتابیں بازار میں دستیاب ہیں، جن میں جنسی خفیہ راز اور جنسی صلاحیت بڑھایئے "بہت مقبول ہیں۔ یہ کتابیں ہر لحاظ سے کارآمد ہیں، ان کے پڑھنے سے ذہن میں بیٹھا ہوا خوف نکل جاتا ہے۔ جو غلط فہمی نیم حکیموں کے اشتہارات سے پیدا کی ہے دور ہو جاتی ہے۔ ان کتابوں میں قابلِ اعتماد حکماء کے نسخے بھی موجود ہیں، نسخوں کی دوائیں بہت معمولی رقم خرچ کر کے بازار سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس طرح وہ نوجوان جوانی کے جوش میں بہک گئے تھے ان کتابوں کی مدد سے خود کو سنبھال سکتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم۔

وقت، ہم سانپوں کو دیکھ کر گھبرا جائیں گے یا انھیں مار ڈالیں گے۔ شوٹنگ کے وقت، ہم سپیروں کو ساتھ لایا کریں گے۔"

وہ چلتے رہے۔ مذاق اور ڈرامائی مناظر کے لیے جگہ پسند کرتے رہے۔ اس دوران دو چار سانپ نظر آئے لیکن وہ جھاڑیوں میں اِدھر اُدھر چھپ گئے۔ انعام نے کہا۔ "ہم کوئی پانچ چھ میل دور نکل آئے ہیں اور کافی لوکیشن مارک کر چکے ہیں۔"

شنکر نے کہا۔ "ہاں! شیری صاحبہ سے میں نے ایک خاص لوکیشن کا ذکر کیا تھا۔ وہ جگہ بس قریب ہی ہے۔ آیئے، دیکھ لیجیے۔"

وہ سب آگے بڑھتے ہوئے ایسی جگہ آئے جہاں سے ڈھلان شروع ہوتی تھی۔ نیچے کوئی بارہ فٹ کی گہرائی میں ایک کھلی جگہ تھی جہاں بے شمار سانپ نظر آرہے تھے۔ وہ بارہ فٹ گہری جگہ زہریلے سانپوں کا مسکن تھی۔ مسکن کے چاروں طرف پہاڑیاں تھیں۔ نیچے اترنے والے سپیرے ایک آدھ سانپ پکڑ کر آسانی سے اوپر نہیں آسکتے تھے۔

انعام نے گہرائی میں کلبلاتے ہوئے سانپوں کو دیکھ کر پوچھا۔ "کیا یہاں بھی شوٹنگ ہوگی؟"

شیری نے کہا۔ "ہاں۔ یہاں زبردست ڈرامائی کلائمکس بنے گا۔ مجھے سانپوں کے درمیان رقص کرنے کے لیے نیچے جانا ہوگا۔"

"کیا تمھیں ڈر نہیں لگے گا؟"

"اگر یہ معلوم ہو جائے کہ سانپ زہریلے نہیں ہیں تو ڈر نہیں لگے گا۔ میں ان کا زہر آزمانے کے لیے تمھیں یہاں لائی ہوں۔ تم نیچے جاؤ۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "ایسا مذاق نہ کرو۔"

"مذاق تو تمھارے خاندان میں کیا جاتا ہے۔ ایک بیوی بچہ پیدا نہ کرے تو یکے بعد دیگرے اس پر سوکنیں لائی جاتی ہیں۔ لیکن میں اُن بیویوں میں سے نہیں ہوں جو دوسری جائداد میں دوسروں کا حصہ تسلیم کر لیتی ہیں۔ تم یہاں مر جاؤ گے تو تمام انعام اللہ کی دولت صرف میری کہلائے گی۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "کیا تم سنجیدہ ہو؟"

"اتنی ہی سنجیدہ ہوں جتنی سنجیدگی سے تم میری میڈیکل رپورٹ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ تم خود کو بہت ہوشیار سمجھتے ہو۔ تمھیں شبہ ہو گیا تھا کہ میں شوبزنس میں رہ کر بچے پیدا نہیں کروں گی اور تمھارا شبہ درست تھا۔ میں تمھارے دو بچے ضائع کرا چکی ہوں۔"

وہ حقارت سے بولا۔ "تم میرے اندازے سے زیادہ ذلیل ثابت ہو رہی ہو۔ میرے بچوں کے بعد مجھے بھی ختم کرنا چاہتی ہو۔"

"ایک دن سب ختم ہو جاتے ہیں۔ تمھاری بات ذرا الگ ہے۔ تم موت سے بہت ڈرتے ہو۔ بند کمرے میں بھی تنہا نہیں رہ سکتے۔ ویسے یہاں نہیں مرنا چاہیے۔ تم سانپوں کے مسکن میں جا کر بھی تنہا نہیں رہو گے۔ ہم سب اوپر موجود رہ کر تمھاری تنہائی اسی طرح دور کریں گے جس طرح ایک رات صائمہ نے اور روشنائی سے تمھاری تنہائی دور کی تھی۔"

شنکر دادا نے ریوالور نکال کر کہا۔ "میں دھکا نہیں دینا چاہتا۔ خود ہی نیچے چلے جاؤ۔"

اس نے ریوالور کو سہم کر دیکھا پھر کہا۔ "شیری! میں نے تمھیں دولت دی، شہرت دی۔ اور جو مانگو گی وہ دوں گا۔ یہ خوفناک کھیل نہ کھیلو۔"

"میں یہ کھیل کر دیکھنا چاہتی ہوں کہ مادام مونیکا اور تمھارے نجومی کی پیشین گوئی درست ہے یا نہیں۔ سچ پوچھو تو میں مادام کی کسی بات کو نہیں جھٹلاتی۔ انھوں نے تمھارے بارے میں سچی باتیں بتائی ہیں۔ پھر بھی یہ مذاق لگتا ہے کہ ایک شخص مرے گا تو بالکل تنہائی میں مرے گا اور کسی کی موجودگی میں موت نہیں آئے گی۔ میں یہاں رہ کر مادام مونیکا کی سچائی ضرور دیکھوں گی۔"

شنکر نے کہا۔ "وقت ضائع ہو رہا ہے۔ یہ سیدھی طرح نیچے نہیں جائے گا۔"

وہ دھکا دینا چاہتا تھا۔ انعام کترا کر بھاگنے لگا لیکن جوزف نے پکڑ لیا۔ پھر شنکر نے گردن دبوچ لی۔ وہ اکیلا تھا اور وہ دو تھے۔ دونوں نے اسے بلندی سے پستی میں پھینک دیا۔ وہ چیختا چلاتا ڈھلان میں لڑھکتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔ خوف سے بُرا حال تھا۔ لڑھکنے کے دوران وہ کئی سانپوں کے اوپر سے گزرتا گیا تھا۔ بے شمار سانپ ہر طرف سے اس کی طرف چلے آرہے تھے۔ وہ اٹھ کر اچھل رہا تھا۔ چیخیں مار رہا تھا۔ "بچاؤ۔ بچاؤ۔ مجھے ان سانپوں سے بچاؤ۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ کوئی ہے؟ کوئی ہے! جو مجھے بچائے گا۔ میں اسے اپنی تمام دولت دے دوں گا۔"

چیخنے کے دوران اسے ایک سوکھی سی لکڑی مل گئی۔ وہ اس کے ذریعے قریب آنے والے سانپوں کو دور ہٹانے لگا۔ وہ زہریلی بلائیں بڑی تیز رفتار تھیں۔ بل کھاتی ہوئی چشم زدن میں چلی آتی تھیں۔ وہ ایک بار راستہ بنا کر چڑھائی کی طرف آیا۔ اوپر چڑھنے لگا۔ لیکن دہشت حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکا چنانچہ اوپر چڑھتے چڑھتے پھر پھسلتا ہوا نیچے آگیا۔

اوپر زندگی قہقہے لگا رہی تھی۔ نیچے موت کا [illegible]

بلاؤں کے درمیان بڑی جلدی موت آسکتی تھی۔ مگر کوئی بھی آدمی بڑے آسانی سے مرنا نہیں چاہتا۔ اپنی آخری سانس تک زندگی کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ وہ بھی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ پھر اچانک ہی اس کی دم توڑتی ہوئی چیخ سنائی دی۔ ایک سانپ نے پاؤں میں ڈس لیا تھا۔ وہ یکبارگی چکرایا پھر اپنے وجود کے آخری بوجھ کے ساتھ کلبلاتے ہوئے سانپوں پر گر پڑا۔ سانپ ادھر اُدھر رینگنے لگے۔ وہ ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ بڑے کرب سے آنکھوں کے سامنے مٹتی ہوئی دُنیا کو دیکھ رہا تھا۔ کیری دھندلی دھندلی سی نظر آ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ بلندی کی آرزو کرتی تھی تاکہ لوگ سر اُٹھا کر اسے دیکھتے رہیں۔ اس کی تمنا کرتے رہیں مگر اُسے چھو بھی نہ سکیں۔ انعام نے آخری بار اسے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر اس کا سر ڈھلک گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ زندگی کی ایک کہانی ختم ہو گئی۔

وہاں موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔ چہار طرف پہاڑیوں میں چکرانے والی ہوائیں سائیں سائیں کی آوازیں سنا رہی تھیں۔ کیری نے شنکر سے لٹکی ہوئی دوربین ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگائی۔ نشیبی بستی میں پڑی ہوئی لاش بالکل قریب دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ اسے دیکھتی ہوئی کمنٹری کر رہی تھی۔ "شنکر! وہ مر چکا ہے۔ اس کا سارا جسم نیلا پڑ گیا ہے۔ اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ڈاک بنگلے میں جا کر اس کا ماتم کرنا چاہیے۔ کسی قریبی بستی سے جوگی یا سپیروں کو بلا کر اس کی لاش وہاں سے اٹھوانا چاہیے۔ ہائے میں بیوہ ہو گئی! اپنے میاں کی لاش پر روتی ہوئی بستی پہنچوں گی۔ ہائے ہائے۔"

شنکر اور چونی لال نے باری باری دوربین لے کر لاش کو دیکھا۔ پھر پوری طرح یقین کر لینے کے بعد ڈاک بنگلے کی طرف چل پڑے۔ وہ تیزی سے چلتے رہے تاکہ ہانپتے رہنے سے دلی پریشانی اور صدمہ ظاہر ہوتا رہے۔ ڈاک بنگلے کے قریب پہنچ کر کیری نے پرس سے شیشی نکالی پھر اس میں سے گلیسرین آنکھوں میں لگائی جس کے نتیجے میں آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ یہ ملی جلکڈ ڈالی بہت کام آ رہا تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ ڈاک بنگلے کے چوکیدار نے کہا: "یہاں سے پندرہ کوس پر ایک بستی اور پولیس تھانہ ہے۔ وہاں سپیرے بھی ہیں۔ مگر وہاں جا کر آنے تک اندھیرا ہو جائے گا۔"

پنڈت نے کہا: "ہیلی کاپٹر میں چلو۔ ہم آدھے گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔"

وہ سب ہیلی کاپٹر میں بستی کے قریب پہنچے۔ شاید بستی والوں کی زندگی میں پہلی بار وہاں ہیلی کاپٹر آیا تھا۔ مرد، عورتیں، بوڑھے بچے سبھی دوڑے چلے آئے۔ تھانیدار بھی دھوتی سنبھالتا ہوا دو سپاہیوں کے ساتھ آ گیا۔ کیری نے کہا: "میرے پتی دیو سانپوں کے مسکن میں گر پڑے تھے۔ ہم ان کی چیخ سن کر وہاں پہنچے تو وہ مر چکے تھے۔ انسپکٹر صاحب! پلیز سپیروں کو لے کر وہاں چلیں اور کسی طرح اُن کی لاش وہاں سے نکلوائیں۔"

تھانیدار نے کہا: "پانچ منٹ انتظار کرو۔ میں سپاہیوں کے ساتھ وردی پہن کر آتا ہوں۔"

وہ جانے لگا۔ کیری بھی اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی ایک چھوٹے سے مکان تک آئی۔ اس مکان کو پولیس اسٹیشن بنایا گیا تھا۔ تھانیدار اس مکان کے اندر جا کر وردی پہننے لگا۔ کیری نے پوچھا: "انسپکٹر صاحب! یہاں آپ بہت تکلیف میں رہتے ہوں گے۔ کتنی تنخواہ ملتی ہے؟"

"پانچ سو پچیس روپے۔" اندر سے جواب ملا۔

"اوہ گاڈ! اتنی تھوڑی تنخواہ میں کیسے زندگی گزارتے ہو؟"

"کیا کریں مجبوری سے گزار لیتے ہیں۔ پانچ سو روپے شہر میں بیوی بچوں کو بھیج دیتے ہیں۔ پچیس روپے مہینے میں گھر چلانے کے لیے بچتے ہیں۔ سرکار اچھی طرح جانتی ہے کہ ہمارا خرچہ بستی کے گھروں سے پورا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اتنی کم تنخواہ دیتی ہے۔"

اس نے وردی پہن کر دروازہ کھولا۔ کیری نے اندر آ کر اپنا بیگ کھولا۔ پھر نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی: "یہ دس ہزار روپے ہیں۔ کبھی ایک ساتھ

بتول فاطمہ کی طرف سے

- شادی سے فرار کی ترکیب بتائیے؟
  یہ کیسے ممکن ہے بھلا آپ جیل میں داخل ہونے بغیر جیل سے فرار ہو سکتے ہیں؟
- پنجابی کہاوت ہے کہ افسر کے اگاڑی اور گھوڑے کے پچھاڑی مت چلو لیکن اگر افسر گھوڑے پر نکل آئے تو کیا کرنا چاہیے؟
  اس کے پیچھے سے گزر جانا چاہیے۔
- کیا آئینہ کبھی جھوٹ بولتا ہے؟
  جی ہاں۔ جب کوئی جھوٹا اس کے سامنے ہو۔
- بڑھاپے کی سب سے بڑی اذیت؟
  اٹھکیلیاں کرتی ہوئی نئی نسل۔
- محنت کا پھل ملتا ضرور ہے چاہے دیر سے ملے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟
  جی ہاں! لیکن بسا اوقات اتنی دیر سے ملتا ہے کہ سر گنجا ہو چکا ہوتا ہے۔
- غریبوں کے مقابلے میں امیر نجوم پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔
  کیونکہ غریبوں کو حالات بہتر ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہوتی۔
- ہمارے سیاستدانوں کی طویل عمروں کا راز کیا ہے؟
  جو بندے خدا کو پسند ہوتے ہیں، انہیں وہ اپنے پاس جلد بلا لیتا ہے۔

اتنے نوٹ دیکھے ہیں؟"

اس کی اوپر کی سانس اوپر رہ گئی تھی۔ وہ حیرانی سے گڈی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی: "جلدی سے چھپا لو۔ کوئی دیکھے گا تو بھے گا رشوت دے رہی ہوں۔ جبکہ میں رشوت دینے اور لینے کو پاپ سمجھتی ہوں۔ بس مجھے تم سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ میں اپنا پتا لکھوا دوں گی۔ بمبئی آؤ گے تو ایک موٹر سائیکل خرید کر تمھیں دوں گی۔"

وہ خوشی سے پھول رہا تھا۔ اس نے کشتی کے صندوق میں اس گڈی کو چھپایا تالا لگایا پھر اس کے ساتھ باہر آگیا۔ ہیلی کاپٹر میں اگرچہ زیادہ افراد کی گنجائش نہیں تھی پھر بھی تھانیدار اور سپاہی ایک دوسرے کی گود میں بیٹھ کر سانپوں کے مسکن تک پہنچ گئے۔

جب ہیلی کاپٹر مسکن کے اوپر پرواز کی تو میری، شنکر اور چھوٹی لال نیچے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ انعام نظر نہیں آ رہا تھا۔ پائلٹ نے میری سے پوچھا: "آپ کے صاحب کہاں ہیں؟"

تھانیدار نے پوچھا: "لاش کہاں ہے؟"

شنکر نے پوچھا: "کیا مردار کھانے والے جانور یہاں آتے ہیں؟ اگر آتے ہیں تو وہ لاش کو گھسیٹ کر کہیں لے گئے ہوں گے۔ ہیلی کاپٹر کو ذرا دور تک لے چلو۔"

تھانیدار نے کہا: "یہ مردار کھانے والا جانور سانپوں کے مسکن میں جائے گا تو وہ بھی زندہ نہیں بچے گا۔ لاش کو پیٹ کر کیسے لے جائے گا۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ پھر بھی ہیلی کاپٹر دور تک مسکن کے چاروں طرف پرواز کرتا رہا پھر پائلٹ نے اسے ایک جگہ اُتار دیا۔ میری پر مصیبت آنے والی تھی۔ لاش نہ ملی تو شبہ ہوتا کہ اسے قتل کر کے کہیں گاڑ دیا گیا ہے۔ انعام کی موت سے اُسے ہی فائدہ پہنچتا تھا اور اب اُسے ہی زبردست نقصان پہنچنے والا تھا۔

اس نے پوچھا: "کیا یہاں قریب ہی اور کوئی بستی ہے؟ ہو سکتا ہے وہاں کے سپیرے لاش اُٹھا کر لے گئے ہوں۔"

ایک سپاہی نے کہا: "ایک بستی بیس کوس پر اور دوسری پچیس کوس پر ہے۔"

میری نے پائلٹ سے کہا: "پلیز اُن بستیوں کی طرف چلو۔"

"سوری میڈم! میں شیڈول کے خلاف ایک بستی کی طرف گیا وہاں سے یہاں آیا۔ اب یہاں سے بمبئی ہی واپس جا سکتا ہوں۔"

اس نے بیگ میں سے دس ہزار کی ایک اور گڈی نکالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی: "میں اس سے بھی زیادہ دوں گی۔ میری پریشانی کو سمجھو۔ میں اپنے خاوند کی لاش حاصل کیے بغیر واپس نہیں جاؤں گی۔"

"میڈم! مجھے آپ کی پریشانیوں کا علم ہے۔ مگر اس چھوٹے سے ہیلی کاپٹر میں محدود ایندھن ہوتا ہے۔ یہ دیکھیے ایندھن کا نشان بتا رہا ہے کہ ہم نے اگر غلط پرواز کی تو بمبئی واپس نہیں جا سکیں گے۔"

تھانیدار نے کہا: "میڈم! آپ بمبئی جائیں اور پولیس پارٹی کے ساتھ دوسرا ہیلی کاپٹر لے آئیں۔ اگر لاش مسکن سے گئی تو وہ کسی قریبی بستی میں مل جائے گی۔"

اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ شنکر اور چھوٹی لال سپاہیوں اور سپیروں کے ساتھ ڈاک بنگلے میں رہ گئے۔ میری تھانیدار کو ساتھ لے کر بمبئی آگئی۔ وہاں کے اعلیٰ پولیس افسر کو ساری روداد سنائی پھر کہا: "جتنی بھی رقم خرچ ہو میں کروں گی۔ آپ ایک ہیلی کاپٹر چنبل کے علاقے کے لیے چارٹرڈ کر لیں۔ میں ابھی زیادہ سے زیادہ رقم لے کر آتی ہوں۔"

وہ پولیس کی ایک گاڑی میں گھر پہنچی۔ ماں کو جلدی جلدی روداد سنائی۔ پھر رقم نکالنے کے لیے دو چابیوں سے آہنی الماری کو کھولا۔ الماری کے سیف کو کھولنے کے لیے تیسری چابی دراز میں تھی۔ اس نے چابی نکالنے کے لیے دراز کھولا تو ایک دم سے چونک گئی، گھبرا گئی۔ حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

دراز میں اوپر ہی مادام مونیکا کی بڑی سی تصویر رکھی ہوئی تھی۔۔ تصویر میں مادام اپنی بتیسی کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔

انعام نے آنکھیں کھول دیں۔ موت سو گئی، زندگی جاگ گئی۔ وہ گم صم پڑا سوچ رہا تھا: "میں کہاں ہوں؟ کیا دوسری دنیا میں؟ یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے؟ جنت ہے یا جہنم ہے؟"

اس نے سر گھما کر پہلے دائیں جانب دیکھا پھر بائیں جانب۔ اُسے مٹی کے دیے روشن نظر آ رہے تھے جو دیواروں میں جلائے جاتے ہیں۔ وہ کوئی پتھریلی جگہ تھی۔ دیواریں مٹی اور پتھر کی تھیں۔ چھت بھی سیلے پتھروں کی تھی۔ جلد ہی سمجھ میں آگیا کہ وہ کسی غار کے اندر ہے۔

پھر دیواروں پر انسانی سائے متحرک دکھائی دیے۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھ کر بیٹھنے لگا۔ اُسے چار جنگجو نظر آئے۔ اُن کے سر منڈے ہوئے تھے۔ انھوں نے گیروے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ ایک کے ہاتھوں میں مٹی کی چھوٹی سی ہانڈی تھی۔ دوسرے کے ہاتھوں میں پیتل کی تھالی تھی۔ تیسرے کے ہاتھوں میں ایک انگیٹھی تھی جس میں سے سفید دھواں نکل رہا تھا اور

کے نیچے وہ پڑا ہوا تھا مسرت چہرہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ میری لرزتے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ انعام کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ خون نام کو نہیں جھلک رہا تھا۔ سانس بھی نہیں چل رہی تھی۔ مسز خاموش دکھائی دے رہا تھا سو وہ چیخ مار کر اس پر گر پڑی۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس سے لپٹ کر رونے کے بہانے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ سانس جاری ہے یا نہیں؟

"ہائے میں لٹ گئی۔ مجھے آنکھوں سے دیکھ کر یقین نہیں آ رہا ہے کہ میرا سہاگ لٹ گیا ہے۔ ہائے انعام! مجھے کس کے سہارے چھوڑ جاتے ہو۔ میں تمہارے بغیر جینا نہیں چاہتی۔ مجھے دولت نہیں چاہیے، مجھے عیش و آرام نہیں چاہیے۔ مجھے بھی قبر میں تھوڑی سی جگہ دے دینا۔ میں اتنی بڑی دنیا میں اکیلی نہیں رہوں گی۔ میں بھی مر جاؤں گی۔"

وہ الگ ہو کر اس کے پاس ہی پتھریلی زمین پر سر مارنے لگی۔ افسر اور ایک سپاہی نے اسے پکڑ لیا۔ دوسرے افسر نے نرمی سے کہا: "میڈم! یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔ پھر بھی آپ کو ہوش میں رہنا چاہیے۔"

"میں ہوش میں رہنا نہیں چاہتی۔ میں جینا نہیں چاہتی۔ میں۔ میں...."

وہ کہتے کہتے ایک دم سے خاموش ہو گئی۔ انعام ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مسز میری کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس سے لپٹ کر روتے وقت صحیح طرح اس کی سانسوں کا پتا نہیں چلا تھا۔ دل کی دھڑکن بھی سنائی نہیں دی تھی۔ لیکن اب اس کی کراہیں زندگی کا ثبوت دے رہی تھیں۔

بڑے افسر نے کہا: "ارے! یہ تو زندہ ہے!"

"نہیں!" میری نے ایک چیخ ماری: "یہ زندہ نہیں ہے۔ دیکھو اس کی آنکھیں بند ہیں۔ یہ مر چکا ہے۔"

افسر نے اسے جھنجوڑ کر کہا: "میڈم! یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ یہ معجزہ ہو رہا ہے۔"

وہ جنونی انداز میں ہاتھ جھٹک کر بولی: "یہ معجزہ نہیں ہے۔ اس کمین کتے کی وحشت گری کراہ رہی ہے۔ اس نے کہا تھا: یہ کسی کی ہو کر نہیں رہے گا۔ میری موجودگی میں زہریلے ناگ نے ڈس لیا۔ کیا تمہاری عقل کہتی ہے کہ یہ زندہ رہے گا؟ نہیں! یہ زندہ نہیں ہے۔ نہیں ہے۔ نہیں ہے۔ نہیں ہے...."

وہ جنون میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ادھر سے اُدھر بھاگ رہی تھی۔ افسر نے سپاہیوں سے کہا: "یہ ہوش میں نہیں ہے۔ اسے پکڑ لو۔" سپاہی نہ پکڑتے تب بھی وہ کہاں جا سکتی تھی۔ انعام ہوش میں آ کر بیان دینے والا تھا۔ اس کے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ افسر نے پوچھا: "بی بی کیا کسی زہریلی ناگن نے کوئی حرکت کی تھی؟"

وہ خاموش تھی۔ سپاہیوں کی گرفت میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انعام کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کراہتے ہوئے آنکھیں کھول رہا تھا۔ بڑا افسر اس پر جھک کر کہہ رہا تھا: "مسٹر انعام! اس بار آپ کو نئی زندگی ملی ہے۔" اس کے بیٹھنے سے تو گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میری لرز رہی تھی۔ وہ بڑی مشکلوں سے اٹک اٹک کر بولا: "مم... مجھے موت چاہیے۔ مجھے ابدی آسودگی چاہیے۔"

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ گہری گہری سانسیں لے کر چھت کی چھت کو گھورتے ہوئے سوچنے لگا۔ ساری زندگی آسودگی کے لیے بھٹکتا رہا۔ کتنے پاپڑ بیلے، کتنی کمائی کی۔ دنیا کی ہر خوشی جیت لی۔ آج میری کو بھی مات کر دیا۔ سائرہ کی محبت نے ایک بیٹا دیا۔ اب وہ دوسرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ یہ زندگی بہت کچھ دیتی ہے۔ بلکہ سب کچھ دیتی ہے۔ مگر قناعت نہیں دیتی۔ جتنا دیتی ہے اتنی ہی پیاس بڑھتی جاتی ہے۔

"آہ! آج ابھی تھوڑی دیر کے لیے مر کر کتنا سکون ملا تھا۔ اپنے پانچوں حواس کو مار کر تمام خواہشوں کو بجھا کر تمام فکروں سے نجات حاصل کر کے اور خوف و دہشت سے نکل کر موت کو گلے لگا کے جو آسودگی ملی وہ زندگی میں کبھی کسی کو مل نہیں سکتی۔

'کیا میں کسی طرح مر نہیں سکتا؟'

'نہیں! مرنا چاہوں تب بھی مر نہیں سکتا۔ زندہ رہنے کی خواہش چٹکیاں لے رہی ہے۔ بے شمار دولت اور عیش و عشرت کے لمحات پکار رہے ہیں۔ سائرہ کی وفائیں قسم دے رہی ہیں۔ 'واپس آؤ!' دو برس کا بیٹا توتلی زبان سے 'ابو' کہتا ہے تو دماغ گھوم جاتا ہے۔ جہاں کچھ بھی نہ ہو وہاں سب کچھ ہونے لگتا ہے۔ مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ میں ہو رہا ہوں۔ ہائے ری آسودگی! تو کبھی نہیں ہو گی۔ تجھے پانے کے لیے زندگی کو ہارنا ہو گا۔'

وہ سوچتے سوچتے ہنسنے لگا۔ سب اسے چونک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ ہنستے ہنستے کہنے لگا: "یہ تنہائی کیا ہوتی ہے؟ کیا آدمی کبھی تنہا رہتا ہے؟

"یہ ہمارا ایمان ہے۔ ہمارے دین کے مطابق انسانوں کی طرح فرشتے بھی اپنا وجود رکھتے ہیں۔ جب موت کا فرشتہ آئے گا تو میں تنہا کیسے رہوں گا۔ میں کبھی تنہا نہیں رہ سکتا۔ کبھی تنہا نہیں رہ سکتا۔"

فریب مشترک

محبت ایک ایسی طاقت ہے جس کے سہارے بڑی بڑی منزلیں سر کی گئی ہیں مگر جب محض طاقت کو مرکزی حیثیت دی جائے تو محبت کی دیوی درمیان سے از خود رخصت ہو جاتی ہے۔ فریب مشترک ایک ایسا قضیہ [illegible] ہے جس میں فریقین ایک دوسرے پر بازی لے جانے میں مصروف رہے اور جذبۂ محبت ان دونوں کی انا کے قدموں تلے سسکتا رہا۔ محبت جس ایثار اور خود سپردگی کا تقاضا کرتی ہے، وہ دونوں ہی اس سے محروم تھے لہٰذا وہ ایک ایسی جنگ لڑتے رہے جس کا ہر نیا محاذ ان کے باطن میں کھلتا تھا

[illegible]

ابھی

ابھی بالکل ابھی ابھی ایک پل گزر گیا اور یہی دنیا عبرت ہے کہ گزرے ہوئے ایک پل کا حساب کرنے سے پہلے ہی دوسرا پل گزر جاتا ہے مگر حساب تو کرنا ہی پڑتا ہے آج نہیں تو کل، جوانی میں نہیں تو بڑھاپے میں سوچنا پڑتا ہے کہ اب تک کیا کیا اور کیا نہ کیا، شاید وہ کیا جو کرنا تھا اور وہ کرتے رہے جو نہیں کرنا تھا۔ پھر

برکت علی نے کافی کا ایک گھونٹ حلق سے اتارتے وقت محسوس کیا تھا کہ ایک ایک پل کر کے ساٹھ برس گزر گئے ہیں تو وہ گھونٹ حلق میں اٹک گیا جیسے جوانی کے حلق میں بڑھاپے کا خوف اٹک جاتا ہے۔

یہ ایک ساعت کی بات تھی۔ دوسری ساعت میں اسے ٹھسکا لگا۔ کافی کچھ منہ سے کچھ ناک سے نکلنے لگی۔ کھانسی کے جھٹکے لگنے لگے۔ آنکھوں میں پانی آ گیا۔ شاید اس پانی میں بھی کافی کی کچھ مقدار ہوگی۔ اس عمر میں کچھ کھاؤ پیو تو غلط جگہ سے باہر آ جاتا ہے۔

بابو برکت علی بڑھاپے کو کسی طرح بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے سوچا۔ بڑھاپا بہت دور ہے۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔ یہ محض بڑھاپے کا خوف تھا جو حلق میں اٹک گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں ٹھسکا لگا اور میں کھانس رہا ہوں۔ یہ کمبخت کھانسی کا تسلسل نہیں ٹوٹ رہا ہے۔ لوگ خواہ مخواہ سوچیں گے کہ یہ بڑھاپے کی کھانسی ہے!

کھانسی کے جھٹکے ایسے تھے کہ پیالی میز پر رکھتے رکھتے کافی تھوڑی سی کافی چھلک کر گر پڑی۔ دیکھنے والے تو یہی سمجھیں گے کہ بڑھاپے سے ہاتھ کانپ رہا تھا۔ بعض اوقات دیکھنے والوں کی غلط فہمی سے آدمی بوڑھا کہلانے لگتا ہے۔ یہ بڑی غلط بات ہے کسی کی برتھ سرٹیفکیٹ معلوم کیے بغیر اس پر بڑھاپے کا لیبل نہیں لگانا چاہیے۔

دوسری میز پر بیٹھے ہوئے لوگ سر گھما گھما کر مسلسل کھانسنے پر اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا "بے چارہ!" بعض حالات میں ایک لفظ عمر کی تمام سنجیدگی بیان کر دیتا ہے۔

بابو برکت علی نے کھانستے کھانستے گھورتے ہوئے اس شخص کو دیکھا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ کھانسی بولنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔ دوسری میز پر بیٹھی ہوئی عورت نے اپنے مرد ساتھی سے کہا "بڑے میاں کو پانی پلاؤ۔ کھانسی رک جائے گی۔"

اس کا ساتھی پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر بابو برکت علی کے [illegible] پیش کرتے ہوئے بولا "بڑے صاحب [illegible] پی لو۔"

بابو برکت علی نے اسے غصے سے دیکھا۔ ہاتھ سے [illegible] گلاس کو [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کھانسی [illegible]

[illegible]

[illegible] اگر [illegible]

[illegible] بڑے میاں [illegible]"

[illegible] مڑ کر دیکھنے لگی [illegible] عورت

کے پاس چلا گیا۔ پورے کافی ہاؤس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ سبھی دبی زبان سے کچھ نہ کچھ کہہ رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا "بڑھاپے میں [illegible]"

کوئی جواباً کہہ رہا تھا "نہیں بلکہ غصے کا جوش ہے۔"

ایک باڈی والے نے کاؤنٹر پر جا کر کافی ہاؤس کے مالک سے کہا "اس نے گلاس توڑا ہے، میں اس کا سر توڑ سکتا ہوں مگر ایک بوڑھے پر کیا ہاتھ اٹھاؤں۔ تمہیں اس کے خلاف ایکشن لینا چاہیے۔ یہاں شریف اپنی گھر والیوں کے ساتھ آتے ہیں۔"

کافی ہاؤس کے مالک نے کہا "وہ بھی شریف آدمی ہے۔ اسے غصہ آ گیا پھر بھی اس نے دنگا فساد نہیں کیا صرف ایک گلاس توڑا۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ اس کا سر توڑنے نہ جاؤ۔ یہ اپنے وقت کا مشہور کشتی پہلوان بابو برکت علی ہے۔"

باڈی بلڈر نے اسے حیرت سے دیکھا پھر پوچھا "کیا یہ بوڑھا نہیں ہے؟"

"میں نے آج تک بوڑھا پہلوان نہیں دیکھا۔ شاید پہلوان بوڑھے نہیں ہوتے یا بوڑھے ہو کر بھی تو پہلوان نہیں رہتے!"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ بوڑھا نہیں ہے جب کہ سر کے بال اور مونچھیں سفید ہو گئی ہیں۔"

"میں تیس برس کا ہوں اور میرے بال آدھے سے زیادہ سفید ہیں۔ ایسا نزلے کے باعث ہوتا ہے۔ سفید بال بڑھاپے کی دلیل نہیں ہیں۔"

"کیا بات ہے تم اس کی بڑی حمایت کر رہے ہو؟"

"کوئی تمہارے خلاف کچھ بولے گا تو میں تمہاری حمایت میں بھی بولوں گا۔ یہ دکانداری کا اصول ہے۔ مجھے یہاں آنے والا ہر گاہک عزیز ہے۔"

باڈی بلڈر بل ادا کر کے خاموشی سے بابو برکت علی کو دیکھتا ہوا چلا گیا۔ اس کی میز پر سے شیشے کے ٹکڑے اٹھا لیے گئے تھے۔ [illegible] بچھایا گیا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک حسین عورت آئی۔ وہ جوان دوشیزہ نہیں تھی۔ بھرے بھرے بدن کی عورت تھی۔ اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا [illegible] تھے۔ کافی کا گھونٹ پیتے تھے یا دوستوں سے باتیں کرتے تھے۔ [illegible] وہ بابو برکت علی کے سامنے والی میز پر [illegible] گئی تھی۔

[illegible] اس کی میز پر [illegible] دو گلاس رکھے [illegible] کافی کا [illegible] اس کے بیٹھنے کے بعد [illegible] اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ اپنی پلکوں کو دیکھتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے؟ پھر اس نے ننھا سا رومال نکال کر دائیں آنکھ [illegible] کر دیا۔ جیسے

اگر کسی ہمالے نقاب پہننے کا رواج ہوتا تو چہرے کی بڑی جھریاں چھپ جاتیں۔ وہ خود کو پسند کرتا تھا۔ بالوں کی سفیدی اور چہرے کی جھریاں پختہ عمر کی دلیل ہیں بڑھاپے کا ثبوت نہیں ہیں۔

بہرحال اسے یقین تھا کہ سامنے دل پھینک کرے گی اگر نہیں کرے گی تو ایسی کوئی مجبوری بھی نہیں تھی۔ جو دیکھنے میں ہی بیگم صاحبہ لگتی ہو مجبوریاں پالتی ہو ... ہاتھ میں ... ابھی تک بے داغ تھا۔

کافی ہاؤس کے دروازے پر ایک نوجوان دوڑتا ہوا آیا۔ وہ خاصا خوبصورت تھا۔ بلیو جینز اور جیکٹ میں ایکشن فلموں کا ہیرو لگ رہا تھا۔ کہیں دور سے دوڑتا ہوا آیا تھا۔ دروازے پر ایسے رکا تھا جیسے بڑی مشکل سے خود کو بریک لگایا ہو۔ اس نے دور تک نظریں دوڑائیں۔ پھر بیگم کو دیکھتے ہی تیزی سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا۔ میز کے پاس کھڑا ہو کر بولا "ویری ویری سوری۔ مجھے دیر ہو گئی۔ یہ بس والے اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ جہاں بس روک دیتے ہیں، وہاں سے آگے نہیں بڑھتے۔"

بیگم نے دھیمی آواز میں غصہ دکھایا۔ "یو شٹ اپ! ایک لوگوں کو سمجھانے ... بیٹھ جاؤ۔ سانسیں درست کرو اور دھیمی آواز میں گفتگو کرو۔"

وہ میز کے دوسری طرف اس کے روبرو بیٹھ گیا۔ بیگم نے چہرہ ... سے ... وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ وہ ... تھا۔ یہ ... اس کے ساتھ ... بولنے والے فرینڈ کو ... "... میرے پاس گاڑی ہوتی ... تو میری ... ہوتی۔"

وہ بولا "میں شرمندہ ہوں مگر کیا کروں۔ میرے پاس بڑی مشکل سے بس کا کرایہ ہوتا ہے۔ میں آپ کو اپنے حالات بتا چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے لیے کچھ کروں گی بلکہ بہت کچھ کروں گی۔"

"شکریہ آپ۔ ... میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"یہ آپ آپ کیوں ... لگتے ہو۔ کیا میں عمر میں تم سے بڑی ہوں؟"

"جی وہ میں آپ کی عمر تو نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑا بنایا ہے ... آپ بڑی دولت مند ہیں اس لیے میں بڑی سمجھتا ہوں۔"

"... بڑی سمجھ کے آپ میں بڑی لگوں گی۔ ... دوست ... آپ کو دوست سمجھو۔ ... میری

خوش قسمتی ہے۔ آپ جیسے اس قابل بھی ہیں۔"

"آپ نہیں تم۔"

وہ کچکچاتے ہوئے بولا "تم! اچھا ٹھیک ہے تم کہوں گا۔ کبھی یہی ہو ... مجھے آپ سے تم پر لا رہی ہیں۔ مگر میں غریب آپ کو تم کہے گا تو لوگ کیا سوچیں گے؟"

"تم غریب نہیں رہو گے۔ میں تمہاری حیثیت بدل دوں گی۔ تم میرے برابر کے ہو گے۔"

"اوہ! مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔"

"کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟"

"جی نہیں میرا مطلب ہے، میں نے بہت غریبی دیکھی ہے۔ ایم اے کرنے کے بعد غیر یقینی حالات سے گزر رہا ہوں۔ اکثر خوابوں اور خیالوں میں دیکھتا رہا ہوں کہ راستہ چلتے مجھے سونے یا ڈالروں سے بھرا بریف کیس مل گیا ہے یا لاکھوں روپے کی لاٹری نکل آئی ہے۔ بیٹھے بیٹھے وارے نیارے ہو گئے ہیں یا پھر ایک بہت ہی دولت مند لڑکی مجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔"

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ بیگم نے جلدی سے پوچھا "میرے متعلق کیا خیال ہے؟"

"ان!" اس نے بیگم کو دیکھا پھر کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کے متعلق کیا خیال قائم کروں۔ سا... تو مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ آپ مجھ پر مہربان ہو گئی ہیں۔ یہ مجھے خواب یا خیال جیسا لگ رہا ہے۔ پھر میں نے خود کو سمجھایا کہ آپ کے پیچھے کوئی ٹریجڈی چھپی ہوئی ہے۔"

"کیسی ٹریجڈی؟"

"یہی کہ شاید آپ کا چھوٹا بھائی یا جوان بیٹا آپ سے بچھڑ گیا ہے۔ آپ اس کی کمی پوری کرنے کے لیے..."

وہ دانت پیس کر دھیمے سے بولی "گدھے کے بچے! میں تمہیں کسی جوان بیٹے کی ماں لگتی ہوں۔ یو ایڈیٹ۔ نانسنس۔ تمہارے جیسا چھوٹے دماغ کا، چھوٹی اوقات کا اور چھوٹے نصیب کا آدمی ایسی ہی چھوٹی بات سوچتا ہے۔ اور خوابوں کی دولت مند لڑکی تعبیر بن کر آئی ہے تو اسے سمجھ نہیں پاتا۔ دفع ہو جاؤ گیٹ لاسٹ۔"

وہ بوکھلا گیا۔ بات دیر سے سمجھ میں آئی مگر سمجھ میں آگئی کہ اس کے سامنے دولت مند بیگم صاحبہ نہیں ایک نوخیز حسینہ بیٹھی ہے...

اس لئے کہتے ہیں جو دولت کسی بھی ... کو حسین بنا دیتی ہے۔ اس نے میز پر جھک کر عاجزی سے کہا "مجھے معاف کر دو۔ میز کے نیچے دیکھو تو دونوں ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔ میں تمہیں کسی جوان بیٹے کی ماں نہیں کہہ رہا تھا۔ تم تو کسی پہلو سے شادی شدہ بھی نہیں لگتیں، پھر ماں کیسے ہو سکتی ہو۔ وہ بھی جوان بیٹے کی۔ لعنت ہے ایسا سوچنے والے پر۔ ہزار بار لعنت ہے۔ دیکھو میں تمہیں تم کہہ رہا ہوں۔"

وہ سنجیدگی سے بولا "ٹھیک ہے میز کے نیچے سے ہاتھ نکالو۔"
"نہیں نکالوں گی۔ پہلے غصہ تھوکو اور مسکراؤ۔"
"میرا مسکرانے کا موڈ نہیں ہے۔"
"ایک عاشق کا سوال ہے۔ محبت کے نام پر مسکراؤ۔"
وہ ہنسنے لگی۔ اس نے ایک ہاتھ نیچے سے لا کر میز پر رکھ لیا۔ وہ بولا "دوسرا ہاتھ بھی نکالو۔"
اتنے میں ویٹر آگیا۔ بیگم نے کہا "شہزاد کے لیے سینڈوچز اور کافی لے آؤ۔"
ویٹر چلا گیا۔ وہ بولا "تم نے ابھی تک ہاتھ نہیں نکالا۔"
"نہیں۔ پہلے تم اپنا ہاتھ میز کے نیچے لاؤ اور دوستی کا ہاتھ ملاؤ۔"
وہ مسکرا کر بولا "یہ رومانٹک آئیڈیا ہے۔ مگر لوگ کیا کہیں گے؟"
"میز کے نیچے شاید ہی کوئی دیکھے۔ اگر دیکھے گا تو جل جائے گا۔ میری قسمت پر رشک کرے گا۔"
بیگم نے دائیں بائیں دیکھا کوئی متوجہ نہیں تھا۔ شہزاد کے پیچھے دوسری میز پر ایک بابو برکت علی اجنبی نظروں سے عجیب چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ خوش ہو گئی۔ اسے دکھانے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ اونچی طور پر اٹھا کر میز کے نیچے لائی۔ شہزاد نے اسے پکڑ لیا۔
اس نے پکڑنے کو تو پکڑ لیا مگر جیسے تصور میں چار برس پیچھے چلا گیا۔ اس روز وہ صبح سے فاقے کر رہا تھا۔ شام کو گھر جاتے وقت اسے معلوم تھا کہ چھوٹی بہن بھی ماں باپ کے ساتھ بھوکی ہوگی۔ جیب میں صرف تین روپے تھے۔ اس نے گھر والوں کے لیے دو روپے کی ڈبل روٹی لی۔ بڑی ڈبل روٹی ڈھائی روپے کی آتی تھی۔ چونکہ باسی تھی اس لیے دو روپے میں مل گئی تھی۔ اس نے بھوک کے وقت ڈبل روٹی کو پکڑا تو وہ دنیا میں سب سے مہربان اور سب سے زیادہ پرکشش لگی۔ آج بیگم کا ہاتھ بھی سب سے مہربان اور سب سے زیادہ پرکشش لگ رہا تھا۔ بالکل ڈبل روٹی کی طرح ایسا ہی گول پھولا پھولا اور کچھ زیادہ نرم۔ ڈبل روٹی گرم نہیں بلکہ ٹھنڈک کی جمائی ہے وہ ہاتھ بھی ٹھنڈا تھا۔ برسوں پہلے فریزر سے نکل کر آیا تھا۔
وہ شرماتے ہوئے بولی "اب چھوڑو بھی۔"
اس نے چونک کر چھوڑ دیا۔ پھر کہا "تمہارا ہاتھ بہت خوبصورت ہے۔ شکر ہے تمہارا کرسٹ ڈود نکل گیا تھا۔"
وہ مسکراتے ہوئے سوچنے لگی۔ ہائے ایسے رومانی فقرے سننے کے لیے تو برسوں سے بے چین تھی۔ میرے پاس شہرت ہے دولت ہے مرتبہ ہے مگر شاعری کی وہ کتاب نہیں ہے جو جوانی میں کھو گئی تھی۔
شہزاد نے پوچھا "کیا سوچ رہی ہو؟"
"تم نے ان باتوں سے مجھے بھی دور کہیں گم کر دیا تھا۔ بتاؤ تم کیسا مستقبل چاہتے ہو؟"
"میرے بہت چھوٹے چھوٹے خواب ہیں۔ سوچتا تھا کوئی ملازمت مل جائے یا ٹیکسی ڈرائیور بن جاؤں۔ محلے میں پان سگریٹ کی دکان کھول لوں۔ مگر اب ویسا مستقبل چاہتا ہوں جو تمہارے شایان شان ہو۔"
وہ بولی "ملازمت بری نہیں ہے اگر وہ انکم ٹیکس یا کسٹم کے شعبے میں ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور بننا بری ہوتی بات ہے۔ ٹیکسی کا مالک بننا اور ترقی کرتے ہوئے کئی ٹیکسیوں کا گیراج کھولنا کامیابی اور فخر کی بات ہے۔ میں کچھ عرصہ تمہاری محبت اور وفاداری کو آزماؤں گی پھر تمہیں ٹیکسی خریدنے کے لیے رقم دوں گی۔"
"تمہاری آزمائش تک میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بھوکا مر جاؤں گا۔"
وہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ وہ جوان خوبرو تھا۔ پرکشش لگتا تھا۔ بے حد ضرورت مند تھا۔ ضرورت اسے اور مجبور کرتی تو وہ محبت کا چکر چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کر سکتا تھا اور وہ اُسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔
اس نے ویٹر کو بلا کر سو کا ایک نوٹ دیا۔ پھر "کیپ دی چینج" کہہ کر اٹھ گئی۔ شہزاد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بیگم نے آنکھ کے اشارے سے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ پیچھے چلتا ہوا کافی ہاؤس سے باہر آیا۔ بیگم نے کار کے پاس آکر کہا "تمہارا حلیہ ٹھیک نہیں جائے گا۔ تم میرے پیچھے ڈرائیور کی طرح چل رہے تھے، سوا آگے چلتا ہے یا بوائے فرینڈ کی طرح شانہ بشانہ رہتا ہے۔"
وہ شرمندگی سے بولا "آج پہلا دن ہے۔ کل سے غلطی نہیں ہو گی۔"
"مرد اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے عورت کے لیے دروازہ کھولتا ہے۔"
شہزاد نے جلدی سے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ وہ ہنستے ہوئے بولی "تم نے اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھولا ہے۔ کوئی بات نہیں میں خود ہی ڈرائیو کروں گی۔ آؤ کار میں بیٹھو۔"
وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ شہزاد کار کے دوسری طرف سے گھوم کر اگلی سیٹ پر آگیا۔ بیگم نے بیگ سے پانچ پانچ سو کے دس نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا "اپنے لیے نئے کپڑے خرید لو۔ سوٹ وغیرہ سلواؤ۔ پرسوں حلیہ بدل کر میری کوٹھی میں آؤ۔ یاد رکھو پیدل نہ آنا۔ ٹیکسی میں آنا۔ وہاں اگر کوئی شناسا موجود ہو تو باتوں میں ظاہر کرنا تمہاری کار گیراج میں مرمت کے لیے گئی ہے اس لیے ٹیکسی میں آئے ہو۔ اور ہاں جو نئی ماڈل کی گاڑی آنے والی ہوئی ہے تم خریدنا چاہتے ہو۔"
"میرے باپ نے کبھی ایک موٹر سائیکل نہیں خریدی۔ میں نیا ماڈل کیا خریدوں گا۔ مگر تمہاری باتیں سمجھ رہا ہوں۔ تمہارے مرتبے کا خیال رکھتے ہوئے ہنس کی چال چلوں گا۔"
"او کے! اب جاؤ۔ پرسوں شام کو اسی وقت کوٹھی میں ملاقات

ہو گی۔"

وہ کار سے باہر آیا پھر جلدی سے اندر آکر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا: "میں بھرپور محبت کے ساتھ رخصت ہونا چاہتا ہوں۔ مگر پبلک کے کنارے میں کار کے اندر صرف ہاتھ کو چومنے کی گنجائش ہے۔"

وہ جھک کر چومنا چاہتا تھا۔ بیگم نے جلدی سے ہاتھ کھینچ کر کہا۔

"میں نے تمہیں آگے بڑھایا ہے مگر تمہارے ساتھ زمانے سے گزرنا نہیں چاہتی۔ میں کوئی سستی لڑکی نہیں ہوں۔ اب جاؤ۔"

وہ باہر چلا گیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی پھر دھیمی رفتار میں ڈرائیو کرتی ہوئی جانے لگی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس نے ایک جوان عاشق کے سامنے خود کو لڑکی کہا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ بچپن سے خود کو لڑکی ہی کہتی آئی تھی یعنی سال ہا سال سے لڑکی کہتے رہنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا سبھی ایسا کہتی ہیں۔ کلب میں آنے والی بیگمات اگرچہ اپنے لیے 'لڑکی' کا لفظ استعمال نہیں کرتی تھیں۔ تاہم باتوں ہی باتوں میں اپنی عمر گھٹا دیتی تھیں۔ کہا کرتی تھیں "بہت چھوٹی عمر میں شادی ہو گئی اس لیے بچے جلدی جوان ہو گئے۔ ورنہ شادی کی عمر تو اب ہوئی ہے۔"

وہ اپنی عالیشان کوٹھی کے سامنے آئی۔ دربان نے بڑے سے گیٹ کو کھولا۔ وہ کار ڈرائیو کرتی ہوئی پورچ میں آ گئی۔ ایک ملازم نے آ کر ادب سے اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ باہر آئی۔ وہاں سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کاریڈور، لاؤنج میں پہنچی۔ چاروں طرف رنگ برنگ گلاب کھلے ہوئے تھے ان گلابوں کو دیکھنے سے ماضی کے بہت سے زخم کھل جاتے تھے۔ وہ منہ پھیر کر دروازے کی طرف آئی۔ ایک اور ملازم نے دروازہ کھولا۔ وہ اندر آئی۔ اندھیرا ہو چلا تھا چھت پر فانوس روشن تھے کوٹھی کے اندر کسی ملازم کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک پرانی خادمہ دن رات خدمت کے لیے موجود رہتی تھی۔ اسے معلوم تھا بیگم صاحبہ کس وقت کیا چاہتی ہیں۔ اس نے شب خوابی کا لباس الماری سے نکال کر باتھ روم میں رکھ دیا تھا۔ سامنے کے ٹب میں صابن کا جھاگ بھرا ہوا تھا۔ ٹب کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے ریک پر وسکی کی بوتل اور شیشے کا جام تھا۔

بیگم نے آئینے کے سامنے آ کر اپنے عکس کو دیکھا۔ سب سے پہلے اپنی آنکھوں سے مصنوعی پلکیں اتاریں، پھر سر سے سیاہ بالوں کی وگ اتاری۔ سر کے اصلی بال جگہ جگہ سے چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ صرف یہ دو چیزیں الگ ہونے سے اس کی صورت بدل گئی تھی۔ اس صورت میں کوئی بھی جوان اسے ماں کہہ سکتا تھا، محبوبہ ہرگز نہ کہتا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آتے آتے رہ گئے۔ اس نے فوراً ہی لباس اتارا پھر ٹب کے اندر صابن کے جھاگ میں جا کر بیٹھ گئی۔ بوتل کھول کر شیشے کے خوبصورت جام میں ڈبل پیگ لیا پھر ایک گھونٹ حلق سے اتار لیا

ایسے وقت سہارے کی ضرورت ہوا کرتی تھی مگر میں اور کوئی سہارا کہاں؟ سہارا نہیں تھا لہٰذا وہ سب کچھ بھلا دینے کے لیے مدہوشی کے راستے پر چل پڑی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چسکیاں لیتی رہی اور ٹشو پیپر سے اپنے آنسو پونچھتی رہی۔ دو چار ڈبل پیگ ختم کرنے تک غسل سے فارغ ہوئی۔ شب خوابی کا لباس پہن کر خواب گاہ میں آئی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ خادمہ نے ڈرائیر سے اس کے بال خشک کیے۔ وہاں بھی وہ مسلسل پیتی رہی۔ پھر خادمہ کھانا لگانے چلی گئی۔

بیگم نے پاس رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا۔ نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف رابطہ قائم ہوتے ہی آواز آئی: "ریکارڈ آن ہے۔ تمہاری باتیں ریکارڈ ہو رہی ہیں۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی: "میں کیا بولوں۔ جی چاہتا ہے تمہیں جان کہہ کر مخاطب کروں۔ مگر ایسا کس رشتے سے کہہ سکتی ہوں؟ ہمارا کیا تعلق ہے؟ یہ بھی کیسی بے تعلقی ہے۔ ہم انسانوں کی دنیا میں دشمن سے بھی دشمنی کا ایک رشتہ ہوتا ہے۔ تم نے میری ذات سے کوئی رشتہ رہنے نہیں دیا۔ میں چاہتی تھی کہ اسے توڑ دوں۔ مگر تم پہلوان ہو، مرد ہو۔ اگر تم نہیں توڑو گے تو میرے ہاتھ ٹوٹ جائیں گے۔"

وہ ریسیور کو ایک کان سے ہٹا کر دوسرے کان سے لگاتے ہوئے

بولی: "بابو برکت علی! تم نے اس جوان کو دیکھا ہے۔ اس کا نام شہزاد ہے۔ کیسا نوخیز اور بھرپور جوان ہے۔ میں کسی بڈھے سے دوستی کر سکتی تھی مگر تم نے ایک بار نہیں ہزار بار طعنے دیے کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں، کوئی جوان میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ آج تم نے اسے دیکھ لیا، آئندہ بھی اسے میرے ساتھ دیکھو گے۔

"اب بھی وقت ہے اپنے زہریلے الفاظ واپس لو۔ مجھے سوری کہو۔ تم ایسی طرح جلتے ہو۔ میں دولت کی چھاؤں میں اپنے حسن و شباب کی تعریفیں سن سن کر خوش ہوتی آئی ہوں۔ بڑھاپے کا طعنہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ مجھے سوری کہو۔ ایک بار اپنی غلطی تسلیم کر لو۔ نہیں کرو گے تو شہزاد سے نکاح پڑھوا لوں گی۔"

"ارے بے وفا! میں دولت مند ہوں تو کیا ہوا؟ کیا عورت نہیں ہوں؟ عورت امیر ہو یا غریب، اس میں وفا اور شرم ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حالات اور ماحول اسے بے شرم بنا دیتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے، میں ابھی تک شرم والی ہوں۔ آج بھی کسی دوسرے کو اپنا ہاتھ چھونے نہیں دیتی۔ شادی کے نام پر کسی غیر مرد کو برداشت نہیں کر سکتی۔ تم نے مجھے زندگی کے کس نئے موڑ پر لا کر چھوڑ دیا ہے۔ بتاؤ میں تمہارے پاس کیسے آؤں؟ کس رشتے سے آؤں؟"

وہ کہتے کہتے سسکنے لگی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔ اس کی آواز بھر گئی تھی۔ وہ بول نہیں پا رہی تھی۔ کچھ داستانیں ایسی ہوتی ہیں جو آنسوؤں میں ڈوب کر ادھوری رہ جاتی ہیں۔

○

بابو برکت علی تھوڑی دیر تک اپنی میز پر بیٹھا سوچتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ گزشتہ رات [illegible] بیگم سے [illegible] چل گئی۔ یہ تو بہت بڑی شکست [illegible] سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

وہ بڑی فکر سے اٹھ کر کاؤنٹر پر آیا۔ کافی ہاؤس کے مالک نے بڑے ادب سے پوچھا "میرے لائق کوئی خدمت؟"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بابو برکت علی نے کہا: [illegible] کا ذکر کیا تھا [illegible]

یاد ہے؟"

"اچھی طرح یاد ہے۔ کب اسے دیکھنا چاہیں گے؟"

"ہاں ابھی! اسی وقت دیکھ سکتا ہوں؟"

"آپ کے لیے دن دن نہیں، رات رات نہیں ہے۔ جس گھڑی حکم دیں گے، یہ بندی خدمت کے لیے حاضر ہو جائے گی لیکن ایک بات ہے جس کے لیے میں نے کہا تھا اس کا تعلق ایک معزز گھرانے سے ہے۔ آپ ان کے گھر نہیں جا سکیں گے۔ میں اس لڑکی کو اپنے ہاں بلا رہی ہوں۔ آپ آدھے گھنٹے بعد آ جائیں۔ آپ کو میرا گھر یاد ہے نا؟"

"بھولنے والے سب کچھ بھول جاتے ہیں مگر تمہارے گھر کا راستہ نہیں بھولتے۔ میں آ رہا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ کر کافی کا بل ادا کیا۔ پھر باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ شام کے [illegible] رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ کار ڈرائیو کرتا رہا اور سوچتا رہا کوئی نہیں آئے گی۔ میری شخصیت سے متاثر ہو کر کوئی نہیں آئے گی۔ عجیب بات ہے چند برس پہلے میں گلفام تھا۔ اس کیا بیتا کہ اب کوئی پوچھتا ہی نہیں۔

"آہ! عورت کیا چیز ہے، بوڑھی ہو جاتی ہے پھر بھی مرد اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے کہ اس کھنڈر میں کچھ باقی ہے یا نہیں۔ اب زمانہ اونچے طبقے میں معمر خواتین کا احترام نہیں رہا کیونکہ وہ خود بزرگ نظر نہیں آنا چاہتیں۔ جوانی کے پہلے لمحے سے بڑھاپے کی آخری سانس تک میک اپ میں تروتازہ دکھائی دینا چاہتی ہیں۔ نادرہ بیگم کی بھی یہی کوشش رہتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جوان خود بیگم کے پاس چل کر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی ضرورت اسے لائی ہوگی۔ بیگم اس کی بہت سی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ بن گئی ہوگی۔"

وہ آدھے گھنٹے بعد میڈم کے فلیٹ میں پہنچا۔ اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ گاڑی کی آواز سن کر میڈم کی بڑی بیٹی [illegible] مسکراتے ہوئے [illegible] کہا: "تشریف لائیے۔ ممی آپ ہی کا کام کرنے گئی ہیں۔ آتی ہی ہوں گی۔"

وہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ وہ بولی: "میرا نام شمع ہے۔ میں ایک [illegible] بچی ہوں۔ آپ [illegible] آپ کو کیا یاد ہوگا۔"

وہ تھی اسے یاد نہیں تھی۔ شاید ان دنوں [illegible] جوان تھا۔ حسیناؤں کا [illegible] لگتا تھا [illegible] کے بعد یاد نہیں رہتا۔ [illegible] شمع [illegible] اس سے پوچھا "آپ [illegible]؟"

"شکریہ! میں ابھی کافی پی کر آیا ہوں۔"

ایک نوجوان لڑکی فلیٹ کے [illegible] نے سلام کیا۔ شمع نے کہا: "یہ میری چھوٹی بہن [illegible] ہے [illegible] برس کی ہے [illegible]"

بابو برکت علی اسے دیکھ [illegible]

"صرف پانچ ہزار؟"

"مگر بیٹے مل رہے ہیں۔ اگر میں یہاں سے اُٹھ گیا تو نادانی بلکہ بیوقوفی ہوگی۔"

"بس آپ سے ذرا سودے بازی کروں گی۔ نہ آپ کو ناراض کروں گی۔ بس اپنی طرف سے میری بوتل کے پیسے بڑھا دیں۔ آپ جانتے ہیں، مجھے پینے کی عادت ہے۔ اس کے بغیر نیند نہیں آتی۔"

"ایک ہزار زیادہ دوں گا۔ میرا وقت برباد نہ کرو۔"

وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو برکت علی اُٹھ کر ایک کھڑکی کے پاس آیا، پھر باہر دیکھنے لگا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ لڑکیاں شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں، اس لیے انہیں بھاگنے میں دیر لگ رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد بڑی لڑکی حسنہ ڈرائنگ روم میں آئی۔ بابو برکت علی نے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ اس کے سر پر آنچل تھا اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا: "میں نے میڈم سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ لین دین میرے اور نیلما کے درمیان ہوگا۔"

وہ آہستگی سے بولی: "نیلما بچی ہے۔ ابھی دسویں جماعت کا امتحان دے رہی ہے۔ ہم دو بہنیں اُسے ایسے معاملے سے دُور رکھنا چاہتی ہیں۔ بہتر ہے آپ سائرہ کو پسند کر لیں۔ وہ آپ کے مقابلے میں بہت کم عمر ہے اور خوب صورت بھی ہے۔"

"جہاں تک پسند کا تعلق ہے، میں تمہیں بھی پسند کر سکتا ہوں، میڈم کی لڑکیوں کو بھی پسند کر سکتا ہوں۔ مگر یہ دل آنے کی بات ہے اور میرا دل نیلما پر آ گیا ہے۔ اس کے لیے لین دین کی بات کرو گی تو بیٹھتا ہوں ورنہ چلا جاتا ہوں۔"

حسنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولا: "اگر نصیب پلک سے لکھا جاتا تو آنسوؤں سے مٹ جاتا۔ اُسے مٹا کر دوسرا نصیب لکھا جاتا۔ میری یہ بات آنچل میں باندھ لو۔ ایک شریف لڑکی جتنے وقت روتی ہے، اتنی زیادہ حسین اور پُرکشش لگتی ہے۔ عورت کو زبردستی حاصل کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ مرد محبت کے معاملے میں بدمست ہوتا ہے اور ہوس کے معاملے میں قصائی۔"

وہ آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔ بابو برکت علی نے کہا: "کل نیلما کو کوئی اٹھا لے جائے گا۔ اس کی عزت سے کھیل کر چھوڑ دے گا۔ تب تم بہنیں رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکو گی۔ آج بھی تم دونوں بڑی اپنی عزت کی میت پر آنسو بہاتی ہو گی — آج کل میں تیسری بہن بھی ماتم کرے گی۔ پھر ایسا راستہ کیوں اختیار نہیں کرتیں جس پر چل کر تم تینوں جلد سے جلد سہاگن بن جاؤ۔"

حسنہ نے کہا: "ایسا صرف سوچا جا سکتا ہے مگر ہو نہیں سکتا۔ ہم میں سے کسی بہن کی شادی ہوگی تو اس کی سسرال والے سوال کریں گے کہ ہماری دو بہنیں راتوں کو کہاں جاتی ہیں؟"

"ایسے سوالات کا موقع ہی نہیں آئے گا۔ نیلما سے میرا معاملہ طے ہوتے ہی تم دو بہنیں راتوں کے عذاب سے نجات حاصل کر لو گی۔ عزت سے ملازمت کرتی رہو گی۔ اور یہ صرف پچاس دن کی بات ہوگی۔ آج سے میں تم تینوں کو پانچ پانچ سو روپے روزانہ دیا کروں گا۔ یوں پچاس دن میں ہر بہن کے پاس پچیس ہزار روپے جمع ہو جائیں گے۔ اتنی رقم جہیز کے لیے کم پڑے گی تو نیلما سے میری دوستی سو دن تک چلے گی۔ اس طرح روزانہ پانچ سو کے حساب سے ہر ایک کے پاس پچاس ہزار جمع ہوں گے۔ یہ میعاد جتنی بڑھانا چاہو گی رقم بھی بڑھتی جائے گی۔ میں نیلما کو خود نہیں چھوڑوں گا۔ وہ جب بھی چاہے مجھے چھوڑ کر جا سکتی ہے۔"

"آپ بہت ہی صاف گو ہیں۔ جو طریقہ بیان کر رہے ہیں اس سے کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ روزانہ اچھی خاصی رقم ملا کرے گی۔"

"بے شک جس روز تم نے مجھ سے تعلقات ختم کیے، سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن میں زبان کا دھنی ہوں۔ مخصوص رقم روزانہ ادا کروں گا۔ اور پہلی قسط ابھی کار میں بیٹھ کر دوں گا۔"

وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی۔ وہاں پھر دس پندرہ منٹ تک کھسر پھسر ہوتی رہی۔ اس کے بعد میڈم ان تینوں کے ساتھ آئی اور کہا "بابو صاحب! مبارک ہو، نیلما آپ کی ہو گئی۔"

وہ اُٹھتے ہوئے بولا: "میرے ساتھ آؤ۔"

میڈم تینوں کو ساتھ لے کر اُس کے پیچھے چلتی ہوئی فلیٹ کے باہر کار کے پاس آئی۔ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر نیلما کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ ہچکچا رہی تھی مگر میڈم نے اُسے زبردستی بٹھا دیا۔ دو بہنوں کے ساتھ خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بابو برکت علی نے اسٹیئرنگ سیٹ پر آ کر ڈیش بورڈ کے ایک حصے کو کھولا۔ وہاں نوٹوں کی گڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے چھ ہزار نکال کر میڈم کو دیتے ہوئے کہا: "آج سے ان لڑکیوں کو بھول جاؤ۔ ان کے لیے کبھی کسی سے سودا نہ کرنا۔ میری مرضی کے خلاف کبھی ایسا کرو گی تو پولیس والوں کو پیچھے لگا دوں گا۔"

"میں کان پکڑتی ہوں، کبھی ان لڑکیوں سے بات بھی نہیں کروں گی۔"

وہ کار سے نکل کر فلیٹ میں چلی گئی۔ بابو برکت علی نے حسنہ کو پندرہ سو روپے دے کر کار آگے بڑھاتے ہوئے کہا: "نیلما کے لیے شاپنگ ضروری ہے۔ نئے ملبوسات، ان سے میچ کرتی ہوئی چپلیں اور سینڈلیں اور میک اپ کا سامان وغیرہ لانا ہے۔ بیوٹی پارلر میں اس کا حلیہ تبدیل ہوگا تاکہ یہ میرے طبقے کی شہزادی نظر آئے۔"

حسنہ نے کہا: "اس کا حلیہ تبدیل ہوگا تو ہمارے محلے میں باتیں بنائی جائیں گی۔"

"گلشن اقبال میں میری ایک چھوٹی سی کوٹھی ہے۔ کل صبح تک وہاں شفٹ ہو جاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد کار ایک کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی۔ چوکیدار نے سلام کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ اندر کی لائٹس جلا دیں۔ حسنہ اور سائرہ مختلف کمروں میں جا کر کوٹھی کو دیکھنے لگیں۔ بالو برکت علی نے نیلما سے پوچھا: "تم خاموش ہو، نہ مسکراتی ہو نہ اداس ہو۔ کیا یہ کوٹھی اندر سے نہیں دیکھو گی؟"

نیلما نے خاموشی سے منہ پھیر لیا۔ اس کی یہ ادا بھی اچھی لگی۔ اس نے پوچھا: "مجھ سے ناراض ہو؟"

وہ پھر خاموش رہی۔ اس نے کہا: "میں تمہاری بہن سے یہ پوچھنا بھول گیا کہ تم بول سکتی ہو یا پیدائشی گونگی ہو؟"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کوٹھی کے باہر برآمدے میں آ گئی۔ وہ اس کے پیچھے آ کر بولا: "تم بڑی خاموشی سے میری انسلٹ کر رہی ہو۔"

نیلما نے ایک گہری سانس لی پھر کہا: "میں یہ جرأت نہیں کر سکتی۔ خاموش ہوں کہ کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں رہی۔ دل اور دماغ پر بوجھ ہے، کچھ بولنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"یہ بوجھ رفتہ رفتہ اتر جائے گا۔"

"آپ جتنی مہربانیاں کریں گے، بوجھ بڑھتا جائے گا۔ ہزاروں روپے قیمتی لباس مہنگا میک اپ، شاندار کوٹھی، سوسائٹی میں عزت بڑھتی جائے گی۔ یہ آدمی کا کمال ہے کہ عزت سے گرتا جاتا ہے۔"

"مجھے کڑوی گولیاں بھی لگتی ہیں۔ میں نگلنے سے پہلے یا نگلتے وقت منہ نہیں بناتا۔"

"آپ مجھ سے سودا کر کے نیکی کمانے کے لیے بھی ایسا کر سکتے ہیں۔"

"شوق کی حد نہیں ہوتی جیسا کہ تم دیکھ رہی ہو۔ انسانی فطرت کے مطابق نیکی کی حد ہوتی ہے۔ اگر تم فاقہ کر رہی ہو تو میں تمہیں روٹی کھانے کے لیے ایک روپیہ دوں گا۔ اگر کہیں حادثے میں زخمی ہو جاؤ اور میں وہاں پہنچ جاؤں تو تمہیں کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر اسپتال پہنچا دوں گا۔ کبھی کبھی نیکی کی حد بھی گزر جاتی ہے۔ مثلاً کوئی مولوی میلاد کا چندہ لینے آئے گا تو میں پانچ روپے دوں گا۔ تم چندہ مانگنے آؤ گی تو سو روپے دوں گا۔ ہم سب حالات کے مطابق نیکی کرتے ہیں اور شوق کے مطابق قیمت بڑھاتے یا گھٹاتے ہیں۔"

وہ الجھن کا اظہار کرتے ہوئے بولی: "دراصل جو بات میں کہنا چاہتی ہوں، وہ صحیح طور پر نہیں کہہ پا رہی ہوں۔"

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھوں کہ میں بہت بڑی نیکی بہت بڑی نیت کے ساتھ کر رہا ہوں۔ ورنہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

"میں ہاسٹل میں کہنا چاہتی ہوں آپ گریبان میں جھانک کر جواب دیجئے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا: "میرا پاکر پیسن ہو جوں جوں، رفتہ رفتہ معلوم ہو گا کہ ہمارے پاس گریبان ہوتا ہی نہیں ہے جیب کہیں گریبان جاتی ہے! البتہ مجھ میں اتنی شرافت ہے کہ میں زبردستی نہیں کرتا۔ میں نے تمہیں دیکھا اور قیمت لگائی۔ میں اب بھی کوئی جبر نہیں کر رہا ہوں۔ صبح تک گریبان میں جھانکتی رہو، اگر میں نا زخموں کو دیکھے پاس نہ آتا۔"

وہ سر جھکا کر بہنوں کے پاس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد تینوں باہر آ گئیں۔ اس نے پوچھا: "گھر پسند آیا؟"

سائرہ نے کہا: "یہ ہمارے خیالوں اور خوابوں سے بھی زیادہ بڑا اور خوبصورت ہے۔ یقین نہیں آ رہا کہ ہمارے دن بدل رہے ہیں۔"

اس نے حسنہ سے پوچھا: "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں کل اپنی بہنوں کے ساتھ یہاں آ جاؤں گی لیکن ایک بات ہے۔"

"ہاں ہاں بولو۔"

"ہمارے پاس پرانی الماری، ٹین کا صندوق اور دو چارپائیاں ہیں۔ اتنی شاندار کوٹھی میں ہمارا سامان مضحکہ خیز لگے گا۔"

"جو سامان ضروری سمجھتی ہو لے آؤ۔ باقی چھوڑ دو۔ یہاں نیا

ایک خاتون نجومی سے کہہ رہی تھیں: "میرا شوہر بے حد خرچ نہیں دیتا۔ سارے گھر کا سارا کام خود ہی چلاتی ہے۔ بات بات پر حکم چلاتی ہے۔ شکایت کروں تو شوہر الٹا مجھ پر ہی خفا ہوتا ہے۔ آخر ایسا کب تک رہے گا؟"

نجومی نے اطمینان سے جواب دیا: "کوئی تین برس تک۔"

خاتون نے خوش ہو کر پوچھا: "اور پھر اس کے بعد؟"

"اس کے بعد آپ عادی ہو جائیں گی۔" نجومی نے جواب دیا۔

ناصر ادریس • حیدرآباد

فرنیچر اور تمہاری ضرورت کا تمام سامان آجائے گا۔ کل گیارہ بجے میں کرنیلا
کو شاپنگ کے لیے لے جاؤں گا۔ میرے ساتھ جو جوان ہو گا وہ بل
چکا دے گا۔"

"شکریہ۔ آپ جائیں۔ ہمیں یہاں سے ٹیکسی مل جائے گی۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر آیا۔ وہ جاتے
جاتے نیلا کو نظر بھر کے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ دیکھنے کی چیز تھی۔ اسے بار بار
دیکھنا چاہتا تھا لیکن اسے بہت تک فیصلہ کرنے کا وقت دے چکا تھا۔
وہ انکار کر سکتی تھی۔ اس کا انکار سننے سے پہلے وہ اسے بار بار دیکھ کر اس
کی طلب بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اس پر نظر ڈالے بغیر یوں چلا آیا جیسے
اس کی خاص ضرورت نہ ہو۔ کراچی جیسے شہر میں ہزاروں مل جاتی ہیں۔

وہ آرام سے ڈرائیو کرتا ہوا اپنی کوٹھی کے احاطے کے قریب آیا۔ کوٹھی
شہر کے سب سے مہنگے علاقے میں تھی۔ نائٹ چوکیدار نے بڑے آہنی
گیٹ کو کھولا۔ کار اندر آئی تو ایک ملازم اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ
کھول کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ کوٹھی کا دروازہ کھولنے کے لیے ایک
اور ملازم تھا لیکن کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اتنی بڑی کوٹھی
میں صرف ایک بوڑھا ملازم تھا۔ اسے معلوم تھا صاحب کو کس وقت
کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے وارڈروب سے شب خوابی
کا لباس نکال کر باتھ روم میں رکھ دیا تھا۔ باتھ ٹب میں صابن کا
جھاگ بنا دیا تھا۔ ٹب کے پاس ہی ایک ہوا رنگ ٹرالی تھی جس پر ایک
بے لباس حسینہ کی مورت رقص کے انداز میں کھڑی ہوئی تھی۔ ٹرالی کے
گھومنے سے یوں لگتا تھا جیسے وہ حسینہ رقص کے انداز میں گھوم رہی
ہے۔ اس کے ساتھ ہی میٹھے سُروں میں دھیمی دھیمی موسیقی کی آواز ابھرتی
تھی۔ موسیقی کے اتار چڑھاؤ کے مطابق حسینہ پر رنگ برنگی روشنی کے
زاویے بدلتے رہتے تھے۔ ٹرالی کے نچلے حصے میں وسکی کی بوتل اور
شیشے کا خوبصورت جام رکھا ہوا تھا۔

بابو برکت علی اپنی خواب گاہ میں آیا۔ سب سے پہلے ٹیلیفون
کے پاس پہنچا۔ ریکارڈر کو ٹیلیفون سے الگ کر کے اندر رکھے ہوئے کیسٹ
کو ریوائنڈ کیا پھر اسے آن کرنے کے بعد جوتے اور جرابیں اتارنے لگا۔
ریکارڈر سے نادرہ بیگم کی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "بیٹے کیا ابو لیا
بھی جانتا ہے تمہیں یہاں کہہ کر مخاطب کروں۔ مگر ایسا کس رشتے سے کہہ
سکتی ہوں؟"

بابو برکت علی نے ناگواری سے منہ بنایا۔ ابھی وہ نیلا کے حسین بہار
چہرے کو دیکھ کر آیا تھا۔ نادرہ بیگم کی آواز بڑھاپے کی شام کا تصور پیش
کر رہی تھی۔ وہ ریکارڈر کو بند کر سکتا تھا مگر ایک تجسس تھا کہ نادرہ کے
ساتھ وہ جوان کون تھا؟

نادرہ کہہ رہی تھی ریکارڈر کے ذریعے کہہ رہی تھی۔ "بابو برکت علی!
تم نے اس جوان کو دیکھا ہے۔ اس کا نام شہزاد ہے۔ کیسا تو خیز اور بھرپور
جوان ہے۔ میں تمہارے بڑھاپے سے دو دو ہاتھ کرنے آئی تھی مگر تم نے ایک نہیں
ہزار بار محسوس کیے کہ میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ کوئی جوان میری طرف آنکھ
اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ آؤ تم نے اسے دیکھ لیا۔ آئندہ بھی اسے میرے
ساتھ دیکھو گے۔"

بابو برکت علی نے فوراً ہی قریب آ کر ریکارڈر کا بٹن یوں دبایا
جیسے گلا دبا رہا ہو۔ نادرہ بیگم کی آواز گھٹ کر مر گئی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا باتھ روم
میں آیا۔ "آئندہ تو اسے اپنے ساتھ کیا رکھ سکے گی۔ میں دکھاؤں گا جب
نیلا میرے بازو میں بازو ڈال کر چلے گی تو تیرا بڑھاپا عفونت کی طرح
ننگا ہو جائے گا اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ مرد بڑھاپے میں بھی جوان
رہتا ہے اور نیلا جیسی جوانیاں حاصل کرتا رہتا ہے۔"

وہ لباس اتار کر ٹب کے اندر جھاگ میں ڈوب کر بیٹھ گیا۔
حسینہ کی مورت ٹرالی پر رقص کر رہی تھی۔ اس نے ایک جام میں وسکی لی۔
ٹب سے ذرا فاصلے پر ایک آئینہ تھا۔ اس نے اپنے عکس کو دیکھ کر جام
اٹھایا۔ عکس نے بھی جام اٹھایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو "چیئرز" کہا
پھر اسے ہونٹوں سے لگایا۔ برکت علی نے ایک گھونٹ پی کر ایک مسرت
بھری آہ بھری۔ اپنی اہمیت جتائے بغیر بھی تسکین نہیں ملتی۔ جب تک
جوانی کا رعب اور دبدبہ رہتا ہے ہم اپنے شہر اپنے ملک اور ساری دنیا میں
نمایاں مقام حاصل کر کے اپنی شخصیت کو اہم بنانے کی جدوجہد کرتے
رہتے ہیں۔ عمل کی جدوجہد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کوئی کامیابی اہرام
کی طرح نمایاں رہتی ہے کوئی ہمیں مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتی
ہے۔ صرف ایک کامیابی ایسی ہے جو بڑھاپے کی رعونت کو توڑ دیتی ہے
اور وہ ہے پہلوانی۔۔۔"

برکت علی پہلوان نہیں تھا۔ ایک موٹر میکینک تھا۔ لوگ اسے
بابو مستری کہتے تھے۔ چار برس کی عمر میں ماں باپ مر گئے۔ چچا بری کا بوڑھا
تو بچپنے کے گھر سے نکال دیا۔ وہ قد اور جسامت میں ایسا پہلوان تھا کہ
پھر برس کی عمر تک بارہ چودہ برس کا لگتا تھا۔ پانچ چھ روٹیاں کھاتا
تھا۔ چچا اس کی خوراک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مستری کے
پاس گیراج میں اسے کام پر رکھوا دیا۔ وہ محنتی تھا۔ صبح سے رات گئے تک کام
کرتا رہتا تھا لیکن تین آدمیوں کا کھانا کھایا کرتا تھا۔ مستری بھی اس کی
خوراک دیکھ کر اسے گیراج سے بھگا دینا چاہتا تھا لیکن مستری کا ایک پہلوان
دوست وہاں آیا کرتا تھا۔ وہ برکت علی کو دیکھ کر کہتا تھا "یہ تو پیدائشی
پہلوان لگتا ہے۔ کیوں بھئی میرا اکھاڑے کا بچہ بنے گا؟ تجھے رستم زماں بنا دوں گا۔"

مستری کہتا تھا "اماں رہنے دو! جب تک تو اسے رستم زماں بنائے
گا یہ تجھے کھا جائے گا۔ یہ آدمی کی خوراک کھاتا ہے۔"

"اگر یہ پہلوان نے کہا "یہی تو پہلوانوں کی نشانی ہے میاں۔ اس
کا خرچہ اٹھاؤں گا۔ تم اسے میرے حوالے کر دو۔"

"جب چاہو لے جاؤ۔ یہ میری اولاد تو نہیں ہے کہ روک سکوں۔"

اس نے مستری سے کہا: "یار! میرے دل میں ایک بات پک رہی ہے۔ تجھ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

مستری نے برکت سے کہا: "اے بالو! جا ادھر افضل کے ساتھ کام کر۔"

بالو دور ایک گاڑی کے پاس کام کرنے چلا گیا۔ امام دین نے کہا: "یار! تو نے میری بیٹی کو دیکھا ہے! ابھی پندرہ برس کی ہے اور بجے نگر ہو گئی ہے۔ میں باپ ہو کر کہتا ہوں، ایسی بدصورت لڑکی گھر میں بیٹھی رہ جائے گی۔ پہلوانوں کو صرف لنگر کھائی ہے اگر میں لنگر سندر ہوں گا تو اکھاڑے میں مار جاؤں گا۔"

مستری نے کہا: "بیٹیوں کی فکر سے کبھی نجات نہیں ملتی۔"

"تم میرا ساتھ دو تو نجات مل جائے گی۔ یہ برکت علی آج کی عمر میں کیسا لگتا ہے۔ میں اسے کھلاؤں گا تو آٹھ دس برس میں میری بالو سے دوگنی عمر کا لگے گا۔ ابھی سے میرا احسان مند ہے گا تو بالو سے شادی کرے گا۔"

"تم نے بہت دور کی سوچی ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"صرف لے جانے سے بات نہیں بنے گی۔ تجھے بھی ساتھ دینا ہوگا۔ اسے پکا موٹر مکینک بنا دے۔ جب کمانے کے قابل ہو جائے گا تو اپنی خوراک کا بوجھ خود ہی اٹھایا کرے گا۔"

"مگر تو اسے پہلوان بنانا چاہتا تھا۔"

"وہ تو بناؤں گا۔ مگر پہلوانی میں بھی آمدنی اسی وقت ہوتی ہے جب بڑے بڑے نامی گرامی پہلوانوں کو پچھاڑا جاتا ہے اور میں ابھی کہہ نہیں سکتا کہ برکت کہاں تک میدان مار سکے گا۔ میں اپنی کوشش سے اسے پہلوان بناؤں گا۔ تو اسے زبردست مکینک بنا دے تو میری بالو تیری بھتیجی کی زندگی سنور جائے گی۔"

دونوں اس بات پر راضی ہو گئے۔ برکت کو بلا کر سمجھایا کہ آج سے وہ امام دین کے ہاں رہا کرے گا۔ پہلوانی بھی سیکھے گا اور گیراج میں آکر کام بھی سیکھتا رہا کرے گا۔ مستری نے کہا: "ہم دونوں تیری زندگی بنانا چاہتے ہیں۔ محنت کرے گا تو بہت بڑا آدمی بنے گا۔ بڑا نام کمائے گا۔"

برکت نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا: "آپ لوگوں کی مہربانی ہے۔ آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی کرتا رہوں گا۔"

امام دین نے پوچھا: "کیا ہمارا وفادار رہے گا؟"

وہ بولا: "استاد! آپ کے حکم پر جان بھی دے دوں گا۔"

وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ گھر میں بالو کو دیکھ کر برکت نے کہا: "سلام باجی!"

پہلوان نے گرج کر کہا: "ابے! یہ تیری باجی کیسے ہو گئی۔ ساتھ کھڑا ہو کر دیکھ، یہ تیرے برابر ہے۔ تو اسے بالو کہا کرے گا۔"

"جی اچھا، بالو کہوں گا۔"

"میرے ہاں کچھ پابندیاں ہیں۔ جب تجھے دودھ پینے اور مکھن کھانے سے کوئی نہیں روکے گا۔ تیری خوراک میں کمی نہیں ہوگی۔ جب تو پہلوان بن جائے گا، پوری طرح تیار ہو جائے گا اور پہلا دنگل جیت کر آئے گا تو بالو کی شادی تجھ سے کر دوں گا۔"

اس نے سر اٹھا کر بالو کو دیکھا۔ شام کے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں وہ کچھ ادھوری سی تصویر لگ رہی تھی۔ شادی کی بات سنتے ہی شرما کر چلی گئی۔ پہلوان نے کہا: "میں اپنی پہلوانی، اپنے علم کا ہنر اور اپنی بیٹی بھی تجھے دے رہا ہوں۔ تیرے جیسا خوش نصیب کوئی نہیں ہوگا۔ اگر انکار ہے تو ابھی بتا دے۔"

"استاد! میری کیا مجال ہے کہ میں انکار کروں۔ جو حکم دو گے وہ کروں گا۔ ساری زندگی تمہارے قدموں میں پڑا رہوں گا۔"

امام دین خوش ہو گیا۔ دوسرے دن صبح منہ اندھیرے سے پہلوانی کا سبق شروع ہو گیا۔ وہ سورج نکلنے تک ورزش کرتا تھا۔ پھر ڈنڈ بیٹھک سے لوٹ کر تازہ پھل کھا کر سیر دو سیر دودھ پیتا تھا۔ یہ خوراک روز بروز عمر کے ساتھ بڑھتی گئی۔ وہ دن کے دس بجے گیراج جاتا تھا۔ سہ پہر تین بجے واپس آکر کھانا کھاتا اور شام ہوتے ہی پھر اکھاڑے میں پہنچ جاتا تھا۔

ایک دن بالو نے کہا: "صرف پہلوان بننے سے کیا ہوتا ہے۔ کچھ پڑھنا لکھنا بھی سیکھو۔ میں تمہیں پڑھایا کروں گی۔"

وہ نویں جماعت تک پڑھی تھی۔ اسکول سے آکر اسے پڑھانے لگی۔ اس طرح وہ مصروف رہ کر دن رات گزارنے لگا۔ پڑھنے لکھنے میں زیادہ دل نہیں لگتا تھا۔ لیکن بالو کی عمر کے حساب سے دل لگانا سکھاتی تھی۔ جیسے جیسے دن گزرتے تھے وہ نکھرتا جاتا تھا۔ قد میں ابھرتا جاتا تھا۔ بیس برس کی عمر میں ساڑھے چھ فٹ کا پہاڑ جیسا جوان نظر آنے لگا۔ امام دین کے تمام داؤ پیچ سیکھ لیے۔ مستری نے اسے گاڑیوں کی مرمت کرنا سکھا دیا۔ بالو کی محنت اور توجہ سے اردو کی ہر کتاب پڑھنے لگا۔ انگریزی اخبار اٹک اٹک کر پڑھ لیتا تھا۔ وہ ایسا گبرو جوان بن گیا تھا کہ بالو اسے دیکھ دیکھ کر گھبراتی تھی۔ آئینہ دیکھتی تھی اور سوچتی تھی کوئی بھی حسین لڑکی اسے چھین کر لے جائے گی۔

اس کا اندیشہ غلط نہیں تھا۔ وہ پتلون شرٹ پہن کر کسی فلم کا ہیرو لگتا تھا۔ قریب سے گزرنے والیاں اس کے کسرتی بدن کو مڑ مڑ کر دیکھتی تھیں۔ کئی ہی ایسے گھرانوں کی عورتیں اپنی گاڑیاں لے کر گیراج میں آتی تھیں۔ گاڑیوں میں چھوٹی بڑی خرابیاں پیدا کر کے اس کے پاس آنے کا بہانہ ڈھونڈ لیتی تھیں یا ملازموں کے ذریعے اسے کوٹھیوں میں بلا لیتی تھیں۔

یہیں سے بالو برکت علی کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ آخر

وہ عورتوں سے کہاں تک بچ سکتا تھا۔ پہلی بار ایک رئیس زادی کے التفات کی طرف مائل کیا تو اس نے کہا: "میں تم سے دوستی نہیں کر سکتا۔"
رئیس زادی نے پوچھا: "کیوں نہیں کر سکتے؟"
"مجھ پر اُستاد کے اور مستری صاحب کے بڑے احسانات ہیں۔ میں نے دس برس پہلے زبان دی تھی کہ ان کا وفادار رہوں گا اور اُستاد کی بیٹی سے شادی کروں گا۔"
"تم اُس کی بیٹی سے محبت کرتے ہو؟"
"محبت کیا ہوتی ہے؟ اگر تم لیلیٰ مجنوں والی محبت کو پوچھ رہی ہو تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج تک جتنے محبت کرنے والے گزرے ہیں ان میں سے کوئی پہلوان نہیں تھا۔"
"یعنی پہلوان محبت نہیں کرتے۔ کیا وہ خوبصورت ہے؟"
"بہت ہی بدصورت ہے۔"
"سمجھ گئی تمہارے اُستاد اور مستری نے تمہیں الّو بنایا ہے ایک بدصورت لڑکی سے شادی کرانے کے لیے تمہاری پرورش کی ہے۔"
"انھوں نے مجھے ہنر مند بنایا ہے کیا یہ احسان نہیں ہے؟"
"تم کسی بھی گیراج میں کام کر کے مکینک بن سکتے تھے۔ کسی بھی پہلوان کے چیلے بن سکتے تھے اگر تمہارے پاس عقل اور سیکھنے کی لگن نہ ہوتی تو وہ تمہیں کبھی ہنر مند نہیں بنا سکتے تھے۔ پھر یہ بھی کوئی ہنر ہے۔ تمہیں مکینک کون کہے گا؟ تم ڈپلوما ہولڈر نہیں ہو۔ ملک کے اندر یا باہر بڑی موٹر کمپنیوں میں جاؤ گے تو تمہیں محض کاریگر کے طور پر رکھا جائے گا۔ جہاں تک پہلوانی کا تعلق ہے اگر ایک دنگل بھی ہار گئے تو چھٹی ہو جائے گی۔ کیا تم گیراج مستری بن کر ایسی شان و شوکت کی زندگی گزار سکتے ہو جیسی ہم گزارتے ہیں؟"
"نہیں۔ یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔"
"نصیب چالبازیوں سے بنتا ہے جیسے امام دین نے اپنی بیٹی کے لیے چالبازی سے تمہارا نصیب بنایا ہے۔ کیا وہ بغیر مطلب تمہیں روزانہ خشک میوے اور تازہ پھل کھلا سکتا تھا۔ روز چار پانچ سیر دودھ پلا سکتا تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ آج تک ایسا کوئی سخی داتا پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔"
"تمہاری باتیں دل کو لگ رہی ہیں۔ جب میں باڑو کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں تمہارے جیسی حسین لڑکیوں کو دیکھنے کے بعد اس کے ساتھ کیسے زندگی گزار سکوں گا۔"
"تم جب تک میرے پاس رہو گے ممی اور ڈیڈی لندن میں ہیں۔ تم یہاں سے جانے کے بعد عقل سے سوچ سکو گے۔ میں تمہیں چالبازی کا جواب چالبازی سے دینا سکھاؤں گی۔"
وہ نہ بھی سکھاتی، تب بھی وہ سیکھ جاتا۔ کیونکہ اس کی خوبروئی اور مردانہ وجاہت اُسے بڑی بڑی کوٹھیوں میں پہنچا رہی تھی۔ وہ دولت کی چکا چوند میں سوچنے لگا تھا کہ یہ شان و شوکت میرے پاس کیوں نہیں ہے۔ وہ فری اسٹائل کشتیوں کے لیے کئی بار ملک سے باہر گیا۔ باہر کی دنیا نے اس کی آنکھیں اور کھول دیں۔ اُدھر امام دین کہتا تھا: "بڑے دنگل جیت لیے۔ اب میری بیٹی سے شادی کر لے۔"
"اُستاد! ابھی بیوی بچوں کے چکر میں پڑوں گا تو پھر کوئی دنگل جیت نہیں سکوں گا۔ مجھے کچھ عرصہ دولت اور نام کمانے دو۔"
اس کی بات معقول تھی لیکن امام دین کو بیٹی کی عمر کا حساب زبانی یاد تھا۔ وہ تیس برس سے اوپر ہو گئی تھی۔ برکت کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہتی تھی۔ ایک گبرو پہلوان کو دن رات اپنے قریب دیکھ کر نہ جانے اس کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ اس نے اپنی ایک سہیلی کے ذریعے باپ تک یہ بات پہنچائی تھی کہ برکت پر بڑی بڑی خوبصورت لڑکیاں مرتی ہیں۔ گیراج میں آ کر اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ کیا باپ ان باتوں سے بے خبر ہے؟
وہ بے خبر نہیں تھا۔ اسی لیے برکت کے پیچھے پڑ گیا تھا اور برکت شادی کے معاملے کو ٹال رہا تھا۔ ایک دن اس نے اور مستری نے مل کر شرم دلائی۔ مستری نے کہا: "باؤ شرم کر! امام دین تیرا اُستاد بھی ہے اور باپ کی جگہ بھی ہے۔ اُس نے تجھے زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا۔ تو نے اس کے گھر میں قدم رکھ کر قسم کھائی تھی کہ اس کا وفادار رہے گا۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا اور باڑو سے شادی کرے گا۔"
وہ بولا: "مستری چاچا! کوئی کسی کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر نہیں پہنچاتا۔ آدمی اپنی محنت اور لگن سے شہرت کی بلندیوں پر پہنچتا ہے۔ کیا اُستاد نے مجھے مکمل طور پر پہلوان بنا دیا ہے؟"
امام دین نے کہا: "بے شک۔ تو خود دیکھ سکتا ہے۔ تو نے یورپ کے چار نامور پہلوانوں کو ناک آؤٹ کیا ہے۔"
"صرف چار پہلوانوں سے کیا ہوتا ہے۔ کیا میں اُستاد کو پچھاڑ سکتا ہوں؟"
"میں نے تجھے ایسے ایسے داؤ پیچ سکھائے ہیں کہ بڑے سے بڑا اُستاد بھی تیرے آگے ٹھہر نہیں سکے گا۔"
"تو میرا اُستاد ہے کیا میں تجھے پچھاڑ سکتا ہوں؟"
امام دین نے غصے سے کہا: "تو میرا بیٹا ہے اور مجھے پچھاڑنے کی بات کرتا ہے۔"
مستری نے پوچھا: "کیا تُو اُستاد سے دنگل کرنا چاہتا ہے؟"
"ہاں اگر یہ اُستاد ہے تو اپنی آن ذرا دکھائے۔ میں زبان دیتا ہوں کہ یہ مجھے پچھاڑ دے گا تو میں باڑو سے شادی کر لوں گا۔"
امام دین ایسی شرط سن کر دنگ رہ گیا۔ وہ بڑھاپے کے باعث لنگوٹ اُتار چکا تھا۔ دوسرے پہلوانوں سے مقابلہ کرنے کی عمر گزر چکی تھی۔ ایسے میں ایک شاگرد اُسے چیلنج کر رہا تھا۔ یہ اس کے لیے شرم

کی بات تھی۔ اگر شاگرد جیت جاتا تو وہ کسی کو منہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ اگر وہ شاگرد کو پچھاڑ دیتا تب بھی لوگ کہتے کہ بدمعاش، لنگوٹ باندھ کر لڑکی پچھاڑتا تو بے چارے شاگرد کو جو اس کے داؤ پیچ کا محتاج رہتا آیا ہے۔

اُس نے کہا۔ ”برکت! تو نے جس تھال میں کھایا اُس میں چھید کر رہا ہے۔ مجھے مشکل میں ڈال رہا ہے کوئی بات نہیں۔ میں تجھ سے مقابلہ کروں گا۔“

مستری نے کہا۔ ”امام دینا! دنیا والے کیا کہیں گے؟“

”مجھے دنیا والوں کی نہیں، بیٹی کی فکر ہے۔ اس سے پکے کاغذ پر لکھوا لو کہ میں اسے پچھاڑوں گا تو اس کے بعد کسی حیل و حجت کے بغیر یہ بانو سے شادی کرے گا۔ اب اس کی زبان کا بھروسا نہیں رہا۔ اس سے لکھوا لو۔“

مستری نے برکت کو اکیلے میں سمجھایا۔ ”اُستاد سے منہ زوری نہ کر۔ بیٹا باپ سے اور شاگرد اُستاد سے لڑے تو دنیا اس پر تھوکتی ہے۔ بانو تجھے پسند نہیں ہے کوئی بات نہیں۔ استاد کا دل رکھنے کے لیے شادی کر لے۔ وہ بے چاری ایک طرف گھر میں پڑی رہے گی۔“

”مستری چاچا! میں ماڈرن ہو گیا ہوں۔ گھر میں بھینس نہیں پالوں گا۔“

”ہار جائے گا تو بھینس پالنی ہی پڑے گی۔“

”وہ مجبوری ہوگی۔ ابھی میں مجبور نہیں ہوں۔“

وہ ماننے والا نہیں تھا۔ دوسرے دن اسٹامپ پیپر پر معاہدہ ہوا۔ برکت نے اس تحریر کے نیچے دستخط کیے کہ وہ امام دین سے کشتی ہارنے کی صورت میں بانو سے شادی کرے گا، اُسے تمام عمر خوش رکھے گا اور اس پر سوکن نہیں لائے گا۔ یہ بہت ہی کڑی شرط تھی۔ برکت کو جیتنے کا یقین تھا اس لیے اس نے پکے کاغذ پر بیٹی کے باپ کی تمام شرائط مان لیں۔

امام دین نے کہا۔ ”ہم دنیا والوں کے سامنے لڑیں گے تو دونوں کی بدنامی ہوگی۔ جب بازی ہاروں گا اور بیٹی کی شادی نہیں ہوگی تو وہ بھی مفت میں بدنام ہوگی۔ اس لیے ہم کسی ویرانے میں جا کر لڑیں گے۔ ہماری ہار جیت کا فیصلہ مستری کرے گا۔“

برکت نے یہ بات مان لی۔ اُس رات وہ تینوں سمندر کے کنارے سے دُور ویرانے میں گئے۔ چاندنی رات تھی۔ ساحل روشن تھا۔ دونوں نے کپڑے اتارے۔ اپنا اپنا لنگوٹ اچھی طرح کس کر باندھا۔ پھر ایک دوسرے کے مقابلے پر کھڑے سامنے آگئے۔ امام دین نے کہا۔

”اب بھی سوچ لے۔ یہ تو نمک حرامی کر رہا ہے۔“

برکت نے جنبتر بدلتے ہوئے کہا۔ ”میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں نے جتنا نمک کھایا ہے اُس سے زیادہ پسینہ بہایا ہے۔ پہلے تیرے بل دس بھینسیں تھیں پھر اٹھارہ ہو گئیں۔ میں ان سب کو نہلاتا تھا، اُن کا چارہ تیار کرتا تھا۔ روزانہ بھینسوں کا دودھ دوہنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنے والی بات ہے۔“

اُستاد نے شاگرد کو باتوں میں لگا کر اچانک ایک داؤ مارا۔ ایسی چال کو بھی اُستادی داؤ کہتے ہیں۔ مگر وہ صاف بچ نکلا۔ پھر پینترا بدلتے ہوئے بولا۔ ”میں نے دن رات محنت کی ہے۔ تجھے گرانے کی بھی کمائی دیتا رہا ہوں۔ یورپ کے دنگل سے حاصل کیے ہوئے پچاس لاکھ روپے میں سے چار لاکھ روپے تجھے دے چکا ہوں۔ پھر بھی تو مجھے نمک حرام کہتا ہے۔“

استاد نے پھر ایک داؤ آزمایا۔ وہ داؤ میں آگیا۔ تھوڑی دیر تک پھنسا رہا۔ پھر اس نے توڑ کیا تو اُستاد اس کے اوپر سے ہوتا ہوا دور ریت پر جا کر گرا۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ کمر کی ہڈی بُری طرح دُکھنے لگی تھی۔ وہ جوانی میں گرتے وقت فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ آج بڑھاپا گھٹ کر لمبا پڑ گیا۔ کیسے کھڑا ہو۔

تھوڑی دیر تک تینوں خاموش رہے۔ لہروں کا شور سنتے رہے۔ پھر برکت آہستہ آہستہ چلتا ہوا کپڑوں کے پاس آیا۔ اپنی شلوار اٹھا کر پہننے لگا۔ مستری نے کہا۔ ”رک جا بابو برکت علی پہلوان! ابھی میرا یار چاروں شانے چت نہیں ہوا ہے۔ اس کا ایک شانہ اٹھا ہوا ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں چاہتا ہوں اس کا شانہ اور سر ہمیشہ اٹھا رہے۔ آخر یہ میرا اُستاد ہے۔ تو گواہ ہے مستری چاچا! میں نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور کوئی داؤ نہیں مارا۔ صرف اس کے داؤ سے نکلنے کے لیے توڑ کیا تھا۔“

امام دین آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے اور کراہتے ہوئے بولا۔ ”یہ صفائی پیش نہ کر۔ میں حوصلہ ہارنے والا اور آسانی سے چت ہونے والا نہیں ہوں۔ تو کشتی چھوڑ کر جائے گا تو ہار تیری ہوگی۔“

وہ قمیص پہنتے ہوئے بولا۔ ”پکے کاغذ پر اس ویرانے میں مقابلے کی بات نہیں لکھی ہے۔ میں تیری عزت رکھنے یہاں آیا ہوں۔ اگر چیلنج کرے گا تو بھرے مجمع میں شرمندگی اٹھائے گا۔“

امام دین سوچ میں پڑ گیا۔ برکت نے کہا۔ ”میں بانو کے ساتھ بچپن سے ایک چھت کے نیچے رہتا آیا ہوں۔ تیرے گھر سے جا کر اسے رسوا نہیں کروں گا۔ میں اب بھی چند شرائط پر اُس سے شادی کر سکتا ہوں۔“

وہ جلدی سے بولا۔ ”منظور ہے۔ تیری ہر شرط منظور ہے۔“

مستری نے پوچھا۔ ”کیا چاہتا ہے؟“

”پہلے تم دونوں یہ اعتراف کر لو کہ ہماری دنیا میں انسان اپنی ضرورت اور فائدے کے مطابق دوسرے انسان کو خریدتا ہے۔ تم نے مجھ سے نیکی نہیں کی تھی۔ آدمی دولت سے خریدا جاتا ہے یا احسان سے۔ تم نے احسان کرتے کرتے مجھے خرید لیا تھا۔“

”چلو مان لیتا ہوں۔ میں نے تمہیں خرید رکھا تھا۔“

”تم بیٹی کی خاطر میری بات مان رہے ہو جب کہ میری ایک

بات نہیں، ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر بولو کہ بچے ہو اکبر پہلے اپنے گھر کیوں لے گئے تھے؟"

مستری نے چور نظروں سے اپنے یار کو دیکھا۔ دونوں چپ رہے۔ دونوں نے ایک چھ برس کے بچے کو تمام عمر پھانس کر رکھنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ امام دین نے کہا: "تماشا دیکھ رہا ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے معلوم تھا بانو کا رشتہ کہیں سے نہیں آئے گا۔ اگر کوئی داماد بننے کو راضی ہو گا تو وہ میری بھینسوں کے دودھ کی آمدنی کو اور میری زمین بیچ کر دیکھے گا۔ کوئی خود غرض اسے عمر بھر سکھی نہیں رکھے گا۔ میں نے سوچا تیری پرورش کروں گا، تجھے اچھا کھلاؤں گا، پلاؤں گا تو تُو میری بانو کی قدر کرے گا۔"

برکت نے کہا: "یہ بھی خود غرضی ہوئی کہ مجھے اچھا کھلانے پلانے سے بانو کی قدر ہو گی ورنہ نہیں ہو گی۔"

"ہاں مگر میں نے یہ بھی سوچا تھا بچہ میرے ہاں پرورش پا رہا ہے تو اس کا مزاج اور اس کی عادت معلوم ہوتی رہے گی اور میں اسے اپنے مزاج کے مطابق ڈھالتا رہوں گا۔"

"استاد! یہاں تجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ تُو نے مجھے بیٹا بنا کر نہیں سوچا۔ بیٹا اپنے باپ کی عادات و اطوار کو سکھائے بغیر سیکھتا ہے کیونکہ وہ باپ کا عقیدت مند ہوتا ہے۔ تُو نے میرے اندر عقیدت مندی نہیں غلامی پیدا کی۔ تُو نے مجھ سے بھینسوں کی خدمت کرائی۔ کبھی یہ نہیں چاہا کہ میں بھی بانو کی طرح اسکول میں داخل ہو جاؤں۔ ایک باپ کی اور ایک آقا کی پلاننگ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"میں اپنی حماقتوں کو تسلیم کرتا ہوں۔ تُو بانو سے شادی کی بات کر۔"

"میں اس سے شادی کروں گا۔ مجھے تیرا گھر تیری بھینسیں نہیں چاہئیں۔ تُو نے جتنی دولت جمع کی ہے اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گا۔ تیرا سب کچھ بانو کے نام ہو گا۔"

امام دین نے شدید حیرانی سے پوچھا: "یہ تُو کہہ رہا ہے؟ اپنی شرافت کا ثبوت دے کر مجھے شرمندہ کر رہا ہے۔ میں اسی قابل ہوں۔ مجھے ایک بار لو پھر دے، ایک بار لکھ دے کہ تجھے کچھ نہیں چاہیے۔ صرف بانو چاہیے۔"

مستری نے کہا: "بابو، یہ بات تو پہلے بھی کہہ سکتا تھا۔ کسی کے لیے پکے کاغذ پر لکھوانے کی کیا ضرورت تھی؟"

اس نے جواب دیا: "آدمی کو اٹھا کر پٹخ دو پھر کوئی بات سمجھاؤ تو فوراً سمجھ لیتا ہے۔ اگر پہلے کہتا کہ مجھے دولت نہیں بانو چاہیے تو تمہارے دماغ میں یہی کیڑا کلبلاتا کہ بچپن سے میری ذہنیت غلامانہ ہو گئی ہے۔ آقا اپنی بیٹی دے کر احسان کر رہا ہے۔"

امام دین نے پاس آ کر اس کے شانے اور بازو کو دباتے ہوئے کہا: "تو نے اپنا فیصلہ سنا کر مجھے غلام بنا لیا ہے۔ ہم ابھی سے شادی کی تاریخ مقرر کر لے۔"

"بانو تیری بیٹی ہے۔ تیرا نرم دل اس کے خون میں بھی شامل ہے۔ پھر بھی طعنے دے سکتی ہے کہ میں اس کے باپ کے ٹکڑوں پر پلتا رہا ہوں۔ وہ بیوی بن کر معزز سوسائٹی میں میرا پہچار کر سکتی ہے۔ اس لیے وہ شادی سے پہلے پکے کاغذ پر لکھ کر دے گی کہ گھر کی چار دیواری سے باہر میرے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی۔ کبھی میں دوسری شادی کروں تو اعتراض نہیں کرے گی۔"

"یہ تو بانو پر ظلم ہو گا۔"

"ظلم نہیں ہو گا۔ وہ شادی سے پہلے مجھے دوسری تیسری شادی کی اجازت لکھ کر دے گی تو میں اس کا ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔ اس کے تمام حقوق ادا کروں گا۔ اسے ہر طرح سے پہلی بیوی کا مان دوں گا۔"

وہ تینوں ساحل سمندر کے کنارے سے واپس آ گئے۔ باپ نے گھر آ کر بیٹی کو تمام روداد سنائی۔ اس نے کہا: "میں اسے بچپن سے جانتی ہوں۔ وہ دل کا بہت اچھا ہے۔ میں اسی کے لیے بیٹھی ہوں۔ ابا! اس کا قد ہے۔ آپ جیسا چاہتا ہے ویسا ہی لکھ دوں گی۔"

دوسرے دن تحریری معاہدہ ہو گیا۔ ایک ماہ بعد دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ ایک برس بعد وہ ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔ جب اس نے پہلی بار بیٹے کو ہاتھوں میں لے کر پیار کیا تو اس کے چہرے سے، آنکھوں سے اور پیار کرنے کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ ہر عورت کی طرح بانو کے دماغ میں بھی یہ بات آئی کہ مرد کو بچوں کی محبت میں اولاد کے مسائل میں الجھا کر رکھا جائے تو وہ ماں کی خاطر دوسری عورت کے قریب نہیں آتا۔

اس نے چند ماہ بعد دوسرے بچے کی فرمائش کی۔ برکت نے کہا: "ابھی جلدی مناسب نہیں ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی اچھی چیز ہے۔"

وہ ضد کرتی تھی، یہ انکار کرتا تھا۔ بچے کیسے پیدا کیے جاتے ہیں، یہ عورتیں ہی جانتی ہیں۔ وہ جب چاہتی ہیں احتیاطی تدابیر کے باوجود ماں بن جاتی ہیں۔ بانو نے چند ماہ تک خاندانی منصوبہ بندی کو بھی برداشت کیا۔ پہلے بیٹے کی پیدائش کے پانچ ماہ بعد برکت یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بانو کے پاؤں بھاری ہیں۔ اس نے پوچھا: "یہ کیسے ہو گیا؟"

وہ بولی: "میں کیا بتاؤں؟ اللہ تعالیٰ کی مرضی میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔"

دو برس بعد وہ دوسرے بیٹے کا باپ بن گیا۔ اس نے بیس برس کی عمر میں شادی کی تھی۔ بانو نے اسے تیئس برس میں تین بچوں کا باپ بنا دیا۔ تیسری بار بیٹی ہوئی۔ بانو نے کہا: "اب تم خوشی والے ہو

گئے ہو۔ باہر کی مصروفیات کم کرو۔ ایک شریف اور سنجیدہ باپ باہر کسی لڑکی کو دیکھتا ہے تو اپنی بیٹی ضرور یاد آتی ہے۔"

"کیا بکواس کرتی ہو۔ باہر آوارہ لڑکیاں بھی ہوتی ہیں کیا میں انھیں بھی بیٹیاں سمجھ لوں؟ تم تو بس چار دیواری میں بیٹھ کر مردوں کو مات دینے والی سیاست کرتی ہو۔ بے وقت سے پہلے بڑھاپے کا احساس دلاؤ گی تو میں بوڑھا نہیں ہو جاؤں گا۔ میں پہلوان ہوں۔ سلیا ہوں۔ تم اپنے بڑھاپے کا حساب کرو۔"

آدمی صبح کو سمجھتا ہے کہ شام ہوگی۔ زندگی کی سانس لیتے ہوئے یقین رکھتا ہے کہ موت ضرور آئے گی۔ لیکن جوانی میں کبھی یقین نہیں کرتا کہ وہ کبھی بوڑھا ہوگا۔ اس نے دودھ سے بھرا ہوا شیشے کا گلاس اٹھایا پھر اسے بانو کے سامنے لا کر صرف پانچ انگلیوں کے شکنجے میں دبا کر توڑ دیا۔ اس کے بعد کہا "یہ پہلوان کی جوانی ہے تیری بد دعاؤں سے نہیں جائے گی۔ یہ میری کوشش سے قائم رہے گی۔"

اس کی کوششیں بتاتی تھیں کہ وہ شاید جوانی کے بعد بھی جوان رہے گا۔ وہ پہلوانی کے مطابق صبح منہ اندھیرے اٹھتا تھا۔ کم از کم دو میل کی دوڑ لگاتا تھا۔ معمول کے مطابق ورزش کرتا تھا۔ ڈٹ کر کھاتا تھا۔ صرف اچھی سے اچھی خوراک کھانے سے بات نہیں بنتی۔ وہ تمام فکروں کو بھی کھا جایا کرتا تھا۔ اسی لیے جوانی کے پہلے دن کی طرح تر و تازہ دکھائی دیتا تھا۔ ہمیشہ جوان رہے گا۔ سمجھتا کہ وہ بوڑھا ہو رہا ہے نہیں تھا۔ تب ہی لڑکیاں اس پر مرتی تھیں۔ وہ لڑکیوں پر نہیں مرتا تھا۔

گھر سے باہر صرف ایک ایسی لڑکی سے عارضی تعلقات تھے جس نے اسے امام دین کے خلاف بھڑکایا تھا۔ اس کی غلامی سے نجات کا راستہ دکھایا تھا اور اسے سمجھایا تھا "ہم کسی غرض کے بغیر ایک دوسرے سے چھوٹی بھری نیکیاں کر لیتے ہیں لیکن ہر نیکی کے پیچھے کوئی غرض چھپی ہوتی ہے۔ خصوصاً امیر دوستی کسی خاص مقصد کے بغیر نہیں کی جاتی۔"

اس نے پوچھا تھا: "تم بھی مجھ پر پچھلے دو ماہ سے مہربان ہو۔ تمہارا کیا مقصد ہے؟"

"تم نے میری سہیلیوں کے مقابلے میں مجھے پسند کیا ہے۔ جب میں نے دیکھا تم مجھے ترجیح دے رہے ہو تو میں بھی تم پر مہربان ہو گئی۔ تمھیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ یہ مہربانی ایک ہفتے بعد ختم ہو جائے گی۔ میری ممی اور ڈیڈی لندن سے واپس آ رہے ہیں۔"

"واپس آنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم کہیں دوسری جگہ مل سکتے ہیں۔"

"سوری! میری شادی ہونے والی ہے۔ ایک ہفتے بعد میری طرف رُخ نہ کرنا۔"

ایک ہفتے بعد اس سے تعلقات ختم ہو گئے۔ کوئی دو ہفتے بعد اس کی ایک سہیلی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بولی "پچھلے دنوں تمھارے

"بیگم صاحبہ" گداگر نے ایک رحم دل خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اگر آپ نے آج پانچ روپے دے دیے تو مجھے ایک ایسے عمل کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس کے تصور سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جسم کانپنے لگتا ہے۔"

خاتون نے پانچ روپے کا نوٹ گداگر کو دیتے ہوئے ازراہ تجسس اس سے پوچھا: "خدا تم پر رحم کرے کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ میں نے تمھیں کس عمل سے بچایا ہے؟"

گداگر نے شکر و اطمینان کی ایک نگاہ نیک دل خاتون پر ڈالی اور کہا: "کام کرنے سے..."

گیراج میں آئی تھی۔ میں نے اپنی سہیلیوں سے تمھارا تعارف کرایا تھا اور تم مجھے چھوڑ کر روزینہ کے پھیر میں آ گئے۔ جانتے ہو میری کتنی انسلٹ ہوئی ہے؟"

"اس میں انسلٹ کی کیا بات ہے؟"

"میری دوستی ہو کر دوسری لڑکی سے ملتے ہو تو کیا یہ میری توہین نہیں ہوگی۔ ہم پانچ سہیلیاں ہیں۔ ہماری ہابی ہے کہ ہم کسی بڑی بات پر بڑی رقم لگاتے ہیں۔ تم سے پہلے بھی دو بار شرطیں لگا چکی ہیں۔ ایک بار میں نے دوسری بار شیبا نے شرط جیتی۔ اس بار تم نے روزینہ کو جتوا دیا۔"

"یہ شرط والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

وہ بولی "کوئی خوبرو جوان ہم پانچوں کو پسند آ جائے تو وہ ہم سب کے لیے چیلنج بن جاتا ہے کہ ہم میں سے کون اسے اپنی طرف مائل کرے گا۔ اسے بہت بڑا چیلنج بنانے کے لیے ایک لاکھ روپے کی شرط لگائی جاتی ہے۔ ہر لڑکی بیس بیس ہزار رکھتی ہے۔ ہمارا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ ہم اپنے اپنے طور پر اس نوجوان کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوششیں کرتی ہیں۔"

"یہ تو بے حیائی ہے۔"

"روزینہ کے ساتھ وقت گزارتے وقت تمھیں بے حیائی کا خیال نہیں آیا؟"

"میں سمجھ رہا تھا وہ محبت کرتی ہے۔ مگر یہ تو مشغلہ ہے۔"

"کیا یہ تمھارا مشغلہ نہیں ہے کہ گھر میں بیوی ہے اور تم روزینہ سے دل بہلاتے آ رہے ہو؟"

وہ جواب نہ دے سکا۔ وہ بولی "ہمارے باپ دادا امیر تھے

ایک کمسن کی بیٹی سے شادی کی ہے۔ مجھے اتنی جلدی شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ابھی میری جوانی اور فتح عروج پر ہے لیکن بات تو یہ ہے کہ وہ دس برس بڑی ہے۔ اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے شادی کرنی پڑی۔"

نادرہ نے بڑی دیر کی خاموشی کے بعد حیرانی سے پوچھا "تم سے دس برس بڑی ہے اور تم نے شادی کر لی؟"

"میں زبان کا دھنی ہوں، جان دے کر بھی قول پورا کرتا ہوں۔"

نادرہ نے دل ہی دل میں کہا: "پھر تو بڑے احمق ہو تمھاری شخصیت کا یہ پہلو مجھے پسند ہے۔ تم میرے پاس آتے جاتے یا تو قول توڑنا سیکھو گے یا پھر مجھے دیے ہوئے قول کے ہمیشہ پابند رہو گے۔"

برکت نے کہا "تم کسی سوچ میں گم ہو گئی ہو۔"

وہ چونکنے کے انداز میں بولی "ہاں میں نے تمھیں پہلی بار ٹی وی اسکرین پر دیکھا تھا اور یہ رائے قائم کر لی تھی کہ تمھیں آگے بڑھنے والا ایک ہاتھ مل جائے تو تم دولت، عزت اور شہرت کی بلندیوں کو چھو لو گے۔ مگر تم نے بیوی بچوں کی زنجیریں پہن لی ہیں۔"

اس نے پوچھا "بیوی بچوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دنیا کے ٹاپ کے بزنس مین بیوی بچوں والے ہوتے ہیں۔"

"وہ پہلے ٹاپ پر پہنچتے ہیں پھر شادی کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوں جنھیں بلندی تک جانے کے لیے کسی کے تعاون کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مگر تمھیں کسی کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔"

"مجھے یہ تعاون کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟"

"تم جان دے کر بھی قول پورا کرتے ہو۔ جو ایک ہی قول میں اٹک جائے وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اگر تم سے کہا جائے بیوی بچوں سے نجات حاصل کر لو اور صرف کاروبار میں لگ جاؤ تو تم کیا کرو گے؟"

"میں بیوی بچوں پر ظلم نہیں کروں گا۔"

"اگر کہا جائے تعلقات ختم نہ کرو صرف رابطہ ختم کر دو۔ ان کی ضرورت کے مطابق معقول رقم بھیجتے رہو۔ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتے رہو۔ ان کے لیے معقول حد تک جائیداد خریدتے رہو تو یہ ظلم نہیں ہو گا۔"

"ان سے رابطہ کیوں ختم کیا جائے؟"

"میں مزید وضاحت نہیں کر سکتی۔ جو بات میری سمجھ میں آئی وہ میں نے کہہ دی۔ تمھارے پاس سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا وقت ہے لیکن بہت کم وقت ہے۔ باہر میری گاڑی ہے جس کی تم نے مرمت کی ہے۔ اسے لے جاؤ اور اچھے داموں فروخت کرو۔ تمھیں میرا نہیں، پاپا کا دل جیتنا ہے۔ اب میں آرام کروں گی۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا "کل ملاقات ہو گی؟"

"جب تک بلندیوں کو چھونے کا معقول فیصلہ نہیں کرو گے میں تم سے نہیں ملوں گی۔"

"تم نے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ پھر بھی کل اپنا فیصلہ ضرور سناؤں گا۔ اس لیے جتنی دیر کروں گا اتنا ہی تمھارے دیدار سے محروم رہوں گا۔"

وہ اپنی مسکراہٹ کو چھپا نہ سکی۔ برکت اس کی چاہت کے انداز میں اسی وقت فیصلہ سنا چکا تھا۔ نادرہ جو چاہتی تھی اس کے لیے وہ اندر ہی اندر آمادہ ہو چکا تھا۔ وہ نادان نہیں تھا، یہ جانتا تھا کہ روزینہ کی طرح اور بھی لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں گی اور پتا نہیں اسے کتنی دور تک بہا کر لے جائیں گی۔ اسی لیے اس نے بانو سے پکے کاغذ پر لکھوا لیا تھا۔ وہ گھر سے باہر کسی معاملے میں مداخلت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے جس حال میں رکھا جاتا، وہ اسی حال میں زندگی گزار لیتی۔ پھر وہ بےحس اور بےمروت نہیں تھا۔ اپنے بچوں سے بہت پیار کرتا تھا اور پیار کا تقاضا تھا کہ ان کے بہترین مستقبل کے لیے ایک طویل عرصے تک ان سے دور رہے۔

اس نے دوسرے دن اپنا فیصلہ سنا کر نادرہ کا دل جیت لیا لیکن میدان جیتنے کے لیے نئی مشکلات سامنے آئیں۔ نادرہ کے والدین نے برکت کی شدت سے مخالفت کی۔ باپ نے کہا "بے شک مجھے اس کی کاروباری ذہانت پر بڑا ناز تھا۔ تم نے ایک بیوی بچوں والے کو پسند کر کے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔"

"پاپا! آپ اس کے بیوی بچوں کو بھول جائیں۔ ان کی موجودگی نہ ہونے کے برابر ہو گی۔ مجھے برکت کی سچائی اور وفاداری نے متاثر کیا ہے۔ وہ ہمیشہ میرا وفادار رہے گا۔ میں رفتہ رفتہ سوکن اور سوتیلے بچوں کا کانٹا نکال کر پھینک دوں گی۔"

ماں نے غصے سے کہا "میں پوچھتی ہوں آخر اس میں تم نے کیا دیکھا ہے؟"

"یہی سوال میں کروں گی کہ اس میں خرابی کیا ہے؟"

باپ نے کہا "بہت سی خرابیاں ہیں۔ وہ بہت چھوٹے طبقے

مرسلہ: فاطمہ کاظمی، کراچی

ایک لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ کو ٹیلی فون پر بتایا۔

"آج شام کو تم ہمارے گھر نہ آنا۔ پاپا بہت غصے میں ہیں۔ انھیں معلوم ہو گیا ہے کہ کل شام ہم ان کی کار لے گئے تھے۔"

بوائے فرینڈ نے پوچھا "مگر انھیں پتا کیسے چلا؟"

لڑکی بولی "پتا کیسے چلا؟ ہم نے ان کے ٹکر مار دی تھی نا۔"

سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا کوئی فیملی بیک گراؤنڈ نہیں ہے۔ کوئی ذات برادری نہیں ہے۔ کوئی سماجی مرتبہ نہیں ہے۔ تم ایک کچی عمر اور کچے ذہن کی لڑکی ہو۔ اس کی مردانہ وجاہت اور قد و قامت کو دیکھ کر متاثر ہو گئی ہو مگر ہم کچے نہیں ہیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے تمہیں گڑھے میں گرنے نہیں دیں گے۔"

"پاپا! میرے ذہن میں ایک زبردست پلاننگ ہے۔ میں بہت جلد اسے اپنی سطح پر لے آؤں گی۔"

"بحث نہ کرو۔ صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ ابھی تمہاری فیصلہ کرنے کی عمر نہیں ہے۔ اکیس برس کی ہو جاؤ گی تو تمہاری باتیں سنوں گا۔ تب تک برکت سے دور رہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے کبھی کسی کو بوائے فرینڈ نہیں بنایا۔ مجھے یقین ہے تم برکت سے بھی کوئی رابطہ نہیں رکھو گی۔"

باپ یہ کہہ کر باہر چلا گیا تاکہ بیٹی کو مزید بحث کا موقع نہ ملے۔ بیٹی بھی ضدی تھی۔ ماں باپ کے پیچھے پڑ گئی۔ تقریباً ایک ہفتے تک بحث چلتی رہی۔ اس نے برکت کی خاطر بھوک ہڑتال کی دھمکی دی۔ باپ نے کہا "میں تمہیں جان سے زیادہ چاہتا ہوں۔ ایک وقت بھی فاقہ کرتے دیکھوں گا تو زہر کھا کر مر جاؤں گا۔ میں زہر کی شیشی تمہاری مسلسل ضد اور ہٹ دھرمی کو دیکھ کر پچھلے دو دنوں سے اپنی جیب میں لیے گھومتا ہوں اور تم جانتی ہو میرا ارادہ کتنا اٹل ہوتا ہے۔"

وہ بھوک ہڑتال سے باز آ گئی۔ باپ نے کہا "مجھے زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو لندن جانے کی تیاری کرو۔ تم مستقل وہاں رہو گی اور اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھو گی۔"

"میں سمجھ رہی ہوں، آپ مجھے یہاں سے بھگا رہے ہیں۔ تاکہ میرا سوچا ہوا فیصلہ رفتہ رفتہ کمزور پڑ جائے۔"

"تم کچھ بھی سمجھو۔ اگر شام تک تم نے لندن میں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ نہ کیا تو صبح میری لاش دیکھو گی۔"

وہ مجبور ہو گئی۔ وہ اس کا آئیڈیل باپ تھا۔ اسے کانٹا چبھتا تھا تو وہ رو دیتی تھی۔ اس لیے باپ کی محبت کی خاطر جانے پر راضی ہو گئی۔ سفر کی شاپنگ کے لیے کار لے کر نکلی پھر برکت کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے پوچھا "کیا ابھی تک گول میز کانفرنس جاری ہے؟"

"ہاں، پاپا نے تم سے دور کرنے کے لیے مجھے لندن جانے کا حکم دیا ہے۔"

"اور تم جا رہی ہو؟"

"میں بتا چکی ہوں، مجھے پاپا سے کتنا پیار ہے۔ میں جاؤں گی لیکن تم سے دور نہیں رہوں گی۔ تم بھی لندن میں رہو گے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ یہاں میرے کاروبار کا کیا ہو گا؟"

"کاروبار منیجر اور ملازمین سنبھالتے ہیں بلکہ محض ان کی نگرانی کرتا ہے۔ اعلیٰ احکامات صادر کرتا ہے۔ تم پندرہ دن میں آ کر یہاں کی ذمہ داریاں پوری کر سکتے ہو پھر کسی امپورٹ لائسنس کے بغیر تم وہاں سے کئی کاریں اپنے شو روم میں لا سکتے ہو۔"

برکت بھی امپورٹ لائسنس کے بغیر ایسا دھندا جانتا تھا۔ یورپ کے کار ڈیلروں سے مل کر ہر ماہ دو ماہ میں کسی پاکستانی کو گفٹ کے بہانے کار دلائی جا سکتی ہے۔ گفٹ کاریں یہاں آتے ہی اچھے داموں فروخت کر دی جاتی ہیں۔ برکت کے پاس پہلے ایسے ذرائع نہیں تھے۔ اب وہ نادرہ کے تعاون سے ایسا کر سکتا تھا۔ نادرہ نے کہا "تم اچھا خاصا کاروبار بھی کرو گے اور انگریزی بھی آسانی سے سیکھتے رہو گے۔ اس سے بڑی خوشی کیا ہوگی کہ ہم ہر وقت ساتھ رہیں گے۔"

ان کے درمیان یہ طے پایا کہ نادرہ کی روانگی کے ایک ہفتے بعد وہ لندن جائے گا۔ لیکن نادرہ مقررہ دن نہ جا سکی۔ اچانک اس کی امی کا انتقال ہو گیا۔ وہ ماں کے سوگ میں باپ کے پاس رہنا چاہتی تھی۔ چالیس دن تک رہنا چاہیے تھا لیکن باپ اس بہانے برکت کا راستہ ہموار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بیٹی کو زبردستی لندن بھیج دیا۔ بھجوانے کے بعد اس نے سیکرٹری سے کہا "اپنی موٹر والے برکت پر نظر رکھو۔ دو چار روز میں بتاؤ کہ وہ یہاں موجود ہے یا نہیں؟"

سیکرٹری کی رپورٹ کے مطابق وہ موجود تھا۔ پھر ایک ہفتے بعد غائب ہو گیا۔ منیجر نے بتایا "برکت صاحب لاہور میں شو روم کے لیے جگہ خریدنے گئے ہیں۔ پتا نہیں کتنے ہفتے یا مہینے بعد آئیں گے۔"

بہرحال دو عشق کرنے والے دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لندن کی رنگین فضاؤں میں مرادوں کی راتیں اور محبت کے دن گزارنے لگے۔ ڈیڑھ برس بعد وہ اکیس برس کی ہو گئی۔ اس نے بالغ ہونے کا میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کیا پھر کورٹ میرج کے ذریعے مسز نادرہ برکت بن گئی۔

ان کے درمیان طے پایا کہ شادی کو جب تک راز میں رکھا جا سکتا ہے تب تک وہ سوسائٹی میں صرف دوست کہلائیں گے۔ جب نادرہ کا باپ اس کی شادی کے لیے بہت اصرار کرے گا تب وہ میاں بیوی ہونے کا انکشاف کریں گے۔ اس طرح اندیشہ تھا کہ باپ یا تو خودکشی کر لیتا یا پھر بیٹی کو اپنی دولت اور جائیداد سے محروم کر دیتا۔ نادرہ نے شادی تو کر لی تھی لیکن اندیشوں میں گھری رہتی تھی۔

خوش بختی برکت کے حصے میں آئی تھی۔ دو برس کے بعد نادرہ کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ وہ آخری سال لندن سے واپس آ گئی۔ اب وہ اپنی مرضی کی مختار ہو گئی تھی۔ باپ کے چالیسویں کے گزرتے ہی بے شمار خواستگار پیدا ہو گئے۔ دوسرے ماہ برادری سے اور اونچے طبقے سے شادی کے پیغامات آنے لگے۔ اس نے برکت سے شادی کرنے کا اعلان کر دیا۔

مل جائے گی تو وہاں تمہارے ساتھ زندگی گزاروں گا۔"

"احمقانہ خواب نہ دیکھو۔ تم جتنی بڑی کوٹھی خریدو گے وہ اس کوٹھی کے ایک گوشے کے برابر ہوگی۔ کیا تم ایک بڑی جگہ سے بے چھوٹی جگہ سے جاکر میری ہنسی اڑاؤ گے؟ میں ایسی نادان نہیں ہوں۔"

"میں کوٹھی خریدنے کے بعد تمہیں لینے آؤں گا۔ اگر انکار کرو گی تو ضد نہیں کروں گا۔ یہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مجھ سے زیادہ ضدی ہو لہٰذا تمہارے دعوے کی نفی نہیں کروں گا۔"

"تم بڑی خوب صورتی سے مجھے ضدی اور سرکش عورت کہہ رہے ہو جب کہ تم ضدی ہو۔ میں دیکھوں گی کہ کب تک نہیں آؤ گے۔ یہ خیال دماغ سے نکال دو کہ میں خوشامد کروں گی۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے بعد بڑی دیر تک غصے میں تلملاتی رہی۔ برکت اس کے پاس نہ آکر اس کی عالیشان کوٹھی کو ٹھکرا کر اس کی توہین کر رہا تھا۔ اُس کے خیال کے مطابق دوسرے مردوں کی طرح شادی کے بعد اپنا اصلی رُوپ دکھا رہا تھا۔ وہ ولیمے کی تقریب میں جانے سے پہلے آئینے کے سامنے بنی سنورتی رہی اور اس کا انتظار کرتی رہی۔ پھر غصے میں تنہا چلی گئی۔ اس نے سوچا کوئی ضرورت نہیں ہے کہ شوہر ہمیشہ باڈی گارڈ کی طرح ساتھ ہو کبھی تنہا اور آزاد بھی رہنا چاہیے۔

تقریب میں دوسری عورتیں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ جہاں سے گزرتی تھی، جس سے ملتی تھی، وہی پوچھتا تھا یا پوچھتی تھی "تمہارے صاحب نظر نہیں آ رہے ہیں؟ ایسی بھی کیا مصروفیت ہے۔ شام کے بعد اُن کا تمام وقت بیوی کے لیے ہوتا ہے۔ جو یہ وقت اپنی عورت کو نہیں دیتا وہ دوسری عورت کے پیچھے بھٹکتا ہے۔ مرد صرف دولت کی زنجیروں سے باندھ کر نہیں رکھا جا سکتا۔ اسے پابند رکھنے کے لیے حکمت عملی لازمی ہوتی ہے۔ تعجب ہے شادی کے چھ ماہ بعد ہی تم اکیلی ہو گئیں۔"

وہاں جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔ باتیں بڑے میٹھے انداز میں تھیں مگر نشتر کی طرح لگ رہی تھیں۔ یہ حقیقت پہلی بار سمجھ میں آئی کہ اب وہ سوسائٹی میں برکت کے بغیر اُدھوری ہے۔ شوہر ایک شناختی کارڈ ہوتا ہے۔ اگر وہ اس شناختی کارڈ کو ہمیشہ اپنے ساتھ نہیں رکھے گی تو معاشرہ اُسے مشکوک بری عورت سمجھے گا۔

اُس نے دوسرے دن فون کیا "برکی آجاؤ۔"

وہ غصے سے برکت کہتی تھی اور پیار سے برکی۔ وہ بولا "میں ایک کوٹھی پسند کرنے جا رہا ہوں۔ تمہاری پسند بھی ضروری ہے تم بھی چلی آؤ۔"

وہ بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے شوروم میں پہنچ گئی۔ وہاں دفتری کمرے کو اندر سے بند کر کے اس سے جھگڑا بھی کیا۔ پیار بھی کیا۔ اسے سمجھایا "جان! میری عزت کا خیال کرو۔ چار چھ لاکھ کی کوٹھی خریدو گے تو لوگ پیٹھ پیچھے میرا مذاق اڑائیں گے۔ میری کوٹھی ایک کروڑ بیس لاکھ کی ہے تمہیں کم از کم پچاس لاکھ کا مکان خریدنا چاہیے تھا۔"

"میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔"

"مجھ سے لے لو۔ دیکھو طعنے نہ دینا۔ میری محبت اور امداد کو خیرات نہ کہنا۔ تمہیں بڑی جلدی غصہ آجاتا ہے۔"

"میرے خیرات نہ کہنے سے کیا وہ امداد خیرات نہیں کہلائے گی؟"

"امداد نہ لو۔ قرض لے لو۔ قسطوں میں رقم واپس کر دینا۔"

"میرے شوروم کی آمدنی اتنی نہیں ہے۔ تمہارا قرض ادا کرتے کرتے میری آیندہ نسلیں بھی گزر جائیں گی۔"

"تمہاری آمدنی بڑھے گی۔ میں پلاننگ کر چکی ہوں۔"

"آخر وہ پلاننگ کیا ہے؟"

"تم مشہور و معروف سیاسی لیڈر آصف سردار کو جانتے ہو۔"

"اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تمہارے ڈیڈی کے بہت اچھے دوست رہ چکے ہیں۔ سیاست میں بڑا نام ہے۔"

"الیکشن قریب ہیں۔ یہ بڑا سیاسی لیڈر الیکشن میں کھڑا ہوگا تو مخالفوں کو شکست دیتا ہوا قومی اسمبلی میں پہنچے گا۔ اپنی سیاسی چالوں سے کوئی بڑا وزیر بھی بن جائے گا۔"

"یہ تم سیاسی باتیں کیوں چھیڑ رہی ہو؟"

"میں کاروباری باتیں کر رہی ہوں۔ الیکشن لڑنے کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم آصف سردار کو رقم دیں گے۔ پچیس لاکھ، پچاس لاکھ یا کچھ لاکھ جتنی اُسے ضرورت ہوگی۔ ہم اسے قرض دیتے جائیں گے۔ میں اُس سے معاملات طے کر چکی ہوں۔ وہ پچیس لاکھ لینے سے پہلے پچاس لاکھ کا پرونوٹ لکھ کر دے گا۔ یعنی جتنی رقم لیتا جائے گا اس کی دوگنی رقم کا قرضدار ہوتا جائے گا۔"

"کوئی مجبوری تو نہیں کہ وہ وزیر بن جائے اور ملکی خزانے کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر ہمیں منافع دیتا رہے۔"

"ریس کھیلنے والا ماہر پہلے گھوڑے کی ہسٹری معلوم کرتا ہے، اس کی میڈیکل رپورٹ دیکھتا ہے، اس کی چال اور چال بازی کے انداز کو سمجھتا ہے پھر بڑی بڑی رقم لگاتا ہے۔ میرے پاپا سیاسی داؤ پیچ کے ماہر تھے اور اکثر سیاست کے میدان میں اپنی پسند کے گھوڑے دوڑاتے رہتے تھے۔ انھیں صرف ایک بار ناکامی ہوئی ورنہ وہ ہمیشہ جیتنے والے گھوڑوں سے کاروباری مفادات حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے ایک بار مجھ سے کہا تھا 'یہ آصف سردار جیتنے والا گھوڑا ہے۔ آیندہ الیکشن میں اس پر رقم لگاؤں گا۔' آہ! ڈیڈی نہیں

ہے کہ میں اُن کے تجربات سے فائدہ اُٹھانا چاہتی ہوں۔"

"نادان لڑکی! تم کتنی بڑی رقم سے جوا کھیلنا چاہتی ہو؟"

"یہ جوا ہم کھیلیں گے۔ میں تمہیں قرض دوں گی یا تمہاری پارٹنر رہوں گی۔ رقم میری اور بھاگ دوڑ تمہاری ہوگی۔ خدانخواستہ نقصان ہوا تو میں برداشت کروں گی۔ فائدہ ہوا تو ففٹی ففٹی۔"

وہ بڑی بحث و تکرار کے بعد راضی ہوگیا۔ نادرہ ایک بہت ہی چالاک بزنس مین کی بیٹی تھی۔ اس نے برکت سے تحریری معاہدہ کیا۔ آصف سردار ایک معروف کاروباری علاقے میں بہت بڑی زمین کا مالک تھا۔ اُن دنوں وہ علاقہ کمرشل نہیں تھا۔ زمینیں بہت زیادہ مہنگی نہیں تھیں۔ نادرہ نے آصف سردار سے پرونوٹ لکھوایا اس کے عوض جتنی رقم دی اس میں زمین بھی اپنے نام کرالی۔ برکت نے الیکشن کا نتیجہ نکلنے تک اس زمین پر پلازا تعمیر کرایا۔ شہر کی آبادی آندھی کی رفتار سے بڑھتی جارہی تھی۔ رہائشی فلیٹ بک ہونے لگے۔ نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔ یہ کاروبار برکت کے نام سے ہو رہا تھا اور توقع سے زیادہ برکت ہو رہی تھی۔ خوش نصیبی اُس کے نام اور کام سے چپک کر رہ گئی تھی۔

آصف سردار الیکشن میں ووٹوں کی بھاری تعداد سے جیت گیا چونکہ وہ حکمران جماعت سے تعلق رکھتا تھا اس لیے کسی روک ٹوک کے بغیر وزیر بن گیا۔ نادرہ اور برکت کی چاندی ہوگئی۔ پانچ برس کے عرصے میں اس کی وزارت کے شعبے بدلتے رہے۔ اُن کی مناسبت سے برکت نے کبھی مہنگا منافع بخش سامان منگوانے کا امپورٹ لائسنس حاصل کیا۔ کبھی لانگ روٹ کی درجنوں گاڑیاں چلانے کا اجازت نامہ لیا۔ کبھی شہر کے مختلف ترقی پذیر علاقوں میں سرکاری کاغذات پر سستی زمینیں خریدیں۔ رہائشی فلیٹس، بنگلوز، شاپنگ سینٹر اور فائیو سٹار ہوٹل تعمیر کرائے۔ کسی کی کامیابی سمندر کے کنارے روشنی کے مینار کی طرح ایستادہ رہتی ہے۔ کسی کی کامیابی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ پانچ برس بعد آصف سردار کو سیاسی زوال آیا اور برکت کا شمار شہر کے چند بڑے سرمایہ داروں میں ہونے لگا۔

روشنی کے ساتھ سایہ ضرور ہوتا ہے۔ زندگی کے روشن پہلو کے ساتھ تاریک پہلو لازمی ہوتا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے اشتراک سے کامیابیاں حاصل کی تھیں لیکن مزاج دہی پڑا تھا۔ نادرہ کو ناز تھا کہ اس کی رقم اور حکمت عملی سے برکت سرمایہ داروں کی صف میں آگیا ہے۔ اگرچہ یہ درست تھا مگر یہ احسان اُسے مجروح کرتا تھا۔ وہ اپنی انا کی تسکین کے لیے کہتا تھا۔ "رقم اور حکمت عملی اس وقت تک کام نہیں آتی جب تک مجھ جیسا کام کرنے والا ایماندار آدمی نہ ہو۔ اگر تم میری بیوی نہ ہوتیں تو میں کروڑوں روپے ہضم کر جاتا اور تمہیں پتہ بھی نہ چلتا۔ ہماری کامیابی کی بنیادی وجہ میری دیانتداری اور محنت ہے۔"

وہ تسلیم نہیں کرتی تھی اپنی رقم کو اہمیت دیتی تھی اور کہتی تھی "جب میں ٹھوس منصوبہ بندی کرتی ہوں تو کام کرنے والے دیانتدار لوگوں کو ملازم بھی رکھ سکتی ہوں۔ دیانتدار تو چھوٹی تنخواہ کے عوض مل جاتے ہیں لیکن سچائی یہ ہے تم خود وہ مقام تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔"

"لعنت ہے تم پر اور تمہاری رقم پر جب دیکھو احسان جتاتی رہتی ہو کسی دن غصہ آگیا تو منہ توڑ کر ہمیشہ کے لیے زبان بند کردوں گا۔"

"پہلوانوں کی طرح دھمکی نہ دو۔ میں جاہل عورتوں کی طرح مار کھانے سے پہلے ہی تمہیں عدالت کے کٹہرے میں پہنچا دوں گی۔"

"میں وہ مرد نہیں ہوں جو عدالت میں پہنچ کر بیوی سے معافی مانگتے ہیں۔ میں اس سے پہلے ہی تمہیں طلاق دے دوں گا۔"

"ارے تم کیا دو گے۔ میں اپنے وکیل کے ذریعے طلاق کے کاغذات بھیج دوں گی۔ میں جس اونچی سطح پر زندگی گزار رہی ہوں وہاں ہم جیسی عورتوں کے لیے طلاق گالی نہیں ہوتی۔"

"تو پھر دیر کیوں کر رہی ہو، کاغذات بھیج دو میں دستخط کردوں گا۔"

وہ پیر پٹختی ہوئی دروازے تک گئی پھر وہاں سے پلٹ کر بولی۔ "ہم ایک ہفتے تک نہیں ملیں گے اور ٹھنڈے دماغ سے سوچتے رہیں گے اس کے بعد بھی ایک دوسرے کے لیے دل میں جگہ نہ ہوئی تو ہم علیحدگی اختیار کرلیں گے۔"

وہ برکت سے منہ پھیر کر چلی گئی۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے برکت کے لیے اب دل میں جگہ نہیں ہوگی۔ "وہ بے حد ملنسار سا، فراخ دل ہے، مہذب بھی ہے، بیوی کے ساتھ تمیز سے پیش نہیں آتا ہے۔ میں تو شادی کرکے پچھتا رہی ہوں،" اس نے سوچا۔

رفتہ رفتہ غصہ کم ہوا تو برکت نے سوچا: "نادرہ اچھی ہے بہت اچھی ہے۔ بس یہی خرابی ہے کہ طنز آمیز انداز میں احسان جتاتی ہے۔ اگر وہ انا کو مار دے کہ اپنے محبوب کی کامیابی اور کامرانی کے لیے رقم لگاتی رہی ہے تو میں محبت سے سر جھکا کر اس کی عظمت کا اعتراف کروں گا۔"

تیسرے دن جانے کیا ہوا اچانک ہی نادرہ کا سر چکرایا۔ وہ فوراً ہی بیٹھ گئی۔ یہ چند لمحوں کی بات تھی۔ وہ پھر نارمل ہوگئی۔ اسے گرمی لگ رہی تھی، بجلی گئی ہوئی تھی، ایئرکنڈیشنر خاموش تھے۔ اس نے انٹرکام پر سیکریٹری کو حکم دیا۔ "جنریٹر آن کردو۔"

اس نے جھک کر ریسیور رکھا تو اسی وقت متلی ہونے لگی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی باتھ روم میں آئی پھر بیسن پر جھک گئی۔ قے ہونے والی تھی مگر نہیں ہوئی تھی مگر حلق سے زرد پانی نکل رہا تھا۔ وہ خوش ہوگئی۔ شاید یہی ماں بننے کے آثار تھے۔ اس نے باتھ روم سے آکر ایک لیڈی ڈاکٹر کو فون کیا۔ وہ ڈاکٹر اس کی سہیلی بھی تھی۔ نادرہ نے مسکراکر

کہ وہ شاید مُراد پوری ہونے والی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے سر چکرایا تھا۔ پھر ابکائیاں سی آنے لگیں۔ تو ما جی آؤ۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو میرے کلینک کا وقت ہو گیا ہے۔ بڑی بڑی بیگمات میرے انتظار میں بیٹھی ہوں گی۔ تم کلینک آجاؤ۔"

"تو سیل وہ دیر کلینک نہ زیادہ بکواس نہ کرو۔ فوراً چلی آؤ۔ ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"یہ حکم دینے والی عادت سے باز نہیں آؤ گی۔ اسی لیے میاں سے تمہارا جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ ابھی آرہی ہوں۔"

وہ ریسیور رکھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ مسکراتے ہوئے چھت کو تکنے لگی۔ وہاں برکت نظر آ رہا تھا۔ اس پہلوان پر بڑا پیار آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ نائی بڑی خوش خبری اسے سنائے گی۔ وہ آئے گا تو پہلے اس کی گردن میں بانہیں ڈالوں گی۔ اس کے چٹان جیسے سینے پر سر رکھوں گی۔ پھر جھکی جھکی نظروں سے شرماتے ہوئے کہوں گی۔ میں ماں بننے والی ہوں۔

اونہوں۔ ماں بننا میرے لیے خوشی کی بات ہے۔ مجھے برکت کو خوش خبری سنانا ہے۔ میں کہوں گی تم باپ بننے والے ہو۔ مرد کو خوش کرنے کے لیے یہی کہنا چاہیے۔ مگر اس میں تشنگی کا احساس ہو رہا تھا۔ فقرہ نامکمل تھا۔ اس میں باپ کے لیے فخر تھا، ماں کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ وہ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر خوش ہو کر بولی۔ "یہ کہوں گی بدھو! میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

اس فقرے میں دونوں کی کوششوں کا ذکر ہے۔ وہ کھل کر مسکرائی۔ میں ایسا کہتے وقت لفظ "تمہارے" پر زور دوں گی یوں عورت کی طرف سے سند ہو جاتی ہے کہ بچہ تمہارا ہی ہے۔

بعض اوقات مسرتوں کے ہجوم میں خوشخبری سنانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کبھی الفاظ نہیں ملتے کبھی انداز بیاں نہیں ملتا۔ سمجھ میں نہیں آتا اس خوشخبری کو اس کی تمام خوشیوں سمیت کیسے سنایا جائے۔ اس کے سوچتے سوچتے لیڈی ڈاکٹر آگئی۔ آتے ہی بولی۔

"چپ چاپ لیٹی رہو۔ تم کسی دن پاگل ہو جاؤ گی۔ کبھی تمہیں پاؤں بھاری لگتے ہیں کبھی سر بھاری لگتا ہے۔ مہینے میں دو چار دن آگے پیچھے ہو جائیں تو میرے پیچھے پڑ جاتی ہو۔ اچھی طرح چیک کرائی ہو پھر رپورٹ سن کر مایوس ہو جاتی ہو۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں ماں بننے کی خواہش کو اپنے حواس پر طاری نہ کرو۔ خدانخواستہ دماغی مریضہ بن جاؤ گی۔"

"تم لڑتی بہت ہو۔ ڈاکٹر کو مریضہ کے معائنے پر پوری توجہ دینا چاہیے۔"

وہ باتھ روم میں دستانے اور ہاتھ دھونے کے لیے گئی پھر وہاں سے بولی۔ "میں ہمیشہ توجہ سے دیکھتی ہوں لیکن قدرت تم پر توجہ نہیں دے رہی ہے۔"

یہ سنتے ہی نادرہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ مرجھا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آنا چاہتے تھے مگر وہ ضبط کر رہی تھی۔ سہیلی نے کہا۔ "میری بات مان لو۔ برکت کا میڈیکل چیک اپ کراؤ۔"

"نہیں! مجھے ڈر لگتا ہے اگر وہ باپ بننے کے قابل نہ نکلا تو کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟"

"میں برکت سے کم تر ہو جاؤں گی۔ وہ باپ بن سکتا ہے میں ماں نہیں بن سکتی۔ اس معاملے میں وہ برتر ہوگا جب کہ میں ہر معاملے میں اس سے برتر رہتی ہوں۔"

"تمہارا یہ سوچنے کا انداز کسی دن تمہیں لے ڈوبے گا۔"

وہ رخصت ہو کر دروازے تک گئی پھر پلٹ کر بولی۔ "اب بھی وقت ہے سمجھ لو کہ مرد عورت سے برتر ہوتا ہے۔"

وہ چلی گئی۔ نادرہ تھوڑی دیر سوچتی رہی۔ اگر میں برکت سے علیحدگی اختیار کروں تو کسی دن ماں بننے کا چانس ہی ختم ہو جائے گا۔ میں پھر کبھی دوسری شادی کی حماقت نہیں کروں گی۔ نہ مجھے برکت جیسا محبت کرنے والا ملے گا اور نہ ہی میں کسی دوسرے کو دوسری شادی کے نام پر برداشت کروں گی۔ یہ بے حیائی مجھ سے نہیں ہوگی۔"

اس نے فون اٹھا کر رابطہ قائم کیا پھر کہا۔ "برکت! آجاؤ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"تم پھر کسی دن بڑے صاحب کی بیٹی بن کر بڑی بڑی باتیں کرو گی۔"

"تم اس قدر طعنے کیوں دیتے ہو؟ کیا تم نے نہیں سنا کہ دودھ دینے والی گائے کی لات کھانی پڑتی ہے۔"

"مرد گائے کی لات کھا سکتا ہے عورت کی نہیں۔ اور یہ بات تم ایک پہلوان کو سمجھا رہی ہو۔ میں ایسی صورت میں گائے کو ذبح کر دوں گا اور عورت کی ٹانگیں توڑ کر وہیل چیئر پر پہنچا دوں گا۔"

"تم بیٹھے میری ٹانگیں توڑ دو مگر آجاؤ۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ دونوں میں پھر دوستی ہو گئی۔ مگر بیوی عادتی ہوتی تھی اور جھگڑے بھی زیادہ طوالت اختیار نہیں کرتے تھے۔ اس طرح دن، مہینے اور سال گزرتے گئے۔ شادی کو بیس برس گزر گئے پھر تیس برس گزر گئے۔ مگر اولاد نہ ہوئی۔ بڑھاپا جوانی کی دہلیز پر دستک دے رہا تھا۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ جوانی ڈھل گئی ہے۔ ابھی ایک بچہ بھی نہیں ہوا۔ جسم پر تخلیق کے کرب کا زلزلہ نہیں آیا۔ میں کہیں سے کمزور نہیں ہو سکتی ہوں۔ یہ تو چند برسوں کی بات ہے جب میں دلہن بنی تھی۔ اتنی جلدی تیس برس کیسے گزر سکتے ہیں۔ مجھے حساب میں غلطی ہو رہی ہے۔"

ایک دن برکت نے کہا۔ "اولاد کی تمنا ہے تو کسی کا بچہ گود لے لو۔"

"میں تمھارا بچہ چاہتی ہوں۔"

"اب یہ ممکن نہیں ہے۔ تم بوڑھی ہو چکی ہو۔"

یہ سنتے ہی وہ بھڑک گئی: "کیا میں تمھیں بوڑھی لگ رہی ہوں؟ ابھی ایک بچے کو جنم نہیں دیا ہے۔ مائیں بننے والی عورتیں بوڑھی ہوتی ہیں۔ میں تو سہاگ کی پہلی رات میں جیسی تھی ویسی ہی آج بھی ہوں۔ تم میرے ساتھ نہیں رہتے ہو تو لوگ مجھے کنواری سمجھتے ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ وہ اور زیادہ بھڑک کر بولی: "تم میرا مذاق اڑاتے ہو۔ کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟"

"تم شوہر کے سامنے خود کو کنواری کہلانا چاہتی ہو تو اس سے بڑا مذاق اور کیا ہوگا؟"

"میں تم سے مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ مجھ پر ہنسنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ اپنی عمر چھپانا چاہو گے تب بھی نہیں چھپا سکو گے۔ تمھاری پوتی اور پوتے جوان ہو گئے ہیں۔ تم سیلوں کو دے میک کے بغیر بوڑھے نظر آتے ہو۔"

وہ کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ برکت نے پانی سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر اسے دکھایا۔ پھر اسے پانچ انگلیوں کے شکنجے میں رکھ کر دبایا تو وہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ اس نے فاتحانہ انداز میں کہا: "میں پہلوان ہوں اور پہلوان کبھی بوڑھا نہیں ہوتا ہے۔ آج بھی جس بھی کو نظر بھر کے دیکھوں تو وہ کھنچی چلی آئے گی لیکن کوئی لڑکا تمھیں گھاس نہیں ڈالے گا۔ تم پہلی نظر میں کاٹھ کباڑ لگتی ہو۔"

وہ بارود کی طرح پھٹ پڑی۔ کانچ کی پلیٹ اٹھا کر پھینک دی پھر کہا: "تم کیا تھے؟ ہو ایک کانچ کی پلیٹ جسے پہلی ملاقات میں اٹھا کر پھینک دیتی تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ میں نے تمھیں کھانے کی میز پر رکھ کر غلطی کی۔ میرا نمک کھاتے ہو اور میرا مذاق اڑاتے ہو۔"

"شٹ اپ۔ ذلیل عورت! میں اپنی محنت کی کمائی کھاتا ہوں اور اپنی کوٹھی میں رہتا ہوں۔"

"تمھارے پاس جو کچھ ہے، وہ سب میرا دیا ہوا ہے۔ میری رقم اور میری پلاننگ نے تمھیں زمین سے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ تم اپنی اوقات بھول گئے ہو۔"

پہلوان سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ کرسی سمیت الٹ کر پیچھے فرش پر گر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگی۔ ہاتھ کرارا پڑا تھا لیکن وہ پچھلے تیس برس سے اس بڑھاپے کو برداشت کرتی آ رہی تھی۔ اسے تکلیف چوٹ کی نہیں تھی، اپنی بے عزتی کی تھی۔ اس کا نمک کھانے والے نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ ایک بڑے باپ کی معزز بیٹی کو پیٹ دیا تھا۔ وہ غصے میں پاگل ہو گئی تھی۔ چیختی جا رہی تھی اور چیزیں اٹھا اٹھا کر برکت کو نشانہ بنائے جا رہی تھی۔

شفیق الرحمٰن کی "دجلہ" سے اقتباس

ایک خاتون کو بے خوابی کی شکایت تھی۔ معالج نے بتایا کہ رات کا کھانا اچھی طرح کھایا کرو۔ نیند ضرور آئے گی۔ ڈیڑھ مہینے کے بعد وہ پھر اس کے پاس گئی اور نیند کی کمی کی شکایت کی۔ اتفاق سے وہ مریضہ کو بھول چکا تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ رات کا کھانا بالکل ہلکا پھلکا ہونا چاہیے پھر آپ مزے سے سوئیں گی۔ خاتون نے یاد دلایا کہ ڈیڑھ ماہ پہلے تو آپ نے بالکل الٹ بتایا تھا۔ اس پر معالج نے فوراً جواب دیا: "خاتون! آپ نہیں جانتیں کہ اس ڈیڑھ مہینے میں میڈیکل سائنس نے کتنی ترقی کی ہے۔"

کہتے ہی ملازم دوڑتے ہوئے آ گئے۔ برکت نے ڈانٹ کر کہا: "بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

وہ سب چلے گئے۔ اس نے کہا: "میں تیس برس سے تمھارے نخرے سہ رہا ہوں اور آج تک یہ سوچ کر برداشت کرتا آ رہا ہوں کہ میری محبت تمھیں ایک دن صحیح معنوں میں شریکِ حیات بنا دے گی لیکن تم ایک مغرور اور بد دماغ ملکۂ عالیہ ہی بن کر رہنا چاہتی ہو۔ تمھاری فطرت اور کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہوگی۔ اس لیے میں پورے ہوش و حواس میں رہ کر تمھیں طلاق دیتا ہوں۔"

"طلاق نہیں لوں گی۔ میں نے آج تک تم سے کچھ نہیں لیا ہے۔ ہمیشہ دیتی آئی ہوں۔ اس لیے طلاق بھی میں ہی دیتی ہوں۔ طلاق... طلاق۔۔ طلاق۔۔ میرا وکیل طلاق کے کاغذات لائے گا۔ دستخط کر دینا۔"

وہ غصے میں تنتناتی ہوئی اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ برکت وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد ایک ہفتے کے اندر طلاق کی کارروائی بھی مکمل ہو گئی۔ وہ ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو گئے۔ پھر کبھی ایک چھت کے نیچے ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔

اس کی پہلی بیوی بانو مر چکی تھی۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے بچے بھی جوان ہو گئے تھے۔ برکت کا جوان پوتا اپنے دادا کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا پہلوانی سیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کے لیے اور بچوں کے بچوں کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ ان سب کو الگ الگ کاروبار سے لگا چکا تھا۔ وہ اپنے باپ اور دادا سے ملنے والی بڑی بڑی رقومات کو صحیح طور پر استعمال کر رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر برکت کو اطمینان ہوتا تھا۔ اس نے زندگی کے میدان میں بہت کچھ جیت لیا تھا۔ شکست نادرہ کے حصے میں آئی تھی۔

وہ طلاق کے چند دنوں بعد ہی پچھتانے لگی۔ پچھتاوا یہ تھا کہ آزمانے کر وہ برکت سے کتنا پیار کرتی ہے۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہو گئے تھے۔ وہ سوچتی تھی اور خود پر لعنت بھیجتی تھی۔ غصے اور غرور کو لپیٹ کر سامنے سے فوراً پھینکنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ پچھتاوے کے عمل میں اپنی اصلاح کر سکتی تھی اب تو کچھ کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔

اس نے چھ ماہ تڑپ تڑپ کر گزارے۔ پہلوان نے اُسے اپنا عادی بنا دیا تھا۔ وہ اس سے ملے بغیر اور جھگڑا کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے ایک رات فون کیا۔ برکت نے اس کی آواز سن کر پوچھا: "کس رشتے سے فون کر رہی ہو؟"

"کیا ابھی تک غصے میں ہو؟"

"غصہ بھی کسی تعلق سے کیا جاتا ہے۔ تم سے نہ کوئی تعلق ہے نہ غصہ ہے۔"

"برکی! میں اکیلی ہوں۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"میرے پاس آجاؤ یا مجھے بلا لو۔ دو انسان کسی رشتے کے بغیر بھی ملاقات کر سکتے ہیں۔"

"ہم مختلف انسان ہیں۔ ہمارا مذہب مطلقہ بیوی سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

"کوئی ایسی بات کرو جس سے ملنے کی صورت نکل آئے۔"

"کسی ایسی بات کی گنجائش نہیں رہی۔"

"تمہارے دل میں میرے لیے جگہ ہو گی تو گنجائش نکل آئے گی۔"

"آج بھی تمہارے لیے دل میں جگہ ہے لیکن جوانی میں تمہارا غصہ قابلِ برداشت تھا بڑھاپے میں ناقابلِ برداشت ہو گئی ہو۔"

"دیکھو تم پھر مجھے بڑھاپے کا احساس دلا رہے ہو۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ ابھی کل ہی لیڈیز میگزین والا ٹائٹل پر میری تصویر شائع کرنے لے گیا ہے۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ میں جوان ہوں؟"

"تصویر میں تاج محل کا بیرونی حُسن نظر آتا ہے۔ اُس کے اندر کی پرانی قبر نظر نہیں آتی۔ یہ حقیقت تو سارا جہاں جانتا ہے۔"

"تم پھر میری انسلٹ کر رہے ہو۔ مجھے سوری کہو۔"

"میں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔"

"تم اپنے بڑھاپے کا غصہ مجھ پر اُتار رہے ہو۔ کیا میری محبت کی خاطر سوری نہیں کہہ سکتے۔ دوستی کی کوئی صورت نہیں نکال سکتے؟"

"ایک ہی صورت ہے۔ حلالہ کرا لو۔"

"کیسی بے شرمی کی باتیں کر رہے ہو۔ میں کسی دوسرے سے شادی کروں۔ وہ طلاق دے تو تمہارے پاس آؤں۔ یہ کبھی نہیں ہو گا۔ آئندہ میری تنہائی میں کوئی دوسرا نہیں آئے گا۔"

"تو پھر دوری برداشت کرتی رہو اور یہ تسلیم کرنے کا حوصلہ پیدا کرتی رہو کہ اس عمر میں کوئی تم سے شادی نہیں کرے گا۔"

"یو شٹ اپ۔ تم مجھے بار بار عمر کا طعنہ دے رہے ہو۔ میں تمہارے چیلنج کا جواب دے سکتی ہوں۔ ایک سے ایک خوبرو جوان کو بوائے فرینڈ بنا سکتی ہوں۔ مگر تمہیں کوئی لڑکی گھاس نہیں ڈالے گی۔"

"تم میری فکر نہ کرو۔ تمہارے طبقے میں سولہ برس سے لے کر ساٹھ برس تک کی دوشیزائیں بوائے فرینڈ بناتی رہتی ہیں۔ تم پر بھی کوئی انگلی نہیں اُٹھائے گا۔ ایک نہیں ایک درجن بوائے فرینڈ بناؤ۔"

اُس نے ریسیور رکھ کر رابطہ ختم کر دیا۔ اس کے بعد دونوں میں ٹھن گئی۔ دونوں یہ ثابت کرنے پر تل گئے کہ ابھی تو ہم جوان ہیں اور حسین لڑکیاں اور خوبرو لڑکے ان کی راہ میں دل بچھانے کے منتظر ہیں۔ انہی کوششوں میں دو برس گزر گئے۔ اس عرصے میں جو بھی آئی اس نے انکل کہا اور جو بھی آیا اُس نے آنٹی یا باجی کہا۔ یہ بھی ان کا خیال تھا کہ آج کی نوجوان نسل پچپن برس کی عمر کو بڑھاپا سمجھتی ہے اور پندرہ بیس برس کی عمر کو جوانی سمجھ کر جوانی سے پہلے ٹھوکریں کھاتی ہے۔

دونوں نے جوان نسل کو محبت اور رومانس کا درس دینے کے لیے اپنی دولت کا سہارا لیا۔ اس طرح وہ غریب لڑکی اور لڑکے کے معاشی مسائل بھی حل کر سکتے تھے۔ نیکی بھی کما سکتے تھے اور اپنے جوان ہونے کا ثبوت بھی دے سکتے تھے۔

◘

وہ باتھنگ ٹب کے اندر صابن کے جھاگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ قریب ہی گردش کرتی ہوئی ٹرالی پر حسین مورتی گھوم رہی تھی اور وہ اتنی دیر تک سوچتے سوچتے بہت ساری وسکی پی گیا تھا۔ اچھا خاصا نشہ ہو رہا تھا۔ اُس نے شاور کے نیچے غسل کیا، تولیے سے بدن پونچھ کر شب خوابی کا لباس پہنا پھر لڑکھڑاتا ہوا بیڈروم میں آیا۔ اُس کی نظر ٹیلی فون کے پاس رکھے ہوئے ریکارڈر پر پڑ گئی تھی۔ اس میں نادرہ کی فون کال ریکارڈ ہوئی تھی۔ اس نے باتھ روم میں جانے سے پہلے نادرہ کی آدھی گفتگو سنی تھی پھر اُسے آف کر دیا تھا۔

وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے ریکارڈر کے پاس آیا پھر پلے کرنے والے بٹن کو دبا دیا۔ نادرہ کی آواز اُبھرنے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی "اب بھی وقت ہے اپنے زہریلے الفاظ واپس لے لو مجھے سوری کہو۔ تم بھی جانتے ہو میں دولت کی چھاؤں میں اپنے حسن و شباب کی تعریفیں سن سن کر خوش ہوتی آئی ہوں۔ بڑھاپے کا طعنہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ مجھے سوری کہو۔ ایک بار اپنی غلطی تسلیم کر لو۔ نہیں کرو گے تو شہزادے سے نکاح پڑھوا لوں گی۔"

"اے بے وفا! میں دولت مند ہوں تو کیا ہوا؟ کیا عورت نہیں ہوں۔ عورت امیر ہو یا غریب، اُس میں وفا اور شرم ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حالات اور ماحول اسے بے شرم بنا دیتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے میں ابھی تک شرم والی ہوں۔ آج بھی کسی دوسرے کو اپنا ہاتھ چھونے نہیں دیتی۔ شادی کے نام پر کسی غیر مرد کو برداشت نہیں کر سکتی۔ تم نے مجھے زندگی کے کس سنسان موڑ پر لا کر چھوڑ دیا ہے۔ بتاؤ میں تمہارے پاس کیسے آؤں؟ کس رشتے سے آؤں؟"

اس کی آواز آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ برکت نے ریکارڈر کو آف کر دیا پھر بڑبڑاتے ہوئے کہا: "مگرمچھ کے آنسو۔ میں اس عورت کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ یہ ایک طرف رو رو کر مجھ سے شدید محبت کا اظہار کرتی ہے اور دوسری طرف ایک نوجوان کو بوائے فرینڈ بنا کر چیلنج کر رہی ہے کہ میں کسی جوان حسینہ کو گرل فرینڈ نہیں بنا سکوں گا۔ بزنس مین کی مکار بیٹی دوہری چالیں خوب چلتی ہے۔"

اُس نے ریسیور اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر نشے میں ہاتھ دوسری طرف پڑ گیا۔ دوسری بار اُس نے دونوں ہاتھوں سے لپک کر اُسے اٹھایا جیسے ریسیور بھاگنے والا ہو۔ پھر اُس نے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ قائم ہونے پر کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ اُس نے کہا: "اچھا جان! نادرہ تمہیں اپنے بیڈ روم میں لے آئی ہے۔ میرے سامنے پارسائی جتا رہی تھی کہ شادی کے نام پر بھی کسی دوسرے مرد کو برداشت نہیں کرے گی۔"

دوسری طرف سے ڈانٹ کر کہا گیا: "ابے او شرابی! میں تھانے کا انچارج ہوں اور تھانے سے بول رہا ہوں۔ اپنا پتا بتا۔ میں تجھے ابھی اندر کر دوں گا۔"

برکت نے کریڈل پر ہاتھ رکھا۔ رابطہ ختم ہو گیا۔ دوسری بار صحیح نمبر ڈائل ہوا۔ نادرہ کی آواز سنائی دی: "ہیلو، کون؟"

"میں بول رہا ہوں۔ یہ مت سمجھنا نشے میں ہوں۔ میں تمہاری مکاری خوب سمجھتا ہوں۔ ایک جوان کو کانی ہاؤس میں بلا کر مجھے چیلنج کرتی ہو۔ اگر ایک باپ کی بیٹی ہو تو پرسوں تک زندہ رہنا۔ کانی ہاؤس میں آ کر دیکھنا، میرے ساتھ ایک ایسی حسین و جمیل دوشیزہ ہوگی جسے دیکھنے کے بعد تم آئینے میں اپنے بڑھاپے کو نہیں دیکھ سکو گی۔"

وہ بولتا جا رہا تھا۔ مدہوشی میں میز پر جھکتا جا رہا تھا۔ اس کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی پھر وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے میز پر اوندھا ہو گیا۔ ریسیور چہرے کے پاس پڑا رہ گیا۔ زبان چپ ہو گئی تھی۔ نادرہ پکار رہی تھی: "ہیلو، ہیلو، برکی! ہیلو..."

وہ دو چار بار آوازیں دے کر چپ ہو گئی۔ رابطہ ختم نہیں ہوا تھا اس لیے یقین تھا وہ کچھ بولے گا۔ لیکن ذرا دیر بعد ہی ریسیور سے خراٹوں کی آواز سنائی دی۔ ایک طویل عرصے بعد وہ چھوٹی خرّاٹے بے چینی کا باعث بن گئے۔ اس کی آنکھیں خواب ناک ہو گئیں۔ وہ ریسیور کو کبھی سینے سے لگانے اور کبھی ہونٹوں سے چومنے لگی۔ وہ خرّاٹے اُس کے ہونٹوں پر سنگ رہے تھے، سانسوں میں اتر رہے تھے اور دل میں بج رہے تھے۔ پیار ایسا بھی ہوتا ہے کہ دور رہ کر بھی پاس رہتا ہے۔

٭

وہ تینوں بہنیں نئی کوٹھی میں آ گئیں۔ اُن کے پاس سامان زیادہ نہیں تھا اور جو بھی تھا وہ کوٹھی کے شایانِ شان نہیں تھا۔ وہ ایک کمرے میں مختصر سے سامان کے ساتھ یوں بیٹھی ہوئی تھیں جیسے ریلوے ویٹنگ روم میں ٹرین کا انتظار کر رہی ہوں۔ برکت نے آ کر انہیں دیکھا پھر کہا: "تم تینوں سوچ میں بیٹھی ہو کہ نئی زندگی کی ابتدا کہاں سے کریں اور کیسے کریں؟"

بڑی بہن حسنہ نے کہا: "جی ہاں! زندگی کے نئے راستے پر کس طرح چلنا چاہیے اور کتنی دور تک جانا چاہیے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میرے ساتھ آؤ۔ میں چلنا سکھاؤں گا۔"

وہ تینوں کار میں آئیں۔ نیلا کو اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا

پڑا۔ اس نے ایک دکان میں پہنچ کر لڑکی کے ہر کمرے میں ٹرائیں
پھاڑنے اور پہنے لگنے کا آرڈر دیا۔ حسنا اس دکان کے ایک کاؤنٹر
کو کوٹھی میں لے گئی۔ ایک شوروم سے تمام ضروری فرنیچر خرید لیا
گیا۔ دوسری جس سارا فرنیچر کے ساتھ پہنچ گئی۔ نیلما اس کے پاس
تنہا رہ گئی۔ وہ شکار کر لیا۔ "مجھے خوشی ہے کہ آپ کا انتظار نہیں کیا مجھ
سے دلچسپی ہے۔ چلو لباس کی خریداری سے شاپنگ شروع کرو۔"

وہ اسے بڑی بڑی دکانوں میں لے گیا جہاں سے کہتا رہا "وہ
کیا پسند کرتی ہے؟ کیا خریدنا چاہتی ہے؟ قیمت کی پرواہ کیے بغیر خریدتی
چلی جائے" لیکن وہ چپ چپ سی تھی۔ دو بار پوچھنے کے بعد ایک بار جواب
دیتی تھی۔ برکت اسے اعلیٰ پسند کے کپڑے، سینڈلیں اور میک اپ
کا سامان خرید کر دیتا رہا۔ اس دوران وہ دوستوں کے لیے کچھ خریداری سے
کر رہی تھی اور وہ چیزیں خریدنے کے لیے کہتی تھی۔ اس نے کہا "ہم لوگ
فکر ہے دوستوں کے لیے بھی کچھ لے لو، کوئی بات۔"

"میں بہت دیر سے سوچ رہی ہوں، مجھے کچھ کہنا چاہیے۔ اگر
آپ ٹیپ ریکارڈر خرید لیں اور اس میں سے آواز سنائے تو آپ کی رقم
ڈوب جائے گی۔ میں آپ سے ریکارڈ واپس کروں گی۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا "تم بہت لالچی ہو۔ مگر گھر میں
پڑی ہو میں واپس نہیں کروں گا۔"

"سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں کس موضوع پر بولوں؟ میں نے ابھی
آنکھیں کھولی ہیں۔ بی بی زیادہ دیکھ رہی ہوں۔ میں نہیں جانتی آنا ذریعہ
سے تعلق رکھنے والے گفتگو کے لیے کون سا موضوع پسند کرتے ہیں۔"

برکت کو ذرا غصہ آیا۔ وہ اسے آنا اور ترقی کر رہی تھی۔ مگر اس
نے غصے کو اندر ہی اندر کچل دیا۔ وہ گھر والی نہیں تھی۔ غصہ دکھانے سے
بات بگڑ جاتی۔ وہ دونوں ایک دکان سے نکل کر کار کے پاس آ گئے
کسی نے کار کے پیچھے بھاری بھرکم موٹر سائیکل کھڑی کر دی تھی۔ آس پاس
بھی گاڑیاں ایسی تھیں کہ کار کو وہاں سے نکالنے کی جگہ نہیں تھی۔ برکت نے
بار بار اپنی کار کا ہارن بجایا تاکہ غلط جگہ پارک کرنے والا وہاں آ کر اپنی
موٹر سائیکل ہٹالے مگر کوئی نہیں آیا۔

اس نے نیلما سے کہا "اچھا تعلق رکھنے والی مدد میں
کمزوری کا آغاز ہوتا ہے۔ شکستہ اور کمزور ہو گئی ہیں کہ ایک نئی اینٹ کا
بوجھ برداشت نہیں کر پاتیں۔ میں ایک اینٹ تو کیا پوری گاڑی کو
اٹھا کر ادھر سے ادھر پھینک سکتا ہوں۔"

وہ پہلوانی انداز میں چلتا ہوا موٹر سائیکل کے پاس آیا۔ پھر اس
نے نیلما کے دیکھتے ہی دیکھتے اس بھاری بھرکم گاڑی کو دونوں ہاتھوں
میں اٹھا لیا۔ ویٹ لفٹنگ کا کمال تھا۔ راستہ چلنے والے ٹھٹک گئے۔
قریب سے گزرنے والی گاڑیاں رک گئیں۔ اس کے سر کے بال سفید تھے
مونچھیں سفید تھیں۔ دور سے عمر رسیدہ تھا اور قریب سے اس کی تنومندی
بڑھاپے کو جھٹلا رہی تھی۔ وہ پہلوان بنا ہوا گاڑی اٹھائے ایک طرف گیا
پھر ذرا فاصلے پر آہستگی سے اسے نیچے رکھ دیا۔

کتنے ہی لوگ تالیاں بجانے لگے۔ وہ فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا
نیلما کے پاس آیا۔ اس کے لیے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ چپ چاپ
بیٹھ گئی۔ پھر وہ بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا "یہ تو میری بدن کی طاقت ہے
بڑھاپا نہیں آتا۔"

اس نے کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے نکالی پھر ڈرائیو کرتے
ہوئے بولا "آپ تو خاموش ہو گئیں۔"

نیلما نے بے اختیار پوچھا "آپ کی عمر کیا ہو گی؟"

"ستاسی برس۔"

وہ ہونٹ بھینچ کر مسکرائی پھر بولی "آپ مذاق کر رہے ہیں۔"

"جوانی کا زندہ کمال یہ ہے کہ بوڑھا برکت بڑھاپے کا نشانہ نہیں بنتا۔" برکت نے
کہا "آنکھیں جو دیکھتی ہیں، وہی سچ ہوتا ہے۔ تمہاری آنکھیں میری تنومندی
کو دیکھیں گی تو عمر کم ہو گی۔ سفید بالوں کو دیکھیں گی تو زیادہ ہو گی۔ سمندر
ہزاروں لاکھوں برس کا بوڑھا ہے مگر اس کی لہریں ہر لمحہ جوان ہوتی ہیں۔ ساحل
چٹانوں کو ٹکریں مار کر توڑ دیتی ہیں۔ جس طرح سمندری سیپ … ہوتا
ہے اسی طرح تند و تیز لہروں کی جوانی بوڑھے سمندر کے اندر … ہوتی ہے
تمہیں ذہنی طور سے معلوم ہو کہ میں اور سمندر کبھی اندر سے بوڑھے نہیں ہوتے۔"

اس نے ایک بیوٹی پارلر کے سامنے گاڑی روک دی۔ نیلما کے
ساتھ گاڑی سے نکل کر دکان کے اندر آیا۔ ایک عمر رسیدہ خاتون نے مسکرا کر
خوش آمدید کہا۔ وہ بولا "یہ نیلما ہے، میری کزن۔ قسمت والے لمبی
فرمائشوں سے خوش رہتے ہیں اور قدرت نے تمہارے ہاتھوں میں ہنر
کو دو آتشہ بنانے کا ہنر دیا ہے۔ اسے تمہارے اور سنوارنے میں جتنی بھی
محنت کر سکتی ہو کرو۔ معاوضے کی فکر نہ کرو۔ جو تمہاری زبان سے نکلے گا، وہی
دوں گا۔ یہ ایڈوانس رکھو۔"

اس نے پیشگی ایک ہزار روپے دے کر کہا "میں ایک گھنٹے
بعد آؤں گا۔"

"اگر آپ اسے مکمل دیکھنا چاہتے ہیں تو تین چار گھنٹے بعد آئیں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں اطمینان سے آؤں گا۔"

اس نے نیلما کے شانے پر ہاتھ رکھ کر … کہنا چاہا۔ وہ جھجک
سے سمٹ کر ایک طرف ہو گئی۔ اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا
"کوئی بات نہیں، میں ابھی آؤں گا۔"

وہ دکان سے باہر آیا، پھر کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
سوچنے لگا "یہ سہمی ہوئی ہرنی ہے۔ آہستہ آہستہ مانوس ہو گی۔"

وہ کار اسٹارٹ کرنا چاہتا تھا، اسی وقت نادرہ دکھائی دی۔
وہ سامنے والے فٹ پاتھ پر شوہر کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس نے ہیئر
سیلون جا کر میک اپ کیا تھا۔ نہایت قیمتی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کے

ریاست میں لاکھ دو لاکھ کے ہیرے بھی جڑے ہوں گے مگر اس سے کیا ہوتا ہے کھنڈر کو جگمگ کرتے نگینوں سے سجایا جائے تب بھی وہ شاہی محل تو نہیں کہلاتا۔

برکت نے ناگواری سے کہا "یہ لڑکی بھی آئینہ نہیں دیکھتی ہے؟ اس جوان کے ساتھ ایسی لگ رہی ہے جیسے ماں اپنے بچے کی انگلی پکڑ کر شاپنگ کے لیے جا رہی ہو۔"

ایسا سوچتے وقت وہ خود کو بھول رہا تھا۔ نیلما کو شاپنگ کراتے وقت کتنے ہی دکانداروں نے اُسے انکل کہا تھا اور نیلما کو بے بی کہتے رہے تھے۔ اس حساب سے وہ دونوں کو باپ بیٹی سمجھ رہے ہوں گے۔ وہ انکل کہلانے پر بُرا مانتا تھا مگر ہر ایک سے جھگڑا کر کے اپنی شہ زوری کے حوالے سے جوانی کا ثبوت پیش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے طور پر مطمئن تھا کہ جوانی اندر سے قائم ہے اور شاید دائم بھی ہوگی۔

وہ تین گھنٹے تک کاروباری معاملات میں مصروف رہا اور نادرہ کے ساتھ نظر آنے والے جوان کے متعلق کئی بار سوچتا رہا۔ یہ بھی تسلیم کرتا رہا کہ اس بزنس میں باپ کی بیٹی نے زبردست نوجوان کا انتخاب کیا ہے جسے شہزادہ ہر لحاظ سے خوبرو اور گبرو جوان کہلانے کا مستحق تھا۔ اگر نیلما، نادرہ کے انتخاب پر بھاری نہ پڑی تو بڑی سبکی ہوگی۔ وہ یہی سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ نیلما کو جلد سے جلد دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا حسن بیوٹی پارلر میں دو دھاری تلوار بن جائے گا یا نہیں؟

وہ بیوٹی پارلر کے ویٹنگ روم میں پہنچا۔ میڈم نے کہا "آپ تشریف رکھیں۔ ابھی اُسے تیار کیا جا رہا ہے۔"

اس نے کہا "چار گھنٹے گزرنے والے ہیں، وہ ابھی تک تیار نہیں ہوئی؟"

"مسٹر! آپ نے فرمایا تھا، زیادہ وقت اور زیادہ توجہ کے ساتھ اُسے جنت سے زمین پر اتارا جائے۔"

وہ خوش ہو کر بولا "ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ میں نے یہی کہا تھا آپ جائیں توجہ دیں۔ میں یہاں آرام سے بیٹھا رہوں گا۔"

میڈم ویٹنگ روم سے نکل کر نیلما کے پاس آئی۔ وہ آدم قد آئینے کے سامنے کھڑی حیرانی سے اپنے حسن و جمال کو دیکھ رہی تھی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کوئی دوسری نیلما سامنے کھڑی ہے جو پیدائش کے وقت سے اس کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ اس نے کہا "میڈم! مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ میں ہوں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرے اندر اتنا حسن بھرا پڑا ہے۔"

میڈم نے کہا "حسن ہر انسان کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ کوئی علم کے ذریعے حسن کو کرید کر عالم بن جاتا ہے۔ کوئی اپنی لگن سے حسن کو اجاگر کر کے ہنرمند کہلاتا ہے اور کوئی دولت کے ذریعے کسی غریب نیلما کے..... اندر سے حسن کو دریافت کر لیتا ہے۔ حسن باہر سے دیکھنے کی چیز ہے لیکن یہ ہمیشہ اندر ہوتا ہے جو اسے باہر لے آتا ہے وہی حسین کہلاتا ہے۔"

"کیا ابھی اور محنت کریں گی؟"

"اتنی ہی کافی ہے۔ مسٹر برکت انتظار کر رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں تم ابھی نہ جاؤ۔ ذرا انتظار کرنے دو۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

وہ سمجھ رہی تھی لیکن انتظار محبوب کو کرایا جاتا ہے تاکہ اس کے دل میں دیدار کی آرزو شدید ہو جائے۔ برکت جیسے خریدار کے دل میں وہ ایسی آرزو پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جب سے آئینے کے سامنے نکھر رہی تھی اور سنور رہی تھی تب سے ناصر کے سامنے جانے کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک خیال تھا کہ وہ اس نئے روپ میں اُسے دیکھ کر حیران رہ جائے گا اور دیوانوں کی طرح دیکھتا رہے گا۔ کچھ بولنا بھول جائے گا۔ پھر خیال آتا تھا کہ پرائی دولت سے تراشے ہوئے حسن پر برہم ہوگا۔ وہ پچھلی رات اس سے ملنے گئی تھی اُسے اپنا دکھڑا سنایا تھا اور بتایا تھا کہ ایک دولت مند اُسے خرید رہا ہے۔ وہ کبھی بکنے کے لیے تیار نہ ہوتی لیکن اپنی زندگی داؤ پر لگا کر دو بہنوں کو دھوم دھام سے سہاگن بنا سکتی ہے۔

ناصر نے بے بسی سے کہا "میرے سوال یہی تمہیں ہو جائیں گے"

تصویروں کا البم

جوشی صاحب کا ایک دوست اُن کے یہاں تصویروں کی البم دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے ایک تصویر دکھا کر پوچھا "یہ کس کی تصویر ہے؟"

جوشی صاحب نے فرمایا "کوئی بیوقوف سا شخص معلوم ہوتا ہے۔"

انہوں نے گردن جھکائی۔ جوشی صاحب ٹھٹکے اور پوچھنے لگے۔

"آخر یہ کس کی تصویر ہے؟"

انہوں نے آہستہ سے جواب دیا "میرے والد کی۔"

جھوٹی

کثرت سے جھوٹ بولنے والی ایک بیوی کسی بات پر ناراض ہو کر اپنے شوہر سے کہنے لگی "میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گی۔"

پھر اس نے کچھ دیر سوچا اور بولی "زیادہ خوش فہمی میں نہ رہنا۔ تمہیں معلوم ہے میں کس قدر جھوٹ بولتی ہوں۔"

جہیز کے بغیر تمھیں قبول کرلیں گے لیکن تمھاری بہنوں کے لیے کچھ نہیں کرسکیں گے ویسے برا نہ ماننا تمھاری بہنیں خود غرض ہیں۔ تمھیں اپنے مفادات کے لیے قربانی کرری ہیں۔"

"ایسا نہ کہو۔ محسن آپ نے ماں بن کر میری پرورش کی ہے۔ وہ تیس برس کی ہوگئی ہیں۔ انھیں دیکھتی ہوں تو جان دے کر انھیں سہاگن بنانے کو جی چاہتا ہے۔ جان دینا کچھ مشکل نہیں ہوتا لیکن دولت مند جو چاہتا ہے اسے ضمیر نہیں مانتا۔ میں تمھارے لیے ہوں صرف تم سے لیے۔ مگر ان حالات میں کیا کروں؟"

ناصر نے کہا۔ "اس بڈھے کو دو دن تک کسی طرح ٹالتی رہو۔ خود کو بچائے رکھنے کی کوشش کرو۔ امتحان کے دو پرچے رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد میں اس خبیث سے نمٹ لوں گا۔ تم اپنی بہنوں کے لیے ضمیر کے خلاف نہ جاؤ۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ اس بڈھے کا نام اور پتا بتاؤ۔"

"آپا نے یا میڈم نے اس کا نام لیا تھا۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔ میں کل معلوم کرکے آؤں گی۔"

آج نیلما نے معلوم کیا تھا کہ اس کا نام بابو برکت علی ہے۔ بلڈی بلڈر بھی ہے اور پلازا بلڈر بھی۔ تیّ کاریں چور دروازوں سے امپورٹ کرتا ہے۔ ایک مایو اسٹار ہوٹل کا مالک ہے اور بڑے بڑے منسٹروں تک اس کی پہنچ ہے۔ نیلما نے گھبرا کر سوچا "بڑا خطرناک ہے۔ ناصر کو اس سے دُور رکھنا چاہیے۔ ورنہ یہ میرے چاہنے والے کو الٹے سیدھے کیس میں پھنسوا دے گا۔"

وہ خیالات سے چونک گئی۔ بیوٹی پارلر کے آدم قد آئینے میں برکت نظر آرہا تھا۔ اس کے پیچھے کھڑا ہوا یوں آنکھیں پھاڑ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ میڈم سے کہہ رہا تھا "آپ نے کمال کردیا۔ یہ مجھے ایسا لگتا ہے میرے لیے جنت اُتاری گئی ہے۔ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے کاش میں پہلوان نہ ہوتا شاعر ہوتا۔"

اس نے میڈم کو دو ہزار روپے دیے۔ پھر نیلما کے ساتھ باہر آیا۔ کار میں بیٹھتے ہوئے سوچنے لگا "اچھا ہوا میں شاعر نہیں ہوا۔ شاعر کے حالات اسے جوانی میں بھی جوان نہیں رہنے دیتے جب کہ میں بڑھاپے میں بھی شیر بنا ہوں۔ عمر بھر شعر کہنے سے بہتر ہے آدمی شیر بنا رہے۔"

نیلما نے پوچھا "ہم کہاں جارہے ہیں؟"

"مجھے اپنی خبر نہیں ہے۔ تمھیں دیکھ رہا ہوں اور خود کو بھول رہا ہوں۔ تم بتاؤ کہاں چلنا چاہتی ہو؟"

"میں بہت تھک گئی ہوں۔ گھر میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے ابھی چار بج رہے ہیں۔ سات بجے تک آرام کرو۔ پھر میں آؤں گا اور تمھیں ڈنر کے لیے لے جاؤں گا۔"

"اگر میں آج رات کہیں نہ جاؤں تو کیا حرج ہے؟"

"تم خود سوچو۔ آج میں نے تقریباً پچاس ہزار کے قالین پردے اور فرنیچر والے ہیں پچیس ہزار سے زیادہ کی شاپنگ کرائی ہے۔ تمھارے حسن کو چار چاند لگائے ہیں۔ تمھیں ساتھ لے کر ہوٹلوں اور کلبوں میں نہیں جاؤں گا تو اتنی محنت اور روپے کا کیا صلہ ملے گا؟"

"آپ درست کہتے ہیں سر۔ آپ کے حکم سے انکار نہیں کروں گی۔"

"یہ حکم والی بات نہ کرو۔ میں آقا نہیں ہوں۔ تم لونڈی نہیں ہو۔ میں تمھیں محبت سے جیتنا چاہتا ہوں۔"

"آپ وعدہ کریں کچھ روز ہمارے درمیان فاصلہ رہے گا۔"

"کتنا فاصلہ؟"

"جتنا اب ہے۔"

اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے پاس بیٹھی ہوئی حسن و شباب کی نوخیز صورت کو دیکھا۔ پھر کہا "ابھی ایک بالشت کا فاصلہ ہے۔ یہ مجھے منظور ہے۔"

وہ اس عمر میں پکا بزنس مین بن چکا تھا۔ وہ کل سے اب تک رقم پھینکتا آیا تھا۔ آئندہ نیلما کا کوئی رشتے دار یا ہمدرد اعتراض کرنے آتا تو اس لڑکی کو نجات دلانے کے لیے اتنی بڑی رقم ادا نہیں کرسکتا تھا۔ سودا پکا تھا۔ ایڈوانس کی رقم اتنی بڑی تھی کہ نیلما پھنس کر رہ جاتی۔ یہ بات وہ بھی سمجھ رہی تھی۔ ناصر اس کی خاطر جان دے سکتا تھا۔ اتنی رقم کا بندوبست نہیں کرسکتا تھا۔

●

شہزاد نے قیمتی سوٹ میں رچ رہا تھا۔ کافی ہاؤس کی اس میز پر نادرہ کے سامنے بیٹھا دھیمی آواز میں باتیں کررہا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے آس پاس دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔ دُور تک میزوں کے اطراف بیٹھے ہوئے رومانی جوڑے اپنے رومانس کے دوران اُسے اور شہزاد کو دیکھتے جاتے تھے۔ دیکھنے کا اپنا اپنا زاویہ ہوتا ہے۔ کوئی لڑکی شہزاد کی خوبروئی کو بے اختیار دیکھنے لگتی تھی۔ کوئی نادرہ کی امارت کا اندازہ کرتا تھا۔ ایک شخص اپنی میز پر اپنی محبوبہ کی طرف جھک کر کہہ رہا تھا "یاد ہے یہ نوجوان پرسوں اسی وقت کافی ہاؤس میں آیا تھا تو لنڈے کا لباس پہنے ہوئے تھا۔"

"ہاں ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کیا یہ راتوں رات امیر بن گیا ہے۔"

"آج کل کے بے روزگار نوجوان اگر ہینڈسم ہوں تو ان راہوں پر روزگار سے لگ جاتے ہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں اُس مالدار عورت نے اُسے خوابوں کا شہزادہ بنایا ہے۔"

دوسری میز پر ایک عورت نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "میرا خیال ہے یہ نوجوان تاریخ کا اسٹوڈنٹ ہے۔ اس بوڑھے کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے پانی پت کے میدان میں خم ٹھونک کر آیا ہو۔"

اسی وقت برکت نیلما کے ساتھ کافی ہاؤس میں داخل ہوا۔ نادرہ نے ادھر دیکھا تو اس کی سانس اوپر رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسی حسین و جمیل لڑکی برکت کے ہاتھ لگ جائے گی۔ شہزاد کی نظریں نیلما سے ہٹنا نہیں چاہتی تھیں لیکن روزگار کا معاملہ تھا۔ دال روٹی کا سوال تھا۔ وہ اُدھر سے منہ پھیر کر باسی ڈبل روٹی کو دیکھنے لگا تھا۔

نادرہ نے ناگواری سے کہا: "اس کی بیٹی لگتی ہے۔"

اب وہ بیٹی لگے یا گرل فرینڈ۔" برکت تو حملہ کرنے آیا تھا۔ وہ اس کے دائیں طرف والی میز پر آ کر نیلما کو ایسی جگہ بٹھا رہا تھا جہاں سے شہزاد کا مسلسل سامنا ہوتا رہتا۔ وہ جوان نادرہ سے گفتگو کرتا مگر نظر نیلما پر بھی پڑتی رہتی۔

کافی ہاؤس کے اندر بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ جو لوگ دوسروں کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتے تھے، وہ بھی رہ رہ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگتے تھے کیونکہ وہ مجبور تھے۔ ایک معمر خاتون نوجوان فرینڈ کے ساتھ تھی اور ایک بوڑھا شخص انتہائی کم سن لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں ماں بیٹے کے ساتھ اور باپ بیٹی کے ساتھ نہیں آتا تھا۔ اس لیے ان کے تعلقات سوالیہ نشان نہیں تھے۔ سوال یہ تھا کہ معمر خاتون کی میز پر روبرو جوان تھا اور دوسری میز پر (ذرا فاصلے ہی سہی) بوڑھا بھی روبرو تھا۔ کیا وہ خاتون اس جوان اور بوڑھے کا موازنہ کر رہی تھی؟

دوسری طرف نوجوان کے بالمقابل معمر خاتون تھی اور دوسری میز پر (ذرا فاصلے پر سہی) نوجوان حسین دوشیزہ تھی۔ سوال یہ تھا کہ وہ جوان اس خاتون پر اکتفا کرے گا یا دوشیزہ کی طرف پھسل جائے گا؟

برکت کا حملہ کامیاب ہو رہا تھا۔ شہزاد نادرہ سے باتیں کرتے کرتے بے اختیار نیلما کو دیکھ لیتا تھا جبکہ شعوری طور پر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ قدرتی تقاضوں کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ جوانی جوانی کو کھینچ رہی تھی۔ بڑھاپا جوانی کو لگام نہیں دے سکتا۔ یہ سیدھی بات سب سمجھتے ہیں۔ اس وقت وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

نادرہ نے دانت پیستے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "شہزاد! میں تمہاری نظریں دیکھ رہی ہوں۔ کیا تم یہاں میری انسلٹ کرنے آئے ہو؟"

"اوہ نو! خدا جانتا ہے تم میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہو۔ میرے خاندان سے زیادہ، میری جان سے زیادہ اہم ہو۔ میں ایسی ہزاروں دوشیزاؤں کو تم پر قربان کر سکتا ہوں۔"

"پھر اسے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"اسے نہیں، اس کی آنکھوں میں بوڑھے کو دیکھ رہا ہوں۔ ذرا تم بھی دیکھو لڑکی پریشان ہے جیسے بوڑھا زبردستی اُسے اٹھا لایا ہو۔"

نادرہ خوش ہو کر بولی۔ "تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔ یہ پہلوان ہے بڑے بڑے داؤ استعمال کرتا ہے اور حریف کو چت کر دیتا ہے۔"

"کیا تم اسے جانتی ہو؟"

"ہاں! یہ مجھے شکست دینا چاہتا ہے لیکن اس سے پہلے میں اسے منہ توڑ جواب دینا چاہتی ہوں۔ میں جیسا کہوں ویسا کرو گے؟"

"جان دے کر بھی کروں گا۔"

"اس لڑکی کو بڈھے کی طرف سے پھیر دو۔"

"کیسے پھیر دوں؟"

"کچھ بھی کرو۔ اسے محبت کے جال میں پھانس لو۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں اس سے محبت کروں؟"

"میں اجازت دے رہی ہوں۔ تم اسے جتنی جلدی بوڑھے سے دُور کرو گے، میں اتنا ہی زیادہ تمہیں انعام دوں گی۔ تم ابھی اسے بڈھے سے توڑ دو گے تو کل میں تم سے شادی کر لوں گی۔"

وہ بڑے جوش میں بول گئی۔ پھر اس نے چونک کر برکت کو دیکھا۔ وہ نیلما سے مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ شہزاد نے پوچھا۔ "تم... تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"آں؟ نہیں! میں کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ م... میں کہنا چاہتی تھی اس لڑکی سے تمہاری شادی کرا دوں گی۔ تمہیں بہت بڑے کاروبار کے لیے بہت بڑی رقم دوں گی مگر کوئی کمال دکھاؤ۔ فوراً دکھاؤ۔"

"تم بہت بڑی آزمائش میں ڈال رہی ہو۔ مگر کوئی تدبیر سوچنے کی مہلت دو۔"

"تدبیر ضرور سوچو۔ مگر اسے نظر بھر کر دیکھنا شروع کر دو۔ وہ دیکھے تو مسکراؤ۔ یہ لڑکی پھانسنے کا طریقہ میں تمہیں بتاؤں۔ تمہارے پاس عقل نہیں ہے۔"

وہ دانت نکال کر مسکرانے لگا۔ یہی کام اسی وقت نیلما نے دیکھا تھا۔ اس کے مسکرانے کے انداز پر وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ شہزاد نے آہستگی سے کہا۔ "تعجب ہے، یہ تو پہلی نظر میں پھنس گئی۔ اب کیا کروں؟"

ایک سیاح ایک گائیڈ کے ساتھ چڑیا گھر کی سیر کر رہا تھا کہ وہ ایک ایسے پنجرے کے پاس پہنچا جس میں شیر اور بکری اکٹھے بند کیے ہوئے تھے۔

سیاح حیرت کے ساتھ بولا۔ "واہ واہ! یہ پرامن بقائے باہمی کی ایک شاندار مثال ہے، لیکن آخر یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"اس کا جواب صاف ہے۔" گائیڈ بولا۔ "کہ ہم ہر روز اس پنجرے میں ایک نئی بکری ڈال دیتے ہیں۔"

نادرہ اُسے گائیڈ کرنے لگی۔ اُدھر برکت نے نیلما سے پوچھا۔ "کس بات پر ہنس رہی ہو؟"

وہ بولی "وہ جو نوجوان ہے احمقوں کی طرح دانت نکال کر مسکرا رہا تھا، کچھ نروس لگ رہا ہے۔"

"اسے اُلّو بناؤ۔ وہ اچھا شکار رہے گا۔"

"مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میرے اسکول کی ایک لڑکی اکثر ایک جوان کو اسی طرح گھیر کر اور احمق بنایا کرتی تھی۔ ایک روز پھنس گئی۔ وہ احمق اسے گن پوائنٹ پر کہیں لے گیا تھا۔"

"میں تمہاری حفاظت کے لیے موجود ہوں اور تم میری تندرستی دیکھ چکی ہو۔ پلیز اُسے اپنے پاس آنے پر مجبور کر دو۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"اس کے ساتھ باہر چلی جانا۔ میں تمہارے ساتھ سائے کی طرح لگا رہوں گا۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

وہ ذرا سوچ کر بولی "جیسا کہہ رہے ہیں، ویسا ہی کروں گی۔ لیکن آپ بھی میری بات مانیں گے۔ اندھیرا ہونے کے بعد سمندر کے کنارے چلیں گے۔"

"یہ بھی کوئی شرط ہے، میں چلوں گا۔"

نیلما نے شہزاد کو دیکھا۔ اس سے نظریں ملتے ہی مسکرائی۔ اس نے خوش ہو کر نیلما سے اشارے میں پوچھا "میں تمہارے پاس آؤں؟"

وہ شرمانے لگی۔ شہزاد کامیابی کا یقین کرتے ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ سوچ رہا تھا، وہ حسینہ کو بوڑھے سے توڑ سکتا تھا۔ نادرہ نے دھیمی آواز میں کہا "دیر نہ کرو، جاؤ۔"

وہ آگے بڑھا۔ برکت کی میز پر آیا پھر اسے نظرانداز کرتے ہوئے بولا "مجھے شہزاد کہتے ہیں اور تمہیں؟"

"میں نیلما ہوں۔ فرمائیے؟"

"تمہارے حسن کی جادوگری کھینچ لائی ہے۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"میں سن رہی ہوں۔"

"یہاں نہیں، کہیں دوسری جگہ چلو۔"

برکت نے پوچھا "اے مسٹر! بات کیا ہے؟"

شہزاد نے کہا "یو شٹ اپ! یہ تمہاری کوئی نہیں لگتی ہے۔ تم اسے کہیں سے لائے ہو۔ میں بھی کہیں لے جا سکتا ہوں۔ یہ خیرات کی شیرینی ہے کسی کے ہاتھ میں بھی آ سکتی ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا "چلو میرے ساتھ۔"

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھتے ہوئے بولی "تم نے میرا ہاتھ پکڑنے کی جرأت کیوں کی؟"

اس نے ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ چٹاخ کی آواز پورے کافی ہاؤس میں گونج گئی۔ تمام لوگ اُدھر دیکھنے لگے۔ کچھ اپنی جگہ سے اٹھ کر شہزاد کی طرف آنے لگے۔ کافی ہاؤس کا مالک دوڑتے ہوئے نادرہ بیگم کے پاس آیا پھر بولا "بیگم صاحبہ! یہ آپ کے ساتھی نے کیا کیا ہے؟ پلیز اسے اپنے پاس بلائیں۔"

نادرہ گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جسے بوائے فرینڈ بنا کر لائی ہے وہ برکت کی گرل فرینڈ سے طمانچہ کھا جائے گا۔ اتنے لوگوں کے سامنے خصوصاً برکت کی طنزیہ نظروں کے سامنے وہ اپنی بے عزتی محسوس کر کے شرم سے گڑی جا رہی تھی۔

کافی ہاؤس کا مالک بیگم کو سکتے کی حالت میں دیکھ کر نیلما اور شہزاد کے درمیان آیا۔ پھر برکت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا "پلیز! اور بات نہ بڑھنے دیں۔"

برکت نے کہا "ایک طمانچہ ہی کافی ہے۔ بات نہیں بڑھے گی۔ دراصل اس جوان کا بھی قصور نہیں ہے۔ اس بیچارے کو بڑھاپے کے سحر میں رکھا گیا تھا۔ میرے ساتھ جوانی کی نئی بہار دیکھتے ہی کھنچا چلا آیا۔ اس سے جو گستاخی ہوئی، اس کی سزا مل گئی۔ مگر سزا وہ ناقابلِ برداشت ہوتی ہے جب جوان ساتھی ایک نئی چیز کے لیے پرانی چیز کو ٹھکرا دیتا ہے۔"

نادرہ میں اور کچھ سننے کی تاب نہیں تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر تیزی سے چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ شہزاد اس کے پیچھے دوڑتا ہوا آیا۔ وہ اپنی کار کے پاس رک کر بولی "کمینے! اُلو نے میری عزت، میرا غرور خاک میں ملا دیا۔ بھاگ جا یہاں سے۔ میں تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"میں تو تمہارے مشورے پر عمل کر رہا تھا۔"

"کیا میں نے تھپڑ کھانے کا مشورہ دیا تھا؟"

"یہ تو ہم میں سے کسی نے نہیں سوچا تھا کہ وہ ہاتھ اٹھا دے گی۔ وہ مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے اور اشارے کا جواب اشارے سے دے رہی تھی۔ اس کی طرف سے حوصلہ پا کر ہی میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔"

وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کرنے لگی۔ شہزاد نے کہا "میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم نے اس سے محبت کرنے پر مجبور کیا۔ مجھے ایک موقع اور دو۔ مجھ سے ناراض ہو کر نہ جاؤ۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اونہہ!" وہ حقارت سے بولی "آج سے تین برس پہلے میں اسے فٹ پاتھ سے اٹھا کر اپنی زندگی میں لائی تھی۔ اس کا نتیجہ بھگت رہی ہوں۔ تم سب ٹکے کے کیڑے ہو۔ تم لوگوں کو گٹر ہی میں رہنا چاہیے۔ گیٹ لاسٹ۔"

اس نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھائی۔ پھر تیزی سے دور ہوتی چلی گئی۔ شام کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ برکت نیلما کے ساتھ کافی

ہاؤس سے باہر آیا۔ نیلما کے لیے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے حقارت سے شہزاد کو دیکھا۔ نیلما اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ کار کے دوسری طرف سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آیا پھر اُسے اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس پر ہاتھ اٹھا دو گی۔"

وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "یہ ہاتھ صرف میرا چاہنے والا پکڑ سکتا ہے۔ کوئی اور اسے چھونا بھی چاہے تو مجھے آگ لگ جاتی ہے۔"

"تم روانی میں میرے سودے کے خلاف کچھ بول گئی ہو۔"

"میں نے ہوش و حواس میں کہا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، پہلی بار اُس نے میرے اس ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا تو میں نے قسم کھائی تھی اب یہ ہاتھ کسی کے ہاتھ میں نہیں جائے گا۔"

"جتنی جلدی ہو سکے قسم توڑ دو۔"

"جان چھوڑ سکتی ہوں، قسم نہیں توڑ سکتی۔"

"نادان بچی ہو۔"

"ایسی بھی نادان نہیں ہوں۔ یہ سمجھتی ہوں کہ آپ ہماری اوقات سے بہت زیادہ رقم لگا چکے ہیں۔ ہم بہنیں تمام عمر یہ رقم ادا نہیں کر سکیں گی۔"

"جس کے لیے قسم کھائی ہے شاید وہ بھی ادا نہ کر سکے۔"

"وہ اتنی رقم نہیں دے سکے گا لیکن کسی دوسری صورت سے تمام قرض ادا کر سکتا ہے۔"

وہ حقارت سے بولا "چھوٹے لوگ قسطوں پر ادائیگی کی بات کرتے ہیں۔"

"وہ چھوٹا نہیں ہے۔"

"کتنا بڑا ہے؟"

"اتنا کہ میرے وجود کی کل کائنات پر چھایا رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے بے شک آدمی آدمی کو کسی نہ کسی پہلو سے خریدتا رہتا ہے کبھی دولت سے کبھی احسان سے مگر افسوس محبت سے نہیں خریدتا۔"

"میں دولت کا حساب نہیں کروں گا، محبت سے تمہیں خریدنے کی کوشش کروں گا۔"

"آپ کی عمر میں لوگ بچوں سے محبت کرتے ہیں اور بیوی کو بھی اپنی اولاد سمجھتے ہیں۔"

وہ بھڑک کر بولا "تم مجھے بوڑھا کہہ رہی ہو۔ کیا میری شہ زوری کو بھول چکی ہو؟"

"آپ راستہ بھول رہے ہیں۔ میں نے سمندر کے کنارے چلنے کو کہا تھا۔"

وہ راستہ بدلتے ہوئے بولا "ہم سمندر کی طرف جا رہے ہیں مگر آج چاندنی رات نہیں ہے۔ اندھیرے میں سمندر کا حسن مٹ جاتا ہے۔"

"ایسا بھی اندھیرا نہیں ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ نیم تاریکی بوڑھوں کو مکمل تاریکی لگتی ہے۔"

"تم مجھے چیلنج کر رہی ہو۔ اگر میں ثابت کر دوں کہ نیم تاریکی میں مجھے نظر آتا ہے۔ میں عینک کا محتاج نہیں ہوں اور تمہارے عاشق سے زیادہ جوان ہوں تو اپنی قسم توڑ دو گی؟"

"کیا آپ اس سے پنجہ لڑا سکیں گے؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا "میں پنجہ ملاتے ہی اُس کی انگلیاں توڑ ڈالوں گا۔"

وہ بولی "میں نے اُسے سمجھایا تھا آپ پہلوان ہیں دونوں ہاتھوں سے وزنی موٹر سائیکل اُٹھا لیتے ہیں مگر وہ سمجھنا نہیں چاہتا۔ کہتا ہے 'وہ جوان ہے آپ بوڑھے ہیں۔ فری اسٹائل کشتی میں آپ کی گردن توڑ دے گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "اُسے میرے پاس لے آؤ۔ میں اُس کی گردن توڑ دوں گا تو تمہاری قسم آپ ہی آپ ٹوٹ جائے گی۔"

وہ سمندر کی ساحلی سڑک پر آ گئے۔ برکت اُسے باتوں میں لگا کر ویران ساحل کی سمت جا رہا تھا۔ کچھ دور جا کر اُس نے گاڑی روک دی پھر کہا "آؤ ہم ٹھنڈی ریت پر چلیں۔"

نیلما نے ونڈ اسکرین کے پار دور تک دیکھا پھر کہا "ذرا آگے چلیں پھر کار سے اتریں گے۔"

وہ خوش ہو گیا۔ تنہائی اور ویرانے میں کچھ رومانس کا موقع مل سکتا تھا۔ نیلما کی طرف سے اعتراض کی توقع تھی مگر وہ توقع کے خلاف کچھ اور ویرانے میں چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے کار آگے بڑھا دی، ہیڈ لائٹس کو بجھا دیا۔ نیلما نے پوچھا "لائٹس کیوں بجھا دیں؟"

"میں دکھانا چاہتا ہوں کہ چاند نہ نکلا ہو، رات اندھیری ہو تو میں ستاروں کی روشنی میں ڈرائیو کر سکتا ہوں۔"

اُس نے بجھانے کو تو ہیڈ لائٹس بجھا دی تھیں۔ لیکن یہ بھول گیا تھا کہ اچانک روشنی چلی جائے تو تاریکی سے زیادہ تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس کے سامنے ونڈ اسکرین کے پار اُفق تک سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سنبھل سنبھل کر گاڑی چلا رہا تھا۔ ساحلی سڑک کی چوڑائی کا اندازہ تھا۔ اسی اندازے نے اس کا بھرم رکھ لیا تھا۔

نیلما نے کہا "ہم بہت دور آ گئے ہیں۔"

اس نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے فوراً گاڑی روک دی۔ وہ دور تک دیکھنے کے لیے ہیڈ لائٹس آن کرنا چاہتا تھا اسی وقت نیلما نے کہا "ستاروں کی روشنی میں سمندر کتنا پُراسرار لگ رہا ہے۔"

وہ کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے بولا "واقعی۔" حالانکہ کچھ

نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف لہروں کا شور سُنائی دے رہا تھا۔ وہ دونوں سے باہر نکلے۔ آسمان پر دُور تک ستارے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی روشنی میں قریب کا راستہ کسی حد تک دکھائی دینے لگا۔ نیلما سمندر کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک پرچھائیں کی طرح نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔

ساحل ریت ٹھنڈی تھی۔ پاؤں دھنس رہے تھے۔ وہ تیزی سے آگے جا رہی تھی۔ برکت نے اُسے روکنے کے لیے پوچھا۔ "اس ویرانے میں ڈر نہیں لگ رہا ہے؟"

وہ دوڑتی ہوئی اور آگے چلی گئی۔ ستاروں کی روشنی کے باوجود نگاہوں سے اوجھل ہو رہی تھی۔ پھر بیٹھنے سے پہلے ہی اس کے قریب ایک سایہ نظر آیا۔ وہ بولا: "یاد کرنے والا موجود ہو تو ویرانہ ویرانہ نہیں رہتا۔"

برکت نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہے؟"

نیلما کی آواز آئی۔ "آپ پوچھتے کیوں ہیں؟ میرا ہاتھ دیکھیں۔ یہ ہاتھ ان ہاتھوں میں ہے جن کے لیے میں جان چھڑک سکتی ہوں قسم نہیں توڑ سکتی۔"

اُسے دو ہیولے سے سائے نظر آ رہے تھے۔ دوسرے کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہ بھڑک کر بولا۔ "اچھا تو تم اس کے لیے یہاں آنا چاہتی تھیں۔ میں حیران تھا کہ ویرانے میں بے خوف و خطر کیسے آ گئی ہو؟ کیا یہ تجھ سے لڑے گا؟"

جوان مرد کی آواز آئی۔ "لڑاؤں گا۔"

"بچو! اگر لڑتا ہے تو چند منٹ کے بعد آنکھوں سے نظر نہیں پکڑ سکے گا۔ میں نے آج تک کشتی نہیں ہاری۔ کسی میدان میں شکست نہیں کھائی۔ میری ہر فتح میری کھول بہتی ہوئی جوانی کا ثبوت ہے۔"

"میں صرف یہ نہیں لڑاؤں گا۔ تجھے فری اسٹائل میں پچھاڑ کر اپاہج بنا دوں گا۔"

برکت اس بات پر ہنسنا چاہتا تھا۔ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا۔ "جوان! تیری آواز کچھ جانی پہچانی سی ہے۔"

"کیا مقابلے کے خوف سے جان پہچان پیدا کرنا چاہتا ہے؟"

"بکواس مت کر۔ تو بڑی سے بڑی سفارش لے کر آئے گا تب بھی تجھے پچھاڑ کر اس لڑکی کو اپنی جوانی کا زور دکھاؤں گا۔"

"مجھے تو ایک بوڑھے پہلوان سے لڑتے ہوئے ندامت سی ہو رہی ہے۔ ذرا سوچا کر۔ کیا تو نے بھری جوانی میں کسی بوڑھے پہلوان سے مقابلہ کیا ہے؟"

"اس سوال کا مقصد کیا ہے؟"

"یہی کہ مقابلہ کیا ہے تو اس بوڑھے پہلوان کی شکست کو یاد کر کے نیلما کے حصول سے باز آ جا اور واپس چلا جا۔"

برکت باتوں کے دوران قریب آ کر پینترا بدلنے لگا۔ وہ جوان قریب سے مکمل سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اُس پر آسانی سے حملہ کیا جا سکتا تھا۔ نیلما دُور ہو گئی تھی۔ برکت نے حملہ کیا۔ وہ بچ گیا۔ دوسرے لمحے میں جوان نے اچانک ہی پلٹا کھایا۔ پھر دھوبی پاٹ کا داؤ استعمال کرتے ہوئے اسے دُور پھینک دیا۔ ریت پر گرتے ہی برکت کے حلق سے کراہ نکلی۔ وہ ایسے وقت فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہو جاتا تھا لیکن اس وقت اُٹھ نہ سکا۔ ریڑھ کی ہڈی دُکھنے لگی تھی۔

جوان نے کہا۔ "دادا جانی! میں تیرا پوتا ناصر پہلوان ہوں۔ آج سے کوئی چالیس برس پہلے تُو نے اسی جگہ میرے ایک بزرگ کو پچھاڑا تھا۔ میں نے اس کا انتقام نہیں لیا ہے۔ تجھے پہلے ہی سمجھایا تھا کہ کسی بوڑھے پہلوان کی شکست کو یاد کر لے۔ مگر تُو گزری ہوئی جوانی کی لاش اٹھائے گھومتا ہے۔ اپنی بزرگی پر غور نہیں کرنا چاہتا۔"

بابو برکت علی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ وہ برسوں بعد اپنے پوتے کی آواز سن رہا تھا۔ وہاں روشنی ہوتی تو شاید ناصر کو صحیح طور پر پہچان نہ پاتا۔ کیوں کہ دوسری شادی کے بعد وہ برس دو برس میں پہلی بیوی، بیٹوں اور پوتوں سے سرسری ملاقات کے لیے جاتا تھا اور انہیں جائداد خریدنے اور کاروبار کرنے کے لیے لاکھوں روپے دے کر چلا آتا تھا۔ نادرہ کو طلاق دینے کے بعد اُسے اپنے بیٹوں اور پوتوں کی اہمیت کا پتا چلا تھا۔ کیوں کہ ان سے اس کے نام کا سلسلہ چلنے والا تھا۔ نادرہ نے کوئی اولاد پیدا نہیں کی تھی۔

ان حالات میں وہ پہلوان پوتا ناصر بہت اہم اور بہت پیارا تھا۔ کیوں کہ دادا کے نقش قدم پر پہلوانی کر رہا تھا۔ آج اس نے دادا کو پچھاڑ کر گزری ہوئی باتیں یاد دلائی تھیں اور کہہ رہا تھا۔ "دادا جی! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں ویسے دنگل میں بھائی بھائی کو اور بیٹا باپ کو پچھاڑتا ہے۔ تجھے یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ پہلوان کبھی شہ زور نہیں ہوتا۔ جوانی شہ زور ہوتی ہے اور یہی جوانی پرانی ہو کر آنے والی نئی جوانی سے مات کھا جاتی ہے۔"

اُس نے نیلما کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "میں اِسے لے جا رہا ہوں۔ یہ تیری ہونے والی بہو ہے۔ جو لوگ طاقت سے زیر نہیں ہوتے وہ رشتوں کی نزاکت سے مات کھا جاتے ہیں۔"

وہ نیلما کے ساتھ جانے لگا۔ برکت سر جھکائے ریت پر بیٹھا رہ گیا۔ اس کے سامنے سمندر کی لہریں اچھل رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہی تھیں، پلٹ رہی تھیں، جوانی کی شرارتیں کر رہی تھیں۔ سمندر ہزاروں لاکھوں برس کا بوڑھا تھا مگر اس کے اندر جوانی لہر لہر موجیں مار رہی تھی۔ ناصر بھی ایک جوان لہر تھا جو بوڑھے کے بطن سے نکل کر جا رہا تھا۔